خطباتِ حکیم الامتؒ

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ
چوک فوارہ ملتان پاکستان فون:4540513-4519240

بسلسلہ خطبات حکیم الامت جلد۔ ۱۷

سُنّتِ ابراہیم

(خطبات حج وقربانی)

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہٗ

عنوانات وترتیب

قاری محمد ادریس صاحب مدظلہ

تصحیح و تزئین — صوفی محمد اقبال قریشی مدظلہ

تخریج احادیث — مولانا زاہد محمود قاسمی

اِدارۂ تالیفاتِ اشرفیہ

چوک فوارہ ملتان پاکستان

(061-4540513-4519240

سُنّتِ اِبراہیم

تاریخ اشاعت..........................رجب المرجب ۱۴۳۰ھ

ناشر..........................ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان

طباعت..........................سلامت اقبال پریس ملتان

قارئین سے گذارش

ادارہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی ہے کہ پروف ریڈنگ معیاری ہو۔ الحمدللہ اس کام کیلئے ادارہ میں علماء کی ایک جماعت موجود رہتی ہے۔ پھر بھی کوئی غلطی نظر آئے تو برائے مہربانی مطلع فرما کر ممنون فرمائیں تاکہ آئندہ اشاعت میں درست ہو سکے۔ جزاکم اللہ

ملنے کے پتے

ادارہ تالیفات اشرفیہ.....چوک فوارہ.....ملتان | مکتبہ الفاروق.مصریال روڈ چوہڑ پال۔راولپنڈی

ادارہ اسلامیات..........انارکلی..........لاہور | دارالاشاعت..........اُردو بازار..........کراچی

مکتبہ سید احمد شہید..........اردو بازار.....لاہور | مکتبۃ القرآن.....نیو ٹاؤن..........کراچی

مکتبہ رحمانیہ..........اُردو بازار.......... لاہور | مکتبہ دارالاخلاص.....قصہ خوانی بازار.....پشاور

ISLAMIC EDUCATIONAL TRUST U.K
(ISLAMIC BOOKS CENTERE

119-121- HALLIWELL ROAD
BOLTON BL1 3NE. (U.K.)

عرض ناشر

اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اپنے اکابرین کی دعاؤں کے طفیل ''خطبات حکیم الامت''، مکمل ۳۲ جلدوں میں شائع کر چکا ہے۔

بہت سے بزرگوں کی تمنا تھی کہ خطبات میں آنے والی احادیث مبارکہ کی تخریج ہوجائے اور فارسی اشعار وغیرہ کا ترجمہ ہوجائے۔

بتوفیقہٖ تعالیٰ ادارے نے زر کثیر خرچ کر کے یہ کام کیا۔ محترم جناب مولانا زاہد محمود صاحب نے تخریج احادیث اور حضرت صوفی محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہ نے فارسی اشعار کے ترجمہ وغیرہ کے کام انجام دیئے۔

اس طرح الحمدللہ یہ جدید ایڈیشن آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے آمین۔

احقر: محمد اسحٰق عفی عنہ

رجب المرجب ۱۴۳۰ھ بمطابق جولائی 2009ء

اظہار مسرت و تحسین

از حضرت اقدس مرشدی ومربی مولانا الحاج محمد شریف صاحب رحمہ اللہ

خلیفۂ ارشد

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"مجھے دلی خوشی ہے کہ عزیز القدر حافظ محمد اسحاق صاحب

مجدد الملت حکیم الامت حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی تالیفات شائع کرنے کے حریص ہیں۔

انہیں حضرت رحمہ اللہ سے صرف محبت ہی نہیں محبت کا نشہ ہے۔ حضرت کے مسلک اور مذاق کی تبلیغ کے بہت خواہشمند ہیں اور زر کثیر خرچ کر کے حضرت کی کتابیں جو نایاب ہیں چھپواتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی سعی کو قبول فرما کر ناظرین کے لئے نافعیت ہدایت اور اُن کے لئے سرمایۂ اخرت بنائیں"۔ آمین

دُعا گو

احقر محمد شریف عفی عنہ

اجمالی فہرست

۷- تعظیم الشعائر صفحہ---۱۶۴	ذٰلِكَ ۗ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ۝
۸-الحج المبرور---۱۸۳	قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۝۱۱
۹- تحصیل المرام صفحہ---۲۱۲	وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۶۹
۱۰- التہذیب (۲۴۴)	وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ۚ
۱۱- روح العج والثج صفحہ---۲۴۸	وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝۲۶ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝۲۷ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْۤ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ۝۲۸ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝۲۹
۱۲- روح الارواح صفحہ---۳۱۵	لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ۗ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ ۗ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۳۷
۱۳-احکام حج---۳۵۹	اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ

فہرست مکتب

سنت ابراہیم

حج وقربانی

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ.

اما بعد! ففي حديثه صلى الله عليه وسلم قالوا ما هذه الاضاحي يا رسول الله قال سنة ابيكم ابراهيم. (السنن الكبرى للبيهقي)

ترجمہ:۔ حدیث شریف میں ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ قربانیاں کیا ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تمہارے ابا جان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہیں۔

عیدگاہ کی حاضری کا اہتمام

چونکہ زمانہ قربانی کا قریب ہے اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ قربانی کے مسائل ضرور یہ بیان کئے جائیں کیونکہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ آج کل قربانی بوجہ لاپروائی کے حسب قاعدہ نہیں کی جاتی حالانکہ ان قواعد کا لحاظ واہتمام نہایت ضروری ہے اور بعض اہل ثروت کو دیکھا گیا ہے کہ وہ خود قربانی ہی کی طرف توجہ نہیں کرتے حالانکہ ذی وسعت پر قربانی واجب اور اسکے ترک پر وعید وارد ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں جو شخص وسعت رکھتا ہو اور قربانی نہ کرے وہ ہماری عیدگاہ کے قریب نہ آوے۔ یہ عیدگاہ وہ جگہ ہے جس میں حاضر ہونے کی تاکید اور ترغیب بیان فرمائی ہے کہ جن پر نماز عید واجب بھی نہیں بلکہ ان کو نماز پڑھنا فرض بھی نہیں ان کو بھی پہلے یہ حکم تھا کہ عیدگاہ میں حاضر ہوں چنانچہ حیض والی عورتوں کو حضورؐ نے حکم فرمایا تھا کہ وہ بھی عیدگاہ میں حاضر ہوں۔ حالانکہ حائضہ کو نماز پڑھنا جائز نہیں (مگر یہ حکم حضورؐ ہی کے زمانہ کے ساتھ خاص تھا اس زمانہ میں بسبب فتنہ کے یہ حکم نہیں جیسا اپنے محل میں تحقیق ہو چکا ہے)

یہاں سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو عیدگاہ میں ضرور جانا چاہئے اور وہیں نماز ادا کرنا چاہئے بعض لوگ اس میں تساہل کرتے ہیں اور بلاعذر اپنے محلّہ کی مسجد میں نماز پڑھ لیتے ہیں۔ہمارے فقہاء نے اس کو منع فرمایا ہے البتہ معذورین جو عیدگاہ جانے کی طاقت نہیں رکھتے ان کو اتنی اجازت دی ہے کہ ان کے واسطے بستی میں ایک امام رہ جائے یا ایسا ہی کوئی عذر شرعی ہے ان کو بھی شہر کی مسجد میں پڑھنے کی اجازت ہے اور فقہاء یہ اپنی طرف سے نہیں کہتے بلکہ وہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودہ قواعد سے جن کو وہ اپنی خداداد قوت اجتہاد سے سمجھتے کہتے ہیں اور حضورؐ کا فرمودہ باری تعالیٰ کا فرمودہ ہے مولانا فرماتے ہیں۔

گفتہ او گفتہ اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمانا اصل میں اللہ تعالیٰ کا فرمانا ہے اگرچہ وہ کلام اللہ تعالیٰ کے بندہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نکل رہا ہے۔

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بانی اسلام ہیں یہ محض غلط اور باطل ہے بلکہ بانی اسلام باری تعالیٰ ہیں چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ (اے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اترا ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دیجئے۔) اس میں صاف تصریح ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم محض مبلغ ہیں اور احکام دینی خدا کے نازل کردہ ہیں اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اسلام دین محمدی ہے یعنی یہ دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس دین کے موجد اور بنانے والے ہیں بلکہ یہ تعبیر مجازی ہے کیونکہ دین تو اللہ ہی کا ہے مگر چونکہ ہم کو بذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے معلوم ہوا ہے اس نسبت خاصہ کی وجہ سے اس طرح تعبیر کر دیا جاتا ہے۔غرض اصل احکام خدا اور رسول کے ہیں فقہاء کا صرف یہ کام ہے کہ انہوں نے اس قانون خداوندی کو جو بذریعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بندوں کو پہنچا تھا۔لوگوں پر ظاہر کر دیا ہے اور بذریعہ قیاس ایسے لوگوں کے لئے اچھی طرح توضیح وتفصیل کر دی جو اس قانون کے سمجھنے کی استعداد نہیں رکھتے تھے۔

اسی واسطے اصول وفقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ مصرح ہے کہ القیاس مظھر لامثبت (قیاس سے کوئی بات ظاہر ہوتی ہے ثابت نہیں ہوتی) اس کی ایسی مثال ہے جیسا کہ ججان ہائی کورٹ نے ایک مسئلہ کو طے کر دیا ہو کہ وہ دراصل قانون ہی کا فیصلہ ہے جو ضرور مانا جائے گا کیونکہ ججان مذکور واضعان قانون کی مقصود کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔لہٰذا ان کا فیصلہ قانونی طور پر صحیح سمجھا جائے گا لیکن یہ نہیں کہا جائے گا کہ ججان مذکور موجد قانون ہیں اور انہوں نے اپنے ایجاد کردہ قانون کے موافق یہ فیصلہ کیا ہے بلکہ وہ مظہر قانون کہلائیں گے۔

یہی مثال فقہاء کی ہے کہ وہ بھی مظہر قانون ہیں نہ کہ موجد، غرض اصل حکم یہ ہے کہ عیدگاہ میں جانا چاہئے۔

رہی یہ بات کہ اس اجتماع و دیگر اجتماعات کی مثل جماعت جمعہ و جماعت پنجگانہ وغیرہ کی کیا مصلحت ہے سو اس مصلحت کے بیان کرنے میں اور نیز دیگر امور شرعیہ کی مصالح کے بیان کرنے میں بھی اس وقت کے عقلاء اور بعض علماء نے بھی ایک غلطی کی ہے اور ٹھوکر کھائی ہے اور حقیقت میں جو چیز اصل مصلحت خداوندی ہے وہ اور ہی شئے ہے مثلاً کہا جاتا ہے کہ جماعت میں مقصود اتفاق ہے اور یہ نکتہ بیان کیا جاتا ہے کہ جماعت پنجگانہ اس مصلحت سے وضع ہوئی تا کہ اہل محلہ شب و روز میں پانچ مرتبہ اپنی اپنی مسجد میں مجتمع و متفق ہو جاویں اور ملاقات کریں اور جمعہ کی جماعت اس مصلحت سے مقرر ہوئی ہے تا کہ تمام شہر کے مسلمان ایک مسجد میں جمع ہو جائیں اور باہم ملاقات کریں اور عید کی جماعت اس غرض سے مقرر کی گئی تا کہ تمام شہر اور اطراف شہر کے کل مسلمان ایک جگہ یعنی عیدگاہ میں جمع ہوں اور باہم ملیں جو مسلمانوں کے اتفاق و اتحاد کی اچھی صورت ہے۔

اے حضرات! محققین کے نزدیک یہ نکتے کچھ بھی قدر نہیں رکھتے اور حقیقت میں یہ نکتے کوئی چیز نہیں شریعت نے نکات کا اہتمام نہیں کیا۔ دیکھو شعراء وغیرہ کی کتابیں قافیہ وغیرہ سے پر ہیں اور قرآن مجید میں اس کا کچھ اہتمام نہیں کیا گیا حالانکہ تمام دنیا بھر کی کتابوں سے قرآن پاک افصح و ابلغ ہے۔ اگر نکتے قابل قدر ہوتے تو خدا تعالیٰ قادر تھا کہ تمام قرآن کو مسجع و مقفی کر دیتا مگر باوجود اس کامل قدرت کے پھر ایسا نہ کیا۔ دیکھو سورہ قٓ مکی ہے اور مکی سورتوں میں بہ نسبت مدنی سورتوں کے بوجہ اس کے کہ مکہ میں اہل زبان زیادہ تھے۔ صناعتیں زیادہ ہیں مگر تکلفات اور زائد نکات سے وہ بھی بری ہیں چنانچہ فرماتے ہیں قٓ. وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ (قٓ (حروف مقطعات سے ہے) قسم ہے قرآن بزرگی والے کی) یہاں تو قافیہ دال ہے آگے فرماتے ہیں۔

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ

(انہوں نے تعجب کیا کہ انہی میں کا ایک رسول ڈرانے والا ان کی طرف بھیجا گیا اور کافروں نے کہا کہ یہ عجیب بات ہے) نہیں یہاں قافیہ با ہے علیٰ ہذا القیاس آگے دیکھئے کہ کچھ قافیہ وغیرہ کا اہتمام نہیں پس بتلا دیا کہ قافیہ وغیرہ کی ضرورت نہیں بلکہ حقائق و معانی کی ضرورت ہے۔

کیونکہ قرآن روحانی مطب ہے اور طب کی کتاب میں زیادہ اہتمام اس کا ہونا چاہئے کہ اس کے نسخے شفاء میں کامل ہوں لفظی نکات کا اس میں اہتمام نہیں ہوا کرتا۔

دیکھئے اگر حکیم عبدالمجید خاں صاحب کے نسخہ میں گل بنفشہ اور کاسنی ہو تو کوئی یہ نہیں کہے گا کہ ان دونوں دواؤں میں قافیہ نہیں اس لئے یہ نسخہ ٹھیک نہیں بلکہ یہی کہا جائے گا کہ یہ نکتہ نہ مقصود ہے نہ قابل لحاظ ہے بلکہ مقصود شفا ہے چونکہ یہ نسخہ اس کے مناسب ہے اس لئے کامل ہے۔

علی ھذا القیاس احکام شرعیہ میں نکات مقصود نہیں بلکہ معرفت الٰہی مقصود ہے پس علماء محققین کی نظر اسی مقصود پر ہے کہ یہ نکات ان کی نظر میں کچھ بھی نہیں ظاہر ہے کہ جس کی نظر اشرفی پر ہو وہ پیسہ کوڑی کو کیا نظر میں لاوے گا۔ وہ معرفت الٰہی ایسی نعمت ہے کہ ان کا ہی دل جانتا ہے اس کے مزہ کے مقابلہ میں تمام دنیا کی نعمتیں ہیچ ہیں وہ معرفت سے ہر وقت مزے لیتے ہیں اور منہ سے کچھ نہیں کہتے گو سب کچھ جانتے ہیں مگر

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(اس بات میں مصلحت نہیں ہے کہ میں راز سے پردہ اٹھاؤں ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی خبر ایسی نہیں کہ نہ ہو۔

جن فضلاء کو یہ معرفت حاصل نہیں اور جن کے آئینہ نظر میں یہ مقصود منکشف نہیں ہوا وہ ایسے نکات کے درپے ہوتے ہیں چنانچہ کوئی نکتہ وحدۃ الوجود میں غرق ہے کوئی وحدۃ الشہود میں لیکن انہیں نکتہ دانوں میں اگر کسی کو یہ معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو یہ نکات سب نظر سے گر جاتے ہیں پھر ان کا نام تک زبان پر نہیں آتا اور معرفت الٰہی سے سکون ہو جاتا ہے۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی شخص کے متعلق جو کہ صفائی کا داروغہ ہے گلیوں وغیرہ کی تحقیق ہوا گر وہ وزیر اعظم ہو جاوے تو اب ان قصوں کو اس کی ضرورت نہیں رہی بلکہ اب اس کو خدمت و رضائے شاہی ہر وقت مدنظر رہے گی۔ پس جماعت وغیرہ میں جو یہ نکتے اتفاق کے بیان کئے جاتے ہیں میں اس کی نفی نہیں کرتا ہوں بلکہ مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ حکم شرعی اس مصلحت اتفاق پر مبنی نہیں ہے۔ حکم شرعی پر خود یہ نکات مبنی اور اس کے تابع ہیں حکم شرعی کی وضع تو ایسی بناء پر ہے جس کا ہم کو علم بھی نہیں ہے۔ ہم کو تو اس قدر علم کافی ہے کہ یہ حکم اللہ تعالیٰ کا ہے۔ جس کو اللہ کے رسول نے ہم تک پہنچایا ہے اور پس ہمارا مشرب یہ ہونا چاہیے۔

زبان تازہ کردن باقرار تو نینگیختن علت از کار تو

(میں تو تیرا نام لے کر زبان کو تر و تازہ کرتا ہوں مجھے تیرے کاموں سے کوئی غرض نہیں ہے۔)

ہمارے لئے بڑی بنا اس حکم کی یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اس کو مقرر کیا ہے البتہ جس حکم کی حکمت خود اللہ تعالیٰ نے بتلا دی ہے اس کو بے تکلف بیان کیجئے باقی جس حکم کی مصلحت خود انہوں نے نہیں بتائی اس میں اپنی رائے کو دخل دینا اور اپنی مزعومہ حکمت پر حکم کو مبنی کرنا بڑی حماقت اور سراسر نادانی ہے مثلاً پھول پتی اور گلکاری پر تعمیر مبتنی نہیں بلکہ تعمیر پر یہ سب گلکاریاں مبنی ہیں ہماری مصلحتیں بالکل پھولوں کی مثل ہیں اور مقصود اعظم عمارت ہے نہ کہ پھول پتی۔ بس سمجھ لو کہ نماز و جماعت اس وجہ سے مقرر نہیں ہوئی تا کہ اتفاق اس پر مرتب ہو بلکہ اتفاق سے حکم شرعی پر یہ مصلحت اتفاق بھی تابع ہو کر مبنی ہو گئی۔

میں نے ایک کتاب لکھی ہے "المصالح العقلیہ فی الاحکام النقلیہ" جس میں احکام شرعیہ کی کچھ حکمتیں بیان کی گئی ہیں مگر اس کتاب میں جو چیز زیادہ پسندیدہ اور کارآمد ہے وہ اس کا خطبہ ہے۔ جس میں چند مفید قواعد

اور فوائد ہیں۔ اس میں یہ فائدہ بھی مذکور ہے کہ یہ نکات مذکورہ حکم شرعی کے تابع ہیں ان پر حکم شرعی مبنی نہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حائضہ کے لئے بھی عید گاہ میں حاضر ہونے کا حکم فرمایا تھا تو اس سے ثابت ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی اہتمام کے ساتھ قولاً بھی عید گاہ میں جانے کا اہتمام کیا ہے۔ حضورؐ کا عملی اہتمام یہ ہے کہ آپ ہمیشہ عید گاہ میں نماز پڑھنے کے لئے تشریف لے جاتے تھے صرف ایک بار بارش کی شدت سے تشریف نہیں لے گئے۔

تعریف سنت مؤکدہ

لیکن یہ آپ کا تشریف نہ لے جانا اپنے ذاتی آرام وراحت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ محض امت پر شفقت کی وجہ سے تھا۔ بعض اعمال مستحبہ گاہ آپ نے اس لئے چھوڑ دیئے ہیں کہ کہیں امت دقت میں نہ پڑ جائے چنانچہ آپ نے صحابہ کو نماز تراویح چند روز پڑھائی اور پھر چھوڑ دی۔ صحابہؓ نہایت ذوق وشوق سے تراویح کے لئے مسجد میں حاضر ہوئے مگر آپ اپنے حجرہ اعتکاف سے تشریف نہ لائے۔ صحابہ نے اس خیال سے کہ شاید آپ سو رہے ہوں گے کھانسنا کھنکارنا شروع کیا تاکہ آپ بیدار ہو جائیں اور ہمیں تراویح پڑھا دیں مگر آپ تشریف نہ لائے۔ مجبوراً صحابہؓ واپس چلے گئے۔ صبح کو جب صحابہؓ خدمت شریف میں حاضر ہوئے تب آپ نے فرمایا کہ مجھ کو تمہارے رات کے آنے کی خبر ہے مگر میں قصداً نہیں نکلا اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ اجتماع پسندیدہ ہے۔ مجھ کو خوف ہوا کہ کہیں تم پر یہ نماز یعنی تراویح فرض نہ ہو جائیں اور تم دقت میں پڑ جاؤ اس وجہ سے پھر آپ نے تراویح جماعت سے نہیں پڑھی لیکن اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو آپ ضرور جماعت تراویح پر مواظبت فرماتے جیسا کہ یہ ارشاد بتلا رہا ہے پس مواظبت حقیقیہ گو نہیں مگر مواظبت حکمیہ ثابت ہے اسی لئے حضرات صحابہؓ نے بعد میں تراویح پر مواظبت کی اور اسی لئے تراویح سنت مؤکدہ ہے چونکہ یہ زمانہ ترجمہ کا ہے اس لئے ضروری ہوا کہ سنت مؤکدہ کی تعریف کر دی جائے تاکہ جو شبہ تراویح کے سنت مؤکدہ ہونے پر واقع ہوتا ہے وہ دفع ہو جائے۔

تعریف سنت مؤکدہ کی یہ ہے کہ جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مداومت کی ہو۔ اب اس میں شبہ یہ پیدا ہوا کہ بعض احادیث کے ترجمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے تراویح باجماعت فصل کے ساتھ صرف تین روز پڑھی ہے پس معلوم ہوا کہ حضورؐ نے اس پر مداومت نہیں کی تو تراویح سنت مؤکدہ نہ ہوئی۔ اس شبہ کی بنیاد محض ترجمہ اردو کا دیکھنا ہے اور محض ترجمہ کے دیکھنے سے اصل حقیقت ہرگز سمجھ میں نہیں آسکتی بلکہ یہ علوم کی تحصیل پر موقوف ہے اور آج کل سرے سے علوم ہی حاصل نہیں کئے جاتے بس اپنی خواہش کے موافق جو دل میں آیا سمجھ لیا اور جو چاہا کرنے لگے گو غلط ہی سمجھا ہو غرض علمائے محققین نے احکام میں کبھی لم وکیف نہیں کہا حالانکہ ان کو علوم بھی حاصل تھے اور اب تو

لوگ محض ترجمے دیکھ کراحکام کے ساتھ تمسخراور گستاخی اور خودرائی کرنے لگے حالانکہ محض ترجمہ کا دیکھنا ہرگز کافی نہیں ہوسکتا ترجمہ کے دیکھنے والے اول تو کہاں تک ترجمہ دیکھ سکتے ہیں پھر کہاں تک یادرکھ سکتے ہیں پھر کہاں تک صحیح سمجھ سکتے ہیں آج کل تو خیر سے حفظ کی قوت ہی نہیں بس یہ حال ہوگا۔

حفظت شیئاً و غابت عنک اشیاء (تم نے ایک چیز یادرکھی اور بہت سے بھلادی)

تجربہ ہے ترجمہ میں کچھ نہ کچھ ضرور رہ جاتا ہے اس لئے استعدادعلمی کی ضرورت ہے۔ محض ترجمہ دیکھ کر غلطی ہوجانے پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک مولوی صاحب پٹنہ عظیم آباد کے رہنے والے تھے انہوں نے سفر حج کیا ان کے پاس ایک کتاب سفرنامہ حج تھی وہ اس سفر میں جو کام کرتے اس کتاب کو دیکھ کر کرتے تھے۔ اس کتاب میں یہ واقعہ بھی لکھا تھا کہ عرب میں یہ عجیب بات ہے کہ بڑے بڑے قیمتی لباس والے بھیک مانگتے ہیں۔ اتفاق سے ایک دن جعفرآفندی جو پاشا کا مترجم تھا اور باوجود ہندی ہونے کے زبان ترکی وغیرہ پر قادر تھا اور شان وشوکت سے تھا۔ ان مولوی صاحب کے سامنے آیا اور آکر سلام کیا۔ مولوی صاحب سخت لہجے میں کہنے لگے کہ کچھ کہنا ہے جعفرآفندی خوش مزاج بھی تھا کہا ہاں چارروز کا بھوکا ہوں کچھ مدد کیجئے مولوی صاحب نے کہا کہ یہ لباس فروخت کردو اور کھاؤ تم کو ایسے لباس کے ساتھ سوال کرتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ جعفر نے کہا کہ لباس بیچ دوں گا تو بھیک کیسے ملے گی۔ اس لباس کے لحاظ سے تو کوئی روپے دوروپے دے بھی دیتا ہے اور یہ نہ ہوتو دو چار ہی آنے پر ٹرخادیا کریں گے۔ خیرآفندی ہی گفتگو کر کے اس وقت تو چلے گئے۔ پھر ایک دن یہ مولوی صاحب میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ سامنے سے جعفرآفندی گزرے میں نے ان کو بلایا اور تعظیم کی۔ یہ مولوی صاحب حیران ہوئے کہ میں نے تو ان کے ساتھ وہ معاملہ کیا تھا اور یہاں معاملہ بالعکس ہے۔ آخران مولوی صاحب نے مجھ سے دریافت کیا کہ یہ کون صاحب ہیں میں نے کہا ایک معزز شخص ہیں وغیرہ وغیرہ تب تو مولوی صاحب نہایت شرمندہ ہوئے اب جعفرآفندی نے مزاحاً مجھ سے کہا کہ ذرا ان مولوی صاحب سے دریافت کیجئے کہ انہوں نے مجھ سے بے رخی کا برتاؤ کیوں کیا۔ وہ بیچارے بہت معذرت کرنے لگے پھر میں نے دریافت کیا کہ آخر آپ نے ان کے ساتھ ایسا بدنما برتاؤ کیوں کیا تو مولوی صاحب فرمانے لگے کہ میں نے ایک کتاب میں دیکھا تھا کہ بعض لوگ عرب میں عمدہ لباس پہن کرلوگوں کے پاس جاتے ہیں اور سوال کرتے ہیں وہ مکار دھوکہ باز ہوتے ہیں اور علاوہ کتاب میں دیکھنے کے میں نے ایسے لوگ آنکھوں سے بھی دیکھے میں نے یہی سمجھ کران کے ساتھ یہ معاملہ کیا میں سمجھا کہ یہ بھی کوئی سائل ہیں جو اس شان سے آرہے ہیں۔ جعفرآفندی بہت خوش طبع تھے فوراً بولے کہ اجی مولوی صاحب آپ نے جن لوگوں کو بھیک مانگتے دیکھا وہ عمامہ

باندھے تھے یا ترکی ٹوپی پہنے اس مولوی صاحب نے کہا واقعی عمامہ باندھے ہوئے تھے۔ جعفر نے کہا کہ حضرت میں تو ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھا نہ کہ عمامہ باندھے ہوئے آپ نے مجھ کو ان پر کیسے قیاس کر لیا۔ سچ ہے یک من علم وردہ من عقل باید محض کتاب دیکھنے سے کچھ نہیں ہوتا جب تک کافی ذریعہ معلومات کا نہ ہو۔ اسی طرح سے نرے ترجمہ سے کام نہیں چلتا بلکہ عقل و استعداد کی بہت ضرورت ہے ورنہ محض ترجمہ دیکھنے والے بہت غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں جیسے یہ مولوی صاحب تھے۔

غرض سنت مؤکدہ کی تعریف کا یہ مقدمہ تو صحیح ہے کہ جس فعل پر حضورؐ نے مداومت فرمائی ہو وہ سنت مؤکدہ ہے لیکن اس مقدمہ کے سمجھنے کیلئے نری ترجمہ بینی کافی نہیں بلکہ استعداد علمی کی بھی ضرورت ہے۔

اب سنو کہ مداومت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مداومت حقیقیہ اور دوسری مداومت حکمیہ۔ مداومت حقیقیہ تو یہ ہے کہ کسی فعل کو صورۃً بھی ہمیشہ کیا جاوے اور مداومت حکمیہ یہ ہے کہ کسی فعل کو صورۃً تو کسی مصلحت کی وجہ سے کبھی چھوڑ دیا ہو لیکن ارادہ میں اس فعل پر دوام ہو اور حضورؐ کے ارادہ کو بھی بجائے فعل کے موثر سمجھنا چاہیے اور حضور کا ارادہ دوام تراویح کے متعلق خود اسی حدیث سے معلوم ہوتا ہے اور آپ نے جماعت تراویح پر مداومت اس وجہ سے نہیں کی تا کہ یہ فرض نہ ہو جائے۔ اور امت دقت میں نہ پڑ جائے۔ یہ غایت درجہ کی امت پر شفقت ہے۔ یہ مصلحت امت تھی ترک دوام صوری میں چونکہ مداومت حکمیہ ارادیہ جو بمنزلہ فعل کے ہے۔ حضورؐ سے ثابت ہو چکی تو یہ تراویح کی سنت مؤکدہ ہونے کی کافی بلکہ اکفی دلیل ہے۔

شان محبت

صاحبو! واقعی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری وجہ سے عمر بھر تکلیف اٹھائی کہ بعض دفعہ ایک کام کو آپ کا جی چاہتا تھا مگر ہماری مشقت کے خیال سے نہ کرتے تھے تو کیا ہم کو آپ کی خوشی کے لئے مشقت نہ برداشت کرنا چاہیے۔ جب کہ ہم کو حدیث سے معلوم ہو گیا کہ تراویح کی جماعت اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے اور حضورؐ کا بھی دل چاہتا تھا کہ اس پر مواظبت کریں مگر آپ نے ہماری دقت خیال سے صورۃً مواظبت نہیں کی تو کیا ہم کو اس پر مواظبت نہ کرنا چاہیے ضرور چاہیے۔

صحابہ کرام نے اس راز کو سمجھا ہے کیونکہ ان کو حضورؐ سے محبت تھی اور محبت کی یہ شان ہے کہ محبوب کی گذشتہ تکلیف تک سے محبّ متاثر ہوتا ہے تو اس کے احکام و مرضیات سے تو کیوں متاثر نہ ہوتا۔ صاحبو! اصل یہ ہے کہ جیسی صحابہ کرام کو حضور پر نورؐ سے محبت تھی ہم کو ویسی محبت ہی نہیں۔ بعض صحابہؓ کی محبت کا یہ لون تھا کہ تمام عمر گزر گئی مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کو جی بھر کر دیکھ بھی نہ سکے کیونکہ محبت کا اختلاف استعداد محبّ سے ہے ایک یہ قاعدہ بھی ہے کہ جب غایت درجہ کی محبت ہو جاتی ہے تو محبوب کے دیکھنے کی تاب نہیں رہتی خوب کہا ہے۔

یوں کہتے تھے یوں کہتے یوں کہتے جو آ جاتا　　سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا
سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آ جائے ہے　　تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

غرض بعض صحابہ کو اس رنگ کی بھی محبت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ کسی نے ایک صحابی سے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ شریف دریافت کیا تو کہا کہ یہ تو اس سے پوچھو جس نے حضور کو آنکھ بھر کر دیکھا ہو یہاں تو تمام عمر گزر گئی کبھی آنکھوں کو تاب نہ ہوئی کہ نگاہ بھر کر اس پر جمال کو دیکھ سکیں بیان کروں تو کیا بیان کروں۔ ؎

غیرت از چشم برم روئے تو دیدن ندہم　　گوش رانیز حدیث تو شنیدن ندہم
بخدا کہ رشکم آید زدو چشم روشن خود　　کہ نظر دریغ باشد بچنیں لطیف روئے

(یہ سبب غیرت کے اپنی آنکھوں کو تجھے دیکھنے نہیں دیتا اور اپنے کانوں کو آپ کی باتیں سننے نہیں دیتا مجھے اپنی ان دو روشن آنکھوں پر رشک آتا ہے کہ آپ کے چہرہ انور کو یہ بے حجاب دیکھتی ہیں۔)

صحابہ حضور کی محبت میں بے چین تھے حتیٰ کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گذشتہ تکلیف کو یاد کر کے بے چین ہو جاتے تھے۔ چنانچہ ایک صحابی کے دسترخوان پر عمدہ گوشت آیا فوراً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فاقہ کی تکلیف یاد آ گئی تو زار زار آنسو جاری ہو گئے۔ کھانا اٹھا دیا اور نہ کھایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری وجہ سے بہت فاقہ کشی کی ہے کہ مہینوں چولہے میں آگ تک نہیں جلی یہ ضرور ہے کہ یہ فاقہ دنیا کے کم ہونے کی وجہ سے اٹھایا لیکن خود دنیا کی کمی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری محبت ہی کی وجہ سے اختیار کی کیونکہ جانتے تھے کہ امت میری عاشق ہے وہ میرا اقتداء کرے گی اگر میں دنیا کو لوں گا تو امت اس کو سنت خیال کر کے دنیا کے پیچھے چل پڑے گی اور مجھ کو تو دنیا کے اختیار کرنے سے کچھ ضرر نہ ہوگا مگر اس کی وجہ سے امت طرح طرح کی مضرتیں اٹھائے گی۔ بعض لوگ اس سنت کو آڑ بنا کر دنیا کی طلب ایسے طریقہ سے کریں گے کہ گنہگار ہو کر عنداللہ ماخوذ ہوں گے۔ جو اعلیٰ درجہ کی تکلیف کا باعث ہے اس وجہ سے آپ نے دنیا کو چھوڑا اور فاقہ کی تکلیف اٹھائی۔

ہر فعل ماثور مسنون ہے

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ ضرور نہیں کہ جس فعل کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کر لیں وہ ہر حال میں مسنون ہی ہو اگر ایسا ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعض افعال کو ہمارے خیال سے ترک کیوں کرتے؟ کیونکہ وہ تو سنت ہوتا پھر مضر کیوں ہوتا اس سے صاف معلوم ہوا کہ بعض دفعہ فعل ماثور بھی غلو کی وجہ سے مضر ہو جاتا ہے یہ خوب یاد رکھئے کہ ہر فعل ماثور ہر حال میں ہر صورت میں موجب ثواب نہیں ہوتا بلکہ بعض دفعہ فعل ماثور بعض عوارض کی وجہ سے بالعکس معصیت ہو جاتا ہے۔ دیکھئے ولیمہ سنت ہے لیکن اس

کے ساتھ ہی بعض صورتوں میں اس سے ممانعت بھی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:
شر الطعام طعام الوليمة يدعى لها الاغنياء ويترك لها الفقراء الخ. (صحیح مسلم)
یعنی کھانوں میں برا کھانا اس ولیمہ کا ہے جس میں امراء کو بلایا جائے اور فقراء کو چھوڑ دیا جائے۔
دیکھئے ولیمہ سنت ہے لیکن اس عارض ترک یا طرد فقراء کی وجہ سے شر ہوگیا۔ افسوس آج کل اکثر ولیمے اسی قسم کے ہوتے ہیں جن میں محض برادری کے معززین کو بلایا جاتا ہے اور غرباء کو نہیں پوچھا جاتا بلکہ اس جگہ سے نکال دیا جاتا ہے حالانکہ جن فقراء کو ولیمہ سے نکالا جاتا ہے ان کی نسبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **هل تنصرون وترزقون الا بضعفائكم** (حلیۃ الاولیاء)
تمہاری جو مدد کی جاتی ہے اور تمہیں جو رزق دیا جاتا ہے وہ فقراء وضعفاء ہی کی وجہ سے تو دیا جاتا ہے۔ پس نہایت بے حیائی ہے کہ جن کی وجہ سے یہ رزق دیا گیا ہے انہیں کو اس رزق سے دھکے دیئے جائیں۔
ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اگر مخلوق میں ایسے بوڑھے نہ ہوتے جن کی کمریں جھک گئی ہیں اور بہائم نہ ہوتے اور شیر خوار بچے نہ ہوتے تو تم پر عذاب کی بارش ہوتی۔ معلوم ہوا کہ ہم عذاب خداوندی سے بوڑھے اور بچوں بہائم وغیرہ کی وجہ سے بچے ہوئے ہیں۔

رحمت کا مذہب

صاحبو! شریعت مطہرہ نے بہائم کے بھی حقوق تعلیم کئے ہیں۔ چنانچہ میں نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں جانوروں کے حقوق بیان کئے ہیں اسلام نے سب کے حقوق بالتفصیل بتادیئے ہیں چنانچہ بہائم کے بھی کچھ حقوق ہیں اور کیوں نہ ہوں جب ان کی برکت سے ہم سے عذاب ٹلا ہوا ہے اسی طرح غریبوں کی وجہ سے ہماری مدد ہوتی ہے اور ہم کو رزق دیا جاتا ہے پھر غرباء کو دھکے دینا بے حیائی نہیں تو اور کیا ہے۔ الحاصل ولیمہ اسی حد تک مسنون ہے جس حد کو اسلام نے متعین کر دیا ہے کہ جس میں غرباء بھی ہوں اور حسب طاقت ہو سودی قرض سے نہ کیا گیا ہو اور اس میں ریا اور سمعہ کو دخل نہ ہو اور تکلفات نہ ہوں خلصاً لوجہ اللہ ہو وہ ولیمہ مسنون ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں جو سب سے بڑا ولیمہ تھا اس میں محض ایک بکری ذبح کی گئی تھی۔ آپ نے کر کے دکھلا دیا کہ اس طرح کام کیا کرتے ہیں۔
اس حدیث سے ایک مشہور اشکال کا بھی جواب ہوگیا۔ وہ یہ کہ بعض فرقے اسلام کو بے رحم بتلاتے ہیں اس وجہ سے کہ اسلام نے ذبح بہائم کو جائز رکھا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر اسلام بے رحم ہوتا تو ہرگز بہائم کے حقوق کی تعلیم نہ کرتا اور اجازت دیتا کہ بہائم کے ساتھ جس طرح چاہو معاملہ کرو خواہ سختی کا خواہ نرمی کا حالانکہ اسلام پکار رہا ہے کہ بہائم کے حقوق کا لحاظ رکھو ان پر بے جا سختی مت کرو

جو کام ان کے متعلق ہو وہ لے لو پھر راحت دو طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہ لادو اور جب سفر کرو تو کبھی کبھی راستہ میں ان کو گھاس چرنے کی بھی مہلت دیدیا کرو اور جانوروں کو ہانکتے ہوئے ان کو گالی نہ دیا کرو اور منزل پر پہنچ کر ان کو زین وغیرہ سے الگ کر دو اور پہلے ان کے چارہ کا انتظام کر کے پھر کسی اور کام میں لگو اس کے علاوہ بہت سے حقوق ہیں جن کی تفصیل میرے رسالہ **ارشاد الھائم فی حقوق البھائم**" میں مذکور ہے جن کی نظیر کوئی باطل مذہب نہیں دکھا سکتا۔ رہی ذبح بہائم کی اجازت تو نہ یہ بے رحمی ہے نہ اس میں جانور کو تکلیف ہوتی ہے جس کی تفصیل آئندہ (اس مقام کے بعد جہاں حضرت نوح علیہ السلام سے برتن بنوانے اور پھر تڑوانے کا قصہ مذکور ہے) آئے گی۔

ذبح بقرہ

بعض مسلمان ہنود کے میل جول کی وجہ سے گائے کا ذبح کرنا اور اس کا گوشت کھانا پسند نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ اسلام کچھ گوشت خوری پر موقوف نہیں۔ اسلام میں گوشت کھانا اور نہ کھانا دونوں یکساں ہیں۔ گائے کا گوشت نہ کھایا تو بکری کا کھالیا اس میں کیا حرج ہے گائے کا گوشت کھانا فرض تھوڑا ہی ہے۔

افسوس ان لوگوں نے شریعت خداوندی کے مقابلہ میں اپنی ایک شریعت گھڑ لی ہے ان لوگوں نے یہ مسئلہ ہنود سے لیا اس لئے کہ ہنود بھی یہی کہتے ہیں کہ گائے کا گوشت مت کھاؤ کہ رحم کے خلاف ہے۔ بکری وغیرہ کا کھاؤ۔ حالانکہ یہ قول بالکل عقل سے بھی بعید ہے اس واسطے کہ جو بے رحمی گائے کے ذبح میں ہے وہی بے رحمی بکری وغیرہ تمام جانوروں کی ذبح میں ہے۔ اگر بکری وغیرہ کا ذبح بے رحمی نہیں گائے کا ذبح بھی بے رحمی نہیں۔ اب ہم کو بتلایا جائے کہ گائے کا ذبح کیوں بے رحمی ہے اور بکری کا ذبح کیوں بے رحمی نہیں؟

بعض کہتے ہیں کہ گائے کے ذبح میں دودھ گھی میں کمی آجاتی ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ گائے سے زیادہ دودھ گھی بھینس کا ہوتا ہے پھر اس کی کیا وجہ ہے کہ ہندو اور ان کے حامی مسلمان گائے کے ذبح سے روکتے ہیں اور بھینس کے ذبح کی اجازت دیتے ہیں حالانکہ اس میں دودھ گھی کا نقصان بہت زیادہ ہے گائے کا دودھ گھی تو بیماروں کو بتلایا جاتا ہے۔ تندرست آدمی تو اکثر بھینس کا دودھ گھی استعمال کرتے ہیں مگر اسکے ذبح پر کسی کو اعتراض نہیں نہ یہ بے رحمی شمار کیا جاتا ہے۔ ہاں گائے کے ذبح پر ہندوؤں کا بھی اعتراض ہے اور بعض مسلمان بھی ان کی حمایت کرتے ہیں۔

صاحبو! یہ دلائل تو محض بہانے ہیں اصل بات یہ ہے کہ گائے ہندوؤں کا معبود ہے۔ اس کا ذبح اس لئے ان کو ناگوار پھر ان مسلمانوں کو شرم نہیں آتی کہ جس اعراض کا منشاء شرک ہے اس میں وہ ہندوؤں کی موافقت وحمایت کرتے ہیں۔ غرض اپنی خواہش کے موافق جس کو چاہا کھالیا جس کو جی نہ چاہا نہ کھایا۔

ایسے مسلمانوں کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کسی نے تمام قرآن میں سے دو چیزیں پسند کی تھیں احکام میں سے تو وَ کُلُوْا وَاشْرَبُوْا کھاؤ اور پیو۔ اور دعاؤں میں سے یہ دعا رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ اے اللہ آسمان سے ہم پر دستر خوان اتار۔ پس جس طرح اس شخص نے اپنی خواہش کے مطابق قرآن پاک سے صرف دو چیزیں چھانٹیں اور باقی کو چھوڑ دیا اسی طرح ان مسلمانوں نے بھی حسب خواہش کچھ جانور اپنے لئے اختیار کر لئے اور باقی جانور جو شریعت اسلام میں حلال ہیں چھوڑ دیئے۔

صاحبو! گائے کا کھانا اگرچہ اسلام میں مباح ہی ہے واجب اور فرض نہیں لیکن کسی فرقہ مخالف اسلام کی دلجوئی وخوشنودی کی غرض سے اور وہ بھی محض مردار دنیا کے لئے اس کا چھوڑنا سخت گناہ ہے اور اسلام کی کھلی مخالفت ہے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترک دنیا کی وجہ

یہ تو جملہ معترضہ تھا اب اصل مضمون کی طرف عود کرتا ہوں۔ مقصود یہ ہے کہ حضورؐ نے دنیا کو اس واسطے پسند نہ کیا کہ آپ جانتے تھے کہ میرے اس فعل سے امت مشقت میں پڑ جائے گی۔ اور یہ دنیا ان کو مضر ہوگی ورنہ آپ کے لئے کیا کمی تھی اگر آپ دنیا چاہتے تو تمام دنیا غلام بن کر تابع ہو جاتی اور جہاں آپ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے جاتے دنیا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ رہتی۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کی معرفت آپؐ کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ اگر آپؐ دنیا لینا چاہیں تو جبل احد کو سونے کا بنا کر اس طرح تابع کر دیں کہ اگر آپؐ سفر میں بھی تشریف لے جائیں تو یہ آپؐ کے ہمراہ رہے آپؐ نے فرمایا۔ "اے اللہ میں تو یہ چاہتا ہوں کہ ایک روز فاقہ رہے اور ایک روز کھانا ملے فاقہ کے روز صبر کروں اور کھانے کے دن شکر کروں۔ یہ کیوں؟ محض ہمارے لئے کیونکہ ہمارے لئے دنیا مضر تھی ورنہ آپ کے لئے کچھ بھی مضر نہ تھی۔

اس کے متعلق ایک مرتبہ حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ کامل کے پاس دنیا ایسی ہے جیسے منتر جاننے والے کے پاس سانپ اور ناقص کے پاس دنیا ایسی ہے جیسے منتر سے ناواقف کے پاس سانپ۔ منتر جاننے والے کے پاس سانپ ہو تو مضر نہیں بخلاف ناواقف کے کہ اس کے ہاتھ میں سانپ مضر ہے۔ جب کامل اور ناقص میں یہ فرق ہے پھر حضورؐ تو اکمل الکاملین تھے۔ آپ کو دنیا کیا مضر ہوتی مگر باوجود عدم مضرت کے پھر آپ نے دنیا کو صرف اس واسطے نہ لیا کہ میرے بعض امتی میرے اس فعل کو آڑ بنا کر دنیا پر گر جاویں گے اور مضرتیں اٹھاویں گے۔

دیکھا آپ نے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو امت پر کس قدر شفقت تھی اسی وجہ سے آپ نے

بہت سے کام جو آپ کر سکتے تھے اور کرنا بھی چاہتے تھے صرف ہماری مضرت کے خوف سے بوجہ ہم پر شفقت کے نہ کئے۔ چنانچہ آپ بارش میں نماز عیدگاہ میں جا کر ادا کر سکتے تھے کیونکہ بارش کو تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم محبوب رکھتے تھے چنانچہ جب بارش ہوتی تو آپ اپنا کرتہ اتار کر بدن پر لیتے تھے اور فرماتے تھے کہ یہ پانی تازہ بتازہ میرے خدا کی طرف سے آیا ہے۔

قوت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

اور اس کے علاوہ آپ کوئی نازک اور کمزور بھی نہ تھے بلکہ طبی طور سے حضورؐ کا مزاج بہت قوی تھا۔ چنانچہ آپ کی نو بیبیاں تھیں اور بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شب میں تمام بیبیوں کے پاس چلے جاتے تھے۔ یہ کتنی کامل قوت کی دلیل ہے۔ پھر یہ ابتدائی جوانی کا واقعہ نہیں۔ جوانی میں تو آپ نے ایک نکاح سے زیادہ نہیں کیا تھا۔ یہ نو بیبیاں آپ کے پاس اس وقت تھیں جب کہ پچاس سے آپ کی عمر متجاوز ہوگئی تھی۔ صحابہؓ فرماتے ہیں کہ آپ میں تیس مردوں کی قوت تھی۔

محققین (قلت رواہ الترمذی مجاہد مرسلاً ۱۲ اظ) نے فرمایا ہے کہ دنیا کے مردوں کی نہیں بلکہ جنت کے مردوں کی اور جنت کے ایک مرد میں سو مردوں کی قوت ہے۔ اس حساب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تین ہزار مردوں کی قوت ہوئی اور معمولی مرد کے لئے اسلام نے چار عورتوں کی اجازت دی ہے تو اس حساب سے آپ کے لئے بارہ ہزار عورتوں کی اجازت ہوتی مگر باوجود اتنی قوت کے آپ نے صرف نو بیبیوں کو اختیار کیا جن کو آپ کی قوت کے اعتبار سے عشر عشیر کی بھی نسبت نہیں ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اعلیٰ درجہ کے نفس کش تھے کہ دنیا بھر میں آپ کا نفس کشی میں کوئی نظیر نہیں مل سکتا۔

ظاہر ہے کہ جس کو بارہ ہزار روٹیوں کی خواہش ہو اور یہ مقدار بلا کسی مزاحم اور بلا مانع و بلا مشقت کے ہر طرح سے اس کو میسر بھی ہو سکتی ہو پھر بھی وہ صرف نو روٹیوں پر اکتفا کرے تو یہ نفس کشی نہیں تو اور کیا ہے کیا کوئی عاقل سوا معاند کے ایسے شخص کو عیش پرستی کا نام دے سکتا ہے۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔
آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت کا یہ حال تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف تریسٹھ سال تھی مگر تمام بال سیاہ تھے۔ بجز چند بالوں کے جن کو شمار بیس سے بھی کم تھی کہ وہ سفید تھے۔ اور یہ حالت بے فکری کی وجہ سے نہ تھی۔ حضورؐ کو تو طرح طرح کی ایسی فکریں تھیں کہ دنیا میں کسی کو بھی نہیں ہو سکتیں۔ حدیث میں آتا ہے کہ **كان رسول الله صلى الله عليه وسلم دائم الحزن طويل الفكرة** (لم أجد الحديث في موسوعة) یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ فکر اور غم ہی میں رہتے تھے۔ رات دن میں کوئی آن ایسی نہ تھی کہ فکر سے خالی ہو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے کہ قسم ہے اللہ کی اگر تم ان امور کو

دیکھو جن کو میں دیکھتا ہوں اور تم کو ان باتوں کی خبر ہو جاوے جن کی مجھ کو خبر ہے تو تم عمر بھر روتے پھرو اور ہنسا بھول جاؤ۔ میں اسرافیل کو دیکھ رہا ہوں جو صور کو منہ میں لئے کھڑے ہیں حکم کے منتظر ہیں کہ اب حکم ہو اور اس میں پھونک ماردوں کہ سارا عالم درہم برہم ہو جاوے۔ ایسی حالت میں مجھ کو کیسے چین آئے اور میں کیسے بے فکر ہو بیٹھوں۔ ایک روایت میں ہے۔ شیبتنی سورۃ ھود (مشکوٰۃ المصابیح) (مجھے سورہ ھود نے بوڑھا کردیا) باوجودیکہ ایسی فکر اور تریسٹھ سال کی عمر پھر بھی بیس بال تک سفید نہ ہوں۔ یہ نہایت قوۃ مزاج کی دلیل ہے۔ غرض آپ نازک مزاج اور کمزور نہ تھے کہ بارش میں چلنا دشوار ہوتا موت سے زیادہ تو کوئی مصیبت نہیں مگر جب اولیاء اللہ موت سے نہیں ڈرتے بلکہ موت کو دوست رکھتے ہیں اور اس دن کی تمنا کرتے ہیں اس لئے کہ یہ وسیلہ ہے محبوب سے ملنے کا۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم ۔۔۔ راحت جاں طلبم و زپے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے ۔۔۔ تا در میکدہ شاداں و غزل خواں بروم

(میں اس روز بہت خوش ہوں گا جب اس دنیا سے جاؤں گا راحت جان حاصل ہوگی اور میں محبوب کے پاس حاضر ہوں گا میں نے یہ نذر مانی ہے کہ جب یہ مبارک دن آئے گا تو میں میکدہ کی طرف غزلیں پڑھتا ہوا خوش خوش جاؤں گا۔) تو حضورؐ اس ذرا سی بارش سے کیا ڈرتے یہ محض امت پر شفقت تھی۔

غرض یہ ہے کہ آپؐ نے صرف ایک مرتبہ مسجد میں عید کی نماز پڑھی اور تمام عمر عیدگاہ میں نماز پڑھی اور حیض والی عورتوں تک کو عیدگاہ میں آنے کا آپؐ نے حکم فرمایا جس سے عیدگاہ میں آنے کی عظمت اور اہتمام شان ظاہر ہے گو بعد میں احادیث ہی سے سمجھ کر صحابہ نے اس سے روک دیا۔

تارک قربانی کے لئے وعید

مگر اسی کے ساتھ حضورؐ کا حکم ہے کہ جس نے باوجود وسعت کے قربانی نہ کی ہو وہ ہمارے مصلی (عیدگاہ) کے قریب نہ آئے۔ یوں نہیں فرمایا کہ عیدگاہ میں نہ آوے بلکہ یوں فرمایا کہ اس کے قریب تک بھی نہ آئے۔ قربانی نہ کرنے والے سے کس قدر نفرت معلوم ہوتی ہے کہ ایسے شخص کو حکم دیا کہ مصلے المسلمین کے پاس تک نہ پھٹکے۔

صاحبو! اگر غیرت ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہو تو بڑی سخت بات ہے مگر افسوس کہ اس قدر تو قربانی کی تاکید ہے مگر بعض مسلمان پھر بھی نہیں کرتے۔

برائے نام قربانی

اور بعض ایسے بھی ہیں کہ قربانی تو کرتے ہیں مگر محض برائے نام ہی کرتے ہیں خواہ عنداللہ مقبول

ہونے کے قابل ہو یا نہ ہو۔ چنانچہ کانپور میں ایک لوہار تھے انہوں نے قربانی کے لئے ایک ایسا بکرا تجویز کیا جس میں سب ہی عیب تھے۔ ایک شخص نے کہا کہ میاں ایسا جانور کیوں ذبح کرتے ہو۔ لوہار بولا واہ صاحب ہماری بیوی صاحبہ کا فتویٰ ہے کہ اس کی قربانی جائز ہے اس شخص نے کہا کہ ذرا ہم کو بھی دکھلانا چاہیے کہ آپ کی بیوی نے کہاں سے فتویٰ دیا ہے۔ لوہار گھر گیا اور بیوی سے ذکر کیا کہ حضور کے فتویٰ کو بعض لوگ نہیں مانتے ذرا انہیں بھی قائل کردو۔ وہ اتفاق سے اردو پڑھی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً اردو کا شرح وقایہ نکال کر دکھلایا کہ دیکھو اس میں لکھا ہے کہ جس جانور کے تہائی سے کم دم و کان ناک وغیرہ کٹی ہوں وہ جائز ہے اس بکری میں چونکہ ہر چیز تہائی سے کم کٹی ہوئی ہے اور یہ عیب موثر نہیں لہٰذا جائز ہے اس شخص نے کہا کہ بھائی ہم شرح وقایہ تو سمجھتے نہیں علماء کے پاس چلو اور یہ جانور ان کو دکھلا لو پھر وہ جو حکم دیں۔ لوہار کہنے لگا کہ بس صاحب ہم کو تو ہماری بیوی کا فتویٰ کافی ہے کسی عالم کو دکھلانے کی حاجت نہیں۔ بس اس لوہار کو صرف قربانی کا نام کرنا تھا۔

فضیلت قربانی

غرض بعض لوگ برائے نام قربانی کرتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قربانی کی عظمت ان کے دلوں میں نہیں ہے۔ اس وقت میں اس کی عظمت ہی ظاہر کرنا چاہتا ہوں جو اس حدیث میں مذکور ہے۔ اب اس حدیث کا ترجمہ بیان کیا جاتا ہے۔ اس حدیث کے دو جز ہیں ایک جزو میں تو فضیلت قربانی کی بیان فرمائی ہے اور دوسرے جزو میں حقیقت قربانی بیان فرمائی ہے۔ یعنی جب حضور نے قربانی کی فضیلت یہ فرمائی ہے کہ ہر ہر بال کے عوض نیکیاں ملتی ہیں تو صحابہؓ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول حقیقت قربانی کی کیا ہے؟

حقیقی ادب

صحابہؓ کا یہ قاعدہ تھا کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خوش مزاج پاتے تھے تو سوال کرلیا کرتے تھے اور حضورؐ اگر مناسب سمجھتے جواب دے دیتے تھے ورنہ منع فرما دیتے تھے۔ چنانچہ مسئلہ تقدیر میں گفتگو کرنے سے آپ نے صحابہؓ کو منع فرمایا کہ اس میں گفتگو مت کرو۔ تمہاری فہم سے بالا ہے۔ جس طرح حکم خداوندی ہے مان لو اس کے بعد صحابہؓ جواب کے لئے اصرار نہیں کرتے تھے۔ اور یہ عدم اصرار غایت ادب کی وجہ سے تھا صحابہؓ کا بے حد ادب کرتے تھے اور طریق ادب میں بہت ہی کامل تھے۔ صاحبو! عالم بن جانا آسان ہے مگر ادب نہایت مشکل ہے ادب کا طریقہ ہر شخص نہیں جانتا۔ بعض طریقے ادب کے ایسے ہیں کہ اہل علم بھی نہ جانتے ہیں نہ سمجھتے ہیں گو درسی علم رکھتے ہیں مگر ادب جاننا اس کے لوازم سے نہیں بقول عارف شیرازیؒ

شاہد آں نیست کہ موئے ومیانے دارد بندہ طلعت آں باش کہ آنے سازد

(معشوق وہ نہیں جو ناز واداء رکھتا ہو بلکہ تو اس کا عاشق بن جو کچھ آن بان رکھتا ہو۔)

نہ ہر کہ چہرہ برا فروخت دلبری داند　　نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(نہ ہر خوب صورت چہرے والا دلبری جانتا ہے جیسے ہر وہ شخص جس کے پاس آئینہ ہو سکندر نہیں ہوتا۔)

ہزار نکتہ باریک ترزمو اینجاست　　نہ ہر کہ سر بتر اشد قلندری داند

(اس میں بال سے بھی باریک ہزاروں نکتے موجود ہیں ہر وہ شخص جو سر منڈا لے قلندر نہیں ہوتا)

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست　　بسیار شیوہ ہاست بتاں را کہ نام نیست

(محبوبوں کی صرف چنک مٹک ہی ان کے قابل التفات ادائیں نہیں ہیں بلکہ ان کی بہت سی ادائیں ایسی ہیں جن کا کچھ نام نہیں ہے۔)

ادب کے متعلق مجھے بلگرام کی ایک حکایت یاد آئی۔ بلگرام میں ایک بزرگ تھے۔ ان کی خدمت میں ان کے ایک شاگرد سبق پڑھنے آئے دیکھا کہ چہرہ مرجھایا ہوا ہے سمجھ گئے کہ آج فاقہ ہے۔ عرض کیا کہ حضرت آج مجھے سبق پڑھنے سے عذر ہے اجازت چاہتا ہوں کہ سبق ملتوی رکھا جائے۔ اجازت لے کر اٹھے اور گھر جا کر بہت سا کھانا لے کر خدمت میں حاضر ہوئے کہ حضرت اس کو قبول فرمالیجئے۔ فرمایا کھانا تو ایسے وقت آیا ہے کہ واقعی مجھے حاجت ہے مگر ایک عذر شرعی کی وجہ سے نہیں قبول کر سکتا۔ عرض کیا حضرت وہ عذر کیا ہے۔ فرمایا حدیث شریف میں آیا ہے جو چیز تمہارے پاس بغیر اشراف نفس یعنی بغیر انتظار وطمع نفس کے آئے اس کو لے لو ورنہ نہیں۔ اے بیٹا جب تم میرے پاس سے اٹھ کر گئے تھے اسی وقت میرے نفس میں آیا تھا کہ یہ کھانا لینے گئے ہیں اس وقت سے اب تک نفس کو اس اس کھانے کا انتظار تھا۔ لہٰذا میں اس کھانے کو قبول نہیں کر سکتا۔ سبحان اللہ یہ ہے اتباع سنت کہ حاجت شدیدہ میں بھی اتباع سنت کو ہاتھ سے نہ جانے دیا ایک ہم ہیں کہ ضرورت کے وقت فرائض کی بھی پرواہ نہیں کرتے۔

پھر دوسرا کمال یہ کہ اپنی احتیاج کو بھی ظاہر کر دیا اور نفس کے انتظار کی بھی قلعی کھول دی۔ جو کچھ بات تھی سچ سچ بیان کر دی نہ کچھ تصنع کیا نہ بناوٹ۔ صاحب جس کے پاس کھرا مال ہوگا وہ خریداروں کی پرواہ نہیں کیا کرتا بلکہ خود خریدار اس کی پرواہ کیا کرتے ہیں اور جس کے پاس کھوٹا مال ہوتا ہے وہ طرح طرح کی بناوٹیں کر کر کے خریداروں کو جماتا ہے۔ بس جو واقعی اہل اللہ ہیں ان کو اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ ہمارا کوئی معتقد رہے گا یا نہیں بلکہ وہ تو چاہتے ہیں کہ بہتر ہو کہ کوئی ہمارا معتقد ہی نہ ہو کیونکہ ان کے معمولات میں مخلوق کی آمد و رفت سے نقصان ہوتا ہے گو وہ اپنی خوش اخلاقی سے کسی کو منع نہ فرمائیں۔

ایک مرتبہ کسی شخص نے حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے عرض کیا کہ فلاں اپنے مرید کو منع کر دیجئے

کہ وہ فلاں کام نہ کرے۔ایسا نہ ہو کہ اس کا اثر آپ تک پہنچے کہ لوگ آپ سے بدگمان ہو جائیں۔آپ نے فرمایا کہ میاں کسی پر کیوں رکھتے ہو تمہارا جی چاہتا ہو بدگمان ہونے کو تو ہو جاؤ اور میاں تم نے تو گویا مجھے بڑی دھمکی دی ہے کہ لوگ بدگمان ہو جائیں گے اور تمہیں یہ بھی خبر ہے کہ مجھے تو تمہارے اس اعتقاد نے پریشان کر رکھا ہے۔بہت اچھا ہو کہ مجھ سے لوگوں کا اعتقاد جاتا رہے کوئی میرے پاس نہ آئے بس تنہا میں ہوں اور میرا اللہ ہو بقول جامیؒ۔

چہ خوش وقتے و خرم روزگارے کہ یارے برخورد از وصل یارے

(کتنا اچھا وقت اور کیسا عمدہ زمانہ ہے کہ عاشق اپنے محبوب کے وصل سے لطف اندوز ہو رہا ہے)

بعض دفعہ اہل اللہ خود اس کی تدبیر کیا کرتے ہیں کہ کوئی ہمارا معتقد نہ رہے چنانچہ حضرت مولانا شہید رحمۃ اللہ علیہ سے میرٹھ میں معتقدین نے وعظ کے لئے درخواست کی تو آپ نے جس وقت وعظ شروع کیا تو مولوی عبدالقیوم صاحب کو جو اس وقت بچے تھے اپنے زانو پر بٹھلا لیا اور درمیان وعظ کے کبھی کبھی ان سے فرماتے گال پھلاؤ وہ پھلاتے اور آپ اس کو پچکا دیتے۔غرض اسی قسم کی حرکات عین وعظ میں کرتے رہے اور یہ افعال اس غرض سے کئے جا رہے تھے تاکہ لوگ غیر معتقد ہو جائیں مگر کوئی غیر معتقد نہ ہوا پھر وعظ کے بعد ایک بہت بڑے رئیس مصافحہ کے لئے آگے بڑھے آپ نے ان کی ناک پکڑ کر ہلا دی۔اس رئیس نے عرض کیا کہ حضرت ہماری عقیدت ایسی نہیں ہے کہ ایسے افعال کی وجہ سے ہم آپ کو چھوڑ دیں۔غرض بعض بزرگ خود ایسے افعال کرنے لگتے ہیں کہ مخلوق خود بخود ہم سے بھاگ جائے اور معتقدوں کے کم ہونے کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ان کا یہ مذاق ہوتا ہے کہ

گرچہ بدنامی ست نزد عاقلاں مانمی خو اہیم ننگ و نام را

(اگرچہ ایسے افعال عقلمندوں کے نزدیک بدنامی کا باعث ہیں لیکن میں تو نام ونمود چاہتا نہیں)اور یہ ہوتا ہے کہ

ساقیا برخیز دو رہ جام را خاک برسرکن غم ایام را

(اے ساقی اٹھ اور جام لا اور غم ایام کی پریشانی کو بھلا دے)

ایک بار یہی مولانا شہید لکھنؤ تشریف لائے تو ایک شہزادہ زیارت کو حاضر ہوا اور حسب دستور اودھ شہزادہ نے جھک کر دونوں ہاتھوں سے تین دفعہ فرشی سلام کیا۔مولانا علیہ الرحمۃ نے تینوں دفعہ انگوٹھا دکھلا دیا۔شہزادہ شرمندہ ہوا اور برہم ہو کر مجمع حاضرین میں بیٹھ گیا۔جب واپس ہونے لگا تو ایک اشرفی مولانا کی نذر کی مولانا نے منہ چڑا دیا شہزادہ تو غصہ ہو کر چلا گیا۔بعد میں حاضرین میں سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت وہ تو سلام کرتا تھا اور آپ انگوٹھا دکھلاتے تھے یہ کیا بات تھی۔فرمایا شریعت میں تو اس طرح سلام ہے نہیں۔میں نے تو یہ سمجھا تھا کہ وہ یوں کہتا ہے کہ میری قسمت پھوٹ

گئی۔ میں نے کہا کہ میرے ٹھینگے سے۔ غرض اولیاء اللہ دل کی بات صاف کہہ دیتے ہیں کسی کے غیر معتقد ہونے سے نہ ڈرتے ہیں نہ کسی کے معتقد ہونے کی پرواہ کرتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ ان بلگرامی بزرگ صاحب نے صاف کہہ دیا کہ نفس کو اس کھانے کا انتظار ہو گیا تھا اس وجہ سے میں نہیں لیتا اور یہ عذر شرعی ہے کیونکہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو چیز بدوں انتظار کے آئے وہ لے لو۔

اور اس سے یہ بھی مفہوم ہوا کہ جو چیز انتظار کے بعد آئے وہ نہ لو۔ اگر اس موقع پر ہم ہوتے تو اصرار کرتے کہ نہیں حضرت لے ہی لیجئے۔ قبول ہی فرمالیجئے۔ جیسا دستور ہے مگر وہ شاگرد نہایت سمجھدار و فہیم تھے اور طریقہ ادب سے واقف اور سچی محبت کرنے والے تھے انہوں نے ذرا بھی اصرار نہ کیا (اب تو محض رسم پرستی ہے محبت و ادب کچھ نہیں ہے) چنانچہ یہ کہہ کر بہت اچھا فوراً کھانا واپس لے گئے اور نظر سے غائب ہو کر پھر فوراً واپس ہو آ گئے اور کھانا پیش کر کے عرض کیا کہ حضرت اب تو نفس کو وہ انتظار نہ رہا تھا بلکہ نفس مایوس ہو چکا تھا کہ آیا ہوا کھانا جاتا رہا۔ سو اب تو قبول فرمالیجئے۔ اب تو عذر شرعی بھی نہ رہا۔ وہ بزرگ بہت خوش ہوئے اور دعا دی۔

غرض رسول کے غلبہ سے طرز ادب مشکل ہے اور حقائق پر نظر ہو تو کچھ مشکل بھی نہیں وہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے لئے محبت کی ضرورت ہے مگر آج کل تو محبت کا دعویٰ ہی دعویٰ ہوتا ہے اگر سچی محبت ہو تو خود محبت ہی طرز خدمت سکھا دیتی ہے۔ (قال الشاعر)

محبت مجھ کو آداب محبت خود سکھا دے گی ذرا آہستہ آہستہ ادھر رجحان پیدا کر

حضرت صدیق اکبرؓ نے قبل از اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ خدمت کرنا چاہی جبکہ حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ سے آپ کا نکاح ٹھہرا تو حضرت خدیجہؓ بڑی امیر تھیں بڑی عاقل بھی تھیں۔ تجارت کے ذریعہ سے مال بڑھاتی تھیں یہاں تک کہ بہت سے غلام اور جانور آپ کے پاس تھے۔ نقدی بھی بہت کچھ تھا ادھر حضورؐ کے یہاں مال زیادہ نہ تھا لیکن حضور کا خاندان ہمیشہ سے معظم اور رئیس سمجھا جاتا تھا گو دعویٰ نبوت سے وہ شان ریاست عامہ کی نہ رہی تھی کیونکہ لوگ مخالف ہو گئے مگر بعد میں پھر پہلے سے زیادہ ہو گئی تھی۔

تو صدیق اکبرؓ نے چاہا کہ اس وقت کچھ آپ کی خدمت روپے سے کروں تا کہ خدیجہؓ کے سامنے آپ کی بات ہلکی نہ ہو۔ اگر خرچ نہ ہوا تو بات ہلکی ہو جائے گی۔ اس وقت صدیق اکبرؓ بہت مالدار تھے مگر ساتھ ہی یہ خیال کرتے تھے کہ میری اس خدمت کو آپ کیوں قبول کرنے لگے۔ آپ کو غیرت و حیا اس کے قبول سے مانع ہو گی۔ کوئی ایسی تدبیر کی جائے کہ آپ قبول فرمالیں وہ تدبیر یہ کی کہ عرض کیا کہ حضورؐ آپ کے دادا صاحب نے غالباً میرے دادا کے پاس کچھ امانت رکھی تھی وہ لے لیجئے۔ اس طریقہ سے روپیہ دیا اور آپ نے قبول فرمالیا۔

تو دیکھئے حضرت صدیق اکبرؓ بھی اسلام بھی نہیں لائے تھے مگر چونکہ آپ کو حضورؐ سے سچی محبت تھی اس نے خدمت کا یہ طریقہ خود بخود ان کو سکھلا دیا۔ الحاصل ادب کے سبب صحابہ کا یہ مذاق تھا کہ حضورؐ سے ایک بات پوچھی اگر آپ خاموش ہو گئے تو پھر جواب پر اصرار نہیں کرتے تھے پھر کسی دوسرے وقت اگر ضرورت سمجھتے تو موقع محل دیکھ کر مکرر عرض کر کے جواب حاصل کر لیتے تھے۔

حقیقت قربانی

غرض جب فضیلت قربانی کی صحابہؓ نے سنی تو عرض کیا کہ یارسول اللہ حقیقت قربانی کی کیا ہے۔ آپ نے جواب میں فرمایا سنة ابیکم ابراهیم (کنز العمال) یعنی تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ اور سنت ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کو جو آپؐ نے باپ فرمایا یا تو اس لئے فرمایا کہ مخاطب عرب ہیں اور اکثر عرب کا سلسلہ نسبی حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ہے تو اس صورت میں ابراہیم کا باپ ہونا حقیقۃً ہوگا اور اگر مخاطب کل امت کو مانا جاوے اس صورت میں ابراہیم علیہ السلام کا کل امت کے لئے باپ ہونا مجازاً ہوگا یعنی روحانی باپ وہ ہوتا ہے جس کے ذریعہ سے روح اور نفس کی اصلاح ہو اور ہماری روحانی اصلاح کا سلسلہ ابراہیم علیہ السلام تک پہنچتا ہے لہٰذا وہ ساری امت کے روحانی باپ ہیں۔ تو باپ کے پہلے معنی ظاہری ہیں اور دوسرے معنی باطنی۔

اور اتفاق سے اسی طرح خود مقصود حدیث بھی دو معنی کو مشتمل ہے یعنی جس طرح ابیکم میں ایک ظاہری معنی ہیں ایک باطنی معنی اسی طرح سنت ابراہیم کے دو معنی ہیں ایک ظاہری اور ایک باطنی کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لکل آیة ظهر وبطن (لم أجد الحدیث فی موسوعة) یعنی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن میں اسکی تحقیق بھی مختصراً عرض کرتا ہوں کہ ظاہر اور باطن کے کیا معنی ہیں بیان اس کا یہ ہے کہ بعض معانی تو وہ ہیں کہ جو مدلول قرآن بدلالت لغویہ ہوں۔ اور بعض وہ ہیں جو مدلول بدلالت لغویہ نہ ہوں پھر اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ وہ معنی کسی طرح سے بھی مدلول قرآنی نہ ہوں نہ بواسطہ نہ بلاواسطہ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ معنی مدلول قرآنی ہوں لیکن بلاواسطہ نہیں بلکہ بواسطہ ہوں پس اگر قرآن کے ایسے معنی گھڑے جائیں جو قرآن کا کسی طرح مدلول نہ ہو تو یہ معنی بالکل غلط ہوں گے اور یہ مسلک فرقہ باطنیہ کا ہے۔ جیسے اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ میں فرقہ باطنیہ نے اس کے یہ معنی لئے ہیں کہ اے روح تو نفس کے پاس جا یعنی ان کے نزدیک موسیٰ سے مراد روح اور فرعون سے مراد نفس ہے اور اس فرقہ نے قصہ موسیٰ و فرعون کو تو بالکل ہی اڑا دیا ہے جو مدلول قرآنی بدلالت ظاہرہ تھا اور اپنی طرف سے ایک نئے معنی گھڑ لئے۔ محققین صوفیہ نے اس کی نسبت فرمایا ہے کہ یہ فرقہ باطنیہ ملحد ہے جو مسلمانوں کا لباس پہن کر اسلام کو مٹانا چاہتا ہے اور محققین صوفیہ نے برخلاف اس فرقہ باطنیہ کے اس آیت کی دو توجیہیں کی ہیں ایک یہ کہ اے

موسیٰ فرعون کی طرف جا۔ یہ معنی تو مدلول قرآنی بدلالت ظاہرہ ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کو خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ فرعون کے پاس جاؤ۔ الخ دوسرے معنی بواسطہ یہ کئے ہیں کہ اے قرآن کے دیکھنے والے اور قرآن کے پڑھنے والے جب تو موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کے قصہ کو پڑھے تو اس قصہ پر اپنے حال کو قیاس کر۔ یعنی تیرے اندر جو منشاء ہے اعمال صالحہ کا یعنی روح جو مثل موسیٰ کے ہے اس کو قوت پہنچا کر اس کے ذریعہ سے نفس کی جو کہ افعال قبیحہ کا منشاء ہونے میں مثل فرعون کے ہے مغلوب کر۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

؎ موسیٰ وفرعون درہستی تست (موسیٰ اور فرعون دونوں تیری ذات میں موجود ہیں)

یہ معنی بھی مدلول قرآنی ہیں لیکن بواسطہ ایک قسم کے قیاس کے کیونکہ اس کی حقیقت یہ کہ اس قصہ ظاہرہ سے سبق لے کر اپنے نفس میں اس کو جاری کیا گیا ہے پس دراصل یہ تفسیر نہیں بلکہ ایک قسم کا قیاس ہے جو اصطلاح میں اعتبار کہلاتا ہے دوسروں کے قصہ سے عبرت حاصل کرنا اور عبرت حاصل کرنے کے یہی معنی ہیں کہ اپنی حالت میں غور کر کے دیکھا جائے کہ میرے اندر تو اس قصہ کے مشابہ کوئی حالت نہیں ہے اگر ہے تو جو نتیجہ قصہ کے اندر مذکور ہے اس سے متنبہ ہونا چاہیے۔

اور اعتبار کا حق تعالیٰ نے امر فرمایا ہے کہ قرآن کے قصوں سے عبرت حاصل کرو چنانچہ ایک جگہ باری تعالیٰ فرماتے ہیں: لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّاُوْلِي الْاَلْبَابِ. کہ ان لوگوں کے قصہ میں اہل عقل کے لئے عبرت ہے اور اس صورت میں مدلول ظاہری بھی منفی نہ ہوگا بلکہ عبرت حاصل کرنے کے لئے اصل قصہ کو بحال خود رکھنا لازم ہوگا۔ غرض ہر آیت کے اسی طرح دو معنی ہیں ظاہر اور باطن اور ہر معنی نہایت عجیب ولطیف ہیں۔ اسی باب میں کہا گیا ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جان تازہ میدارد برنگ اصحاب صورت را بہو ارباب معنی را

(اس کے حسن کی بہار ہمارے دل وجان کو تازہ کردیتی ہے جو ظاہر پرست ہیں وہ صورت سے لطف اندوز ہوتے ہیں جو باطن کے طلب گار ہیں وہ معنی سے لطف اندوز ہوتے ہیں)

قرآن عجیب کلام ہے جس سے ہر شخص اپنی استعداد کے موافق حصہ لیتا ہے اہل ظاہر ظاہری معنی سے اور اہل باطن باطنی وظاہری دونوں سے ؎

چیست قرآن اے کلام حق شناس رونمائے رب ناس آمد بہ ناس
حرف حرفش راست در بر معنی معنی در معنی در معنی

(قرآن کیا ہے حق کو پہچاننے والے لوگوں کے لئے ان کے رب کو دیکھنے کا ایک ذریعہ ہے اس کا حرف حرف بہت سے معنی کو متضمن ہے کہ معنی میں معنی پھر ان میں معنی پوشیدہ ہیں۔)

اسی طرح حدیث کو سمجھ لیجئے۔ غرض ہر نص کا ایک ظاہر ہے ایک باطن یا یوں کہئے کہ ایک

صورت ہے ایک حقیقت۔ اسی طرح یہاں بھی قربانی کا سنت ابراہیم ہونا جو کہ مقصود حیات ہے اس کا ایک ظاہر ہے ایک بطن۔ یعنی جب ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کے ذبح کا حکم ہوا تو مدلول ظاہری تو اس کا یہی ذبح ولد تھا اور بطن وہ ہے جو کہ رات میرے ذہن میں آیا ہے جس کی تفصیل ابھی آتی ہے۔ سنئے کہ جب صحابہ نے اضحیہ کی حقیقت دریافت کی تو آپ نے فرمایا سنۃ ابیکم ابراھیم (السنن الکبریٰ للبیہقی) یعنی یہ تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ ہے۔

تعلیم پدری اور آداب فرزندی

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ باپ کا طریقہ کیا ہے سو ظاہر ہے کہ باپ کا طریقہ وہ ہے جو قرآن میں مذکور ہے پس اس طریقہ کو قرآن ہی سے تحقیق کرنا چاہیے پس قرآن کا جو مطالعہ کیا گیا تو علوم ہوا کہ وہ طریقہ ولد کو ذبح کرنا ہے کیونکہ دنبہ کے ذبح کا حکم قرآن میں مذکور نہیں بلکہ اولاً بیٹے ہی کے ذبح کا قصہ مذکور ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فعل ذبح ولد ہی تھا نہ کہ ذبح کبش پس نص قرآنی کا ظاہر یہی ہے کہ یہ سنت ابراہیم جو حدیث میں مذکور ہے ذبح ولد ہو۔

چنانچہ واقعہ بھی یہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذبح ولد کا خواب دیکھا تھا چونکہ انبیاء کا خواب وحی ہوتا ہے لہٰذا اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو مذبح میں لے گئے اور وہاں ان سے اپنا خواب اس طرح بیان کیا: یٰبُنَیَّ اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُکَ فَانۡظُرۡ مَاذَا تَرٰی.

اے میرے پیارے بیٹے میں نے خواب دیکھا ہے کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں۔ سو دیکھو اس میں تمہاری کیا رائے ہے؟

سبحان اللہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا کیا عجیب اور سہل طریقہ ہے کہ مخاطب پر بالکل بوجھ نہیں ڈالتے بلکہ ان سے سوال کرتے ہیں اور اس طریقہ خاص کا اثر یہ ہوتا ہے کہ مخاطب بشاش ہو کر تعلیم کو ضرور قبول کر لیتا ہے۔ یہ طرز تعلیم نہایت موثر ہوتا ہے باوجودیکہ ابراہیم علیہ السلام کا ارادہ ذبح اسماعیل علیہ السلام کا پختہ تھا مگر پھر بھی یوں نہیں فرمایا کہ میں نے ایسا خواب دیکھا ہے میں تجھ کو یہاں ذبح کرنے کے واسطے لایا ہوں تو ذبح کے لئے تیار ہو جا۔ آپ نے اس مضمون کو جو طبعاً نہایت سخت اور خوف میں ڈالنے والا تھا کس سہل عنوان سے بیان فرمایا کہ اے بیٹے میں نے یہ خواب دیکھا ہے بولو تمہاری کیا رائے ہے۔ گویا ان سے مشورہ لیا اور اس کی تعبیر پوچھی۔ اب بھی اگر کوئی شخص اس طرز تعلیم کو اختیار کرے تو نہایت مؤثر اور نافع مخلوق ہوگا۔ چنانچہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے وعظ میں ایک شخص حاضر ہوا آپ نے دیکھا کہ اس کا پاجامہ ٹخنوں سے نیچا ہے۔ جب

وعظ ختم ہوا اور لوگ چلنے لگے تو آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ ذرا آپ ٹھہر جائیں مجھ کو آپ سے ایک کام ہے۔ جب سب چلے گئے تو آپ نے کھڑے ہو کر فرمایا کہ میں نے تم کو اس لئے روکا ہے کہ بھائی ذرا میرے پاجامہ کو دیکھو مجھ کو شبہ یہ ہو جاتا ہے کہ میرا پائجامہ ٹخنوں سے نیچے لٹک جاتا ہے آیا یہ میرا خیال ہی خیال ہے یا واقعی ٹخنوں سے نیچا ہے کیونکہ جس کا ٹخنوں سے نیچے پاجامہ ہوگا وہ دوزخ میں جائے گا وغیرہ وغیرہ تو بھائی دوزخ کا سخت عذاب ہے۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے ذرا اچھی طرح میرے پاجامہ کو دیکھ لو۔ یہ سنتے ہی وہ شخص شرما گیا اور پیروں میں گر پڑا اور کہا کہ حضرت آپ کا پاجامہ تو نہیں لٹکتا ہے البتہ مجھ نالائق کو لٹکتا ہے میں توبہ کرتا ہوں آئندہ ایسا نہ ہوگا۔

غرض نرمی سے تدبیر سے بہت کام بنتا ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وَقُلْ لِعِبَادِیْ یَقُوْلُوا الَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ یعنی اے نبی میرے بندوں سے کہہ دیجئے کہ وہ بات کریں جو بہتر ہو یعنی اس میں خشونت واشتعال نہ ہو یعنی بلاضرورت اسی لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو علیحدہ لے گئے اور خواب بیان کر کے فرمایا کہ اس میں تمہاری کیا رائے ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس عنوان کو اختیار کیا اور صاف صاف جو بات تھی وہ نہ کہی گو اس میں بظاہر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے اس احتمال کا شبہ ہو سکتا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام کا بچپن ہے کہیں ذبح سے گھبرا کر خلاف نہ کہنے لگیں مگر ان کا یہ خیال راسخ تھا کہ

ے شاباش آں صدف، کہ چناں پرورد گوہر ۔۔۔ آبا از و مکرم و ابنا عزیز تر

(اے صدف تجھے مبارک ہو کہ تو نے اس عمدہ گوہر کو پرورش کیا ہے کہ باپ دادا کی تکریم کا باعث ہے)

یہ ایسا واقعہ تھا جیسا کہ ایک مرتبہ ازواج مطہرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ہمارے خرچ میں بھی اضافہ فرما دیجئے کیونکہ اب تو فتوحات زیادہ ہونے لگی ہیں اس وقت یہ آیت نازل ہوئی: یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِاَزْوَاجِكَ الخ چونکہ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے آپ کو خاص محبت تھی اس لئے آپؐ نے سب سے پہلے حضرت عائشہؓ کو مضمون آیت مذکورہ کا سنایا یعنی اے نبی اپنی ازواج سے کہہ دیجئے کہ اگر تم دنیا کی طالب ہو تو میں تم کو کچھ دے کر علیحدہ کر دوں پھر مجھ سے تمہارا کچھ تعلق نہ رہے گا اور اگر دنیا کو چھوڑ کر مجھ کو اور اللہ کو اختیار کر دو تو تمہارے واسطے اللہ نے آخرت میں بڑے بڑے اجر رکھے ہیں چونکہ حضرت عائشہ کم سن تھیں کیونکہ جب وہ آپ کے گھر میں آئی تھیں تو ان کی نو سال کی عمر تھی اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو اٹھارہ سال کی تھیں اور چونکہ اس عمر میں تدبر اور تجربہ عادۃً کم ہوتا ہے اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو احتمال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ عائشہؓ بلا سوچے سمجھے دنیا کو اختیار کر لیں تو فرمایا اے عائشہ جواب میں جلدی نہ کرنا بلکہ اپنے ماں باپ سے مشورہ کر کے جواب دینا اور ماں باپ کے متعلق یہ شبہ نہ تھا مگر حضرت عائشہؓ کی نسبت حضور کا یہ خیال درجہ احتیاط میں تھا ورنہ ہر ایک کے سینہ میں حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کی محبت اعلیٰ پیمانہ پر ایسا جوش مار رہی تھی جس کے مقابلہ میں ہفت اقلیم کی سلطنت بھی ہیچ تھی۔

یہ سنتے ہی فوراً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ کے بارہ میں میں اپنے ماں باپ سے مشورہ کروں گی۔

قد اخترت اللہ ورسولہ والدار الآخرۃ میں نے اللہ کو اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اور دار آخرت کو اختیار کیا چونکہ حضرت عائشہؓ کا بچپن تھا اس لئے ساتھ ہی یہ بھی عرض کیا کہ یا رسول اللہ کہ اگر دوسری بیویاں آپ سے دریافت کریں کہ عائشہؓ نے کیا جواب دیا تو آپ نہ بتلائیں۔ آپ نے فرمایا اے عائشہ اگر کسی نے پوچھا تو میں بتلا دوں گا کیونکہ خدا تعالیٰ نے مجھے احکام کا ظاہر کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ اسی طرح اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ مشورہ کرتے ہوئے کچھ خیال ہوا بھی ہو کہ دیکھئے اسماعیل کیا جواب دیتے ہیں تو وہ درجہ احتیاط میں ہوگا ورنہ خود ان کی استعداد فطری میں یہ احتمال کی گنجائش نہ تھی۔

عظیم آزمائش

چنانچہ حضرت اسماعیل نے فوراً یہی عرض کیا کہ میں اس کا جواب ہی کیا دوں بس اللہ نے جو حکم آپ کو دیا ہے کہ گزریئے اور اگر آپ کو یہ شبہ ہو کہ میں اس وقت تو پختہ ہوں مگر شاید عین وقت پر ثابت قدم نہ رہوں تو سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ یعنی ان شاءاللہ مجھ کو آپ ثابت قدم پائیں گے۔ بس یہ سن کر ابراہیم علیہ السلام ذبح کے لئے تیار ہو گئے اور زمین پر لٹا کر تیز چھری حضرت اسماعیل علیہ السلام کے گلے پر زور زور سے پھیرنے لگے لیکن چھری تھی کہ نہیں چلتی تھی اس وقت ادھر سے یہ ہوا وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ...... بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ یعنی ہم نے ان کو پکارا کہ اے ابراہیم تو نے اپنے خواب کو سچ کر دکھلا دیا۔ (ہم مخلصین کو ایسے ہی جزا عطا فرماتے ہیں) بیشک یہ کھلا ہوا بڑا امتحان تھا اور ہم نے اسماعیل کو ایک ذبح عظیم کے ساتھ بدلہ کر کے چھڑا لیا۔

روایتوں میں آتا ہے کہ جنت سے ایک دنبہ لایا گیا جو اسمٰعیل علیہ السلام کے بدلہ میں ذبح ہوا۔ واقعی اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سخت امتحان تھا یہ تو ممکن ہے کہ کوئی شخص حالت مغلوبیت و بدحواسی میں اپنے ایسے فرزند کو جو بہت تمناؤں کے بعد بڑھاپے میں پیدا ہوا ہو ذبح کر دے لیکن ہوش وحواس کی حالت میں ہرگز ہمت نہیں ہو سکتی بلکہ ذبح ولد کے بجائے خودکشی نہایت آسان ہے اور ظاہر ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا یہ فعل نہایت درستی حواس میں تھا بدحواسی اور مغلوبیت کا یہاں شبہ تک نہیں ہو سکتا۔

اس لئے انبیاء علیہم السلام کبھی اس درجہ مغلوب الحال نہیں ہوتے کہ حقائق ان کے ادراک سے غائب ہو جاویں۔ البتہ اولیاء بعض اوقات بیشک اس درجہ مغلوب الحال ہو جاتے ہیں۔ دوسرے حق تعالیٰ فرماتے ہیں: يٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا. (اے ابراہیم علیہ السلام آپ نے خواب سچا

کر دکھایا) اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس فعل کو حکم کی تعمیل کی نیت سے قصداً کیا جیسا صدق کی اسناد سے معلوم ہوتا ہے اور غلبہ حال میں قصد کامل نہیں ہوتا۔ تیسرے آگے فرماتے ہیں ۔اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ. (بلاشبہ یہ کھلم کھلا بڑا امتحان تھا) کہ یہ بڑا سخت امتحان تھا اس سے بھی صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے باختیار خود بحالت درستی حواس یہ کام کیا تھا کیونکہ امتحان اسی کا ہوتا ہے جو ہوش وحواس میں ہو بدحواس آدمی جو کچھ کرتا ہے بے اختیاری میں کرتا ہے اور وہاں منجانب اللہ کوئی امتحان نہیں ہوتا۔ غرض بدحواسی سے انبیاءؑ معصوم ہیں۔

ہاں اولیاء کو بعض اوقات یہ حالت پیش آتی ہے چنانچہ حسین بن منصور علیہ الرحمۃ مغلوب الحال تھے۔ کہ غلبہ حال میں انا الحق کہہ گئے اور گو وہ اس میں معذور تھے مگر یہ حالت زیادہ کمال کی نہیں۔ اسی لئے شیخ عبدالحق ردولویؒ نے ان کے باب میں فرمایا ہے۔

منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد برآمد   اینجا مردانند کہ دریاہا فرو برند و اروغ نہ زنند

حالانکہ یہ بزرگ ردولویؒ بھی مغلوب الحال تھے کہ عمر بھر گھر سے جا کر مسجد میں نماز پڑھی لیکن کبھی مسجد کا راستہ یاد نہ ہوا ہمیشہ خادم آگے آگے حق حق کہہ کر مسجد میں لے جاتا تھا۔ نیز حضرت مخدوم احمد صابر بھی مغلوب الحال تھے مگر باوجود اس حالت کے شریعت کے خلاف کوئی امر سرزد نہیں ہوا شریعت کا بہت لحاظ رکھتے تھے۔ بخلاف اس زمانہ کے صوفیوں کے کہ باوجود مغلوب و معذور نہ ہونے کے ان کا بڑا مایہ کمال یہی ہے کہ وہ وجد وحال میں شریعت کا کچھ لحاظ نہیں کرتے۔ جماعت کا وقت ہے لیکن صوفی صاحب حال وقال میں ہیں کچھ خبر نہیں کہ جماعت کدھر ہے۔ اور نماز کدھر ہے کئی کئی وقت کی نمازیں ترک کر دیتے ہیں اور اگر کسی نے پڑھی بھی تو بعض دفعہ اتفاقاً بیہوش ہو کر گر بھی پڑے مگر پھر بھی اسی حالت سے اٹھے اور نماز پڑھ لی حالانکہ بیہوش ہو کر گرنے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے مگر ان کو شریعت کی بالکل خبر نہیں۔ وضو تک کے مسائل بھی یاد نہیں پھر باوجود اس کے علماء سے پوچھتے بھی تو نہیں۔ بس معلوم ہوا کہ شریعت کی پرواہ ہی نہیں کرتے البتہ اہل وجد وسماع میں سے ایک درویش نے ایک مرتبہ مجھ سے یہ مسئلہ دریافت کیا تھا کہ میں نے ایک شخص کو بددعا دی تھی وہ مرگیا میرے ذمہ خون تو نہیں ہوا عمر بھر میں یہ ایک شخص ایسا ملا جس کو باوجود سماع میں مبتلا ہونے کے شریعت کا پاس تھا۔ یہاں سے یہ جواب دیا گیا کہ اگر محض بددعا تھی اور قلبی ہمت کو کچھ دخل نہیں تھا تو اگر وہ محل بددعا نہ تھا تو محض بددعا کا گناہ ہوا قتل کا نہیں ہوا اور اگر دل سے بھی ہمت کی تھی تو قتل کا بھی گناہ ہوا اگر وہ شخص شرعاً مستحق قتل نہ ہو۔ غرض زمانہ حال کے متعارف صوفیہ میں ایسے بہت کم ہیں جو خدا سے ڈریں۔ اکثر تو زمانہ حال کی صوفیت کا مآل کسب دنیا ہے

جس قدر مریدین کی کثرت ہو گویا جائیداد بڑھتی ہے حضرت مولانا گنگوہی علیہ الرحمۃ ایک مرتبہ فرماتے تھے آج کل پیروں کی یہ حالت ہے کہ جب کوئی مرید ان کی خدمت میں آتا اگر اس سے اتفاق سے سر بھی کھجلایا تو معاً پیر صاحب کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ شاید عمامہ سے نذرانہ نکالتا ہے یہ تو جملہ معترضہ تھا میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایسی مغلوبیت شان ولایت ہے۔ انبیاء کی یہ شان نہیں۔ حاصل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مغلوب الحال نہ تھے۔ اسی لئے آپ کا یہ فعل بہت بڑا امتحان تھا۔

اب سنئے کہ اس مقام پر ابراہیم علیہ السلام سے دو فعل صادر ہوئے ایک ذبح ولد دوسرا ذبح کبش۔ شاید یہ شبہ ہو کہ دو فعل کہاں ہوئے کیونکہ یہاں تو فقط دنبہ ذبح ہوا تھا نہ کہ بیٹا یہ شبہ ایک شرعی قاعدہ کے سننے کے بعد بالکل رفع ہو جائے گا وہ یہ کہ شریعت میں ثواب وعقاب کا دارومدار ارادہ مصمم فعل اختیاری پر ہے خواہ وہ فعل کسی مانع یا عدم شرائط کی وجہ سے وقوع میں نہ آئے۔ ایسی صورت میں چونکہ اس شخص کی طرف سے فعل اختیاری کا ارادہ مصمم ہو چکا تھا لہٰذا موجب ثواب یا عقاب ضرور ہوگا۔ مثلاً ایک شخص ارادہ مصمم زنا کا کر کے چلا اور خاص موقع پر پہنچا اور زنا کرنے کو تیار ہو بیٹھا اتفاق سے چھت گر پڑی اور دب کر مر گیا تو حالانکہ اس شخص نے زنا نہیں کیا مگر چونکہ ارادہ مصمم ہو چکا تھا لہٰذا شرعاً زانی ہو کر مرا علی ہذا نماز کا مصمم ارادہ کر کے کھڑا ہوا اور اسی طرح زلزلہ سے چھت گر گئی تو نماز کا اجر اس کو مل گیا۔

پس اسی طرح یہاں ابراہیم علیہ السلام کو جب حکم ذبح ولد کا ہوا تو انہوں نے فوراً ارادہ بھی مصمم کر لیا اور اس فعل ذبح کو کر بھی ڈالا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ارادہ اور فعل دونوں وقوع میں آئے کیونکہ ذبح کے معنی ہیں امرار السکین علی الحلقوم یعنی چھری کا گلے پر پھیرنا اور یہ فعل ابراہیم علیہ السلام سے بطریق اتم صادر ہوا تو پس ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ولد کو ذبح بھی کر ڈالا اور مستحق اجر عظیم ہوئے۔

رہا اس ذبح کرنے کے بعد ولد کا ذبح بھی ہو جانا یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فعل نہیں بلکہ اثر ہے فعل کا جس پر ثواب وعقاب کا دارومدار نہیں نہ یہ فعل کوئی ضروری ہے یہ ایک جدا امر ہے۔ اور قاعدہ شرعیہ مذکورہ کو باری تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمایا ہے: وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ یُحَاسِبْکُمْ بِهِ اللّٰهُ یعنی تمہارے دلوں میں جو ارادے ہیں ان کو تم ظاہر کرو یا چھپاؤ اللہ تعالیٰ سب سے محاسبہ کرے گا ان ارادوں سے مصمم ارادے مراد ہیں۔

مقصود قربانی

دوسرے انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے اور انبیاء کی وحی سچی ہوتی ہے اور ابراہیم علیہ السلام نے ذبح ولد کو خواب میں دیکھا تھا تو یہ وحی بھی سچی ہو گی لہٰذا ذبح ولد کو ثابت ماننا پڑے گا۔ شرعاً بھی اور لغتہً بھی گو اند

باح کا وقوع نہ ہوا ہو پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس امتحان میں پورے اترے تو اللہ تعالیٰ نے بجائے اسماعیل علیہ السلام کے دنبہ ذبح کرا دیا یہ تو اس اضحیہ کا ظاہر ہوا اور اس کا بطن یہ ہے کہ حقیقت میں نفس کا ذبح کرنا مطلوب تھا جو بذریعہ ذبح ولد حاصل ہوا۔ لکل آیۃ ظهر و بطن (ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن) کے اصل پر یہ ہے اضحیہ کا یعنی جس طرح ہر عبادت کی ایک صورت ہوتی ہے یعنی ظہر اور ایک روح ہوتی ہے یعنی بطن اسی طرح اس اضحیہ کی بھی جیسے ایک صورت ہے جو سب کو معلوم ہے اسی طرح ایک روح بھی ہے یعنی ذبح نفس کہ وہی ذبح ولد کی بھی روح ہے۔ تو حقیقت قربانی کی فناء نفس ہوئی اسی واسطے ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد کا حکم ہوا نہ کہ اپنی ذات کے ذبح کا اس لئے کہ اولاد کی گردن اپنے ہاتھ سے کاٹنا جس قدر نفس پر شاق اور سخت ہے (اور واقعی بہت ہی بڑا سخت فعل ہے کہ تصور سے بھی دل کانپتا ہے) اپنی گردن اپنے ہاتھ سے کاٹ لینا اس کے مقابلہ میں آسان ہے۔ کوئی باپ بحالت ہوش وحواس کبھی اس فعل کو گوارہ نہ کرے گا بلکہ اپنی جان دے دینا نہایت آسان اور سہل سمجھے گا اور فناء نفس کے یہی معنیٰ ہیں کہ اپنی نفس کی مخالفت کرنا اور یہ معنیٰ ذبح ولد میں خود اپنے کو ذبح کرنے سے بہت زیادہ موجود ہیں۔

پس اب بتلایئے یہ باطن کون سی نص کے خلاف ہے۔ یاد رکھو کہ محققین صوفیہ کی کوئی بات قرآن وحدیث کے خلاف نہیں ہوتی اگر ہو تو وہ تصوف نہیں زندقہ ہے مگر ان حقائق کے سمجھنے کے لئے صحبت محققین کی ضرورت ہے کتابوں کے دیکھنے سے معلوم نہیں ہوتے اور نہ محض فن دانی سے یہ معانی حاصل ہوتے ہیں کیونکہ تصوف کوئی کتابی فن نہیں بلکہ یہ تو مجموعہ ہے علم وعمل کا اور یہ دونوں جب حاصل ہوتے ہیں کہ کسی شیخ کامل کے اپنے آپ کو سپرد کر دے اور علم وعمل میں اس کا اتباع کامل کرے۔

قال را بگذار مرد حال شو　　پیش مرد کاملے پامال شو

(باتیں چھوڑ و صاحب حال ہو کسی شیخ کامل کے سامنے پامال ہو جاؤ)

اور سپردگی کے بھی یہی معنیٰ ہیں کہ جس طرح شیخ کامل اس نفس متکبر کی اصلاح فرمائے خواہ ظاہری بداخلاقی کی چھری سے خواہ خوش اخلاقی سے یہ طالب سب کو برداشت کرے اور سب کو اپنے لئے نہایت نافع خیال کر کے خوش ہو بلکہ ایسے پیر کا زیادہ احسان مند ہو جس کو عام لوگ بداخلاق سمجھتے ہیں حقیقت میں اس نفس متکبر کا علاج یہی ہے جس کو لوگ بداخلاقی سمجھتے ہیں۔

محبت واطاعت

بعض لوگ اپنے پیر سے محض اس بناء پر منحرف ہو جاتے ہیں کہ وہ مریدوں کے ساتھ رکھی خوش اخلاقی کا معاملہ نہیں کرتا یہ محض نادانی ہے چنانچہ بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ فلاں پیر تو سخت مزاج ہیں کسی خوش اخلاق

پیر سے مرید ہونا چاہیے یہ بڑی سخت غلطی ہے اور ایسی پیری مریدی محض برائے نام ہے، کچھ بھی نافع نہیں۔ پیری مریدی کا حاصل اصلاح نفس ہے اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ تم اپنے کو پیر کے بالکل سپرد کردو کہ وہ حسب حال جس تدبیر سے چاہے اصلاح فرمائے سب کو قبول اور برداشت کرنا چاہیے ورنہ اگر اس کی تدابیر اصلاح کی برداشت کی قوت نہ ہو تو کسی پیر سے مرید ہی نہ ہونا چاہئے کیونکہ اگر کسی وقت پیر نے اصلاح کے لئے زجر و توبیخ فرمائی اور مرید کے نفس متکبر نے برداشت نہ کیا تو پیر کی برائی اس کے دل میں آئے گی پھر بجائے اصلاح کے طرح طرح کی بلاؤں میں مبتلا ہوجائے گا ایسے شخص کو یہی بہتر ہے کہ کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہ دے۔

در بہر زخمے تو پر کینہ شوی   پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

(ہر زخم پر تو ناگواری کا اظہار کرتا ہے بھلا کہیں بغیر رگڑے تو آئینہ بھی بنتا ہے)

جس شخص کو آپریشن کا تحمل نہ ہو اس کو ڈاکٹر کے پاس جانا ہی نہ چاہیے اور اگر جاؤ گے اور اس کے نزدیک آپریشن کی کیا ضرورت ہے تو وہ ضرور ایسا کرے گا ورنہ وہ ڈاکٹر نہیں بلکہ رہزن ہے۔

مولانا نے یہ شعر ایک قصہ کے اندر فرمایا ہے وہ قصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی گودنے والے مصور سے کہا تھا کہ میرے بدن پر شیر کی تصویر بنادے۔ اس نے کہا بہت اچھا اور ایک سوئی کا چوکا بدن میں لگایا تو اس شخص نے سسکی بھر کر کہا کہ میاں کیا بناتے ہو۔ کہا دم بنارہا ہوں بولا کہ میاں دم کو چھوڑ دو دوسری شئے بناؤ۔ دم نہ ہوئی تو کیا شیر لنڈورا بھی تو ہوتا ہے۔ گودنے والے نے کان کا نقشہ گودنا شروع کیا پھر سسکی بھری اور پوچھا کیا بناتے ہو کہا کان کہنے لگا کہ اگر نہ ہوئے تو کیا شیر بوچھا بھی تو ہوتا ہے۔ کانوں کو چھوڑ دو اور کچھ بناؤ پھر اس نے اور جگہ سوئی لگائی تو وہ پوچھتا ہے کہ اب کیا بناتے ہو کہا پیٹ کہنے لگا اس کو پیٹ کی کیا ضرورت ہے۔ اس کو کچھ کھانا پینا تھوڑا ہی ہے۔ گودنے والے نے تنگ آکر سوئی پھینک دی اور کہا کہ صاحب میں نے ایسا شیر نہیں دیکھا جس کے سر کان پیٹ اور دم کچھ بھی نہ ہو۔

شیر بے گوش و سر و شکم کہ دید   ایں چنیں شیرے خدا ہم نافرید

(بغیر کان، سر، اور پیٹ کا شیر کہاں دکھائی دیتا ہے ایسا شیر تو اللہ میاں نے بھی پیدا نہیں کیا)

بس مجھے معاف رکھئے آگے مولانا فرماتے ہیں۔

چوں نداری طاقت سوزن زدن   از چنیں شیر ژیاں بس دم مزن

(جب ایک سوئی کے چبھنے کی بھی برداشت نہیں ہے تو اپنے جسم پر شیر بنوانے کی تمنا نہ کرو) اور فرماتے ہیں۔

در بہر زخمے تو پر کینہ شوی   پس کجا بے صیقل آئینہ شوی

(ہر زخم پر ناگواری کا اظہار کرتے ہو بھلا کہیں بغیر رگڑے آئینہ بن سکتا ہے)

غرض جیسا کہ یہ شخص عدم تحمل کی وجہ سے نقشہ شیر سے محروم رہا ایسے ہی وہ لوگ جو پیر کی اصلاح کی

برداشت نہیں کرتے۔ اصلاح نفس سے محروم اور محض کورے رہ جاتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ جو پیر حسب حال مرید کبھی زجر و توبیخ سے پیش آتے اور کبھی شفقت سے تو سمجھ لینا چاہیے کہ ایسا پیر مریدین پر بہت ہی مہربان ہے اس کو مریدین کا نفع مدنظر ہے اپنی منفعت سے کچھ علاقہ نہیں۔

حضرت ابوسعید گنگوہیؒ جب بارادہ بیعت گنگوہ سے بلخ کو چلے جب اس شہر کے قریب پہنچے تو شیخ نظام الدین بلخیؒ کو جن کی خدمت میں یہ جا رہے تھے خبر ہوئی تو شیخ اور اس شہر کا حاکم صاحبزادہ ابوسعید علیہ الرحمۃ کے استقبال کو آئے کیونکہ یہ شیخ نظام الدینؒ کے دادا شیخ عبدالقدوسؒ کے پوتے تھے۔ پس یہ سن کر کہ صاحبزادے تشریف لائے ہیں نہایت شاندار استقبال کے ساتھ ملاقات کی اور نہایت تلطف اور اخلاق سے پیش آئے۔ اس لئے کہ آخر صاحبزادے ہی تھے۔ بعد ملاقات وغیرہ کے دریافت کیا کہ صاحبزادے کیسے تکلیف فرمائی؟ عرض کیا بارادہ بیعت حاضر ہوا ہوں یہ سنتے ہی فوراً تیور بدل گئے۔ اب کہاں کا اخلاق کہاں کی شفقت کہا بہت بہتر جاؤ باورچی خانہ کی خدمت تمہارے سپرد ہے اور فرمایا فلاں مدت تک میرے سامنے نہ آنا چونکہ آدمی بنانا مقصود تھا اور اس میں بدون تیور بدلے ہوئے کام نہیں چل سکتا تھا اصلاح کامل نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ

ناز پرور دہ تنعم نہ بردراہ بدوست عاشقی شیوہ رندان بلاکش باشد

(نازوں سے پلے ہوئے اور نعمتوں کو پائے ہوئے دوست تک نہیں پہنچ سکتے۔ عاشقی بغیر مصیبت اٹھائے ہوئے حاصل نہیں ہوتی)

اور جو پیر کہ مرید کی مرضی کا لحاظ رکھے ہر امر میں موافقت کا اظہار کرے جو مرید کے لئے سم قاتل ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ پیر دنیادار اور رہزن ہے دکاندار ہے جو فقراء کا لباس پہن کر اور کچھ صوفیہ کے چٹکلے یاد کر کے لوگوں کو مکر و فریب میں مبتلا کر کے اپنی دکان چلا رہا ہے۔

نقد صوفی نہ ہمہ صافی و بیغش باشد اے بسا خرقہ کہ مستوجب آتش باشد

(ہر صوفی کا مال بے کھوٹ نہیں ہوتا۔ صوفیوں کے بہت سے کپڑے اس لائق ہوتے ہیں کہ ان کو جلا دیا جائے) ایسے ہی لوگوں کے حق میں مولاناؒ فرماتے ہیں۔

حرف درویشاں بدزد دو مرددوں! تابہ پیش جاہلاں خواند فسوں

(گھٹیا لوگ درویشوں کے الفاظ کی نقالی کرتے ہیں تاکہ جہلاء کو اپنا گرویدہ بنا سکیں) اور فرماتے ہیں۔

ظالم آں قومیکہ چشمان دوختند از سخنہا عالمے را سوختند

(وہ قومیں بڑی ظالم ہیں جو اپنی آنکھیں سی لیتی ہیں اپنی گفتگو سے ساری دنیا کو جلا دیتی ہیں)

یادرکھو محض باتیں بنانے سے آدمی صوفی نہیں ہوتا بلکہ اس کیلئے باطن میں معرفت الٰہی ہونا شرط ہے۔

هزار نکته باریک تر زمو اینجاست   نه هر که سر به تراشد قلندری داند

(وہ یہاں بال سے بھی باریک ہزاروں نکتے ہیں ضروری نہیں کہ ہر وہ شخص جس نے سر منڈا رکھا ہو قلندری جانتا ہو) اور معرفت کے آثار میں سے ہے استغناء اور کسی کو دھوکہ نہ دینا اور اسرار کو نااہل سے مخفی رکھنا

بامدعی مگوئید اسرار عشق و مستی   بگذار تا بمیرد و رنج و خود پرستی

(عشق و مستی کے راز مدعی کو نہ بتاؤ تاکہ وہ اپنی خود پرستی کے رنج میں خود ہی مر جائے) اور انکا تو یہ حال ہوتا ہے۔

عجب داری از سالکان طریق   که باشند در بحر معنی غریق

دما دم شراب الم درکشند   وگر تلخ بینند دم درکشند

(سالکان طریق نمتا نمت غم کی شراب پی لیتے ہیں اگر کڑوی بھی ہو تو ایک ہی سانس میں پی لیتے ہیں)

غرض فقراء کی سی صورت بنانے سے فقراء کا سا لباس پہننے سے نہ آدمی فقیر ہی بنتا ہے اور نہ فقیری آتی ہے البتہ دکان خوب چلتی ہے عوام جہلاء خوب پھنستے ہیں۔

حاصل یہ ہے کہ اگر محبوب حقیقی کی طلب صادق ہے تو شیخ کامل کی ان تدابیر کی جو موصل الی الحق ہیں برداشت کرنا چاہیے گو کیسی ہی نفس کو ناگوار ہوں۔ دیکھو مخلوق کی طلب میں کیسے کیسے مصائب اٹھائے جاتے ہیں سبکی برداشت کی جاتی ہے اور بخوشی گوارا کی جاتی ہیں۔ تو کیا محبوب حقیقی کی طلب میں اتنی مشقت بھی برداشت نہ ہو عجیب بات ہے۔

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود   گوئے گشتن بہر او اولے بود

(مولیٰ کا عاشق لیلیٰ کے عشق سے کیا کم ہوسکتا ہے اسکے عشق کیلئے گلی کوچوں میں مارے مارے پھرنا بہتر ہے) خلاصہ یہ کہ جن حقائق کا اس وقت بیان ہو رہا ہے وہ ایسے حضرات کی صحبت واطاعت سے منکشف ہوتے ہیں۔

روح قربانی

اب عود الی السابق کرتا ہوں کہ ہر عبادت کی ایک روح ہے اور روحِ قربانی کی فناء نفس ہے جو بذریعہ ذبح ولد واقع ہوئی تھی اور فناء نفس یہ ہے کہ خلاف خواہش کام کرنا اگر نفس کی آرزو چار نوافل کی ہو تو آٹھ پڑھے علی ہذا القیاس اگر صوم نفل سے اعراض کرے اور صلوٰۃ نفل پر خوش ہو تو صلوم نفل کو اختیار کرے۔

ایک بزرگ کو جہاد فی سبیل اللہ کی خبر پہنچی تو نفس کی خواہش ہوئی کہ چلنا چاہیے مگر متردد ہوئے کہ کہیں اس ارادہ میں نفس کا شائبہ نہ ہو حق تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے اس تقاضا کی حقیقت بتلا دی جائے چنانچہ بعد میں معلوم ہوا کہ نفس کی خواہش جہاد کی طرف اس بناء پر ہے کہ ایک دفعہ ہی جو کچھ ہونا ہے ہو رہے گا یہ روز کے

مجاہدوں اور جھگڑوں سے تو نجات مل جاوے گی پس فوراً جہاد کو ملتوی کر دیا اور اس شغل میں جو نفس کے خلاف نفس کشی کا تھا مشغول ہو گئے۔ ان کو اسی میں لطف آتا ہے کہ اس نفس پر روزانہ آرہ چلتا رہے۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زمان از غیب جانے دیگر است

افروختن و سوختن جامہ دریدن پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

(تسلیم کے خنجر کے مارے ہوئے لوگوں کو ہر لمحہ اپنی جان اللہ کے راستہ میں دینی پڑتی ہے پھڑکنا، جلنا، کپڑے پھاڑ دینا، پروانہ نے، شمع نے، پھول نے مجھ سے سیکھا ہے)

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

(عاشقی کیا ہے کہہ دو کہ محبوب کا غلام بن جانا دل دوسرے کے ہاتھ میں دے کر حیران رہ جانا)

غرض یہ حاصل ہے فنا نفس کا اور زہر کھا لینے کا نام فناء نفس نہیں ہے اور یہی فناء مذکورہ روح اضحیہ ہے اب تو آپ کو معلوم ہوا کہ تصوف کے مسئلے اس طرح ثابت ہوتے ہیں کہ سراپا مطابق قرآن وحدیث کے ہیں۔

قربانی میں کوتاہی

اب میں کچھ احکام متفرق قربانی کے بیان کر کے ختم کرتا ہوں کیونکہ مقصود احکام ہیں نہ کہ نکتے پس جب یہ ثابت ہو گیا کہ قربانی کی روح فناء نفس ہے تو جس قربانی میں فناء نفس نہ ہو وہ قربانی بے روح ہے گویا قربانی ہی نہیں۔ اب بعض ان کوتاہیوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو نفس کی متابعت میں اختیار کی جاتی ہیں۔ جو فناء نفس کے بالکل خلاف ہے یہ متعدد کوتاہیاں ہیں مثلاً بعض لوگ قربانی بخل کی وجہ سے نہیں کرتے اور بعض دوسری قوموں کی رعایت سے نہیں کرتے۔

اس کی زیادہ تر یہ وجہ ہے کہ ان لوگوں میں اسلامی قوت کامل نہیں اس لئے کہ قوت کاملہ کا یہ خاصہ ہے کہ کسی دوسری قوت کے اثر کو قبول نہ کریں۔ باوجودیکہ اسلامی قوت تمام قوتوں سے نہایت زبردست ہے پھر بھی جو بعض اہل اسلام بوجہ دیگر اقوام کے میل کے قربانی نہیں کرتے یا گائے کی قربانی پسند نہیں کرتے تو معلوم ہوا کہ ان کی اسلامی قوت کمزور ہو گئی اور آبائی اثر ان سے جاتا رہا جیسے بعض اولاد نالائق اپنے باپ کے اثر کو قبول نہیں کرتی ہے اور پھر کہتے ہیں کہ اس صورت میں گائے کی قربانی کی کیا ضرورت ہے جبکہ دوسرے جانوروں کی قربانی ہو سکتی ہی ہے اور کہتے ہیں کہ اس صورت میں گائے کی قربانی محض تعصب ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ تعصب کسے کہتے ہیں پس سنو کہ تعصب کے معنی ہیں ناحق بات کی پچ کرنا اور ایک چیز تصلب ہے جس کے معنی ہیں حق بات پر پختہ اور مضبوط ہونا اب بتلاؤ کہ گائے کا ذبح کرنا شرعاً حق ہے یا ناحق۔ یقیناً حق ہے اور جو اس کو ناحق کہے اس کے اسلام میں کلام ہے جب یہ حق ہے تو اس پر پختہ اور مضبوط ہونا تعصب کیونکر ہوا بلکہ یہ تو تصلب فی الدین محمود و مطلوب ہے۔

پھر افسوس ہے کہ جن سے تم میل کرنا چاہتے ہو وہ تم سے میل کرنا نہیں چاہتے۔ ورنہ اس کی کیا وجہ ہے کہ تم نے تو ہنود کی دوستی کی وجہ سے گائے کاٹنا چھوڑ دیا مگر ہنود نے تمہاری محبت میں گائے کاٹنا منظور نہ کیا تم نے تو ہنود کے اثر کو جو نہایت لچر اور بیہودہ اور ضعیف ہے قبول کیا اور ہنود نے تمہارے اثر کو جو نہایت قوی اور مستحسن ہے قبول نہ کیا۔ حقیقت میں اسلامی قوت وہ ہے کہ تمام قوموں پر غالب ہے وہ کسی کے اثر کو نہیں قبول کر سکتی بلکہ اپنا سکہ دوسری قوموں پر جماتی ہے اور یہاں بالعکس ہے تو معلوم ہوا کہ ان لوگوں میں اسلامی قوت ہی نہیں اور گائے کاٹنا اور اس کا گوشت کھانا اگرچہ فی نفسہ فرض اسلامی نہیں لیکن اس وقت شعار اسلامی ضرور ہے۔ جو فی الحقیقت اسلام ہے اور شعار اسلامی کو کسی مخالف اسلام کے خوش کرنے کو چھوڑ دینا بڑے سے بڑا گناہ ہے اور اگر اس کے شعار ہونے سے بھی قطع نظر کیا جائے تب بھی ہمارے مذہب میں اس کا کاٹنا اور کھانا اس بناء پر ثواب تو ہے کہ اس میں ہنود کے عقیدہ شرکیہ کی مخالفت ہے تو آپ نے تو ہنود کی محبت کو اس قدر نباہا کہ ثواب کو چھوڑا، لیکن افسوس ہنود نے آپ کی محبت کی کچھ بھی پرواہ نہ کی کم از کم اتنا تو کرتے کہ اگر وہ گائے نہ کاٹتے تو مسلمانوں سے سود ہی لینا چھوڑ دیتے۔ مسلمانوں کو قرض بلا سود دے دیا کرتے۔ یہ عجیب اتفاق اور اتحاد ہے کہ آپ تو ہنود کی محبت میں سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں اور وہ آپ کو ہر بات میں ٹکا سا جواب دے جائیں۔

غرض مسلمان آج کل ہنود کا بکثرت اثر لیتے ہیں مگر یہ شان اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ یہ تو گائے کاٹنے کے متعلق تذکرہ تھا۔

بعض لوگوں نے کاٹنے سے تو تعرض نہیں کیا لیکن ہنود کے اثر سے گائے کا گوشت کھانا چھوڑ دیا اور یہ سب گائے کے نہ کاٹنے یا اس کے نہ کھانے میں گویا ہنود کے مشابہ بن گئے اور حدیث شریف میں آیا ہے **من تشبہ بقوم فھو منھم** کہ جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ ان میں سے ہے۔

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ کوئی بزرگ ہولی کے دنوں میں پان کھائے ہوئے جا رہے تھے۔ اتفاق سے راستہ میں ایک بیمار گدھا پڑا تھا انہوں نے اس پر پیک ڈال دی اور کہا تجھے ہولی میں کسی نے نہیں رنگا۔ لا تجھے میں رنگ دوں۔ بعد مرنے کے کسی نے خواب میں دیکھا کہ ہنود کی جماعت میں ہیں پوچھا اس کا کیا سبب ہے جواب دیا کہ میں نے ہولی میں گدھے پر پیک ڈال دی تھی عتاب ہوا کہ تو نے ہنود کی مشابہت رنگ ڈالنے میں کیوں کی تھی۔ لہٰذا ہنود کی جماعت میں رہو۔ پس ذبح گاؤ کا ترک تشبہ سے بھی خالی نہیں۔

قربانی سے بے رحمی کا شبہ

اور بعضے لوگ گائے کی قربانی اس وجہ سے نہیں کرتے کہ وہ دعویٰ رحم کا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قربانی بے رحمی ہے مگر تماشا ہے کہ وہ بکری وغیرہ کی قربانی کرتے ہیں اس صورت میں یہ دعویٰ عقل کے

بالکل خلاف ہے اس لئے کہ روح کا تعلق جیسے گائے سے ہے ویسے ہی بکری وغیرہ سے ہے جب بکری کی قربانی بے رحمی نہیں تو گائے کی قربانی بے رحمی کیوں ہے اور اگر گائے کی قربانی بے رحمی ہے تو بکری وغیرہ کی بھی بے رحمی ہے پھر ایک جگہ دعویٰ رحم اور ایک جگہ نہیں یہ تو انصاف کے خلاف ہے۔

علاوہ ازیں اگر چہ اس نے بکرے کی قربانی کی مگر پھر بھی یہ فعل روح اضحیہ کے خلاف ہے کیونکہ اس میں یہ شخص نفس کی موافقت کر رہا ہے جیسا اوپر مذکور ہوا جو فنائے نفس کے خلاف ہے اور ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ روح اضحیہ کی فنائے نفس ہے تو اس شخص کو روح اضحیہ جب حاصل ہوگی جب یہ گائے کی قربانی کرے جو اس کے نفس کیخلاف ہے۔

شاید کوئی یہ کہے کہ بعض صوفیہ نے بھی تو گوشت کھانا چھوڑا ہے لہٰذا ہم بھی چھوڑتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ صوفیہ نے جو چھوڑا ہے وہ معالجہ نفس کی غرض سے چھوڑا ہے جیسا کہ بیمار کو بیماری کے زمانہ میں لذیذ غذاؤں سے روکا جاتا ہے اور گوشت ہی کیا صوفیہ نے تو تمام لذیذ کھانے چھوڑ دیئے ہیں تا کہ نفس کشی ہو۔ انہوں نے کسی قوم کے خوش کرنے کے لئے یا بوجہ رحم کے ترک نہیں کیا تھا۔ صاحبو! لوگوں نے تصوف کو سمجھا نہیں اور اسکو غلط استعمال کیا۔ چنانچہ گوشت کے ترک کو بھی تصوف سمجھ گئے جو سخت غلطی ہے اور تصوف کی غلطی کفر تک پہنچتی ہے کیونکہ تصوف اعلیٰ درجہ کی شئے ہے۔ جب اس میں غلطی واقع ہوتی ہے تو اسی پیمانہ پر جیسا کہ سوکھی روٹی اس درجہ نہیں سڑتی جس درجہ قورمہ سڑتا ہے غرض صوفیہ کی حالت پر اپنے کو قیاس کرنا محض لغو ہے۔

نیز جو لوگ گائے ذبح نہ کرنے میں دعویٰ رحم کا کرتے ہیں وہ بدفہم بھی پورے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قربانی کا بھی حکم دیا ہے اور جانوروں پر رحم کرنے کا بھی حکم فرمایا ہے اگر قربانی خلاف رحم ہوتی تو اللہ تعالیٰ جو سب سے زیادہ رحیم ہیں وہ کیوں اس کا حکم فرماتے مگر جب اللہ تعالیٰ نے قربانی کا حکم فرمایا ہے اب اس کو بے رحمی کہنا گویا معاذ اللہ خدا کو بے رحم کہنا ہے۔

رہا یہ کہ خدا نے کہاں حکم کیا ہے تو اس کے لئے ہم قرآن سے ثبوت دے سکتے ہیں۔ اور قرآن کا کلام الٰہی ہونا عقلی دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں جس کا جی چاہے گفتگو کر لے تو اس صورت میں اس کو بے رحمی کہنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا تو رحیم نہیں اور حضرت انسان ایسے رحیم ہیں کہ اس نے قربانی کو بالکل خلاف رحم سمجھا تو گویا حضرت انسان صفت رحیمی میں اللہ تعالیٰ سے زیادہ ٹھہرے۔ نعوذ باللہ من ذالک۔

اللہ تعالیٰ کے برابر جانوروں پر تو کیا دشمنوں پر بھی کوئی رحم نہیں کر سکتا۔ ان کی رحیمی کو دیکھئے کہ ایک مرتبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دستر خوان پر ایک کافر آ گیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اول تو یہ سمجھ کر مسلمان ہے بٹھلا لیا اور جب بسم اللہ نہ کہنے پر اور اس کی وجہ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ دشمن خدا ہے فوراً دستر خوان سے اٹھا دیا اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے خطاب ہوا کہ اے ابراہیم اس کو نوے برس کفر کرتے کرتے ہو گئے ہم نے ایک وقت بھی اس پر کھانا بند نہیں کیا اور تمہارے دستر خواں

پرعمر بھر میں ایک دفعہ آ گیا تم نے اس کو دھکے دیدیئے۔

دگرا دمے برد پیش آتش سجود | تو واپس چرا میکشی دست جود

(حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کافر کو دوبارہ بلایا کہ آؤ میرے ساتھ کھانا کھالو چاہے بسم اللہ نہ پڑھنا۔ اس نے کہا پہلے آپ نے مجھے کھانے سے منع کردیا۔ اب بلاتے ہو اس کی کیا وجہ ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میرے رب نے مجھے یہ حکم دیا ہے یہ سن کر وہ شخص مسلمان ہوگیا اور بسم اللہ پڑھ کر کھانا کھایا)۔

خورش وہ بہ کنجشک و کبک و حمام | کہ شاید ہمائے درافتد بدام

(ھما کو شکار کرنے کے لئے چڑیا، چکور اور کبوتر کو بھی دانہ ڈالنا پڑتا ہے)

چو برگوشہ تیر نیاز افگنی | بنا گاہ بینی کہ صیدے کنی

(شیر کے سروں پر حاجتوں کو ڈالا جائے گا کہ جب اچانک اس پر نظر پڑے گی تو اس کو شکار کرے گا)

ایک بار حضرت نوح علیہ السلام کو حکم ہوا کہ چالیس برس تک مٹی کے برتن بناؤ چنانچہ حسب الحکم چالیس برس تک انہوں نے مٹی کے برتن بنائے پھر حکم ہوا کہ سب کو توڑ ڈالو۔ انہوں نے حسب الحکم سب توڑ ڈالے لیکن قلق ہوا کہ افسوس میں نے ان برتنوں کو بنا کر ایک بار دیکھا بھی نہیں۔

حیف درچشم زدن صحبت یار آخر شد | روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

(افسوس کہ میں ابھی محبوب کو پل بھر بھی نہ دیکھ پایا تھا کہ ملاقات ختم ہوگئی پھول کو آنکھ بھر بھی نہیں دیکھ پائے کہ ملاقات ختم ہوگئی)

حکم ہوا اے نوح دیکھو اپنی بنائی ہوئی چیز کا تم کو کس قدر قلق ہوا اب سوچو کہ ہم نے تمہارے کہنے سے اپنی بنائی ہوئی مخلوق کو ایک دم غرق کردیا۔

غرض اللہ تعالیٰ نے جب جانور بنائے اور ان کے حقوق ثابت کئے اور ان پر رحم کرنے کی بھی تاکید فرمائی اور پھر بھی قربانی کا حکم دیا تو معلوم ہوا کہ قربانی خلاف رحم نہیں۔

مسلمان میں صفت رحم

اور غالب خاصیت عادۃً رحم کی یہی ہے کہ اگر کوئی عارض قوی نہ ہو تو تکلیف سے بچاتے ہیں تو اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ بظن غالب جانوروں کے ذبح ہوتے ہوئے اتنی تکلیف نہیں ہوتی جتنا غم کیا جاتا ہے یعنی طبعی موت سے زیادہ نہیں ہوتی بلکہ کم ہوتی ہے یہ تو حکم طبعی ہے اور ذوق سے معلوم ہوتا ہے کہ شاید اتنی کم ہوتی ہو کہ مثل نہ ہونے کے ہو کیونکہ عاشق کے لئے بڑی خوش نصیبی ہے کہ محبوب کے سامنے گردن جھکے اور اس کے نام پر قربان ہوجائے اور خدا تعالیٰ سے محبت ہر چیز کو ہے۔

اور کیوں نہ ہو؟ جب کہ محبوبان خدا سے ہر شئے کو محبت ہوتی ہے ان مقدمات پر نظر کر کے تو یہ کہا جاوے گا کہ ذبح کے وقت قربانی کے جانور کا یہ حال ہوگا۔

سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے　　　کیا نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے

جس وقت جانور کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نام پر ذبح ہوتا ہوں تو خوشی میں مست ہو جاتا ہے یہی نکتہ ہے اس میں کہ بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کیا جائے کہ اس سے جانور مست ہو جاتا ہے۔ اور کچھ تکلیف نہیں ہوتی چنانچہ اس کی ایک نظیر بھی ہے کہ شہداء کو خدا کے نام پر سر دینے کی خاص خوشی ہوتی ہے اور ان کو کچھ تکلیف نہیں ہوتی البتہ جانور اپنی مستی کو بوجہ بے زبان ہونے کے ظاہر نہیں کر سکتا مگر شہداء کی مستی تو ظاہر بھی ہو جاتی ہے لوگوں کے سامنے سینہ سپر ہونا اور بے تحاشا معرکہ میں گھس جانا ہر شخص کو نظر آتا ہے۔ یہ تو شہادت کے مبادی ہیں جن میں مجاہد کی لذت ظاہر ہوتی ہے۔

باقی خود شہادت کے متعلق خود حدیث شریف میں آیا ہے کہ شہداء کو قتل ہونے پر ایسی تکلیف ہوتی ہے جیسے کہ ایک چیونٹی نے کاٹا ہو اور خوشی اور مستی کیوں نہ ہو وہ تو بزبان حال یوں کہتے ہیں۔

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

(دشمن کے مقدر میں یہ بات نہ ہو کہ تیری تلوار سے ہلاک ہوں دوستوں کا سر سلامت رہے تو اپنے خنجر اس پر آزمالے)

پس اسی طرح جانوروں کو بھی ذبح سے تکلیف نہیں ہوتی بلکہ چونکہ ان کی آرزو ہے کہ ہم اللہ کے نام پر قربان ہوں اس وجہ سے ان کی قربانی کر کے ان کو راحت پہنچائی جاتی ہے۔ پس جاہل ہے وہ شخص جو بے رحمی کے خیال کی وجہ سے قربانی چھوڑتا ہے۔

اسی طرح قربانی کو دیکھ کر بعض مخالف قوموں کا یہ کہنا کہ مسلمان بے رحم ہیں یہ ان کی سخت غلطی ہے اس لئے کہ رحم ایک کیفیت وجدانی ہے۔ ہر ایک شخص کو اپنی کیفیت معلوم ہے دوسرے کی کیفیت ہرگز نہیں معلوم ہو سکتی باوجود عادت ذبح کے مسلمانوں کے صفت رحم کی یہ بین دلیل ہے کہ مسلمان باوجود یکہ قربانی کرتے ہیں مگر پھر بھی ان کے دل میں اس قدر رحم ہے وہ کسی جانور کی تکلیف کو دیکھ نہیں سکتے۔ بلکہ واللہ مسلمان تو عین ذبح کرتے ہوئے بھی جانور پر رحم کرتے ہیں اور ذبح کی حالت دیکھ کر ان کا دل پگھل جاتا ہے۔

قربانی اور مجاہدہ

چنانچہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندیؒ نے ایک دفعہ ایک گائے کی قربانی کی تھی جس کی قیمت اسی روپیہ تک قصائی دیتے تھے مگر مولاناؒ نے نہیں دی اور قربانی کر دی لیکن حالت یہ سنی گئی تھی کہ مولانا روتے جاتے تھے اور قربانی کرتے جاتے تھے۔ دیکھئے یہ کتنا بڑا مسلمانوں کا مجاہدہ ہے کہ دل پانی پانی ہوتا

ہے اور قربانی کرتے ہیں ۔ واللہ یہی نفس کی قربانی ہے کہ نفس کے خلاف کام ہو۔

میں نے ایک صوفی سے جس نے سماع کے متعلق مجھ سے سوال کیا تھا کہ بتلاؤ مجاہدہ کیا ہے کہا کہ نفس کے خلاف کرنا میں نے کہا کہ سچ بتلاؤ تمہارا دل گانا سننے کو چاہتا ہے کہا ہاں ۔ میں نے کہا کہ پھر گانا سننا تو مجاہدہ کے بالکل خلاف ہوا پھر گانا کیوں سنتے ہو وہ اس کا جواب کچھ نہ دے سکا محض ساکت رہا۔

حضرت سلطان جی کی حکایت ہے کہ آپ کے زمانہ میں ایک جوگی تھا جس کسی بیمار پر نظر ڈالتا وہ اچھا ہو جاتا تھا۔ اتفاق سے حضرت بیمار ہوئے متعلقین نے عرض کیا کہ حضرت فلاں جوگی سلب مرض کرتا ہے اگر حکم ہو تو اس کو بلا لیں آپ نے ناراضی ظاہر فرما کر انکار کر دیا۔ اتفاق سے حضرت ایک روز زیادہ بیہوش ہو گئے تو متعلقین بوجہ غایت محبت وتمنائے صحت کے حضرت کو حالت بیہوشی میں اس جوگی کے گھر لے گئے ۔ اس نے نظر ڈال کر سلب مرض کرنا شروع کیا یہاں تک کہ حضرت کو ہوش آ گیا اور اچھے ہو گئے ۔

گو وہاں لایا جانا حضرت کو نا گوار تو ہوا مگر اس پر بھی یہ چاہا کہ جوگی کے احسان کی مکافات کریں اور اس کو بھی کسی مرض سے اچھا کر دیں تو آپ نے اس جوگی سے دریافت فرمایا کہ تو نے یہ عمل کس طرح حاصل کیا ہے جوگی نے عرض کیا کہ میرے گرو نے کہا تھا کہ ہر کام نفس کے خلاف کیا کر۔ بس یہ اس کا اثر ہے تو آپ نے توجہ ڈال کر اس سے دریافت فرمایا کہ بتلا تیرا دل اسلام لانے کو چاہتا ہے کہا نہیں۔ حضرت نے فرمایا پھر اس میں نفس کے خلاف کیوں نہیں کرتا۔ یہ تو تیرے مجاہدہ میں کسر رہی جاتی ہے اس پر وہ لاجواب ہو گیا اور فوراً مسلمان ہو گیا۔

ایسا ہی جواب میں نے اس صوفی کو دیا تھا کہ تم خاک مجاہدہ کرتے ہو کہ نفس نے سماع کا تقاضا کیا اور سن لیا دیکھو مجاہدہ ہم کرتے ہیں کہ بعض دفعہ چشتیت کے اثر سے سماع کا تقاضا اندر سے ہوتا ہے مگر دل کو مار کر رہ جاتے ہیں اور نہیں سنتے۔ سو حضرت یہ مسلمان ہی کا دل ہے کہ نفس کی خواہشوں پر خاک ڈالتا ہے اور باوجودیکہ رحم سے پانی پانی ہوتا ہے پھر قربانی کرتا ہے۔ واللہ یہ اعلیٰ درجہ کا مجاہدہ ہے۔

گائے کے ذبح کا قرآنی ثبوت

بعض لوگ کہتے ہیں کہ گائے کا ذبح اور اس کا کھانا قرآن سے ثابت نہیں۔ اس کی وجہ قرآن سے ناواقفیت ہے۔ قرآن میں گائے کا ذبح کرنا اور اس کا کھانا دونوں موجود ہیں دیکھئے قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً .... وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ط الیٰ اخر الاٰیۃ

ترجمہ:۔ اور مواشی میں اونچے قد کے اور چھوٹے قد کے۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے تم کو دیا ہے کھاؤ اور شیطان کے قدم بہ قدم مت چلو وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔ آٹھ نر و مادہ میں بھیڑیں دو قسم اور بکری دو قسم۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں نروں کو حرام کیا ہے یا دونوں مادہ کو یا اس کو جس کو دونوں مادہ اپنے پیٹ میں لئے ہوئے ہیں تم مجھ کو کسی دلیل سے تو بتلاؤ اگر تم سچے ہو اونٹ میں دو قسم اور گائے میں دو قسم۔

اس آیت سے گائے کا ذبح اور اس کا کھانا بالتصریح ثابت ہو رہا ہے۔

نیز یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ ہر شئے میں درجہ اعتدال مطلوب ہوتا ہے حد اعتدال میں جب تک شئے رہتی ہے ٹھیک اور درست رہتی ہے۔ اور جہاں حد اعتدال سے نکلی معاً خراب اور مضر ہو جاتی ہے علیٰ ہذا القیاس رحم بھی اگر حد اعتدال میں رہے تو ٹھیک و درست ہوگا ورنہ مضر ہوگا دیکھو اگر ہر جگہ رحم کیا جائے جیسا ہنود دعویٰ کرتے ہیں تو اعتدال نہ رہے گا افراط ہوگا جیسے بعض لوگ سانپ بچھو کو بھی نہیں مار سکتے اور اس کا نتیجہ خراب یہ ہوگا کہ اشرف مخلوق یعنی انسان پر تو ظلم ہوگا اور دوسری اشیاء پر جوارذل مخلوق ہیں۔ یعنی سانپ بچھو وغیرہ ان پر رحم ہوگا جو بالکل عقل ونقل کے خلاف ہے۔ پس بحمد اللہ ذبح جانور کے متعلق جو شبہات تھے وہ سب رفع ہو گئے اگر چہ یہ تقریر مناظرانہ نہیں مگر ہم کو خود مناظرہ کا ڈھنگ ہی پسند نہیں نہ ہم کو غیروں کے اعتراضوں پر نظر نہ ان کے مذہب پر جس کی مناظرہ میں ضرورت ہے۔

البتہ ہم کو یہ معلوم ہے کہ ہم میں کوئی عیب نہیں ہے اگر کوئی ہمیں یہ کہے کہ تم کانے ہو تو یہ ضرور نہیں کہ ہم جواب میں یہ ثابت کریں کہ تم اندھے ہو بلکہ محض یہ کہنا کافی ہوگا کہ اگر ہم کانے ہیں تو تم ہماری اچھی آنکھ کو بند کر لو دیکھو پھر بھی ہم کو دوسری آنکھ سے جس کو تم کانی بتاتے ہو نظر آتا ہے یا نہیں۔ اسی طرح جو لوگ مناظرہ کرنے والے ہیں جن کی دوسرے مذاہب کی اندرونی حالت پر بھی کافی نظر ہے وہ تو یوں بحث کرتے ہیں کہ مخالف نے ان کو کانا کہا اور انہوں نے اس کو اندھا ہونا ثابت کر دیا۔ اور ہم یہ کرتے ہیں کہ اپنا بے عیب ہونا ثابت کر دیتے ہیں ہم کو مناظرہ کا زیادہ شوق نہیں بس ہم کو تو پرانا ڈھنگ آتا ہے اور یہی کافی ہے۔

علاوہ ازیں سب سے آخری بات یہ ہے کہ ہم کو تو خدا اور رسول کے حکم کا اتباع کرنا ہے اور کسی کے جرح وقدح سے کیا مطلب۔ باقی میں نے جو مخالفین کے شبہات کا کچھ جواب دیدیا ہے یہ محض تبرع ہے کیونکہ بعض ناواقف مسلمان ان سے متاثر ہو جاتے ہیں اور یہ ان کی قوت اسلامی کے ضعیف ہونے کی دلیل ہے ورنہ اگر جاہل مسلمان بھی پکا مسلمان ہو تو قیامت تک کسی فلسفی کے باپ سے بھی متاثر نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہوتی ہے اس کے پاس تمام اعتراضوں کا ایک جواب یہ ہوتا ہے کہ احمق ابھی تو حضور نے ہمیں یہی حکم دیا ہے کہ اپنے جانور ذبح کرو۔ بخدا اگر حضور ہمیں یہ حکم دیتے کہ اپنی اولاد اور بیویوں کو ذبح کر دو تو ہمیں اس سے بھی دریغ نہ ہوتا۔

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا .... وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا

ترجمہ:۔ ہم اگر لوگوں پر یہ بات فرض کر دیتے کہ تم خود کشی کیا کرو یا اپنے وطن سے بے وطن ہو جایا کرو تو بجز معدودے چند لوگوں کے اس حکم کو کوئی بھی بجا نہ لاتا اور اگر یہ لوگ جو کچھ ان کو نصیحت کی جاتی ہے اس پر عمل کیا کرتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا یا وہ ان کو زیادہ پختہ کرنے والا ہوتا۔

جانور کی جگہ قیمت دینا

اس موقع پر مجھے ایک حکایت یاد آئی ہے وہ یہ کہ ایک شخص تھے کہ ایام قربانی میں جانور ذبح نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی قیمت خیرات کر دیا کرتے تھے کسی رات کو وہ خواب میں کیا دیکھتے ہیں کہ میدان قیامت برپا ہے اور پل صراط قائم ہے اور دوسرے کنارے پر جنت ہے، بہت لوگ اپنی اپنی سواریوں پر سوار ہو کر پل صراط کو طے کرتے ہیں اور جنت میں داخل ہو جاتے ہیں اور یہ شخص حیران اور پریشان کھڑا ہے کہ میں کس طرح گزروں نہ میرے پاس سواری ہے نہ اور کوئی حیلہ ہے اور یہ شخص یہ بھی سوچ رہا تھا کہ یہ سواریاں لوگوں کے پاس کہاں سے آتی ہیں اور کون دیتا ہے اچانک آواز آئی کہ یہ سواریاں ان لوگوں کی ہیں جنہوں نے دنیا میں اپنے لئے تیار کی تھیں یعنی یہ سواریاں قربانی کے جانور ہیں چونکہ تم قربانی نہیں کرتے ہو لہٰذا تم سواری سے محروم ہو۔ جب آنکھ کھلی بہت متاثر ہوئے اور قربانی نہ کرنے سے توبہ کی اور قربانی کرنے لگے۔ صاحبو! قربانی کا یہ نتیجہ ظاہر ہے حدیث میں اس کی صراحت ہے بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ گھٹیا جانور کی قربانی کرتے ہیں حالانکہ قربانی بجائے اولاد کے ہے جیسا کہ بناء قربانی کا واقعہ اس پر شاہد ہے اس لئے چاہیے کہ عمدہ سے عمدہ جانور کی قربانی کی جاوے۔ غرض یہ ہے کہ اچھا جانور ذبح کرنا چاہیے۔

قربانی میں وسعت کا لحاظ

بعض ایسا کرتے ہیں کہ باوجود وسعت کے ایک ہی جانور کی قربانی کرتے ہیں اگر کسی کو وسعت کافی ہو تو اس کو چاہیے گو واجب نہیں مگر آخر حقوق بھی کوئی چیز ہیں اس بناء پر مناسب ہے کہ اپنے بزرگوں کی طرف سے بھی قربانی کرے اور ایک قربانی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی کرے آپ کو امت کے ساتھ کیسی محبت تھی کہ آپ اپنی طرف سے تو قربانی کرتے ہی تھے ایک قربانی زیادہ کرتے تھے اور فرماتے کہ یہ ان لوگوں کی طرف سے ہے کہ جو میری امت میں سے قربانی کی وسعت نہیں رکھتے اور ایک روایت میں ہے کہ عن محمد وامتہ اور ایک روایت میں ہے ھذا عمن آمن بی و صدقنی (ہکذا فی جمع الفوائد) (یہ اس کی طرف سے جو مجھ پر ایمان لایا اور میری تعریف کی) دیکھئے کیسی محبت تھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہمارے ساتھ حالانکہ ہم اس وقت موجود بھی نہ تھے مگر آپ کو ساری امت سے غائبانہ محبت تھی۔

ما نبودیم و تقاضا ہم نبود   لطف تو نا گفتہ ما می شنود

(نہ ہم تھے نہ ہمارا تقاضا تھا تیرے لطف نے ہمیں بغیر مانگے ہی نواز دیا)

ادائے حق محبت عنایت ست زدوست　　　　ورنہ عاشق مسکین بہ ہیچ خور سند ست

(محبت کا حق ادا کرنا دوست کی عنایت ہے ورنہ مسکین عاشق کے پاس تو کچھ نہیں بھی تو پھر بھی راضی ہے)

قربانی کی کھال

ایک ضروری مسئلہ یہ ہے کہ قربانی میں اتباع رسم جائز نہیں مثلاً پائے کسی کے اور سری کسی کی کھال کسی کی یہ بالکل خلاف شرع ہے۔ ہم تو ایسا کرتے ہیں کہ نائی سقہ وغیرہ کو اس کی محنت کی مزدوری الگ دے دیتے ہیں اور اس کے ساتھ کبھی بطور ہدیہ کے سر بھی دے دیتے ہیں اور کہہ بھی دیتے ہیں کہ تمہارا حق نہیں۔ علی ہذا القیاس بعض لوگ ایسا کرتے ہیں کہ قربانی کی کھال مسجد کے ملا کو دے دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اس کا حق خدمت ہے یہ بھی جائز نہیں اس میں بھی وہی صورت کرنا چاہیے کہ ان کا حق الخدمت علیحدہ ہونا چاہیے اور کھال کے اندر آپ مختار ہیں کبھی ان کو دیجئے اور کہہ دیجئے کہ یہ آپ کا حق نہیں اور کبھی نہ دیجئے۔ اور جب ملا کو مسجد میں رکھیں تو اسی وقت صاف کہہ دیں کہ تم کو کھال نہ ملے گی باوجود اس کہنے کے پھر اگر دے دی تو جائز ہے۔ غرض کبھی دیدو اور کبھی نہ دو۔ التزام ہی سے ذہنوں میں یہ حق ہو گیا ہے کہ جیسے آج کل مریدین پیر کی نذر کو اپنے ذمہ لازم سمجھتے ہیں یہ بھی خلاف قاعدہ بلکہ مضر ہے کیونکہ پیر کو اس کی عادت ہو جاتی ہے اور یہ عادت موجب اشراف نفس ہے جو پیر کے لئے مضر ہے یہ کیا انصاف ہے کہ وہ تمہارا دین سنواریں اور تم ان کو بگاڑو اس سے پیروں کو بہت نقصان پہنچتا ہے پیر کے دل میں دنیا طلبی آجاتی ہے اور وہ رنگ ہو جاتا ہے جیسا ایک قصہ ہے کہ ایک مرید نے اپنا خواب پیر سے بیان کیا کہ حضرت میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میری انگلیاں پاخانہ میں بھری ہیں اور آپ کی انگلیاں شہد میں بھری ہوئی ہیں۔ پیر جی خوش ہو کر بولے کیوں نہ ہو تو دنیادار ہے اور ہم پرہیزگار ہیں۔ مرید نے عرض کیا کہ حضرت اس سے آگے کچھ اور بھی دیکھا ہے پیر صاحب نے کہا وہ کیا۔ مرید نے عرض کیا کہ حضرت وہ یہ ہے کہ آپ میری انگلیاں چاٹ رہے ہیں اور میں آپ کی۔ تب تو پیر صاحب بہت شرمندہ ہوئے تو اس کی واقعی تعبیر یہ تھی کہ پیر تو مرید سے دنیا حاصل کر رہا تھا اور مرید پیر سے دین حاصل کر رہا تھا۔

اور پیروں میں یہ دنیا طلبی کا مضمون زیادہ تر مریدوں کے التزام ہدیہ سے آتا ہے۔ اس کو ترک کر دینا چاہیے۔ اسی طرح مسجد کے ملا کو التزاماً کھال نہ دو ورنہ وہ اس کو اپنا حق سمجھ کر پھر تمہاری کھال کھینچے گا۔

گوشت کی تقسیم

باقی رہا گوشت کا حکم تو اس میں اختیار ہے آپ جس کو چاہیں دیں خواہ غنی کو خواہ فقیر کو سب جائز

ہے مگر قصائی کو گوشت کاٹنے کی اجرت میں ہرگز نہ دیا جائے کہ یہ اجرت میں داخل ہو کر ثواب اضحیہ کو باطل کر دے گا۔ اور گوشت بانٹنے میں اچھا طریقہ یہ ہے کہ اپنے خرچ کے موافق نکال کر باقی فقراء اور عزیز و اقارب کو تقسیم کر دیا جائے اور ان لوگوں کا لحاظ خصوصیت کے ساتھ رکھنا چاہیے جو بوجہ عدم وسعت کے قربانی نہیں کر سکے اور یہ جو آج کل ادلا بدلا ہوتی ہے یہ تو بالکل ہی خلاف عقل ہے جب ان اہل مبادلہ میں ہر شخص کے یہاں قربانی ہوتی ہے تو پھر ایک دوسرے کے یہاں خواہ مخواہ یہ بھیجنا ہے۔

• الا ان يكون لحم احدهما اطيب واز كى فلا باس بارساله الى صديقه الذى قدضحى ۱۲ جامع)

ترجمہ:۔ ہاں اگر یہ ہو کہ کسی ایک کی قربانی کا گوشت اچھا ہو اور عمدہ ہو تو پھر اپنے ایسے احباب کے یہاں قربانی کا گوشت بھیج دینے میں کوئی حرج نہیں جس کے گھر میں قربانی ہوتی ہو۔

فقط واخر دعوانا ان الحمدلله رب العٰلمين والصلوٰة والسلام علٰى خير خلقه سيدنا و مولانا محمد وعلٰى آله واصحابه اجمعين.

اشرف علی (ج ا۔ ۱۳۵۵ھ)

الوعظ المسمی بہ

تکمیل الانعام
فی صورۃ ذبح الانعام

۲ ذی الحجہ ۱۳۴۰ھ کو بعد نماز جمعہ مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون میں ۲ گھنٹے
پچاس منٹ کھڑے ہو کر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔
مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔ سامعین کی
تعداد تقریباً پچاس تھی۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلٰنَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ.

اما بعد: فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم

لَنۡ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوۡمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنۡ یَّنَالُہُ التَّقۡوٰی مِنۡکُمۡ ط کَذٰلِکَ سَخَّرَھَا لَکُمۡ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمۡ ط وَبَشِّرِ الۡمُحۡسِنِیۡنَ. (الحج آیت نمبر ۳۷)

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو تمہارے زیر حکم کر دیا تا کہ تم اس بات پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو کہ اس نے تم کو توفیق دی اور مخلصین کو خوشخبری سنا دیجئے۔

اس آیت میں حق تعالیٰ نے ھدایا اور ضحایا کی حکمت بیان فرمائی ہے اور جو اس سے مقصود ہے اس پر متنبہ فرمایا اس سے پہلے بھی چند آیات میں یہ مضمون مذکور ہے چنانچہ اس سے اوپر یہ آیت ہے:

وَلِکُلِّ اُمَّۃٍ جَعَلۡنَا مَنۡسَکًا لِّیَذۡکُرُوا اسۡمَ اللّٰہِ عَلٰی مَا رَزَقَھُمۡ مِّنۡ م بَھِیۡمَۃِ الۡاَنۡعَامِ ط فَاِلٰھُکُمۡ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ

اور ہم نے ہر امت کے لئے قربانی کرنا اس وجہ سے مقرر کیا تھا کہ وہ ان مخصوص چوپایوں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو عطا فرمائے سو تمہارا معبود ایک ہی خدا ہے۔

مجموعہ آیات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہدایا اور ضحایا سے مقصود تقرب الی اللہ ہے جس کو کہیں بعنوان ذکر اسم اللہ بیان فرمایا ہے کہیں تقویٰ سے تعبیر فرمایا۔ مقصود مشترک سب میں تقرب الی اللہ ہے اور یہی راز ہے سب عبادتوں کا مگر قربانی میں اس کا ظہور زیادہ ہے گو اس جگہ حج کی قربانی کا ذکر ہے مگر جو حکمتیں اس

جگہ مذکور ہیں ان کو حج ہی کی قربانی سے خصوصیت نہیں بلکہ وہ سب قربانیوں میں مشترک ہیں۔ گو حج کے انضمام سے اس میں اور قوت بڑھ جاوے گی جیسے تقرب یوں تو تمام طاعات میں مشترک ہے مگر قربانی میں اس کا ظہور زیادہ قوت کے ساتھ ہے پس اس میں شک نہیں کہ جو قربانی حج کے ساتھ ہوگی اس میں برکات اور زیادہ ہوں گی مگر یہ مقصود اور حکمتیں جو اس جگہ مذکور ہیں اسی کے ساتھ خاص نہیں۔ اور میں نے قربانی کے روح کا بیان کرنا اس وقت اس لئے اختیار کیا ہے کہ اس سے پہلے بھی چند بیان ہو چکے ہیں جن میں بعض اعمال کی ارواح کا ذکر ہوا تھا چنانچہ رمضان کے بیانات میں اعمال رمضان کی روح مجاہدہ اور عید کے بیان میں اعمال حج کی روح مشاہدہ ہونا ثابت کیا تھا۔ اس لئے جی چاہا کہ قربانی کی بھی روح بیان کر دوں۔

ترتیب فرعی و عقلی

چنانچہ اس کی روح تقرب الی اللہ ہے جس کے دو درجے ہیں ایک فنا ایک بقاء اول فنا ہوتی ہے پھر بقاء حاصل ہوتی ہے اور ان سب ارواح میں ترتیب وقوعی کے ساتھ ترتیب عقلی بھی ہے یعنی جیسے عقلاً مجاہدہ پہلے ہوتا ہے اس کے بعد مشاہدہ ہوتا ہے ایسے ہی یہاں وقوعاً رمضان کے بعد حج ہوتا ہے۔

جسکی حقیقت مشاہدہ ہے گو شوال میں افعال حج مشروع نہیں ہوتے مگر احرام جو شرط اعظم ہے شوال ہی سے شروع ہو جاتا ہے یعنی سنیت اس کی شوال سے ہوتی ہے اسی طرح پہلا قربانی کا زمانہ حج کے بعد ہے کیونکہ وہ دسویں ذی الحجہ سے شروع ہوتا ہے اور حج عرفہ کے دن نویں کو ہوتا ہے یہ تو ترتیب وقوعی ہے اور غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ترتیب وقوعی کے ساتھ حج و قربانی کی ارواح میں ترتیب عقلی بھی ہے یعنی جو روح مطلق اعمال حج کے متعلق ہے وہ قربانی کی روح سے مقدم ہے یہ میں پہلے بتلا چکا ہوں کہ حق تعالیٰ نے ہمارے ساتھ اکثر ہمارے مذاق کے موافق معاملہ فرمایا ہے تو اب دیکھئے کہ جب ہم کسی بادشاہ سے ملنا چاہتے ہیں تو اول مجاہدہ ہوتا ہے مثلاً چلنے کی مشقت کوشش اور سفارش کی مشقت اور بادشاہ کے ملاقات کے قابل کسی ہنر کے حاصل کرنے کی مشقت اس کے بعد مشاہدہ ہوتا ہے جس مشاہدہ کے بھی ہم قابل ہوں خواہ بلا حجاب خواہ من وراء حجاب اس کے بعد پھر تقرب خاص کا معاملہ ہوتا ہے کہ ہم بادشاہ کے سامنے نذرانہ پیش کرتے ہیں پھر بادشاہ کی طرف سے ہم پر عطا ہوتی ہے اور بادشاہ کی عطا ہمارے نذرانہ سے بہت زیادہ ہوتی ہے کیونکہ وہ خزانہ عامرہ کا مالک ہے اور کریم بھی ہے نیز یہ بھی دستور ہے کہ شاہان دنیا نذرانہ کی اشرفی پر ہاتھ رکھ کر واپس کر دیتے ہیں لیتے نہیں ہیں پھر اپنے خزانے سے خود بہت کچھ دیتے ہیں اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ خدا تعالیٰ کا برتاؤ ہمارے ساتھ ہمارے مذاق کے موافق ہے تو ممکن ہے کہ وہاں بھی یہی ترتیب ہو چنانچہ

رمضان کے افعال مجاہدہ تھے اور حج مشاہدہ ہے اس کے بعد یہاں بھی چاہیے کہ کچھ نذرانہ ہماری طرف سے ادھر سے عطا ہو تو حج جو کہ مشاہدہ ہے اس کے اعمال میں سب سے بڑا عمل وقوف عرفہ ہے کہ بدوں اس کے حج ہو ہی نہیں سکتا اور یہ ایسا رکن ہے کہ اگر کسی سے یہ فوت ہو جائے تو پھر دوسرے سال تک حج کا موقعہ نہیں مل سکتا لہٰذا ظاہر یہ ہے کہ مشاہدہ کے مصداق وقوف عرفہ ہوا۔

جان کا نذرانہ

اس کے بعد دیکھنا چاہیے کہ کون سا عمل نذرانہ بننے کے قابل ہے گو عرفہ کے بعد وقوف مزدلفہ بھی ہے اور رمی بھی ہے اور قربانی بھی اور طواف زیارت بھی مگر ان میں نذرانہ بننے کے قابل بجز قربانی کے اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کیونکہ جیسا وہ دربار ہے ویسا ہی نذرانہ ہونا چاہیے اس نذرانہ کا اصل مقتضا تو یہ تھا کہ انسان اپنی جان پیش کر دے کیونکہ اس سے بڑی چیز انسان کے پاس کچھ نہیں کسی عاشق نے کعبہ کو دیکھ کر خوب کہا۔

چوری بکوئے دلبر بسپار جان مضطر ۔۔۔ کہ مباد بار دیگر نرسی بدیں تمنا

(جب محبوب کے در پر پہنچے تو اپنی جان محبوب کے سپرد کر دے پتہ نہیں کہ دوبارہ آنا نصیب ہو کہ نہ ہو)

یہ کہہ کر دفعتاً گرا اور بیت اللہ تک پہنچنے سے پہلے رب البیت سے جا ملا مولانا اسی پر نظر کر کے فرماتے ہیں۔

نان دادن خود سخائے صادق ست ۔۔۔ جان دادن خود سخائے عاشق ست

(روٹی دینا خود بھی سخاوت ہے لیکن جان کسی پر قربان کرنا عاشق کی سخاوت ہے) اور

حج زیارت کردن خانہ بود ۔۔۔ حج رب البیت مردانہ بود

(ظاہری طور پر خانہ کعبہ کی زیارت کرنے کا نام حج ہے ورنہ حقیقۃً رب البیت کی نیت کرنا اصلی حج ہے)

اس کا حج مردانہ تھا کہ جان دے کر خدا تعالیٰ سے مل گیا۔ جان کا سب سے زیادہ عزیز ہونا ظاہر و باہر ہے اس لئے اس دربار کے لائق نذرانہ بھی ہو سکتا ہے۔ شرعاً بھی جان کو سب سے زیادہ عزیز مانا گیا ہے کہ جان والے کو بھی اس میں تصرف کرنے سے روک دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں لا تقتلوا انفسکم (اور تم ایک دوسرے کو قتل مت کرو) یعنی جس کی ظاہر میں یہ چیز ہے وہ بھی اس میں تصرف نہیں کر سکتا۔ ایک دوسری آیت سے یہ بھی مضمون معلوم ہوتا ہے کہ جان سب سے زیادہ عزیز ہے فرماتے ہیں:

وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ .... صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا.

ترجمہ:۔ اور اگر ہم ان پر یہ بات فرض کر دیتے کہ تم خودکشی کیا کرو یا جلا وطن ہو جایا کرو تو سوائے چند لوگوں کے اس کو کوئی بھی بجا نہ لاتا اور اگر یہ لوگ جو کچھ ان کو نصیحت کی جاتی ہے اس پر عمل کیا کرتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا اور ایمان کو زیادہ پختہ کرنے والا ہوتا اور اس حالت میں ہم ان کو

خاص اپنے پاس سے اجر عظیم عنایت کرتے اور ہم ان کو سیدھا راستہ بتلا دیتے۔

کہ اگر ہم لوگوں پر یہ فرض کر دیتے کہ اپنی جان دے دو یا گھروں سے نکل جاؤ تو بجز تھوڑے آدمیوں کے ایسا کوئی نہ کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جان دینا بہت دشوار ہے انسان کو یہ سب سے زیادہ پیاری ہے اور خروج من الدیار بھی نفس اور جان ہی کی وجہ سے دشوار ہے کیونکہ گھر سے بے گھر ہونے میں روح کو تکلیف ہوتی ہے بلکہ قتل میں تو جان پر ایک ہی بار تصرف ہوتا ہے اور خروج من الدیار میں ہر وقت کا سوہان روح ہے دل پر آرے سے ہر وقت چلتے ہیں یہی تو وجہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھ کو تمام انبیاء سے زیادہ ایذا پہنچی ہے اس پر بظاہر اشکال ہوتا ہے کہ آپ تو قتل نہیں ہوئے اور بعض انبیاء تو قتل بھی ہوئے ہیں جواب ظاہر ہے کہ قتل کی ایذاء ایک دفعہ ہی ہو جاتی ہے اور حضور کو منجملہ اور اذیتوں کے ہجرت کر کے گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ یہ اس سے اشد ہے الغرض انسان کو جان سب سے زیادہ پیاری ہے تو مشاہدہ حق جیسی دولت کا مقتضا یہ تھا کہ اس کے نذرانہ میں ہم اپنی جان پیش کر دیتے مگر خدا تعالیٰ نے اس میں سہولت کر دی ہے کہ بڑی چیز کے بدلہ میں چھوٹی چیز لے لی ہے مگر وہ چھوٹی چیز ایسی ہونی چاہیے جس کو انسان کی جان سے مناسبت ہو سو ظاہر ہے کہ جان سے مناسبت جان ہی کو ہے۔ جسم کو نہیں اس لئے نفس انسانی کا فدیہ کوئی نفس ہی ہو سکتا ہے لہٰذا ذبح حیوان ہی اس کا بدل ہوا اور یہی قربانی ہے پس وقوف عرفہ کے بعد جتنے بھی افعال ہیں ان میں قربانی کے سوا اور کوئی فعل نذرانہ بننے کے قابل نہیں کیونکہ اصلی نذرانہ کے ساتھ اسی کو مناسبت ہے اور گویہ اصلی نذرانہ کا بدل ہے مگر اس میں ثواب ان شاء اللہ وہی ملے گا جو اپنی جان دینے میں ملتا۔

آثار کرم

جیسا کہ لیلۃ المعراج میں نمازیں اول پچاس فرض ہوئی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو غایت عبدیت کی وجہ سے چپکے ہی چلے آئے مگر واپسی میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر آپ کا گزر ہوا تو انہوں نے دریافت کیا کہ حق تعالیٰ نے آپ کی امت پر کیا فرض کیا۔ آپ نے فرمایا پچاس اس وقت کی نمازیں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ حق تعالیٰ سے اپنی امت کے لئے تخفیف کی درخواست کریں۔ کیونکہ آپ کی امت میں اتنی طاقت نہیں یہ مطلب نہیں کہ کسی سے بھی نہ ہو سکے گا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اکثر سے نہ ہو سکے گا اور یہ واقعہ بھی ہے کیونکہ بہت سے مسلمان پانچ وقت کی نمازیں بھی نہیں پڑھتے پچاس وقت کی تو بہت ہی کم لوگ پڑھتے اور اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہم لوگوں پر بڑا احسان تھا کہ انہوں نے ہمارے لئے تخفیف کا مشورہ دیا چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم موسیٰ علیہ

السلام کے فرمانے سے واپس ہوئے۔ اور تخفیف کی درخواست کی کہ آپ کا دربار حق سے اولاً خاموش چلا آنا یہ بھی کرم کا اثر تھا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ سے لوٹنا بھی کرم کا اثر تھا کیونکہ کرم کے آثار مختلف میں کریم کو حاکم کے احکام میں چون چرا کرنے سے خجلت ہوتی ہے اور کسی کے مشورہ کرنے کو رد کرنے سے بھی حیا آتی ہے ہمارے حاجی صاحب کو جو کوئی مشورہ دیتا تو ہر شخص کے مشورہ پر فرما دیتے اچھا جیسی مرضی چاہے وہ حضرت کی رائے کے موافق ہوتا یا خلاف کسی کی دل شکنی نہ فرماتے تھے ہر ایک کے جواب میں اچھا جیسی مرضی ہی فرماتے تھے اسی طرح حضور کو موسیٰ علیہ السلام کے مشورہ کے رد کرنے سے حیا آئی اور واپس تشریف لے جا کر تخفیف کی درخواست کی یہ اشکال نہ کیا جائے کہ خجلت عن الحق پر حیاء عن موسیٰ کیسے غالب آ گئی۔ خلجت عن الحق کیوں نہ غالب ہوئی جواب یہ ہے کہ آپ صاحب حال ہونے کے ساتھ عارف بھی ہیں آپ کو یہ بھی معلوم تھا کہ حق تعالیٰ مانگنے سے بہ نسبت نہ مانگنے کے زیادہ خوش ہوتے اس لئے اس وقت آپ نے واپسی کو ترجیح دی کیونکہ واپس نہ ہونے میں موسیٰ علیہ السلام کی دل شکنی کا احتمال تھا اور واپس ہونے میں حق تعالیٰ کی ناراضی کا اندیشہ نہ تھا صرف اپنی طبیعت اور مذاق کی مخالفت تھی تو حضور نے موسیٰ علیہ السلام کی دلجوئی کے لئے اپنے مذاق کی مخالفت گوارا فرمائی اس وقت حضور پر عجب پس و پیش کی حالت گزری ہوگی کہ ادھر حق تعالیٰ سے بھی خجلت تھی ادھر موسیٰ علیہ السلام سے بھی حیا تھی چنانچہ قدرے تخفیف ہوگئی تو موسیٰ علیہ السلام نے دوبارہ مراجعت کا مشورہ دیا یہاں تک کہ بار بار کی آمد و رفت میں پینتالیس نمازیں کم کرائیں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ آپ کی امت سے اتنا بھی نہ ہوگا اور تخفیف کرایئے حضور نے فرمایا اب مجھے حق تعالیٰ سے شرم آتی ہے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اس وقت آخیر میں آپ کو حیا مانع کیوں ہوئی پہلے کیوں نہ ہوئی۔

کاملین پر غلبہ حال

اس کا راز یہ ہے کہ بعض دفعہ کاملین پر بھی حالات کا غلبہ ہوتا ہے اس کے قبل میں بھی دوسروں کی طرح اس کا قائل تھا کہ کاملین پر احوال کا غلبہ نہیں ہوتا مگر الحمدللہ اب تحقیق بدل گئی اور معلوم ہوا کہ گاہے ان پر بھی غلبہ ہوتا ہے چنانچہ جنگ بدر میں جب حضورؐ نے مسلمانوں کے غلبہ کی دعا فرمائی تو اس میں یہ الفاظ بھی ہیں۔

اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ لم تعبد بعد الیوم (صحیح مسلم) اے اللہ اگر یہ مختصری جماعت ہلاک ہوگئی تو آج کے بعد کوئی آپکی عبادت نہ کریگا حضور کے درجہ پر نظر کرتے ہوئے یہ امر بعید سا معلوم ہوتا ہے کہ آپ اس طرح کھل کر گفتگو فرمائیں مگر اس کا راز یہ ہے کہ مقربین کاملین کا کمال یہی ہے کہ بادشاہ کے مزاج شناس ہوں حق تعالیٰ تو مزاج سے پاک ہیں مگر وہاں تجلیات اور

شیون بے انتہاء ہیں جن کے مقتضیات مختلف ہیں عارف ان شیون اور تجلیات کے مقتضی کی پوری رعایت کرتا ہے جس وقت جو شان ظاہر ہوتی ہے اسی کے موافق گفتگو کرتا ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر شان محبت اور تجلی محبوبیت کا غلبہ تھا۔ آپؐ جانتے تھے کہ اس وقت حق تعالیٰ بھی چاہتے ہیں کہ میں ان پر ناز کروں اس لئے کھل کر ناز کرنے لگے اسی طرح حضرت ایوب علیہ السلام جب بیمار ہوئے تو ایک زمانہ تک دعا نہ کی ان کی بیوی نے جن کا نام رحمت تھا دعا کے لئے عرض کیا کہ آپ کی بیماری کو بہت دن ہو گئے اب دعائے صحت فرمایئے فرمایا کہ اسی برس تو بیماری پر گزرنے دو جتنے دنوں ہم نے راحت سے زندگی بسر کی ہے ابھی کیا جلدی ہے اس وقت آپ پر اس حالت کا غلبہ تھا کہ حق تعالیٰ میرا صبر دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے پورا صبر کیا حتیٰ کہ دعا بھی نہ کی حالانکہ دعا صبر کے منافی نہ تھی مگر صورۃ اس میں بیماری سے ناگواری اور صبر کا اظہار ہے۔ اس لئے دعا بھی نہ کی۔

پھر جب منکشف ہوا کہ اب حق تعالیٰ شان عبدیت کا اظہار چاہتے ہیں تو فوراً دعا کرنے لگے۔ رَبَّہٗ اَنِّیۡ مَسَّنِیَ الشَّیۡطٰنُ بِنُصۡبٍ وَّعَذَابٍ (اے رب مجھ کو شیطان نے دکھ اور آزار پہنچایا ہے) اور اس مصیبت کو شیطان کی طرف منسوب کرنے لگے۔

آداب اسناد

بظاہر یہاں شبہ ہوتا ہے کہ آپ نے فاعل حقیقی کو چھوڑ کر فاعل مجازی کی طرف فعل کی نسبت کی حالانکہ صوفیہ کی بعض حکایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ظاہری اسناد الی الغیر بھی شرک ہے چنانچہ جب حضرت بایزید بسطامیؒ کا انتقال ہوا اور وہ حق تعالیٰ کے سامنے پیش ہوئے تو سوال کیا گیا کہ ہمارے واسطے کیا لائے انہوں نے بہت سوچ کر عرض کیا کہ توحید لایا ہوں ارشاد ہوا۔ اما تذکر لیلۃ اللبن وہ دودھ کی رات یاد نہیں رہی۔ قصہ یہ ہوا تھا کہ ایک رات آپ نے دودھ پیا تھا صبح کو پیٹ میں درد ہو گیا تو ان کی زبان سے یہ نکل گیا کہ رات دودھ پینے سے پیٹ میں درد ہو گیا اس پر مواخذہ ہوا کہ اسی برتے پر توحید کا دعویٰ کرتے ہو کہ درد کو دودھ کی طرف منسوب کرتے ہو مگر اس طریق کے آداب بہت ہیں واقعی ایک وقت میں غیر کی طرف نسبت کرنا بے ادبی ہے اور ایک وقت فاعل حقیقی کی طرف نسبت کرنا بے ادبی ہے چنانچہ آدم علیہ السلام فرماتے ہیں رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا (اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا) انہوں نے ظلم کی اسناد اپنے نفس کی طرف کی، سیر میں ہے کہ ان سے سوال ہوا کہ تم نے اس فعل کو اپنی طرف کیوں منسوب کیا۔ آدم علیہ السلام نے جواب میں عرض کیا۔

گفت من ہم پاس آنت داشتم ۔۔۔ لیک من پاس ادب نگذاشتم

(میں نے ادب کی وجہ سے اپنی غلطی کی نسبت آپ کی طرف نہیں کی۔ اسی ادب کی بھی اللہ

تعالیٰ نے رعایت کی)

یعنی میں نے ادب کی رعایت کی اس لئے سیئہ کو اپنی طرف منسوب کیا آپ کی طرف منسوب نہ کیا اس پر جواب عنایت ہوا کہ پھر میں نے تمہارے ادب کی رعایت کی۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام فرماتے ہیں:

وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ. (اور وہ مجھ کو کھلاتا پلاتا ہے اور جب میں بیمار ہوتا ہوں تو حق تعالیٰ مجھ کو شفا دیتے ہیں) اطعام واسقاء وشفاء کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا اور مرض کو اپنی طرف اس لئے هو الذی یمرضنی ویشفین (وہی مجھے بیمار کرتا ہے اور شفاء دیتا ہے) نہیں فرمایا بلکہ اِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ. کہا کہ جب میں بیمار ہوتا ہوں تو حق تعالیٰ مجھ کو شفا دے دیتے ہیں گویا بیمار تو میں خود اپنی کسی بے اعتدالی کی وجہ سے ہوتا ہوں پھر وہ شفا دے دیتے ہیں چونکہ بیماری طبعاً ناگوار ہے اس لئے ناگوارشی ءکو محبوب کی طرف منسوب نہیں کرتے اگرچہ حافظ یوں فرماتے ہیں کہ

درد ازیارست ودرماں نیزہم دل فدائے اوشد و جاں نیزہم

(درد بھی دوست کی طرف سے اور علاج بھی اسی کی طرف سے ہے میرا دل اور جان بھی اس پر فدا ہے)

یہ درد اور درماں دونوں کو محبوب کی طرف منسوب کررہے ہیں۔ مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام حافظ سے بڑھے ہوئے ہیں نیز ممکن ہے کہ حضرت حافظ کے وارد وقت کا بھی مقتضاء ہو اور اصل میں مرض کو اپنی ہی طرف منسوب کرنا زیادہ ادب ہو مگر ابراہیم علیہ السلام اس کے بعد یوں بھی فرماتے ہیں وَالَّذِیْ یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ یہاں امانت کو حق تعالیٰ کی طرف منسوب کرتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ موت ایسی ناگوار چیز نہیں جس کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب کرنا خلاف ادب ہو گویا موت بیماری سے بھی کم ہے کہ وہ تو ناگوار ہے اور یہ ناگوار نہیں بلکہ موت تو مرغوب شے ہے۔ حدیث میں آتا ہے الموت تحفة المؤمن (مشکوٰۃ) موت مومن کیلئے ایک تحفہ ہے اور ظاہر ہے کہ تحفہ مرغوب ہی شے ہوسکتی ہے نامرغوب کو تحفہ کوئی نہیں کہتا اور جب ہر مومن کے لئے موت تحفہ ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے تو بالخصوص تحفہ ہے کیونکہ وہ تو سید المؤمنین ہیں ان کو موت کیونکر ناگوار ہوسکتی ہے بلکہ میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ گنہگار مسلمانوں کے لئے بھی موت تحفہ ہے گو کچھ دنوں کیلئے اس کو عذاب بھی بھگتنا پڑے کیونکہ موت ہی کے ذریعے سے اس کو کسی وقت خدا کا قرب حاصل ہوگا رہا یہ اشکال کہ کیا مقرب کو عذاب بھی ہوتا ہے تو میں کہتا ہوں ہاں ہوتا ہے جیسے تم بادشاہوں کے پاس کپڑوں میں گوبر لگا کر جاؤ تو وہ تم کو حمام میں بھیج دیں گے جہاں گرم پانی سے خوب مل دھل کر تم کو غسل دیا جائے گا اسی طرح مسلمانوں کیلئے دوزخ جیل خانہ اور حوالات نہیں بلکہ مثل حمام کے ہے۔ دوسرے گنہگار مسلمانوں کو دوزخ کے عذاب کا بہت زیادہ

احساس بھی نہ ہوگا کیونکہ حدیث مسلم میں ہے۔ یمیتھم اماتۃ کہ حق تعالیٰ جہنم میں مسلمانوں کو ایک قسم کی موت دیدیں گے اور اگر عذاب بھی ہوتو قاعدہ یہ ہے کہ جس نعمت کے زوال کی ہر دم توقع ہو وہ اس نعمت سے افضل ہے جس کے زوال کا ہر وقت اندیشہ لگا ہوا ہو پس مسلمان کے لئے موت ہر حال میں اچھی ہے کیونکہ دنیا کی راحت میں زوال کا خطرہ لگا ہوا ہے اور آخرت کی تکلیف کے منقطع ہونے کی ہر دم توقع ہے پس موت ناگوار چیز نہیں اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے یُمِیْتُنِیْ ثُمَّ یُحْیِیْنِ (پھر مجھ کو موت دے گا پھر مجھ کو زندہ کرے گا) میں احیاء کی طرح امات کو بھی حق تعالیٰ کی طرف منسوب فرمایا اور ایوب علیہ السلام نے کلفت مرض کو شیطان کی طرف منسوب فرمایا۔

رَبَّہٗٓ اَنِّیْ مَسَّنِیَ الشَّیْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ اے رب مجھ کو شیطان نے دکھ اور آزار پہنچایا ہے۔ یہ تو نسبت الی الشیطان کا ایک نکتہ درمیان میں بتلا دیا۔

غایت محبوبیت

میں یہ کہہ رہا تھا کہ ایوب علیہ السلام نے جس وقت یہ دیکھا کہ اب حق تعالیٰ دعا کو پسند کرتے ہیں اس وقت دعا کی اور جب تک اظہار صبر پسند تھا اس وقت تک صبر کیا اور دعا نہ کی تو یہ حضرات تجلیات وشیون الٰہیہ کو دیکھتے رہتے ہیں اور ان کے مقتضیات کے موافق عمل کرتے ہیں بلا تشبیہ یوں کہیے کہ یہ حضرات مزاج شناس ہوتے ہیں اسی طرح واقعہ معراج میں جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا کہ حق تعالیٰ کو مراجعت پسند ہے اس وقت حیاء سے مغلوب نہیں ہوئے اور مراجعت فرماتے رہے اور جب دوسری تجلی منکشف ہوئی تو حیاء غالب ہوگئی کیونکہ اس تجلی کا مقتضاء بھی تھا۔ اب اس کے مناسب حالت غالب ہوگئی بہر حال اخیر میں آپ کا یہ فرمانا کہ اب مجھ کو حیاء آتی ہے غلبہ حال کا اثر تھا اور یہی جواب دیا ہے حضرت استاد علیہ الرحمۃ نے تعدد رکوعات کا صلوۃ کسوف میں کہ اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر تجلیات کا غلبہ تھا کبھی آپ پر ایک تجلی غالب ہوتی جس کا مقتضاء طول قیام تھا کبھی دوسری تجلی غالب ہوتی جس کا مقتضا رکوع تھا رکوع سے فارغ ہو کر پھر وہ تجلی غالب ہوگئی جو قیام کو مقتضی تھی اس لئے پھر قیام فرمایا اس کے بعد پھر تجلی مقتضی رکوع کا غلبہ ہوگیا اسی غلبہ تجلیات میں آپ نے متعدد بار قیام اور متعدد رکوع کئے اور جو فعل شارع سے تشریعاً صادر نہ ہو بلکہ غلبہ حال سے صادر ہو وہ مامور بہ نہ ہوگا لہٰذا صلوٰۃ کسوف میں تعدد رکوعات مشروع نہیں جب آپ نے موسیٰ علیہ السلام سے یہ فرما دیا کہ اب میں کچھ نہیں کہتا اس وقت آواز آئی:

امضیت فریضتی وخففت عن عبادی وھی خمس وھن خمسون میں نے اپنے فرض کو نافذ کر دیا اور اپنے بندوں سے تخفیف بھی کر دی پس فرض نمازیں پانچ ہیں اور یہ پانچ

(حقیقت میں پچاس ہی ہیں کیا رحمت ہے کہ جب حضور خود ہی رک گئے اس وقت فرمایا امضیت فریضتی اس سے پہلے نہ فرمایا ورنہ یہ بھی ممکن تھا کہ حق تعالیٰ پینتالیس کم ہونے کے بعد ہی خود فرما دیتے کہ بس اب اس سے زیادہ کمی نہیں ہوسکتی۔ آئندہ درخواست نہ کی جاوے مگر حق تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت پر ذرا بھی بوجھ نہیں ڈالتے جب خود آپ ہی معاملہ کو ختم کر چکے اس وقت فریضہ کو محکم کیا گیا سبحان اللہ کس درجہ محبوبیت ہے اور حق تعالیٰ کو آپ کی رضا کی کس قدر رعایت ہے۔

طوبیٰ لنا معشر الاسلام ان لنا　　من العنایۃ رکنا غیر منھدم

(اسلام کا معاشرہ ہمارے لئے بڑی خوشخبری ہے ہم پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت سے ایسا رکن عطا ہوا ہے)

ہماری بڑی خوش قسمتی ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو ایسا محبوب نبی عطا فرمایا جس کے راضی کرنے کا حق تعالیٰ کو اس قدر اہتمام و رعایت ہے پھر آپ اس وقت تک تھوڑا ہی راضی ہوں گے جب تک سب مسلمان جنت میں نہ پہنچ جائیں اس لئے ہم کو بہت کچھ امیدیں ہیں۔

نماند بعصیاں کسے در گرو　　کہ دارد چنیں سید پیش رو

(وہ شخص گناہوں کی وجہ سے جہنم میں نہ رہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جیسا پیش رو اور سردار رکھتا ہو)۔

چہ غم دیوار امت را کہ دارد چوں تو پشتیباں　　چہ باک از موج بحر آں را کہ باشد نوح کشتیاں

(امتیوں کو کیا غم ہے جبکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جیسا ان کا معاون و مددگار ہے سمندر کے طوفان سے اس کو کیا خوف جس کا کشتی بان حضرت نوح علیہ السلام ہو)

ازدیاد ثواب

پھر اس کے بعد دوسری رحمت ہے کہ اب پانچ کو پچاس کے برابر کرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے عام قانون ہوگیا۔ مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا (جو ایک نیکی لائے گا اس کو دس گنا ثواب عطا کیا جائے گا) ایک نیکی دس نیکیوں کی برابر ہے نماز کا حساب اس قانون پر موقوف نہیں تھا بلکہ میرا ذوق یہ ہے کہ یہ قانون خود واقعہ صلوٰۃ سے مقرر ہوا پھر تیسری رحمت یہ ہے کہ دس پر انحصار نہیں رکھا گیا بلکہ یہ تو کم از کم ہے اس سے زیادہ بھی ثواب ہوسکتا ہے چنانچہ ایک آیت میں ہے:

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ .... مِّائَةُ حَبَّةٍ

ترجمہ:۔ ان لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں گویا اس دانے کی مثل ہے جو سات بالیوں کو اگائے اور ہر بالی میں سو دانے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ سات سو تک تضاعف ہوتا ہے مگر اس پر بھی حد نہیں اس کے بعد فرماتے

ہیں۔ وَاللّٰہُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ کہ حق تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس سے (یعنی سات سو سے) بھی زیادہ دیتے ہیں مگر یہاں یہ مضمون مصرح نہیں محتمل ہے مگر ایک حدیث میں یہ مضمون مصرح ہے حضورؐ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ صدقہ کے چھوارہ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہیں جیسے وہ خود ہیں ویسا ہی ان کا ہاتھ ہے۔ ان کی ذات اوراک عقول سے بالا ہے تو ان کے ہاتھ کی حقیقت کو بھی ہم نہیں سمجھ سکتے۔

تو ندیدی گہے سلیماں را چہ شناسی زبان مرغاں را

(جب تو نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو دیکھا ہی نہیں تو پھر پرندوں کی بولیاں کیسے سمجھے گا)

اس لئے ہم کو ایسی باتوں میں گفتگو نہ کرنا چاہیے ہم کیا ہیں جو خدا کی صفات کو سمجھیں گے۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغبان بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد

(کس کی ہمت ہے کہ باغ کے مالی سے یہ پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور پھول نے کیا سنا اور صبا نے کیا کیا)

پس ہم اس کی حقیقت بیان نہیں کر سکتے ہاں ہمارا اتنا عقیدہ ضرور ہے لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ کہ حق تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں اس لئے خدا کا ہاتھ ہمارے اور تمہارے ہاتھ جیسا نہیں ہے دیکھئے یہاں حق تعالیٰ نے لیس ھو کمثل شی نہیں فرمایا کیونکہ حق تعالیٰ تو قدیم ہیں ان میں یہ احتمال ہی نہیں ہوسکتا کہ ان کا وجود کسی شئ کے وجود کی مماثلت پر قائم ہوا ہو اس لئے لیس ھو کمثل شی کہنے کی ضرورت نہ تھی ہاں دوسری اشیاء حق تعالیٰ کے وجود سے متاخر ہیں ان میں یہ احتمال ہوسکتا تھا کہ شاید ان میں سے کسی شئ کا وجود باصفت اور ذات حق تعالیٰ کے وجود یا ذات وصفات کی مثل بنائے گئے ہوں اس کی نفی فرمادی کو مماثلت طرفین سے ہوتی ہے اور جب ایک طرف سے مماثلت کی نفی ہوگی تو جانب آخر سے بھی نفی ہوگی اس لئے لیس کمثلہ شیء کا مفہوم لیس ھو کمثل شیء کے معنی کو بھی مستلزم ہے مگر پھر بھی جو صورت نفی تشبیہ کی قرآن میں ہے وہ اکمل ہے جس کا نکتہ میں نے بتلا دیا بہرحال حق تعالیٰ کے مثل کوئی چیز نہیں نہ وہ کسی کے مثل ہیں لہٰذا اتنا اعتقاد تو ضروری ہے کہ خدا کا ہاتھ کسی مخلوق کے ہاتھ جیسا نہیں اور بعض صفات میں جو بظاہر مماثلت کا شبہ ہوتا ہے جیسے رحمت وعلم وغیرہ تو یہ اشتراک محض لفظی ہے حق تعالیٰ کی رحمت وعلم کی وہ حقیقت نہیں جو آپ کی رحمت وعلم کی حقیقت ہے چنانچہ ایک فرق پر تو علماء نے بھی متنبہ کیا ہے کہ حق تعالیٰ پر ان صفات کا اطلاق باعتبار غایات کے ہے باعتبار مبادی کے نہیں پھر حق تعالیٰ اس چھوارہ کو پرورش فرماتے ہیں حتیٰ کہ وہ احد پہاڑ سے بھی بڑا ہو جاتا ہے اس حدیث سے میں یہ سمجھا ہوں کہ سات سو تک بھی حد نہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ تضاعف ہوتا ہے کیونکہ پہاڑ سے تمر کو وہ نسبت ہے کہ اس میں تو لاکھوں کروڑوں تمرات ہوں گے اسی کو فرماتے ہیں۔

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد آنچہ درو ہمت نیاید آن دہد
(فانی اور حقیر جان لیتے ہیں اور اس کے بدلہ میں باقی رہنے والی جان عطا کرتے ہیں جو وہم و گمان میں نہیں آتا وہ عطا کرتے ہیں)۔

خود کہ یا بدایں چنیں بازار را کہ بیک گل می خری گلزار را
(تم ایسا بازار کہاں پاؤ گے کہ ایک پھول کے بدلہ

اور یہی خیال میرا لیلۃ القدر کے متعلق ہے کہ وہاں جو الف شھر فرمایا ہے وہ الف تحدید کے لئے نہیں بلکہ تکثیر کثیر کے لئے ہے گو وہ فی الواقع خدا کے نزدیک ضرور محدود ہوگا کیونکہ كُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِمِقْدَارٍ (ہر چیز کا اللہ کے ہاں ایک اندازہ ہے) منصوص ہے اور جب خدا کے نزدیک محدود ہے تو واقع میں بھی محدود ہی ہے کیونکہ خدا تعالیٰ کا علم واقع کے مطابق ہے (بلکہ یوں کہئے کہ واقع خدا تعالیٰ کے علم کے مطابق ہے ۱۲) پس واقع میں تو ثواب لیلۃ القدر محدود ہے مگر یہاں تحدید مذکور نہیں اور اگر غیر محدود وغیرہ متناہی بمعنی لا تقف عند حد (کسی حد معین پر نہیں ٹھہرتے) کہو تو یہ فی نفسہ ممکن ہے مگر لیلۃ القدر کے ثواب کا بایں معنی غیر متناہی ہونا محتاج دلیل ہے اور اس پر دلیل قائم ہونے کی ضرورت ہے جب دلیل نہیں تو اس کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا پس ظاہر بھی ہے کہ وہ واقع میں محدود بمعنی موقوف عند حد ہے مگر وہ حد الف نہیں اب یہ سوال رہا کہ جب الف کی تحدید نہیں تو الف شھر کیوں فرمایا اس کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ لغت عرب میں عدد کے لئے الف سے زیادہ کوئی لغت موضوع نہیں جیسے ہمارے یہاں مہاسنکھ دو مہاسنکھ سو مہاسنکھ کہے گا کوئی اور لغت نہیں بیان کر سکتا اسی طرح اہل عرب الف کے آگے جس عدد کو بیان کریں گے لفظ الف ہی کے ذریعہ سے بیان کریں گے جیسے الف الف مائه الف (سو ہزار) وغیرہ جب یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ الفاظ عدد کا منتہی عرب میں الف ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جو عدد تمہارے نزدیک اعداد کی غایت اور منتہی ہے لیلۃ القدر اس سے بھی بڑھ کر ہے پھر لفظ خیر اسم تفضیل ہے معنی یہ ہوئے کہ بہت بڑھ کر سو اب تو اگر الف تحدید کے لئے بھی ہوتا تب بھی خیر عدم تحدید پر دال ہے خیر یہ تضاعف الی غیر المعدود تو قانونی طور پر نہیں بلکہ بطریق فضل ہے مگر دس گونہ ملنا تو قانون ہے جو کہ واقعہ صلوٰۃ میں مشروع ہوا۔

قربانی کا ثواب

تو میں کہتا ہوں کہ جیسے یہاں خدا تعالیٰ نے پچاس نمازوں کا بدل پانچ کو قرار دیا ہے اور وہ پچاس ہی کے برابر ہیں اسی طرح یہاں قربانی میں حق تعالیٰ نے ہماری جان کے بدلے جانور کی جان مانگی ہے اور اس کو ہماری جان کا بدل قرار دیا ہے تو اس میں بھی وہی ثواب ہوگا جو اپنی جان نذر کرنے میں ہوتا ہے پس اپنی جان دینے کی ضرورت نہیں بلکہ اگر خوشی سے بھی دینا چاہے تو ممانعت

ہے: لَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا (تم ایک دوسرے کو بھی قتل نہ کرو بے شک اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے) اگر کہو کہ مقاتلہ میں تو جان دینے کا حکم ہے تو میں کہتا ہوں بالکل غلط بلکہ وہاں تو دوسروں کی جان لینے کا حکم ہے البتہ اس میں اس قدر ثبات کا امر ہے کہ اگر وہ تمہاری بھی جان لے لے تب بھی نہ بھاگو غرض مقاتلہ میں قتل کرنے کا حکم ہے قتل ہونے کا حکم نہیں نہ یہ مقصود ہے اسی لئے جہاں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کے مقتول ہونے کا ذکر فرمایا ہے وہاں پہلے یقتلون فرمایا ہے بعد میں ویقتلون فرمایا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اصل مقصود تو قاتل بننا ہے تبعاً کبھی مقتول ہونے کی بھی نوبت آ جاتی ہے۔ پس جان دینا کہیں بھی مقصود نہیں اور اگر کوئی خوشی سے بھی دینا چاہے تو منع کیا جائے گا اس میں راز یہ ہے کہ یہ جان ہماری ملک نہیں بلکہ خدا کی جان ہے اس میں ہم کو از خود تصرف کرنے کا کچھ حق نہیں اور اس بناء پر چاہیے تھا کہ نفس کی اضافت ہماری طرف نہ ہوتی مگر حق تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف اس لئے منسوب نہیں کیا کہ اس صورت میں تم مچل جاتے اور کہتے واہ جان تو ہماری ہے اس واسطے فرمایا کہ ہاں بھائی ہاں جان تمہاری ہے مگر اپنی جان کو قتل نہ کرو اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا اللہ تعالیٰ کو تم پر رحم آتا ہے تم اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو حق تعالیٰ نے انسان کے ساتھ اکثر اس کے فہم کے موافق کلام فرمایا ہے یہاں بھی اسی کے موافق اَنْفُسَكُمْ فرمادیا ہے یہی کلام خود اس قابل ہے کہ اس پر جان دے دی جائے گو اس میں جان دینے کی ممانعت ہے مگر جان نکلنا اور ہے اور جان دینا اور ہے میرا مطلب یہ ہے کہ یہ کلام ایسا ہے کہ اس کو سن کر عشاق کی جان نکل جائے تو بجا ہے چنانچہ بعض آیات کو سن کر بعض عشاق کی جان نکل گئی اور اگر کسی نے خود جان دی ہے تو وہ پاگل یا مغلوب الحواس تھے ان کا فعل حجت نہیں گو وہ خود معذور ہوں ان کو اولیاء مستہلکین کہتے ہیں ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو کسی وجہ سے اپنے درجہ سے گر گئے اس لئے غم میں جان دے دی اور بعض وہ ہیں جو ترقی سے رہ گئے۔ ایک ہی مقام پر ایک ہی مقام پر اٹک گئے اور شطحیات ان سے صادر ہونے لگیں جن کی وجہ سے لوگوں نے قتل کر دیا۔ منصور بھی اولیاء مستہلکین میں سے تھے۔ حضرت غوث اعظم قدس اللہ سرہ کا ارشاد ہے کہ منصور کی کسی نے مدد نہ کی اگر میں اس زمانہ میں ہوتا تو میں ان کو اس ورطہ سے نکال دیتا ہمارے حاجی صاحب نے بھی اپنے بعض معاصرین کی نسبت فرمایا ہے کہ وہ ایک مقام پر اٹک گئے اگر میرے پاس آ جائیں تو میں ان کو اس سے نکال دوں۔ واللہ حاجی صاحب بھی اپنے زمانہ میں عجیب چیز تھے آخر کوئی تو بات تھی جو تمام عالم ان کے کمال کو تسلیم کئے ہوئے ہے۔ بہر حال جان دینا تو ممنوع ہے البتہ حق تعالیٰ نے تمہاری جان کے بدلہ میں تم سے جانور کی جان مانگی ہے اور جب یہ اس کا بدلہ ہے تو ان شاء اللہ اس میں بھی وہی ثواب ہوگا جو اپنی جان پیش کرنے میں ہوتا۔

اسرار کی تلاش

مگر یہ سب اسرار و حکم ہیں جو حجت نہیں ہیں مگر میں اپنا جی خوش کرنے کے لئے بیان کر رہا ہوں یہ اسرار نہ خود صاحب وارد کیلئے باعث قناعت ہوتے ہیں نہ اس کے متعلقین کے لئے مگر ان کے متعلق میرا مسلک یہ ہے کہ خود تو اسرار کی تلاش میں کاوش نہ کرے اور جو بیساختہ کوئی بات قلب میں آ جائے اور قواعد شرع کے خلاف نہ ہو تو اس کو بیان کر دے جس سے یہ نفع ہوتا ہے کہ حدیث میں ہے **انا عند ظن عبدی بی** پس اگر کوئی شخص ان اسرار پر جزم نہ کرے بلکہ امید کے درجہ میں مثلاً اس کا معتقد ہو کہ ہم کو قربانی حیوان میں اپنی جان کی قربانی کا ثواب ملے گا تو اس گمان نیک کی بناء پر عجب نہیں کہ حق تعالیٰ اس سے بھی معاملہ فرمائیں باقی از خود کاوش کر کے اسرار بیان کرنا مجھے پسند نہیں۔ حافظ فرماتے ہیں۔

حدیث مطرب ومیگو وراز دہر کمتر جو　　　　که کس نکشود ونکشاید بحکمت ایں معمارا

ترجمہ:۔ مطرب اور مئے کی باتیں کرو، زمانہ کے بھید اور اسرار کی ٹوہ میں لگے رہو کیونکہ یہ عقدہ نہ کسی نے حل کیا ہے اور نہ حل کر سکے گا۔

اس میں جتن کی ممانعت ہے مگر بنظر آمدن کی اجازت بھی ہے اور اصل میں تو عارف شیرازی راز دہر کی کاوش سے منع فرماتے ہیں یعنی امور تکوینیہ کی تلاش سے مگر اسرار و حکم بھی اسی حکم میں ہیں۔ تلاش اور کاوش دونوں میں نہ چاہیے مگر گاہے گاہے ضرورت اور مصلحت کی وجہ سے قدرے ذکر کی اجازت بھی ہے مثلاً کسی مصلحت سے مجذوبین سے کشف کی بات پوچھ لی جائے اور مصلحت کی حد یہ ہے کہ امور تکوینیہ میں ایک جانب تسلی حاصل کرنا چاہے اس پر جزم واعتقاد نہ کرے تو اس کا مضائقہ نہیں حافظ نے ایک مقام پر اس اجازت کو بھی ایک توجیہ پر بیان فرمایا ہے کہتے ہیں۔

راز درونِ پردہ زرندان مست پرس　　　　کیں حالِ نیست صوفی عالی مقام را

ترجمہ:۔ سمجھ میں نہ آنے والی بات کی ٹوہ اور جستجو مت کرو کیونکہ اس کے جاننے والے اس کام کے مامور نہیں۔

لیکن جو اولیاء مسند رسول پر ہیں ان سے کشفیات اور تکوینیات کا سوال نہ کرے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت ایسے امور کے بیان کی نہ تھی اور گو حضور سے پیشین گوئیاں امور تکوینیہ کی بھی بہت ثابت ہیں مگر وہ آپ نے بضرورت از خود بیان فرمائی ہیں کسی کے پوچھنے پر نہیں فرمائیں بلکہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی باتوں کا پوچھنا آپ کو ناگوار ہوتا تھا اسی لئے صحابہؓ بجز مسائل و احکام کے آپ سے کچھ نہ پوچھتے تھے اسی طرح اولیاء وارثان رسول سے امور تکوینیہ کے متعلق سوال نہ کرنا چاہیے۔ ہاں وہ از خود بیان کر دیں تو سن لو(۱۲)

علی ہذا اسرار و حکم بھی ان سے خود نہ پوچھنے چاہئیں ہاں اگر بے ساختہ ان کے قلوب پر اسرار کا ورود ہوگا تو وہ خود ہی بتلا دیں گے۔

طریقہ ابراہیمی

اب میں آیت کی تفسیر شروع کرتا ہوں حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰی مِنْكُمْ

خدا کے پاس تمہاری قربانیوں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ اس کے پاس تمہاری طرف سے تقویٰ پہنچتا ہے یہ تو ترجمہ ہوا اس میں یہ بات قابل غور ہے کہ اس جگہ تقویٰ کے کیا معنی ہیں عام معنی تو تقویٰ کے یہ ہیں کہ سب اعمال شریعت کے مطابق ہوں اور اعمال میں تقرب الی اللہ کی نیت ہو یہ تو یہاں مراد ہیں ہی کیونکہ معنی عام کا تحقق ہر فرد میں ہوا کرتا ہے مگر اس مقام پر تخصیص ذکری سے ذوقاً یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہاں تقویٰ سے مراد بہت ہی بڑا کامل تقویٰ ہے جس کو اس مقام سے خصوصیت ہے اور خصوصیت کی ضرورت اس لئے ہے کہ تقویٰ کا مفہوم عام تو تمام اعمال میں مشترک ہے پھر یہ ظاہر ہے کہ ہر عمل کو دوسرے عمل سے خاص امتیاز حاصل ہے اس کا مقتضی یہ ہے کہ ہر عمل کے ساتھ جو تقویٰ متصل ہے اس کو بھی دوسرے عمل کے تقویٰ سے امتیاز حاصل ہو (جیسے حیوانیت انسان اور جملہ حیوانات میں مشترک ہے مگر امتیاز نوعی کی وجہ سے ہر حیوان کی حیوانیت برابر نہیں بلکہ بعض کی حیوانیت کامل اور بعض کی ناقص ہے کسی میں مادہ حیات وحس و حرکت زیادہ ہے کسی میں کم ہے الغرض ہر نوع میں جو جنس ہے اس کو دوسری نوع کی جنس سے بھی خاص امتیاز ہوا کرتا ہے خواہ ماہیت کے اعتبار سے ہو خواہ آثار کے اعتبار سے کیونکہ ماہیات میں تشکیل کا ہونا نہ ہونا مختلف فیہ مسئلہ ہے ١٢)

پس جیسے قربانی کو دوسرے اعمال سے خاص امتیاز ہے اسی طرح اس میں جو تقویٰ ہے وہ بھی خاص قسم کا تقویٰ ہونا چاہیے۔ اب دیکھئے کہ وہ خاص قسم کا تقویٰ کیا ہے سو دوسری آیت میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ......وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ.

(اے ایمان والو اللہ تعالیٰ سے ڈرا کرو جیسا اس سے ڈرنا چاہیے اور بجز اسلام کے اور کسی حالت میں جان نہ دینا۔) میرے ذوق میں لَاتَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ. (اور تم اپنی جان نہ دینا مگر مسلمان ہونے کی حالت میں) حق تقاته جیسا ڈرنے کا حق ہے کی تفسیر ہے۔

مطلب یہ ہوا کہ کامل تقویٰ یہ ہے کہ اسلام پر موت ہو جائے اسلام کے معنی کیا ہیں اسلام کے

معنی یہ ہیں کہ اپنے کو خدا تعالیٰ کے سپرد کردے یہ معنی دوسری آیت سے حل ہوتے ہیں:

وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ ......اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا

(اور اس شخص سے اچھا کس کا دین ہے جو اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کردے اخلاص نیت کے ساتھ اور ابراہیم علیہ السلام کے طریقہ کا اتباع کرے جو خالص خدا کے ہو رہے تھے) جب اسلام کے معنی یہ ہیں تو تقویٰ کامل یہ ہوا کہ اپنی جان خدا تعالیٰ کے سپرد کردے کہ وہ جس طرح چاہیں اس میں تصرف کریں جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے کیا تھا کہ خدا تعالیٰ کے حکم سے ذبح ولد پر آمادہ ہو گئے تھے اور جو شخص ذبح ولد پر آمادہ ہو جائے وہ اپنی جان دینے پر تو ضرور آمادہ ہوگا کیونکہ بیٹے کا ذبح کرنا اپنے ذبح سے اشد ہے پس کامل تقویٰ یہ ہے کہ خدا کے واسطے جان دیدے یعنی جان کو اس کے سپرد کردے جس کی ایک صورت یہ ہے کہ ایسا کام کرے جس میں جان خرچ ہو جائے تیسری آیت میں اس کی اور زیادہ تصریح ہے فرماتے ہیں۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ ....رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ

(اور بعض آدمی ایسا بھی ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں اپنی جان تک دے ڈالتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بے حد مہربان ہیں) اور یہ آیت اتفاق سے آیات حج ہی سے مرتبط ہے اور قربانی کو بھی حج سے تعلق ہے اس لئے یہ دلیل بہت ہی واضح ہے اور وہ ارتباط یہ ہے کہ اس مقام پر حق تعالیٰ نے حجاج کی دعاؤں کا ذکر فرمایا ہے کہ حج میں دعا کرنے والوں کی چند قسمیں ہیں اور گو ان اقسام کا ذکر حج کے ساتھ ہو رہا ہے مگر یہ تقسیم حجاج ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام تقسیم ہے جس کا تحقق موقع حج میں بھی ہو جاتا ہے پہلی قسم تو یہ ہے:

فَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا وَ مَالَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ بعض لوگ تو وہ ہیں جو یوں کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم کو (جو کچھ دینا ہو) دنیا ہی میں دے دے اور ان کے آخرت میں کچھ حصہ نہیں یہ فرقہ تو منکر آخرت ہے کیونکہ جو شخص آخرت کا قائل ہوگا وہ یہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ مجھ کو سب کچھ دنیا ہی میں دے دے آخرت میں دینے کی ضرورت نہیں اور دوسری قسم وہ ہے جو یوں کہتے ہیں:

رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ کہ اے رب ہم کو دنیا میں بھی حسنہ دے اور آخرت میں بھی حسنہ دے اور ہم کو عذاب نار سے بچا۔ افسوس ہے کہ بعض محرفین نے اس آیت میں حسنہ اول کو انگریزی سے مفسر کیا ہے اور دلیل یہ بیان کیا ہے کہ حسنہ کہتے ہیں اچھی حالت کو یعنی خوشحالی کو اور خوشحالی آج کل صرف انگریزی پڑھنے سے حاصل ہوتی ہے اس لئے وہی حسنہ کا مصداق ہے میں کہتا ہوں کہ لفظ حسنہ اس آیت میں دو جگہ آیا ہے وَّ فِی الْاٰخِرَةِ کے ساتھ بھی حسنہ ہے تو کیا آخرت میں بھی حسنہ سے انگریزی ہی مراد لو گے سو جنت میں تو انگریزی ہو

نہیں سکتی کیونکہ حدیث میں تصریح ہے کہ جنت والوں کی زبان عربی ہوگی ہاں جہنم میں انگریزی ہوتو ممکن ہے جیسے ایک خانساماں کو کسی انگریز نے دھمکایا تھا کہ دور ہو چلے جاؤ اس نے کہا حضور کہاں جاؤں بولا جہنم میں جاوہ چلا گیا اور تھوڑی دیر میں واپس آ کر کہنے لگا کہ حضور جہنم کے دروازہ پر تو صاحب لوگوں کا پہرہ ہے ہندوستانی کو جانے نہیں دیتے بلکہ یورپین ہونے کا سٹرفکیٹ مانگتے ہیں تو شاید یہی مطلب ان لوگوں کا ہوگا کہ ہمیں بھی آخرت میں انگریزی دانوں کا ساتھ نصیب ہو۔

صاحبو! یہ محض تحریف ہے بلکہ یہاں حسنہ سے مراد اعمال حسنہ ہیں اور دونوں جگہ بھی معنی مراد ہیں مگر ایک جگہ باعتبار صورت کے اور ایک جگہ باعتبار حقیقت ہے کیونکہ نعمائے جنت کی حقیقت بھی اعمال حسنہ ہیں اور اتنے فرق کا مضائقہ نہیں بلکہ کچھ فرق تو ضروری ہے کیونکہ نکرہ کے اعادہ میں مغائرت فی الجملہ لازم ہے چنانچہ حسنہ سے اعمال حسنہ مراد لینے میں اور ایک جگہ صورت اعمال اور دوسری جگہ حقیقت اعمال سے تفسیر کرنے میں اتحاد کے ساتھ مغائرت فی الجملہ بھی موجود ہے دوسرے یہاں حسنہ سے دنیوی خوشحالی مراد لینا اس لئے بھی غلط ہے کہ آیت میں دنیا کو حسنہ کا ظرف بنایا گیا ہے اور ظرف ومظروف میں تغائر لازم ہے تو فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً (دنیا میں بھلائی) کا لفظ چاہتا ہے کہ یہ حسنہ دنیا سے مغائر ہے ورنہ کلام کی تقدیر یہ ہوگی رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا (اے ہمارے رب ہمیں دنیا میں عطا کر) دنیا اور اس کا غلط ہونا ظاہر ہے اور دنیوی خوشحالی بھی دنیا ہی ہے وہ دنیا سے مغائر نہیں اس لئے یہ تفسیر صحیح نہیں ہوسکتی پس انگریزی کو حسنہ کا مصداق بنانا بالکل غلط ہے یہاں تک دو قسمیں مذکور ہوئیں پہلی قسم کا مصداق تو کافر ہے اور دوسری قسم کا مصداق عام مؤمنین ہیں اور چونکہ سیاق کلام بتارہا ہے کہ تقسیم موقع حج ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ عام ہے اور عام آدمیوں میں بعض منافق بھی ہوں گے اس لئے تیسری قسم منافقین کی بھی ذکر کردی گئی۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ ...... وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ

ترجمہ:۔ اور بعض آدمی ایسا بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی گفتگو جو محض دنیوی غرض سے ہوتی ہے مزیدار معلوم ہوتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر بتاتا ہے اپنے دل کی بات پر۔ حالانکہ وہ مخالفت میں شدید ہے اور جب پیٹھ پھیرتا ہے تو اس فکر میں پھرتا رہتا ہے کہ شہر میں فساد کرے اور کھیتیاں اور جانیں تباہ کرے اور اللہ تعالیٰ فساد کو ناپسند کرتا ہے اور جب اس سے کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو تو نخوت اس کو اس گناہ پر آمادہ کردیتی ہے سو ایسے شخص کی کافی سزا جہنم ہے اور وہ بری آرام گاہ ہے۔

آگے چوتھی قسم بیان فرماتے ہیں جس کا مصداق مومن کامل ہے اور اس کو اس لئے الگ بیان فرمایا تاکہ پہلی صورت کو یعنی مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (جو کہتا

ہے اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھلائی عطا فرما) کو کوئی مومن کامل کے ساتھ مخصوص نہ کرے پس حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ مومن کامل کو مستقل بیان فرما دیا چنانچہ ارشاد ہے وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ م بِالْعِبَاد

اور بعض آدمی وہ ہیں جو اپنی ذات کو اللہ کی رضا طلب کرنے کے لئے بیچ دیتا ہے اس میں دو قول ہیں کہ شراء سے یہاں کیا مراد ہے بعض نے یشری کو بمعنی یشتری کہا ہے یعنی من الناس من یشتری نفسه من المهالک والمخاوف اور یہ ایسا ہوگا جیسے بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ میں اشتراء نفس مذکور ہے اس تفسیر پر ترجمہ یہ ہوگا کہ بعض آدمی وہ ہیں جو (اعمال صالحہ کر کے) اپنے آپ کو خطرات اور خوفناک امور سے خرید لیتا ہے یعنی بچا لیتا ہے مگر اس تفسیر میں اتنا بعد ہے کہ اشتراء تو اس چیز کا ہوتا ہے جو اپنے پاس نہ ہو اور جان تو اپنے پاس ہے گو اس جگہ کلام میں مجاز ہے مگر مجاز میں بھی قرب ہو تو بہتر ہے اور گو بیع کے معنی مراد لینے میں بھی مجاز ہے مگر وہ بعید نہیں کیونکہ بیع کے معنی مراد لینے میں مجاز صرف یہ ہوگا کہ بیع میں طرفین سے مالیت ہوتی ہے اور یہاں نفس مال نہیں سو یہ مجاز تو دونوں صورتوں میں مشترک ہے باقی یہ بات بیع حقیقی کی باقی رہے گی کہ بیع ایسی چیز ہوتی ہے جو بائع کے پاس تھی اور وہ بعد بیع کے ثمن کا مستحق ہو جاتا ہے یہ بات یہاں متحقق ہے کیونکہ جان اپنے پاس تھی اب اس کو خدا تعالیٰ کے ہاتھ بیع کر دیا ہے تو وہ جنت کا مستحق ہو جاتا ہے اور اس کی جان حق تعالیٰ کی ملک ہو جاتی ہے کہ وہ اس میں جس طرح چاہیں تصرف کریں۔

رہا یہ کہ یہاں تو بیع کے بعد بھی ہماری جان ہمارے پاس ہی رہتی ہے سو یہ وجہ بعد نہیں کیونکہ تمام بیع کے لئے یہ ضروری نہیں کہ بیع بائع کے قبضہ سے نکال دی جائے بلکہ بیع بلا تسلیم بھی ہو جاتی ہے دوسرے یہاں تو تسلیم بھی متحقق ہے کیونکہ تسلیم کے لئے دوسرے کے قبضہ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کو قادر کر دینا کافی ہے جس کو فقہا تخلیہ سے تعبیر کرتے ہیں پس مومن کامل اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتا ہے اور وہ اس پر ہر طرح قادر ہیں اب یہ ان کی عنایت ہے کہ وہ بیع کو ہمارے ہی پاس امانت چھوڑ دیں۔ غرض يَّشْرِىْ نَفْسَهُ میں بیع کے معنی بعید نہیں ہیں البتہ مالیت کے اعتبار سے مجاز ضرور ماننا پڑے گا۔

ہاں ایک اشکال یہ ہوگا کہ جیسے اشتراء میں مشتریٰ وہ شے ہوتی ہے جو پہلے سے اپنے پاس نہ ہو ایسے ہی مبیع وہ شے ہوتی ہے جو پہلے سے مشتری کی ملک نہ ہو اور ہماری جان تو پہلے ہی سے حق تعالیٰ کی ملک ہے جواب یہ ہے کہ یہ صحیح ہے مگر چونکہ ہم اس کو اپنی ملک سمجھتے ہیں اس لئے ہمارے زعم کے موافق بیع کا اطلاق صحیح ہے اور جو لوگ اپنی جان کو خدا کی ملک سمجھتے ہیں ان کو یہ علم کہ مخاطبین جان کو اپنی ملک سمجھتے ہیں بعد سماع لفظ بیع کے حاصل ہوا ہے پہلے حاصل نہیں ہوا۔ ابن عطاء کا قول ہے کہ

اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور ان کے مالوں کو اس بات کے عوض میں خرید لیا ہے کہ ان کو جنت ملے گی) کو سن کر عوام تو خوش ہو گئے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کے بدلہ میں ہماری جانیں خرید لی ہیں ہم کو اسکے عوض جنت ملے گی مگر خواص شرم کے مارے زمین میں گڑ گئے کہ ہمارے اندر دعویٰ ملکیت تھا جبھی تو اشتری فرمایا اس سے میرے جواب کی تائید ہوگئی کہ یہاں ہمارے مذاق کی رعایت کی گئی ہے پس راجح بھی ہے کہ یَشْرِیْ نَفْسَهٗ میں بیع مراد ہے میں نے اپنی تفسیر میں اس آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ بعض وہ لوگ جو طلب رضا الٰہی کے لئے اپنی جان (تک) بیچ دیتے ہیں یہ تک میں نے اس لئے بڑھایا ہے کہ شان نزول اس آیت کا حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ وہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ کو آ رہے تھے راستہ میں کفار نے گھیر لیا تو انہوں نے کہا تم جانتے ہو کہ میں کیسا تیر انداز ہوں (تیر اندازی کے فن میں یہ بہت مشہور تھے) اگر مقابلہ کرو گے تو میں تیروں سے سب کو مار ڈالوں گا باقی اگر تم کو مال کی ضرورت ہو تو مکہ میں میرا مال بہت ہے لاؤ میں تم کو رقعہ لکھ دوں تم جا کر میرے وکیل سے مال لے لو۔ کفار نے اسی کو غنیمت سمجھا کیونکہ مقابلہ میں ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا چنانچہ انہوں نے رقعہ لکھ دیا اور وہ سب واپس چلے گئے۔ سو یہاں تو حضرت صہیب نے جان بچائی تھی اور جان بچانے کو مال دیا تھا جان دی نہیں تھی۔ سو شان نزول کو دیکھ کر معنی بیع پر اشکال ہوتا ہے کہ واقعہ نزول میں جان کی بیع کہاں ہوئی تھی بلکہ وہاں تو جان کو بچایا گیا تھا) اسی وجہ سے بعض مفسرین نے یَّشْرِیْ نَفْسَهٗ کی تفسیر یشتری نفسه من المهالک والمخاوف کی ہے) مگر میں نے لفظ تک بڑھا کر اشکال کو رفع کر دیا ہے۔ کہ گو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے اس واقعہ میں بظاہر مال ہی دیا تھا مگر حقیقت میں وہ اپنی جان تک کو اللہ کی رضا کے لئے بیع کر چکے تھے۔ جس کی دلیل یہ ہے کہ وہ تن تنہا ہجرت کے لئے چل کھڑے ہوئے اور یہ وہی کر سکتا ہے جو اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے حوالہ کر چکا ہو کیونکہ کفار کے نرغہ میں سے تن تنہا ہجرت کر کے نکلنا جان کو ہتھیلی پر رکھ کر چلنا ہے پھر یہ تو ایک اتفاقی بات تھی کہ کفار مال لینے پر راضی ہو گئے۔ اگر وہ مقابلہ پر آمادہ ہوتے تو حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کے لئے جان دینے پر بھی تیار تھے اور اس کے لئے تیار ہو کر ہی نکلے تھے۔ شاید کوئی یہ کہے کہ حضرت صہیب مقابلہ کرتے تو واقعی کمال تھا یا مال کو صدقہ کرتے تو یہ بھی ایک کمال تھا باقی جان بچانے کو مال دے دینا کیا بڑا کمال ہے یہ تو ہر شخص کیا کرتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ دوسرے تو جان بچاتے ہیں اپنی جان کی محبت سے اور حضرت صہیبؓ نے اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے جان بچائی تھی جیسا کہ اِبْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ (اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں) سے معلوم ہو رہا ہے۔

خالی نیت

اور یہ بات محض اتنی نیت کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی کہ میں اللہ کے واسطے جان بچاتا ہوں بلکہ غلبہ حال سے حاصل ہوتی ہے کہ یہ امر اس کا حال بن جائے کہ جان میری نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کی ہے جس کی حفاظت و خدمت میرے ذمہ ہے بدون اس حال کے خالی نیت کی وہی مثال ہوگی جیسے ایک مولوی لٹھ مارنے ساڈھورہ کے ایک پیرزادے کو جبراً نماز کے لئے کھڑا کیا تھا جب اس کو نیت کا طریقہ بتلایا تو وہ کہتا ہے نیت کرتا ہوں چار رکعت نماز فرض کی اللہ واسطے ظلم اس مولوی صاحب کا اللہ وہ بیچارہ سچا آدمی تھا کہ اس نے اللہ کے واسطے کہہ کر یہ بھی کہہ دیا کہ ظلم اس مولوی صاحب کا اور ہم لوگ اپنے دل کے روگ کو ظاہر نہیں کرتے ہم کام کرتے ہیں نفس کے ظلم سے اور کہتے یہ ہیں کہ اللہ کے واسطے کرتے ہیں صاحب جس پر یہ حال غالب ہوتا ہے وہ چھپتا نہیں ہے ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ احکام الٰہیہ میں ذرا سستی نہیں کرتے خدا کے احکام میں سب سے زیادہ چست ہوتے ہیں اور جب حق تعالیٰ حفاظت نفس کا حکم دیتے ہیں اس وقت وہ سب سے زیادہ اپنی حفاظت کرتے ہیں اور ان کو اپنی جان سے اس لئے محبت نہیں ہوتی کہ وہ اپنی جان ہے بلکہ اس لئے محبت ہے کہ یہ خدا کی چیز ہے جس کے ذریعہ سے ہمیں طاعات کی توفیق ہوتی ہے اسی کو ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

نازم بچشم خود کہ جمال تو دیدہ است ۔۔۔ افتم بپائے خود کہ بکویت رسیدہ است

ہر دم ہزار بوسہ زنم دست خویش را ۔۔۔ کو دامنت گرفتہ بسویم کشیدہ است،

(تیرا ناز و انداز میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور گرتا پڑتا تیرے کوچہ میں پہنچا ہے۔ میں اپنے ہاتھوں کو ہر وقت بوسہ دیتا ہوں کیونکہ انہوں نے تیرا دامن پکڑ کر میری طرف کھینچا ہے)

پس حضرت صہیب کا فعل ظاہر میں تو معمولی معلوم ہوتا ہے مگر اس نیت و حال کی وجہ سے وہ حق تعالیٰ کے یہاں بہت بڑا ہے۔ اس کی یہ نیت مقبول ہوگئی اور آیت میں ان کی مدح کی گئی خواہ مال کہیں پہنچے جیسے کسی کے گھر میں آگ لگ گئی ہو تو گو اس کا مال جل گیا صدقہ میں نہیں گیا مگر ثواب تو ملا کیونکہ آیت وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ (اور ہم تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف اور بھوک سے اور مال و جان اور پھلوں کی کمی سے) میں آفات اضطراریہ پر بھی ثواب کا وعدہ ہے جبکہ صبر کیا جائے۔

روح قربانی

بہرحال تقویٰ کامل کے معنی یہ ہیں کہ اپنی جان خدا تعالیٰ کے سپرد کر دے یہی اس جگہ مراد ہے اس

صوفیہ کی اصطلاح میں فنا کہتے ہیں میرے نزدیک قربانی کی روح یہی ہے تو حق تعالیٰ فرماتے ہیں تمہاری قربانیوں کے لحوم ودماء حق تعالیٰ کے یہاں نہیں پہنچتے۔ بلکہ تقویٰ پہنچتا ہے یعنی وہ دل کی حالت کو دیکھتے ہیں کہ قربانی کے وقت یہ اپنی جان کو بھی ہمارے سپرد کر چکا ہے یا نہیں اس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کے یہاں نیت ہی پہنچتی ہے صورت شے نہیں پہنچتی اس سے محرم کی رسم شربت کا غلط ہونا بھی ثابت ہو گیا جو لوگ محرم میں شربت پلاتے ہیں وہ یوں سمجھتے ہیں کہ شربت کا ثواب شربت ہی کی صورت میں پہنچتا ہے اور چونکہ حضرات شہداء کربلا پیاسے شہید ہوئے تھے اس لئے یہ لوگ شربت ہی کا تصدق کرتے ہیں تا کہ ان کو شربت پہنچ جائے۔ سو اول تو یہی غلط ہے کہ شربت تصدق کرنے سے وہاں شربت ہی پہنچے گا۔ دوسرے اس فعل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک حضرات شہداء نعوذ باللہ اب تک پیاسے ہی ہیں عوام میں اس کے متعلق ایک حکایت بھی مشہور ہے کہ خیر آباد کے ایک بزرگ تھے جن کے مرید نے زندہ پیر کی فاتحہ دلوائی تھی اور فاتحہ میں گرم گرم کھیر تقسیم کی تھی۔ جب وہ پیر کے پاس آیا تو انہوں نے کہا میاں ذرا فاتحہ کے وقت گرم ٹھنڈا تو دیکھ لیا کرو تم نے گرم گرم کھیر دے دی جس سے میرے منہ میں چھالے پڑ گئے۔ یہ حکایت کسی کی گھڑی ہوئی ہے۔ ایسی ہی اختراعات کی بناء پر عوام کا یہ اعتقاد ہے کہ جو چیز صدقہ کی جائے مردہ کو وہی پہنچتی ہے حالانکہ نص سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کے یہاں نیت اور تقویٰ پہنچتا ہے لحم ودم نہیں پہنچتا۔

حقیقت قربانی

تقویٰ کے جو معنی اس مقام پر میں نے بیان کئے ہیں یعنی جان کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینا جس کا دوسرا عنوان فنا ہے اس کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے وہ یہ کہ حضرات صحابہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔ ما ھذہ الاضاحی یا رسول اللہ کہ یہ قربانی کیا چیز ہے اہل علم جانتے ہیں کہ لفظ ما سوال عن الحقیقۃ کے لئے موضوع ہے تو اس کلام میں صحابہ نے حقیقۃ اضحیہ سے سوال کیا تھا اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں سنت ابیکم ابراھیم سنت سے مراد طریقہ ہے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ حقیقت اضحیہ وہ ہے جو ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ اور ان کا خاص مذاق ہے اب دیکھنا چاہیے کہ ابراہیم علیہ السلام کا فعل کیا تھا اگر دنبہ کا ذبح کرنا مراد لیا جائے تو یہ بعید ہے کیونکہ وہ ان کا فعل قصداً نہ تھا بلکہ بغیر قصد تھا ان کا اصل فعل تو وہی تھا جو قرآن میں مذکور ہے۔

يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ .... وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ

ترجمہ:۔ اے میرے بیٹے (برخوردار حضرت اسماعیل علیہ السلام) میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں سو تم بھی سوچ لو کہ تمہاری کیا رائے ہے وہ بولے ابا جان آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ کیجئے ان شاء اللہ

آپ مجھ کو صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے غرض جب دونوں نے تسلیم کرلیا اور باپ نے بیٹے کو کروٹ پر لٹایا اور ہم نے آواز دی اے ابراہیم (علیہ السلام) آپ نے خواب سچا کر دکھایا وہ وقت بھی عجیب تھا ہم مخلص کو ایسا ہی اجر دیا کرتے ہیں بلاشبہ یہ بہت بڑا امتحان تھا اور ہم نے ان کو ایک بڑا ذبیحہ ان کے عوض میں دیا۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اصلی فعل ذبح ولد تھا اور دنبہ کا ذبح کرنا حق تعالیٰ کی طرف سے اسکا بدل اور فدیہ تھا باقی اس میں اہل علم کا اختلاف ہے کہ وہ ولد ذبیح کون ہیں اسمٰعیل علیہ السلام ہیں یا اسحاق علیہ السلام ہیں۔ جمہور کا قول یہ ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام ہیں اور یہی صحیح ہے۔ جس کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ ذبح ولد کا قصہ بیان فرما کر حق تعالیٰ نے آگے فرمایا ہے وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ (اور ہم نے ان کو اسحاق (علیہ السلام) کی بشارت دی کہ نبی اور نیک بختوں میں سے ہوگا) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ بشارت اسحاق سے مقدم ہے اس لئے وہ ذبیح نہیں ہو سکتے۔ دوسری لطیف دلیل یہ ہے کہ یقیناً جس ولد کو ذبح کیا گیا ہے بلوغ سے پہلے کیا گیا ہے کیونکہ نص میں یہ قید مذکور ہے فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ کہ جب وہ لڑکا چلنے اور دوڑنے کی عمر کو پہنچ گیا اور یہ حالت بلوغ سے پہلے بہت ہو جاتی ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا دوسرا مقدمہ اس کے ساتھ یہ ملایئے کہ اسحٰق علیہ السلام کی بشارت کے ساتھ تو ان کا صاحب اولاد ہونا بھی بتلا دیا گیا تھا۔ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ (اور اسحاق (علیہ السلام) کو یعقوب (علیہ السلام) عطا ہوگا) اور وحی قطعی ہوتی ہے تو اب اگر ان کے ذبح کا امر ہوتا تو ابراہیم علیہ السلام کو عین ذبح کے وقت وحی سابق کی وجہ سے ان کی عدم موت کا پورا یقین ہوتا کہ یہ صاحب اولاد ہونے سے پہلے کسی طرح نہیں مر سکتے پھر اس ذبح میں بلاء مبین اور امتحان ہی کیا ہوتا اور اسماعیل علیہ السلام کے متعلق اس قسم کی بشارت کوئی نہ تھی کہ یہ صاحب اولاد ہوں گے اس لئے صحیح یہی ہے کہ ذبیح اسمٰعیل علیہ السلام ہیں بہرحال ابراہیم علیہ السلام کا فعل ذبح ولد تھا تو اب حضور کے جواب کا حاصل یہ ہوا کہ الاضحیۃ ذبح الولد یعنی قربانی کی حقیقت ذبح ولد ہے۔

سنت ابراہیمی کا مصداق

اور اگر لفظ سنت پر نظر کی جائے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ ذبح ولد بھی حضرت ابراہیم کی سنت نہیں کیونکہ سنت اس فعل کو کہتے ہیں جس پر مواظبت اور دوام ہو اور ذبح ولد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف ایک ہی دفعہ کیا ہے۔ پس سنت ابراہیم کا مصداق وہ فعل ہونا چاہیے جو ان کا دائمی طریقہ ہو اور وہ درحقیقت اسلام نفس ہے یعنی اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دینا جس کو فنا کہتے ہیں یہی حضرت ابراہیم کا خاص مذاق اور دائمی طریقہ تھا۔ اِذْقَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ. (جب ان

سے ان کے پروردگار نے فرمایا کہ اطاعت اختیار کرو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے اطاعت اختیار کی رب العالمین کی) اور ذبح ولد اس کی صورت تھی گو اسلام نفس کے مناسب صورت تو ظاہر میں یہ تھی کہ ان کو قتل نفس کا امر کیا جاتا مگر اس کے بجائے ذبح ولد کی صورت اس لئے اختیار کی گئی کہ یہ قتل نفس سے بھی اشد ہے چنانچہ ہر صاحب حس سمجھتا ہے کہ خصوصاً جو کسی کا باپ بھی بن چکا ہو وہ جانتا ہے کہ باپ کو اپنی موت اور اپنی کلفت بیٹے کی موت اور کلفت سے سہل ہوتی ہے اولاد کی حفاظت کے لئے انسان ہمیشہ اپنی جان پر کھیل جاتا ہے یہ تو اشدیت فی نفسہ ہے نیز اس وجہ سے بھی اشد ہے کہ اپنا قتل تو ایک ساعت کی کلفت ہے اور ذبح ولد عمر بھر کے لئے سانحہ جانکاہ ہے کسی کا بچہ اس کے ہاتھ سے ذبح ہو جائے تو عمر بھر اس کے دل پر آرے چلیں گے اس لئے اسلام نفس کی یہ صورت اختیار کی گئی ہے اب یہ اشکال ہوگا کہ قربانی تو جانور کی ہوتی ہے نہ کہ ولد کی پھر یہ سنت ابراہیم کیونکر ہوئی جواب اس کا پہلے کلام سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ حق تعالیٰ نے اپنی عنایت سے تمہاری جان کا عوض حیوان کی جان کو بنا دیا ہے جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں بھی نفس اسماعیل کا جو حکماً عین نفس ابراہیم تھے فدیہ ذبح کبش کو قرار دیا تھا اور اجر میں وہ ذبح ولد کے برابر تھا اسی طرح جانور کی قربانی بھی ثواب میں اپنی جان دینے کے برابر ہے اور بھی بذل نفس قربانی کی روح ہے جس کے واسطے میں نے یہ شعر پڑھا تھا۔

چوری بکوئے دلبر بسپار جان مضطر — کہ مباد بار دیگر نرسی بدیں تمنا

(در محبوب پر جب پہنچ جاؤ تو اپنی جان کو اس پر فدا کر دو شاید پھر تمنائے دل پورا کرنے کا موقع نہ ملے)

تو حق تعالیٰ کی یہ کتنی بڑی رحمت و عنایت ہے کہ چند روپے خرچ کرنے میں اتنا بڑا اجر دیتے ہیں۔

جانور کا انتخاب

مگر جب قربانی کا جانور آپ کی جان کا عوض ہے تو اس کا کچھ تو ایسا ہونا چاہیے کہ محبوب اور پیارا ہو اب جو لوگ سڑیل سے سڑیل اور گھٹیا سے گھٹیا جانور خریدنے کی فکر کرتے ہیں یہ زیبا نہیں لیکن اگر عمدہ مال ہو اور سستا مل جائے تو اس کا مضائقہ نہیں یہ تو عاجل بشری المومن اور غنیمت بارد ہے ہم خرما و ہم ثواب۔ لیکن بعض لوگ تو چھانٹ کر خراب جانور خریدتے ہیں سو اس کی ممانعت ہے جیسا کانپور میں ایک شخص نے بکرا قربانی کیا تھا جس میں سارے عیوب تھے۔ مگر ہر عیب تہائی سے کم تھا حق تعالیٰ اسی کو فرماتے ہیں وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِآخِذِيهِ (اور ارادہ نہ کرو گندی چیز کا ایمیں سے کہ اس کو خرچ کرو حالانکہ تم اس کو کبھی نہ لو گے) اس میں تیمم اور قصد کی ممانعت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے واسطے چھانٹ کر بری چیز کا قصد نہ کرو تیمم کی قید میں بھی رحمت ہے کیونکہ حق تعالیٰ

جانتے ہیں کہ بعض لوگ غریب بھی ہوں گے جن کے پاس گھٹیا ہی مال ہوگا تو اگر وہ گھٹیا دیں تو مضائقہ نہیں کیونکہ وہ گھٹیا کا انتخاب اور قصد نہیں کرتے بلکہ اس لئے گھٹیا دیتے ہیں کہ ان کے پاس اور ہے ہی نہیں پھر آگے اس کا معیار بتلاتے ہیں جس سے معلوم ہو جائے گا کہ ہر شخص کے اعتبار سے گھٹیا کا درجہ کیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ولستم باخذیہ (اور تم نہیں لوگے) یعنی بس یہ دیکھ لو کہ اگر ایسی چیز کوئی تم کو دے تو تم بھی خوشی سے اس کو لے سکتے ہو۔ لحاظ کا لینا معتبر نہیں اس لئے آگے اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ (ہاں مگر تم اس سے چشم پوشی کر لو) بھی بڑھا دیا پس جو چیز تم دوسرے سے خوشی کے ساتھ لے سکتے ہو اس کو اللہ کے نام پر بھی دے سکتے ہو اور ظاہر ہے کہ جس غریب کے پاس سب گھٹیا ہی مال ہے وہ دوسرے سے بھی اس جیسی چیز کو لے سکتا ہے۔ لہٰذا ان کو گھٹیا جانور کی قربانی جائز ہے اور جو لوگ ایسے نازک ہیں کہ بیمار اور دبلے جانور کا گوشت کبھی نہیں لیتے ہمیشہ عمدہ جانوروں کا گوشت کھاتے ہیں اگر یہ دبلا پتلا جانور قربانی کریں گے تو اس کی ممانعت ہوگی کیا رحمت ہے کہ حق تعالیٰ نے معیار بھی خود ہی بتلا دیا تمہاری رائے پر نہیں چھوڑا آگے فرماتے ہیں۔ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ یعنی خدا تعالیٰ غنی ہے اس کو تمہارے مال کی ضرورت نہیں پس خدا کے نام پر ایسا مال دو جیسا اغنیاء کو دیا کرتے ہیں اس پر شاید کوئی یہ کہے کہ جب خدا تعالیٰ کو احتیاج نہیں پھر ہم جیسا چاہیں خرچ کر دیں تو فرماتے ہیں حَمِيْدٌ یعنی گو ان کو احتیاج نہیں مگر کرتے تو ان کی رضا کے لئے ہو جب یہ ہے تو وہ محمود بھی ہیں اس لئے اس کے نام پر ہر حال میں مال محمود ہی خرچ کرنا چاہیے پھر بعض کو یہ خیال ہوتا ہے کہ یہ تو سب کچھ ہے کہ اللہ کے لئے مال محمود خرچ کرنا چاہیے کیونکہ وہ غنی حمید ہے مگر عمدہ مال میں روپے بھی تو بہت خرچ ہوتے ہیں پھر محتاج ہو جاویں گے اس کا جواب دیتے ہیں۔ اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ کہ یہ شیطان کا دھوکہ ہے وہ تم کو فقر سے ڈراتا اور بے حیائی کی بات بتلاتا ہے۔ فحشاء سے مراد یہاں مفسرین کے نزدیک بخل ہے واقعی یہ کیسی بے حیائی کی بات ہے کہ خدا ہی کا مال اس کے حکم سے بھی دینا نہیں چاہتا۔ آگے زیادہ ہمت بڑھاتے ہیں وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا اور اللہ تعالیٰ تم سے (انفاق پر) مغفرت کا وعدہ فرماتے ہیں اور ترقی (مال و دولت) کی امید دلاتے ہیں پس مطمئن رہو کہ صدقہ خیرات سے مال میں کمی نہ آئے گی بلکہ ترقی ہوگی (حدیث میں اس کی زیادہ تصریح ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسم کھا کر فرمایا ہے کہ صدقہ سے مال کم نہیں ہوتا ۱۲) آگے واللہ واسع علیم بھی ایک اشکال کا جواب ہے کہ حق تعالیٰ بڑے وسعت والے ہیں ان کے یہاں کچھ کمی نہیں اس لئے وعدہ فضل پر شبہ نہ کرو اور وہ ہر شخص کے عمل کو خوب جانتے ہیں اس لئے یہ وسوسہ نہ کرو کہ اتنے آدمیوں میں ہمارے عمل کی کیا خبر ہوگی ان سے ذرہ برابر کسی کا عمل مخفی

نہیں۔ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ آگے توفیق پر حوالہ کرتے ہیں۔

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ط وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ

یعنی حق تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں فہم دیتے ہیں اور جس کو فہم عطا ہوگئی اس کو خیر کثیر مل گئی اور عقل والے ہی بات کو سمجھتے ہیں اس میں ان لوگوں کو متنبہ فرمادیا جو اعمال صالحہ کررہے ہیں کہ وہ اس پر ناز نہ کریں اعجاب وتکبر اختیار نہ کریں یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے جو تم کو دین کی سمجھ دی اور اعمال صالحہ کی توفیق عطا فرمائی۔ بہرحال فقر کا اندیشہ نہ کرو اور خدا کے نام پر جہاں تک ہوسکے عمدہ جانور ذبح کرو جس کو ذبح کر کے کچھ تو دل دکھے جیسا کہ اپنی جان کو پیش کرتے یا بیٹے کو ذبح کرتے تو دل دکھتا اب ویسا تو کہاں دل دکھے گا لیکن کچھ تو مال ایسا ہو جس کو ذبح کر کے دل پر کچھ چوٹ لگے حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ. مراد بر کامل ہے کہ بر کامل تم کو اس وقت تک حاصل نہ ہوگی جب تک کہ محبوب اشیاء کو خرچ نہ کرو۔ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَىْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ میرے نزدیک اس آیت میں من شیء مما تحبون. کا بیان نہیں بلکہ اس کا مقابل ہے اور مطلب یہ ہے کہ بر کامل تو محبوب شے ہی کے انفاق سے حاصل ہوگا اور یوں جو کچھ بھی خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ کو اس کا علم ہے کچھ نہ کچھ ثواب مل ہی جاوے گا۔ انفاق محبوب کی صورت ایسی ہوتی ہے جیسے حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار قربانی کی تھی۔ آپ نے قربانی سے کئی مہینے پہلے ایک گائے خریدی اور اس کو خوب دانہ کھلایا پلایا اور عصر کے بعد جنگل میں اپنے ساتھ لے جا کر دوڑایا کرتے تھے۔ قربانی کے وقت تک وہ اتنی تیار ہوگئی کہ اس ارزانی کے زمانہ میں بھی قصائی اس کی قیمت اسی روپے دے رہے تھے۔ آج کل گرانی کے زمانہ میں تو نہ معلوم کتنی قیمت ہوتی مگر مولانا نے کسی کو نہ دی اور قربانی کے دن ذبح کیا جب وہ ذبح ہوئی تو مولانا کے دل پر اثر ہوا اور آنکھوں میں آنسو آ گئے کیونکہ عرصہ تک ساتھ رکھنے اور پرورش کرنے سے اس کے ساتھ محبت ہوگئی تھی اس پر کوئی یہ نہ کہے کہ رنج کے ساتھ ذبح کرنا تو اچھا نہیں بلکہ خوشی کے ساتھ ذبح کرنا چاہیے کیونکہ حضرت فاطمہؓ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

یا فاطمة احضری اضحیتک وطیبی بها نفسک (لم أجد الحدیث فی موسوعة)

لہٰذا ایسا جانور ذبح کرنا چاہیے جس کے ذبح سے خوشی ہو کہ اچھا ہوا پاپ کٹا سو یہ خیال غلط ہے حدیث میں طیب نفس کا امر ہے وہ خوشی عقلی ہے اور میں جو کہہ رہا ہوں کہ ایسا جانور ذبح کرے جس سے دل دکھے یہ رنج طبعی ہے جو عقلی خوشی کے منافی نہیں۔

مشاہدہ کے بعد نذرانہ

غرض قربانی کا زمانہ بعد حج کے ہے اور حج کی روح مشاہدہ اور مشاہدہ کے بعد نذرانہ دیا کرتے ہیں تو یہ قربانی نذرانہ ہے اب قاعدہ ہے کہ سلاطین نذرانہ کو رکھا نہیں کرتے بلکہ اس پر ہاتھ دھر کر واپس کر دیتے ہیں یہاں بھی یہی معاملہ ہے چنانچہ گوشت تو فوراً ہی دیدیا گیا کہ کھاؤ اور کھلاؤ اور غریبوں کو دو دوستوں کو دو یا سارا اپنے خرچ میں لے آؤ سب جائز ہے پہلی امتوں کی قربانی کا گوشت کھانا جائز نہ تھا بلکہ ذبح کر کے پہاڑ پر رکھ دیتے تھے غیب سے ایک آگ آ کر جلا دیتی تھی یہ اس امت کی خصوصیت ہے کہ اس کو قربانی کا گوشت واپس کر دیا گیا کہ جو چاہو کرو اور دوسری واپسی یہ ہے جس کا دوسری آیت میں ذکر ہے: وَمَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَهُوَ یُخْلِفُهٗ. وَهُوَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ کہ تم جو کچھ خرچ کرتے ہو حق تعالیٰ اس جگہ اس کا عوض عطا کر دیتے ہیں اور وہ سب دینے والوں میں بہتر ہے تو جو عوض دیں گے وہ اصل سے بہتر ہوگا پس قربانی میں صورۃً تو آپ جانور کی پیش کرتے ہیں اور حقیقۃً اپنی جان پیش کرتے ہیں جیسا کہ اوپر معلوم ہوا کہ اس کی حقیقت اسلام نفس ہے وہاں سے اس کے بدلہ میں آپ کو دوسری جان ملتی ہے جو اس سے بدرجہا افضل ہوتی ہے جس کی حقیقت دو مثالوں سے سمجھئے ایک تو آصف الدولہ کی حکایت ہے کہ اس نے بڑھیا کی سل کو سونا بنا دیا تھا واقعہ یہ ہے کہ آصف الدولہ نے ایک بڑھیا کو دیکھا کہ اصطبل میں ایک سل لئے ہوئے گھوڑے کے سم سے رگڑ رہی تھی پوچھا مائی کیا کرتی ہو کہا بیٹا میں نے سنا ہے کہ آصف الدولہ کے گھوڑے کا سم اگر پتھر پر پڑ جائے وہ سونا ہو جاتا ہے کہنے لگا سچ ہے مگر تم کو رگڑنا نہیں آتا۔ تم سل چھوڑ جاؤ میں سونا بنا دوں گا وہ چھوڑ کر چلی گئی حکم دیا کہ اس سل کی برابر ایک سونے کی سل بنوا کر رکھ دو جب وہ بڑھیا آئی اس کو حوالہ کر دی اور کہا لو تمہاری سل سونے کی بن گئی اور دوسرا قصہ مولانا نے مثنوی میں بیان فرمایا ہے کہ ایک دیہاتی بہت غریب تھا جس پر فاقے گزرتے تھے اس کے گاؤں میں قحط شدید ہوا کہ کنویں اور تالاب خشک ہو گئے اس کی بیوی نے ایک دن کہا کہ خلیفہ بغداد سنا ہے بہت کریم ہیں تم اس کے پاس جاؤ شاید تمہارا فقر و فاقہ زائل ہو جائے۔ اس نے کہا کہ خلیفہ کے پاس جانے کیلئے کوئی ہدیہ اور نذرانہ بھی تو ہونا چاہیے خالی ہاتھ کیونکر چلا جاؤں اور میرے پاس اس کے لائق ہدیہ کہاں ہے۔ بیوی نے کہا فلاں گھڑے میں جو صاف و شفاف کچھ پانی مجتمع ہے ایسا پانی خلیفہ نے کہاں دیکھا ہوگا تم یہ پانی ایک گھڑے میں بھر کر لے جاؤ۔ یہ رائے مرد کی بھی سمجھ میں آ گئی چنانچہ گھڑا بھر کر لے چلا اور عورت نے مصلیٰ بچھا کر اس کے پاس پانی کے صحیح سالم پہنچنے کیلئے دعا کرنی شروع کی اس کو مولانا فرماتے ہیں۔

زن مصلیٰ باز کردہ از نیاز   رب سلم ورد کردہ در نماز

(عورت نے مصلیٰ بچھا کر اپنے رب سے نماز میں دعا مانگنی شروع کی کہ یااللہ اس گھڑے کو صحیح سالم پہنچا دے)

ادھر وہ تمام راستے ربِ سلم ربِ سلم کا ورد کرتا ہوا چلا کہ الٰہی اس گھڑے کی خیر رہے اور میرے قدموں کی بھی خیر رہے کہیں ٹھوکر نہ لگ جائے کیونکہ اس بیچارہ کے پاس تو سب کچھ یہی تھا۔ میں کہتا ہوں اس طرح انبیاء علیہم السلام پل صراط پر اپنی اپنی امتوں کے لئے ربِ سلم ربِ سلم کے ساتھ دعا فرمائیں گے کہ الٰہی مسلمانوں کے قدموں کو لغزش سے بچائیے کہیں جہنم میں نہ گر جائیں پھر خدا خدا کر کے سلامتی کے ساتھ وہ گھڑا بغداد پہنچا اور دربار میں اطلاع واذن کے بعد حاضر کیا گیا خلیفہ نے پوچھا یہ کیا ہے تو وہ بدوی کہتا ہے ھذا ماء الجنۃ یہ جنت کا پانی ہے۔ ایسا پانی کسی نے کبھی نہ پیا ہوگا۔ خلیفہ نے گھڑے کے کھولنے کا حکم دیا چونکہ عرصہ کا بند کیا ہوا تھا اس لئے کھولتے ہی دربار سڑ گیا۔ صاحبو! یہی حالت ہمارے اعمال کی ہے کہ وہ حقیقت میں سڑے ہوئے ہیں مگر خلیفہ کا کرم دیکھئے کہ اس نے ذرا بھی کسی انداز سے بدوی پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ ہم کو اس کی بدبو سے ایذا ہوئی ہے بلکہ کمال یہ کیا کہ سر دربار اس میں سے ایک گلاس بھروا کر چکھا اور بہت تعریف کی کہ نہایت نفیس و لطیف پانی ہے اس کو خاص اہتمام سے فلاں جگہ رکھا جائے چنانچہ اس وقت تو اٹھوا کر کسی جگہ رکھ دیا گیا اور بعد میں اس کے غیبت میں گرا دیا گیا یہی معاملہ بلاتشبیہ حق تعالیٰ ہمارے ساتھ فرماتے ہیں کہ ہمارے اعمال تو سڑے ہوئے ہیں مگر حق تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے ان کی قدر فرماتے ہیں۔

پھر خلیفہ نے حکم دیا کہ اس بدوی کا گھڑا سونے کی اشرفیوں سے بھر کر واپس کیا جائے اور خدام سے کہا کہ اس کو دجلہ کے راستے سے لے جانا تاکہ تکان دور ہو اور فرحت ہو نیز اس کو اپنے ہدیہ کی حقیقت اور ہمارے کرم کی عظمت کا مشاہدہ ہو جائے چنانچہ جب وہ دجلہ پر پہنچا۔ ہے اور اس کی لطافت وشیرینی کو دیکھا تو شرم سے پانی پانی ہو گیا کہ اللہ اللہ یہ خلیفہ کیسا کریم ہے اس کو میرے گدلے اور متعفن پانی کی کیا ضرورت تھی جس کے شہر میں ایسی صاف وشفاف وشیریں نہر چل رہی ہو اور اب معلوم ہوا کہ خلیفہ نے اس کے ہدیہ کی جو کچھ تعریف کی تھی وہ محض اس کی دلجوئی تھی۔

صوفیہ کی کمائی

صاحبو! یہی معاملہ ہمارے ساتھ ہوتا ہے کہ ہمارے حسنات حقیقت میں سیئات ہیں مگر حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ ان کو طاعات ہی شمار کر لیتے ہیں اور ہم کو مطیعین میں داخل کر لیتے ہیں یہ ہے يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ اور جیسے خلیفہ نے سڑے ہوئے پانی کے بدلہ میں سونے کی اشرفیاں دی تھیں ایسے ہی یہاں تم جو اپنی جان پیش کرتے ہو وہ سڑی ہوئی ہے کیونکہ صفات رذیلہ سے متصف ہے اور حق تعالیٰ اس

کے عوض تم کو ایسی جان عطا فرماتے ہیں جو لطیف و شفیف ہے کیونکہ اب وہ متصف بصفات اللہ ہو جاتی ہے اسی کا نام فناء و بقاء ہے یہی صوفیہ کی تحصیل ہے کہ اول وہ اپنی جان کو خدا تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں یہ تو فنا ہے اور اس وقت وہ جان صفات رذیلہ سے متصف تھی پھر حق تعالیٰ اس کو اپنی صفات سے متصف کر کے واپس کر دیتے ہیں یہ بقاء ہے اور گو اس وقت بھی وہ جان حقیقت میں پہلی ہی جان ہوتی ہے مگر اس وقت کی اور پہلی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے اس کی بالکل ایسی مثال ہے جیسے کیمیاوی طریقہ سے تانبہ کو سونا بنا دیا جائے تو گویا وہ وہی ہے جو پہلے تھا مگر اس کی صورت اور حالت اور خاصیت اس درجہ بدل گئی ہے کہ اس کو وہی کہنا دشوار ہے بلکہ اب دوسری شے ہوگئی ہے مولانا فرماتے ہیں۔

کیمیا داری کہ تبدیلش کنی گرچہ جوئی خوں بود نیلش کنی

جو ایسی کیمیا رکھتا ہے کہ اگرچہ خون کی ندی ہو وہ دریائے نیل میں تبدیل ہو جائے۔

اسی طرح یہاں فناء کے بعد تمہاری روح کی حالت ایسی بدل جاتی ہے کہ گویا دوسری روح ہے اب یہ اس کا مصداق ہو جاتی ہے کہ بی یسمع وبی یبصرو بی ینطق وبی یبطش وبی یمشی (الترمذی) (گویا میں اس کے کان، آنکھ، زبان، ہاتھ، پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ ان کے کام لیتا ہے) اس کا چلنا پھرنا بولنا سننا سب خدا تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے اپنی رائے سے کچھ نہیں کرتا کیونکہ خودی کو تو فنا کر چکا ہے یہی ہے روح قربانی کی کہ اول تم اپنی جان پیش کرتے پھر ادھر سے دوسری جان عطا ہوتی ہے گویا روح قربانی فناء و بقاء ہے فنا اپنا فعل ہے اور بقاء حق تعالیٰ کا عطیہ ہے اور یہ معلوم ہے کہ فناء و بقاء کتنی بڑی دولت ہے کہ صوفیہ کی ساری کمائی یہی ہے تو اس سے قربانی کی عظمت بھی معلوم ہوگئی اور کچھ قربانی ہی کی تخصیص نہیں بلکہ تمام اعمال کی روح یہی فناء و بقاء ہے ہر عمل میں اول حق تعالیٰ کے حکم سے بندہ اپنی جان کو پیش کرتا ہے پھر وہ اس کے بدلہ میں دوسری جان خود عطا فرماتے ہیں اب جیسی فنا ہوگی ویسی ہی بقا ہوگی اگر فنا کامل ہے بقا بھی کامل ہے ورنہ اس کے مناسب بقا ہوگی مگر یہ نسبت اور اعمال کے اس فناء و بقاء کا ظہور قربانی میں زیادہ ہے اس لئے میں نے قربانی کے ساتھ اس روح کو بیان کیا ہے ورنہ فناء و بقاء خود مقصود ہے خواہ قربانی کے ذریعہ سے ہو یا کسی اور ذریعہ سے ہو پس یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قربانی کا وقت نکل جانے کے بعد پھر فنا و بقاء کا حصول نہیں ہو سکتا نہیں ہر زمانہ میں ہر عمل کے ساتھ اس کا حصول ہو سکتا ہے۔ پس اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ اب ترتیب اس تربیت کی یہ ہونا چاہیے کہ اول کسی کامل کے پاس رہ کر مجاہدہ میں مشغول ہو پھر مشاہدہ نصیب ہوگا پھر فنا و بقاء حاصل ہوگا۔

حقیقت وصول

اور تم یہ مت سمجھنا کہ ہم اس قابل کہاں۔ ارے حق تعالیٰ بڑے کریم و جواد ہیں تم ایک دفعہ طلب میں مشغول تو ہو ان شاء اللہ وصول بھی ہو جائے گا وہ اپنے طالب کو محروم نہیں کیا کرتے خود ارشاد فرماتے ہیں من تقرب الی شبرا تقربت الیه ذراعًا و من تقرب الی ذراعًا تقربت الیه باعًا و من اتانی یمشی اتیته هرولة (مسند احمد) (جو مجھ سے ایک بالشت قریب ہوتا ہے میں اس سے ایک ہاتھ قریب ہو جاتا ہوں اور جو میری طرف چل کر آتا ہے میں ان کی طرف دوڑ کر آتا ہوں) یہ انکی عنایت ہے کہ جب تم چلنا شروع کرتے ہو تو وہ خود تم سے زیادہ قریب ہو کر مسافت کو کم کر دیتے ہیں ورنہ انسان سے یہ راستہ کیونکر طے ہوتا یہاں سے معلوم ہوا کہ حقیقت میں وصول انسان کے چلنے سے نہیں ہوتا بلکہ حق تعالیٰ خود آ کر اس سے مل جاتے ہیں تو دراصل واصل وہ ہیں یہ واصل نہیں ہے مگر یہ بھی ان کی رحمت ہے کہ وہ طالب کو واصل کا لقب دیتے ہیں۔ ؎

کار زلف تست مشک افشانی اما عاشقاں مصلحت را تہمتے برآ ہوئے چیں بستہ اند

(مشک افشانی محبوب کی زلفوں کا کرشمہ ہے لیکن عشاق نے مصلحت کی وجہ سے چین کے ہرنوں کے سر منڈھ رکھا ہے) اسی طرح یہ عنایت کرم ہے کہ وہ تم کو اپنا محبّ فرماتے ہیں:

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ . (اگر تم اللہ تعالیٰ کی محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو خدا تعالیٰ تم سے محبت کریں گے) حالانکہ حقیقت میں محبّ حق تعالیٰ ہیں کیونکہ محبت معرفت سے ہوتی ہے سو حق تعالیٰ کو تو ہماری معرفت ہے ہم کو ان کی معرفت کہاں پس ہماری محبت جو کہ بلا معرفت ہے محض برائے نام محبت ہے ورنہ حقیقت میں حق تعالیٰ ہی کو ہم سے محبت ہے مگر کس درجہ عنایت ہے کہ وہ ہم کو اپنا محبّ فرماتے ہیں واللہ بات بات میں ان کی رحمت ہے کس کس بات پر جان فدا کی جائے اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

ہر کہ عاشق دید پس معشوق داں کو بہ نسبت ہست ہم ایں وہم آں

(جس عاشق کو دیکھو اس کو معشوق سمجھو اگرچہ نسبت دونوں طرف ہے)

یعنی یہ مت سمجھو کہ تم ہی عاشق ہو بلکہ دراصل حق تعالیٰ تم کو چاہتے ہیں ان کے چاہنے کے بعد تم نے ان کو چاہا ہے مگر دونوں میں فرق اتنا ہے کہ

میل معشوقاں نہاںست و ستیر عشق عاشق باد وصد طبل و نفیر

(معشوق کا عشق پوشیدہ اور مخفی ہے عاشق کا عشق ظاہر اور آشکارا ہے)

ان کی محبت مخفی ہے جس میں جوش و خروش نہیں کیونکہ وہ اضطرار سے پاک ہیں اور تمہارے عشق

نے عالم میں ادھم مچا دیا اور فرماتے ہیں۔ ؎

ہم بدلہای نماید خویش را ہم بدوز و خرقہ درویش را

(ہم خود ہی عشاق کے دلوں میں ظاہر ہوتے ہیں اور ہم خود ہی درویش کے خرقہ کو جلاتے ہیں)

یعنی وہ خود ہی عشاق کے دلوں میں جلوہ گر ہوتے ہیں جس کے بعد یہ عشق کا دم بھرنے لگتے ہیں پھر ان کی طلب اور ان کا عشق ناتمام ہوتا ہے تو وہ خود ہی اس کو کامل بھی کر دیتے ہیں کیونکہ اس طرح کہ دن بدن معرفت میں ترقی کرتے جاتے ہیں جس سے طلب ومحبت کامل ہوتی جاتی ہے اور یہ کچھ اسی محبت کے ساتھ خاص نہیں مولانا عموماً دعویٰ کرتے ہیں کہ جہاں بھی محبت ہوتی ہے اول محبوب کی طرف سے ہوتی ہے چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔

تشنگاں گر آب جویند از جہاں آب ہم جوید بعالم تشنگاں

(پیاسے اگر پانی تلاش کرتے ہیں تو پانی بھی پیاسوں کو تلاش کرتا ہے) اور ایک بزرگ تو بطور کلیہ کے فرماتے ہیں۔ ؎

گر از جانب معشوق نباشد کششے طلب عاشق بیچارہ بجائے نرسد

(اگر معشوق کی جانب کچھ کشش نہ ہو تو بے چارہ عاشق کی طلب کچھ کمال کو نہیں پہنچ سکتی)

خیر اور جگہ تو ہو یا نہ ہو مگر حق تعالیٰ کے ساتھ تو واقعی یہی ہے کہ ہم کو اول محبت نہیں ہوئی بلکہ انہی کو اول محبت ہے پھر وہی خود ہم سے مل بھی جاتے ہیں بالکل ایسی مثال ہے جیسے بچہ کو ماں بلاتی ہے اور وہ چلنے پر قادر نہیں مگر دوڑنا چاہتا ہے تو ایک دو قدم تو وہ اٹھاتا ہے پھر ماں خود دوڑ کر اس کو گود میں اٹھا لیتی ہے۔ بلاتشبیہ یہی حال ہے کہ بندہ ایک دو قدم چلتا ہے پھر خود ہی اس کے پاس چلے آتے ہیں اور آغوش رحمت میں لے لیتے ہیں ورنہ انسان سے حق محبت کیا ادا ہو سکتا ہے۔ ؎

ادائے حق محبت عنایتیست ز دوست وگرنہ عاشق مسکیں بہ ہیچ خرسندست

(حق محبت کی ادائیگی سراسر دوست کی عنایت کے سبب ہے وگرنہ عاشق بیچارہ خواہ مخواہ خوش وخرم ہے)

ہمارا کیا حق تھا کچھ بھی نہیں جو کچھ بھی ہم کو مل جاتا کافی تھا مگر یہ ان کی عنایت ہے کہ وصول بھی عطا فرماتے ہیں محبت سے بھی نوازتے ہیں یہ ہیں کام کرنے کے ان میں کوشش کرو۔ وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ اب میں ختم کرتا ہوں دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو ان دولتوں سے نوازیں اور اعمال صالحہ کی توفیق دیں۔

وصلى الله على سيدنا ومولانا محمد وعلىٰ آله واصحابه اجمعين.

وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ.

عُودالعید

یہ وعظ حضرت حکیم الامت قدس سرہ
نے بیان سے قبل خود تحریر فرمایا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بعد الحمد و الصلوٰۃ یہ احقر مدعا طراز ہے کہ جس روز اس تقریر کے بیان کرنے کا ارادہ تھا اتفاق سے کوئی ضبط کرنیوالا نہ تھا اور باوجود گنجائش زمانہ کے بعض مشاغل کی تنگی تاخیر کی اجازت نہ دیتی تھی اس لئے خود احقر نے اس کو قبل بیان بہت مختصر ضبط کرلیا اور وعظ کے وقت اسی کو کسی قدر بسط کے ساتھ بیان کر دیا۔ اجزاء مابه البسط چونکہ اصل تقریر کے درجہ میں ضروری نہ تھے اس لئے ان کا ضبط نہ ہونا مضر نہیں سمجھا گیا بس اسی تحریر شدہ تقریر کو داخل مواعظ کیا جاتا ہے گو اور وعظوں سے صورۃً یہ بہت چھوٹا ہوگا ماقل ودل کا مصداق ہونے سے معناً یہ کسی سے چھوٹا نہیں۔

کتبہ: اشرف علی عفی عنہ

۲۶ ذیقعدہ ۱۳۳۵ھ، مقام تھانہ بھون

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ۔

لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنْ یَّنَالُہُ التَّقْوٰی مِنْکُمْ ط کَذٰلِکَ سَخَّرَھَا لَکُمْ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ ط وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِیْنَ (الحج آیت ۳۷)

ترجمہ:۔ اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ خون لیکن ان کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو تمہارا زیر حکم کر دیا ہے تا کہ تم اس بات پر اللہ کی بڑائی کرو کہ اس نے تم کو توفیق دی اور اخلاص والوں کو خوشخبری سنا دیجئے۔

تکبیر و تعظیم

اس آیت میں کچھ مضمون قربانی کے متعلق مذکور ہے قرب ذی الحجہ کے سبب اس بیان کو اختیار کیا جاتا ہے کہ سامعین ابھی سے اس کے اہتمام کے لئے آمادہ ہو جاویں۔ حاصل اس آیت کا قربانی کی بعض غایتوں اور حکمتوں کا بیان فرمانا ہے اور گو آیت موقع ذکر حج میں وارد ہے مگر خود ان حکمتوں کے بیان میں تخصیص حج کی مقصود نہیں گو حج کو بھی شامل ہے اور حاصل ان حکمتوں کے دو امر ہیں ایک امر باطنی ایک امر ظاہری، امر باطنی نیت تقرب و اخلاص ہے جس کو ایک عنوان عام یعنی تقویٰ سے تعبیر فرمایا ہے کہ یہ دونوں یعنی نیت تقرب و اخلاص اس کے اعلیٰ شعبوں میں سے ہیں اور باطنی ہونا

اس کا ظاہر ہے مشاہدہ بھی ہے کہ فعل قلب ہے اور حدیث میں بھی ہے ان التقویٰ ھھنا واشار الی صدرہ (مجمع الزوائد) (بلاشبہ تقویٰ یہاں ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے سینہ مبارک کی طرف اشارہ فرمایا) اسکی مقصودیت کو اوپر کی آیتوں میں تعظیم شعائر سے کہ وہ بھی امر مبطن ہے اور اس آیت میں اس عنوان سے بیان فرمایا ہے لَنْ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوْمُھَا (اللہ تعالیٰ کے یہاں ہرگز ان کا خون نہیں پہنچتا) الخ اور امر ظاہری ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لینا جس کو اوپر کی آیتوں میں لِیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ عَلٰی مَا رَزَقَھُمْ مِّنْ م بَھِیْمَۃِ الْاَنْعَامِ (تاکہ وہ مخصوص جانوروں پر اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو عطا فرمائے ہیں) سے اور اس آیت میں لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ سے تعبیر فرمایا ہے اور یہ امر ظاہری یعنی ذکر اسم اللہ اور تکبیر اللہ اسی امر باطنی یعنی تعظیم بالقلب ونیت تقرب واخلاص کا ترجمان ہے یعنی اسی لئے موضوع ہے کہ اس سے اس کا اظہار ہو پس ان میں باہم دال ومدلول کا سا تعلق ہے پس ان میں حقیقی اتحاد اور اعتباری تغایر ہے اس اعتبار سے یہ دونوں حکمتیں ایک ہی حکمت ہے اور ہرچند کہ ظاھراً علی ما ھدٰکم (اس بات پر کہ تم کو ہدایت کی) مطلق ہدایت کو شامل ہے لیکن خصوصیت مقام ونقل عن اہل التفسیر سے اس کی تفسیر خاص یہ ہے علی ما ھدٰکم من الذبح اللہ تعالٰی (اس بات پر کہ تم کو اللہ کے لئے ذبح کرنے کی توفیق دی) جس کا حاصل یہ ہے کہ تم اس بات پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی کرو یعنی ذبیحہ پر اللہ اکبر کہو کہ اس نے تم کو اس فعل موجب تقرب کی توفیق دی چنانچہ اگر وہ توفیق نہ دیتے تو ممکن ہے کہ بعض کی طرح تم ذبح ہی میں شبہات نکالتے یا ذبح کرتے مگر غیر اللہ کے نام یا اللہ ہی کے نام پر ذبح کرتے مگر نیت درست نہ ہوتی یا تو بالکل اخلاص نہ ہوتا یا کامل نہ ہوتا جیسے بعض لوگ ردی جانور ذبح کرتے ہیں جو علامت ہے محبت کی کمی کی اور جس قدر محبت کم ہوگی اسی قدر اخلاص کم ہوتا ہے کیونکہ اس میں آمیزش ہوگی غیر کی محبت کی اور اس غیر کو من وجہ مقصود سمجھنے کی مثلاً مال اگر اس کو مقصود نہ ہوتا تو ردی کیوں ڈھونڈھتا غرض یہ عمل اخلاص کے ساتھ کرنا توفیق ہی پر موقوف ہے پس اس توفیق پر تم حق تعالیٰ کی دل سے بھی تعظیم کرو اور زبان سے بھی اللہ اکبر کہہ کر اس کا اظہار کرو۔ پس یہ تفسیر عَلٰی مَا ھَدٰکُمْ (اس بات پر کہ اس نے تم کو توفیق دی) کی اور اسی تعظیم وتکبیر کی مقصودیت کا اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان ایام میں دوسرے طریق سے یہ تکبیر مشروع ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک تو عید کا دوگانہ مقرر کیا گیا جس میں ایک تو تکبیرات انتقالات مشترک تکبیریں ہیں یعنی جیسی اور نمازوں میں ہیں اور ان کے علاوہ تکبیرات زائدہ بھی ہیں جن کا عدد ائمہ کے نزدیک مختلف ہے۔ امام صاحب کے نزدیک چھ تکبیریں ہیں جو نماز کی گیارہ تکبیروں کے ساتھ مل کر سترہ ہوتی

ہے جو رکعات فرائض کے برابر ہونے سے ایک مہتم بالشان عدد ہے اور دوسرا طریق اس کی مشروعیت کا یہ ہوا کہ یوم عرفہ کے شروع سے ایام تشریق کے خاتمہ تک ہر نماز کے بعد آواز بلند تکبیر کہی جاتی ہے۔ تیسرا طریق یہ ہے کہ عیدگاہ کے راستہ میں بھی کہی جاتی ہے اور اس تکبیر کے اشتراک سے ذبح اور صلوٰۃ کا جو باہمی تناسب معلوم ہوتا ہے مولانا رومی کے ارشاد میں اس کی تصریح بھی ہے ۔

معنی تکبیر ایں ست اے امیم　　کای خدا پیش تو ما قربان شدیم

وقت ذبح اللہ اکبر میکنی　　ہمچنیں در ذبح نفس کشتنی

گوی اللہ اکبر وایں شوم را　　سر ببرتا دار ہدجاں از عنا

تن چو اسمٰعیل و جاں ہمچوں خلیل　　کرد جاں تکبیر برجسم نبیل

ہمچو اسماعیل پشیش سر بنہ　　شادو خنداں پیش تیغش جاں بدہ

(تکبیر کی حقیقت یہ ہے کہ اے خدا ہم آپ کے سامنے قربان ہوتے ہیں ذبح کے وقت تو تکبیر کہتا ہے ایسے ذبح نفس جو مارنے کے لائق ہے اللہ اکبر کہو اور اس منحوس کا سر کاٹ اور جان کو تکلیف سے رہائی دے مثل تن حضرت اسماعیل علیہ السلام کے اور جان مانند حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کے اپنی جان تکبیر کے ساتھ قربان کر۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی مانند اپنا سر اس محبوب حقیقی کے سامنے رکھ اور ہنسی خوشی اس کی تلوار کے سامنے جان دے)

اور اگر لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ (تا کہ اللہ کی بڑائی بیان کرو) کو جو آیت میں مذکور ہے ان سب تکبیرات صلوٰتیہ وغیر صلوٰتیہ کے لئے عام لے لیا جاوے جیسا کہ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ (اور چند دن اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو) میں ان ایام کے سب اذکار و تکبیرات بالاجماع مراد ہیں تو تقریر آیت کی اس طرح ہو گی کہ تسخیر انعام اس لئے ہوئی کہ ہم کو تکبیر مقصود ہے چنانچہ ہم نے دوسرے طرق سے اس تکبیر کو مشروع فرمایا ہے جو علامت ہے اس کے مقصود ہونے کی اور اس تسخیر للذبح سے یہ مقصود حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے اس مقصود کی تحصیل کے لئے ہم نے انعام کو مسخر کر دیا۔ پس آیت ہی مشتمل ہو جاوے گی ان ایام کی تمام طاعات کو قربانی کو بھی تکبیرات غیر صلوٰتیہ کو بھی اور صلوٰۃ کو بھی جیسا کہ اس کی ردیف یعنی عید الفطر کی نماز کو بعض مفسرین نے سورہ بقرہ کی آیت شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (رمضان کا ایسا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا) میں جو ایسا ہی ایک جملہ یعنی لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (تا کہ تم اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو اس بات پر کہ اس نے تم کو توفیق دی) واقع ہے اس کا مدلول تفسیری کہا ہے پس ادھر دونوں یوم کے بعض احکام کا اشتراک اور ادھر ان دونوں میں اس جملہ کا اشتراک اور پھر جملہ سورہ بقرہ کا مفسر بصلوٰۃ العید ہونا اس جملہ سورہ حج کے مشتمل الصلوٰۃ العید ہونے کو قریب کئے دیتا ہے۔

پس اس تقریر پر یہ آیت مشتمل ہوگی ان ایام کی دو قسم کی طاعت کو ایک باطن جس کی یہ تعبیریں ہیں نیت تقرب واخلاص و تعظیم بالقلب اور ایک ظاہر جس کی یہ تعبیریں ہیں۔ صلوٰۃ تکبیرات۔ تسمیہ علی الذبحہ (ذبیحہ پر بسم اللہ پڑھنا) پس سامعین کو ان ایام میں دونوں امر کی رعایت ضروری ہے نہ صرف ظاہر پر کفایت کریں کہ قربانی اور نماز کا نام کرلیا اور بس اور نہ مدعیان کاذب کی طرح نرے باطن پر کفایت کریں کہ اخلاص ہی اصل ہے اور ہم اس اصل کو لئے ہوئے ہیں کہ یہ اعتقاد نری گمراہی ہے وعظ روح الارواح اس جامعیت کی ضرورت کے بیان میں قابل ملاحظہ ہے اور خود قرآن ہی کیسا اس میں واضح ہے کہ آیت میں دونوں امر سے تنصیصا تعرض ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کو فہم سلیم اور دونوں طاعتوں کے جمع کی توفیق دے۔

وجہ تسمیہ وعظ

اب میں اس تقریر کو ختم کرتا ہوں اور اس کا نام عود العید رکھتا ہوں۔ اس لئے کہ عود کے دو معنی ہیں ایک خوشبوئے خاص دوسرے ساز خاص اور چونکہ یہ تقریر مشتمل ہے دو طاعت کے بیان میں ایک ذبح جس میں اراقۃ دم ہوتا ہے اور یہ دم فی سبیل اللہ ہے اور بعض دماء فی سبیل اللہ کی نسبت حدیث میں ہے لونہ لون الدم وریحہ ریح المسک (اس کا رنگ خون کا رنگ ہے اور اس کی بو مشک کی خوش بو ہے) پس اس دم ذبیحہ کو بھی مشابہت دم شہید کے سبب حکما خوشبو قرار دے کر عود سوختنی سے تشبیہ دی گئی اور عود سے یہ مناسبت سمجھی گئی کہ ایک تو عود کو آگ سے مناسبت ہے اور دم طحال و کبد ولحم ذبیحہ کو بھی بوجہ پکائے جانے کے آگ سے تلبس ہے دوسرے اس عمل کی جزا جنت میں ہے اور جنت میں عود کا سلگنا حدیثوں میں آیا ہے سو طاعت اراقۃ کو تو عود کے ایک معنی سے مناسبت ہوئی دوسری طاعت یعنی تکبیر صلوٰتیہ یا غیر صلوٰتیہ اس کو جہر کے سبب عود کے دوسرے معنی سے مناسبت ہوئی۔ اس لئے ان معانی کی رعایت سے اس کا یہ نام مناسب ہوا نیز لفظی لطافت اس نام میں یہ ہے کہ اس کے متصل والی عید الفطر کے متعلق جو بیان ہوا تھا اس بیان کا نام عود العید رکھا گیا ایک حرکت کی تبدیلی کے بعد گویا وہی نام اس کا ہو گیا اور اس میں یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ عود تو آلات محرمہ سے ہے طاعت کو اس سے تشبیہ دینا خلاف ادب ہے بات یہ ہے کہ مجازات واستعارات وتشبیہات میں ایسی تنگی نہیں خود قرآن مجید میں متاع کی مذمت ہے اور حدیث میں امراۃ صالحہ کو خیر المتاع (نیک عورت کو بہترین پونجی) فرمایا گیا ہے۔ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عید ہی کے متعلق ارشاد ہے لکل قوم عید وھذا عیدنا (ہر قوم کے لئے عید ہے اور ہماری یہ عید ہے) ظاہر ہے کہ قوم کفار کی عید بمعنی لہو ولعب ہے تو ذوق لسانی میں ھذا عیدنا کا صاف مدلول یہ ہے کہ ھذا لعبنا تو مجازاً اس کو یوم اللعب کہہ دیا گیا اور حضرت علیؓ کا قول ہے۔

السیف والخنجر ریحاننا　　　اف علی الرجس والآس

شرابنا من دم اعدائنا　　　وکاسنا جمجمة الراس

(تلوار اور خنجر ہمارے پھول ہیں نرگس اور لیلہ پر تف ہے اپنے دشمنوں کا خون پیتے ہیں اور ہمارے پیالے ان کے سروں کی کھوپڑیاں ہیں) بہرحال یہ کوئی شبہ کی بات نہیں۔

ازالہ شبہ

بحمد اللہ اصل تقریر تو ختم ہو چکی اب ایک مختصر شبہ کا رفع کرنا باقی ہے۔ پس پھر مجلس ختم ہے وہ شبہ بھی ایسے شخص کو ہوگا جس نے میری تقریر حدیث **سنة ابیکم ابراهیم** (تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے) کے متعلق جو ابھی پرسوں کیرانہ میں ہوئی ہے جس کا نام میں نے سنت ابراہیم رکھا ہے سنی ہوگی یا بعد ضبط اس کی نظر سے گزرے گی اول میں اس تقریر کا خلاصہ عرض کرتا ہوں پھر اس سے جو شبہ ہو سکتا ہے اس کو ظاہر کروں گا پھر اس کا جواب دوں گا۔ وہ تقریر یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ نے عرض کیا **ما هذه الاضاحی یا رسول الله** یعنی یہ قربانیاں کیا چیز ہیں؟ آپ نے فرمایا **سنة ابیکم ابراهیم** (تمہارے ابا جان حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے) سو احقر نے اس میں یہ بیان کیا تھا کہ صحابہ نے قربانی کی حقیقت پوچھی تھی آپ نے حقیقت بیان فرمائی جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ سنت ہے ابراہیم علیہ السلام کی اور ظاہر ہے کہ سنت سے مراد ہر سنت تو ہے نہیں کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کا ہر فعل تو قربانی نہیں ہے بلکہ مراد سنت خاصہ ہے پس جواب یہ ہوا کہ **التضحیة سنة خاصة لابراهیم** (قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت خاصہ ہے) بس ایک مقدمہ تو یہ ہوا جو حدیث سے ثابت ہے اب دیکھنا چاہئے کہ وہ سنت خاصہ کون سا فعل ہے سو قرآن میں جو اس کے متعلق قصہ مذکور ہے اس میں ان کے دو فعل منقول ہیں ایک ذبح ولد دوسرا ذبح کبش فدیہ اور ہر چند کہ سرسری نظر میں جو آپ کا اخیر فعل ہے یعنی ذبح کبش وہ مصداق معلوم ہوتا ہے سنت ابراہیم کا لیکن اگر غور کر کے دیکھا جاوے تو اس بناء پر کہ اصل مامور یہ ذبح ولد تھا یہی احق ہے سنت کے مصداق ہونے کا پس دوسرا مقدمہ یہ ہوا کہ **سنة ابراهیم ذبح الولد** جو قرآن سے ثابت ہے اور اس کے عدم وقوع کو مانع ارادہ نہیں سمجھا جاوے کیونکہ ذبح بمعنی ذبح کردن جو کہ فعل اختیاری ہے وہ تو واقع ہوا البتہ اس کا اثر مطاوع یعنی مذبوح شدن واقع نہیں ہوا تو ذبح پر عدم وقوع کا حکم ہی غلط ہے نیز انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہے اور وحی میں غلطی کا احتمال نہیں اور خواب میں **انی اذبحک** (میں تجھے ذبح کر رہا ہوں) نص۔ ہے تو ضرور ذبح کو واقع کہا جاوے گا۔ پس جب یہ اس

کا مصداق ہوا تو اب عبارت جواب کی یہ ہوئی کہ التضحیة ذبح الولد (قربانی لڑکے کو ذبح کرنا ہے) اور ظاہر ہے کہ یہ حمل ظاہراً صحیح نہیں اور تصحیح ضروری ہے کیونکہ دونوں مقدمے صحیح ہوں تو نتیجہ ضرور صحیح ہوگا یعنی التضحیة ذبح الولد اور اس کا نتیجہ بالمعنی الاصطلاحی نہ سمجھا جاوے کیونکہ وہ لازم ہوتا ہے۔ صغریٰ اور کبریٰ کو اور یہاں سنة ابراهيم ذبح الولد جو مقدمہ ثانیہ ہے کلیہ نہیں مگر مدعا کا اثبات اس کے کبریٰ ہونے کے طور پر کیا بھی نہیں گیا بلکہ تقریر کی توجیہ یہ ہے کہ سنت سے مراد جب ذبح الولد ہے تو جملہ التضحیة سنة ابراهيم میں بجائے لفظ سنت ابراہیم کے لفظ ذبح الولد رکھ دو تو عبارت یہ بن جاوے گی کہ التضحیة ذبح الولد (قربانی کی صورت لڑکے کو ذبح کرنا ہے) اور یہی مدعا تھا غرض جب دونوں مقدمے صحیح ہیں تو مدعا بھی صحیح ہونا لازم ہے پس اس کو سمجھنا چاہیے۔ یہاں موضوع ومحمول میں دو دو احتمال ہونے سے کل چار احتمال اس حمل میں ہو سکتے ہیں ایک صورة التضحية صورة ذبح الولد (قربانی کی صورت لڑکے کو ذبح کرنا ہے) دوسرا روح التضحية روح ذبح الولد (قربانی کی صورت روح ہے ذبح الولد کی) تیسرا صورة التضحية روح ذبح الولد چوتھا روح التضحية ذبح الولد (روح قربانی کی ذبح ولد کی صورت ہے) اور بجز ثانی کے سب کا بطلان ظاہر ہے پس ثانی متعین ہو گیا یعنی ان دونوں فعل کی روح اور لب اور مغز ایک ہے مطلب یہ ہے کہ تضحیہ کی جو حقیقت اور مغز ہے وہ وہ ہے جو ذبح ولد کی حقیقت اور مغز ہے۔

اب یہ بات رہ گئی کہ وہ مغز ذبح الولد کا کیا ہے کہ اسی کو روح تضحیہ کہا جاوے گا سو وہ مغز ذبح الولد کا بالکل امر وجدانی ہے یعنی وہی امر ہے کہ تصور کیا جاوے کہ اگر بحکم حق میں ولد کو ذبح کر ڈالوں تو مجھ پر کیا حالت گزرے سو ظاہر ہے کہ سخت ناگواری طبعی گزرے اور ایسی حالت میں اس فعل کو کر ڈالنا یہ اس ناگواری طبعی کو برداشت کر لینا ہو پس وہ امر جو گزرے وہ یہ ہوا کہ طبعی ناگواری شدید کو خدا کے حکم سے برداشت کرنا اور اسی کو صوفیہ کی اصطلاح میں فناء نفس کہتے ہیں پس روح ذبح الولد کی فناء نفس ٹھہرا پس یہی فناء نفس روح تضحیہ کی ہوئی پس معنی جملہ التضحیہ ذبح الولد کے یہ ہوئے کہ روح التضحیہ روح ذبح الولد پس حقیقت تضحیہ کی فناء نفس ہوا۔

اور میں نے اس پر یہ حکم متفرع کیا تھا کہ جب روح اور حقیقت تضحیہ کی یہ ہے تو خود اس تضحیہ میں اور اس کے متعلق جمیع احکام واعمال میں نفس کا ذرا اتباع نہ کیا جاوے بالکل احکام شرعیہ کا اتباع کیا جاوے واجبات میں لزوماً اور مستحبات میں بطریق محبت پس یہ حاصل تھا اس تقریر کا اس تقریر سے یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ تقریر سنة ابراہیم سے تو قربانی کی حقیقت فناء النفس معلوم ہوتی ہے اور آج کی تقریر عود العید سے قربانی کی حقیقت تعظیم بالقلب معلوم ہوتی ہے جس کا ترجمان تکبیر باللسان ہے پس ان میں تدافع ہوتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ سنة ابراہیم میں حقیقت بمعنی ماہیت ہے چنانچہ حدیث میں حمل اس کی دلیل ہے اور

عودالعید میں حقیقت بمعنی غایت ہے چنانچہ قرآن میں لام کے لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ (تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نام لیں) اس کی دلیل ہے اور صوفیہ کی اصطلاح میں لفظ حقیقت کا اطلاق دونوں معنی میں شائع ہے۔ اس اصطلاح پر دونوں تقریروں میں لفظ حقیقت وارد ہو گیا بس کچھ تدافع نہ رہا اور باوجود اس کے میں نے تقریر عودالعید میں لفظ حقیقت کو بھی بچایا ہے۔ اب ختم کرتا ہوں اور اس غایت پر بھی میں وہی احکام متفرع کرتا ہوں جو سنت ابراہیم میں حقیقت تضحیہ یعنی فناء النفس پر متفرع کئے تھے۔ یعنی جب حکمت اس طاعت کی تکبیر بالقلب واللسان ہے اور اس تکبیر کے لئے لازم ہے نفس کی تصغیر پس کبیر کے مقابلہ میں صغیر کا اتباع نہ کیا جاوے کبیر ہی کے احکام کو متبوع اصل قرار دیا جاوے خلاصہ یہ ہے کہ ان احکام میں مثل جمیع احکام کے نفس کا ذرا اتباع نہ کیا جاوے پس ترجیح احکام المنصوص علی احکام النفوس لازم عام ہے وعظ سنت ابراہیم کی حقیقت کے لئے اور وعظ عودالعید کی غایت کے لئے سو اس طرح سے دونوں واعظوں کی تفریعات بھی متماثل ہو گئیں۔

بس دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو فہم صحیح اور توفیق عمل نصیب فرماویں۔ آمین

ترغیب الاضحیہ

قربانی کی ترغیب کے متعلق یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون ۷ اذیقعدہ
۱۳۳۰ھ بروز جمعہ تقریباً ایک گھنٹہ بیٹھ کر ارشاد فرمایا
سامعین کی تعداد تقریباً ایک سو تھی۔
مولانا عبداللہ صاحب رحمہ اللہ نے اسے قلمبند فرمایا

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ۔

اما بعد فقد ورد فی حدیث طویل قالوا ما ھذہ الاضاحی یا رسول اللہ قال سنۃ ابیکم ابراھیم۔ (الدر المنثور)

ترجمہ:۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ قربانیاں کیا چیز ہیں؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے۔

تمہید:۔ یہ ایک لمبی حدیث کا ٹکڑا ہے فضیلت اضاحی میں۔ اس وقت ایک مختصر سا مضمون اضاحی کے متعلق عرض کرتا ہوں ہر چند کہ خستگی سفر کی وجہ سے تکان تھا مگر بعض عزیز مہمان اس وقت آئے ہوئے ہیں ان کی وجہ سے خیال آیا کہ کچھ بیان ہو جائے اور اس قدر مقدم بیان کرنے کی اگرچہ ابھی ایام اضحیہ میں مدت زیادہ باقی ہے یہ وجہ ہے کہ پھر سفر کا ارادہ ہے خدا جانے پھر وقت ملے یا نہ ملے اس وقت فقط ترغیب کے لئے فضیلت بیان کرنا مقصود ہے باقی مفصل احکام اگر وقت ملا تو ان شاء اللہ تعالیٰ قریب زمانہ میں بیان کر دیئے جائیں گے مضمون مقصود سے پہلے ایک مضمون بطور تمہید کے بیان کیا جاتا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیسے کریم ہیں کہ ہمارے نفع کی کوئی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بغیر تبلیغ کے نہیں چھوڑی۔ قربانی، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ۔ یہ سب احکام اس وقت ہم کو ایک معمولی باتیں معلوم ہوتی ہیں اور ہم کو ان کی کچھ قدر نہیں یعنی جیسی قدر کرنا چاہیے اس درجہ قدر نہیں ہے۔

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمیشہ سے آباؤ اجداد سے سنتے چلے آئے ہیں جن لوگوں کو جستجو کے بعد یہ دولت ملی ہوگی ان کی کیا حالت ہوئی ہوگی جیسے بھوکا آدمی اگر آدھی روٹی بھی مل جاتی ہے تو غنیمت سمجھتا ہے اور اگر معدہ فاسد ہوگا تو اس کو پلاؤ زردے کی بھی قدر نہ ہوگی۔ چنانچہ صحابہؓ کے سوالات کے بعد جو جواب عنایت ہوئے ان کو تو بعد طلب ملے اور ہم کو مفت جیسا اس حدیث میں بھی ایسا ہی مضمون ہے تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی طرح ہم کو بھی ان کی قدر کرنا چاہیے اور یہ مضامین ثواب وعذاب کے وہ ہیں کہ کوئی شے ان سے زیادہ افضل وانفع ہمارے لئے نہیں ہے۔ ورنہ لازم آئے گا کہ (نعوذ باللہ) حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے دریغ فرمایا اور کام کی بات چھپائی۔ حالانکہ یہ بات ممکن نہیں اور باوجود نافع ہونے کے سہل اس قدر ہیں کہ کسی قسم کی تنگی ان میں نہیں ہے بلکہ ان احکام کا سہل ہونا یہ خود دلیل انفع ہونے کی ہے اس لئے کہ قاعدہ تکوینیہ ہے کہ جو شے زیادہ نافع ہوتی ہے وہ نہایت سہل الحصول ہوا کرتی ہے دیکھو آدمی اور سب حیوانات کو سب سے زیادہ ضرورت ہوا کی ہے کہ اگر ایک منٹ بھی ہوا نہ ہو تو حیات ہی معرض ہلاک میں آ جائے وہ ہی اس قدر ارزاں ہے کہ اس کی کچھ قیمت ہی نہیں اس کے بعد پانی کی ضرورت ہے وہ اس قدر سستا نہیں ہے لیکن اور چیزوں کے اعتبار سے ارزاں ہے اس کے بعد غذا کی ضرورت ہے وہ اس سے زیادہ گراں ہے اور جس شے کی بالکل ہی ضرورت نہیں ہے وہ نہایت گراں ہے جیسے جواہرات کہ عمر بھر بھی اگر کسی کو نہ ملیں تو کچھ حرج نہ ہو چنانچہ صدہا آدمی ایسے ہیں کہ وہ جانتے بھی نہیں کہ لعل کیا ہے اور زبرجد کس چیز کا نام ہے۔ اسی طرح جس قدر علوم زیادہ نافع اور کارآمد ہیں وہ نہایت سہل ہوتے ہیں چنانچہ علوم شریعت بھی ایسے ہی ہیں کہ نہایت ضروری اور سہل ہیں اور ہر جگہ ان کے بتلانے والے موجود ہیں اور وہ کوئی معاوضہ نہیں لیتے اور یہی راز ہے اس میں قرآن شریف کی تعلیم کرنے والے کثرت سے پائے جاتے ہیں اور نہایت قلیل معاوضہ پر مل جاتے ہیں بخلاف دیگر علوم کے کہ وہ کم ہیں اور گراں ہیں۔ غرض دیکھنے کی چیز نفع ہے نہ کہ مضمون کی۔ دوسرے صفات مثل نایابی یا رنگینی یا لذت یا غموض ونحو ذالک اکثر لوگ رنگین مضامین ڈھونڈا کرتے ہیں چنانچہ وعظ میں بھی اس کا تجسس رہتا ہے کہ جس وعظ میں مزے دار اشعار ہوں اور نکتے اور لطائف وحکایات ہوں اس کو پسند کرتے ہیں اور اگر کوئی واعظ مسئلے مسائل سنا دے اس سے بھاگتے ہیں حالانکہ یہ زیادہ نافع ہے۔ لیکن ان کو کیا معلوم ہے کہ ہمارے نفع کی کیا چیز ہے:

قال اللہ تعالیٰ وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ

(بہت سی مرتبہ تم ایک چیز کو ناپسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے بہتر ہوتی ہے اور بہت سی مرتبہ تم ایک چیز کو پسند کرتے ہو حالانکہ وہ تمہارے لئے نامناسب ہوتی ہے۔) حق تعالیٰ کی بڑی رحمت ہے کہ ایسے ایسے مضامین ہم

کو بتائے جو ہمارے کام آنے والے ہیں اور بے کار اور غیر ضروری مضامین ہم کو نہیں سکھائے گو وہ رنگین ہوں یہ تمام تقریر اس لیے عرض کی گئی کہ جو مضمون اس وقت بیان کیا جائے گا اس کو بے قدر اور معمولی نہ سمجھا جائے۔

حاصل یہ کہ ان مضامین نافعہ میں سے یہ مضمون بھی ہے کہ جو حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے ہم کو بتایا ہے حاصل اس کا یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کے متعلق ارشاد فرما رہے تھے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے دریافت فرمایا کہ یا رسول اللہ یہ قربانیاں کیا چیز ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے اس مضمون کو سن کر لوگ کہیں گے کہ قربانی کی اس میں کیا فضیلت ہوئی لیکن سمجھدار کے لئے یہ بڑی بھاری فضیلت ہے بلکہ جس قدر فضائل قربانی کے آئے ہیں ان میں سب سے بڑی فضیلت یہی ہے چنانچہ عنقریب واضح ہو جائے گا۔

نکات حدیث قربانی

درمیان میں جملہ معترضہ کے طور پر عرض کیا جاتا ہے کہ سنة ابیکم ابراھیم (تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام) کیوں فرمایا سنة ابراھیم فرما دیتے ابیکم (تمہارے باپ) کا لفظ کیوں بڑھایا اس کے متعلق دو اعتبار سے کلام ہے اول تصحیح کے اعتبار سے کہ ابراہیم علیہ السلام کو تمام امت کا باپ کیسے فرما دیا۔ دوسرے غرض کے اعتبار سے کہ اس نسبت کی تصریح سے کیا فائدہ نکلا۔ سو تصحیح کے اعتبار سے تو یہ ہے کہ ابیکم فرمانا ایک تو اس طرح اس لئے صحیح ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اکثر عرب کے باپ ہیں اس لئے کہ اکثر عرب بنو اسماعیل ہیں اور اسماعیل علیہ السلام بیٹے ہیں براہیم علیہ السلام کے اس لئے ابیکم فرمایا لیکن چونکہ آیت میں خطاب تمام امت کو ہے اس لئے کہ احکام مخصوص اہل عرب کے ساتھ تو ہیں نہیں اس لئے بہتر وجہ دوسری ہے کہ ابیکم سے مراد روحانی باپ لئے جائیں اس لئے کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے روحانی باپ ہیں اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہمارے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت قرب ہے۔ نسباً بھی اور شریعۃً بھی۔ نسباً تو ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں ہیں اور شریعۃً اس لئے کہ شریعت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام شریعت ابراہیمی سے بہت ملتی جلتی ہے اصولاً بھی اور فروعاً بھی اسی واسطے فرمایا ہے۔

فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا یعنی اتباع کرو ملت ابراہیم علیہ السلام کا یہاں پر ایک شبہ ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت تو تمام ملل و ادیان کی ناسخ ہے پھر ملت ابراہیمی کے اتباع کا آپ کو امر کیوں فرمایا۔ جواب یہ ہے کہ ملت ابراہیم علیہ السلام کے اتباع کا امر اس حیثیت سے نہیں ہے کہ وہ ملت ابراہیم ہے بلکہ اس اعتبار سے ہے کہ وہ شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور ملت ابراہیمی بھی اس

کا ایک لقب ہے اور یہ لقب اس لئے ہے کہ یہ دونوں ملتیں آپس میں اصولاً وفروعاً باعتبار فروع کثیرہ کے متناسب ومتوافق ہیں اور اسی واسطے یہ نہیں فرمایا کہ اتبعوا ابراھیم کہ ابراہیم علیہ السلام کا اتباع کرو بلکہ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ (حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کا اتباع کرو) فرمایا اس کی ایسی مثال ہے جیسے کہا جائے کہ مذہب حنفی اختیار کرو تو اس کے یہ معنی نہیں کہ شریعت نبویہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دو بلکہ مطلب یہ ہے کہ اتباع شریعت میں جو امام ابوحنیفہؒ کا مسلک ہے وہ اختیار کرو اب یہاں سے ان معترضین کا اعتراض بھی جاتا رہے گا جو مقلدین امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت کہا کرتے ہیں کہ یہ لوگ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا اتباع کرتے ہیں۔

ابوّۃ روحانی

الحاصل جب یہ امر ثابت ہو گیا کہ ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ابراہیم علیہ السلام سے دینی بھی بہت قرب ہے اور نسبی بھی کہ ابراہیم علیہ السلام آپ کے باپ ہیں تو اب یہ سمجھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے روحانی باپ ہیں اور اس کی تین دلیل ہیں اول وجہ عقلی ہے وہ یہ کہ دیکھنا چاہیے کہ باپ بیٹے کے ساتھ کیا کیا کرتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ باپ کا کام یہ ہے کہ محنت مشقت جھیلتا ہے اپنے اوپر طرح طرح کے مصائب اٹھاتا ہے جس طرح اس سے ہوسکتا ہے اولاد کو پرورش کیا کرتا ہے اسی طرح ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ روحانی پرورش فرماتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کے واسطے باپ کی طرح بلکہ زیادہ قسم قسم کی تکالیف برداشت فرمائیں اور امت کی تربیت میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا پس آپ روحانی باپ ہوئے۔ دوسرے یہ کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَاَزْوَاجُهٗۤ اُمَّهٰتُهُمْ یعنی نبی مومنین کے ساتھ ان کے نفوس سے بھی زیادہ قریب ہیں اور نبی کی بیبیاں ان کی مائیں ہیں جب آپ کی بیبیاں ہماری مائیں ہیں حالانکہ وہ مربی امت نہیں ہیں۔ صرف مربی کی بیبیاں ہیں تو خود آپ جو کہ مربی ہیں ضرور باپ ہیں اور اس ابوۃ وامومیت کو اس درجہ قوت ہے کہ نبی کی بیبیوں سے بعد وفات کے نکاح بھی حرام ٹھہرا۔ تیسری دلیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَاۤ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ. یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں لوگوں کو سن کر حیرت ہوگی کہ اس آیت سے باپ ہونے پر کیسے استدلال ہوسکتا ہے۔ بلکہ اس سے تو ابوۃ کی نفی مستنبط ہوتی ہے لیکن بعد تقریر مقصود کے ان شاء اللہ تعالیٰ واضح ہو جائے گی کہ اس سے نہایت صاف طور پے ابوۃ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سمجھی جاتی ہے جس میں کلام ہو رہا ہے اول ایک مقدمہ عرض کرتا ہوں وہ یہ کہ نحو کا قاعدہ ہے کہ لکن کے ماقبل اور مابعد میں تضاد ہوتا ہے اور لکن کا مابعد ایک شبہ کا جواب ہوتا ہے جو لکن کے قبل سے پیدا ہوا ہے جیسے کہتے ہیں کہ زید آ گیا لیکن اس کا بھائی نہیں آیا۔ اب اس آیت میں غور فرمایئے کہ لکن کے ماقبل اور مابعد میں تضاد بظاہر سمجھ میں نہیں آتا اس لئے باپ نہ ہونے اور رسول ہونے میں کیا تضاد ہے۔ حالانکہ تضاد ہونا چاہیے تو غور کرنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے وہ یہ کہ جب فرمایا۔

مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں) تو اس سے شبہ ہوا کہ جب حق تعالیٰ نے ابوۃ کی نفی فرما دی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے کسی قسم کے باپ نہیں ہوں گے۔ اس لئے آگے لکن سے اس شبہ کو دفع فرماتے ہیں کہ ہاں ایک قسم کے باپ ہیں وہ یہ کہ رسول اللہ ہیں یعنی روحانی باپ ہیں۔ کہ تمہاری روحانی تربیت فرماتے ہیں پس اگر رسول کی دلالت معنی ابوۃ پر معتبر نہ کی جائے تو کلام میں ربط نہ ہوگا۔ غرض عقلاً و نقلاً ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے باپ ہیں اور ابراہیم علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نسبی باپ ہیں تو ثابت ہو گیا کہ ابراہیم علیہ السلام ہمارے باپ کے باپ ہیں۔ اس لئے کہ جب صرف زوجیت کے تعلق سے آپ کی بیبیوں کو ہماری مائیں فرما دیا تو نسبی تعلق تو اس سے زیادہ ہے اور قرآن شریف میں بھی آیا ہے ملة ابیکم ابراهیم یہاں تو ظاہر ہی ہے کہ روحانی باپ مراد ہیں کیونکہ خطاب یقیناً عام ہے یہ کلام تو صحیح میں تھا۔

اسلوب ترغیب

اب سمجھئے کہ غرض اور نکتہ اس لفظ کے بڑھانے میں کیا ہے کیا سنة ابیکم ابراهیم کافی نہ تھا بات یہ ہے کہ باپ شفیق بیٹے کو قسم قسم سے سمجھایا کرتا ہے اور ہر وقت اسی دھن میں رہتا ہے کہ ایسے عنوان سے اس کو سمجھانا چاہیے کہ موثر ہو جائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ باپ ہیں بلکہ باپ سے زیادہ شفیق ہیں اس لئے ترغیب کے موثر ہونے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عنوان کو اختیار فرمایا ہے تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان کی طبعی بات یہ ہے کہ اس کو اپنے باپ دادا سے اور ان کے رسم و رواج سے نہایت تعلق ہوتا ہے اور اس رسم کا دل سے نکلنا بہت بھاری ہے چنانچہ جب کفار کو بت پرستی سے روکا جاتا تھا یا آج کل کی رسم مرجہ کو روکا جاتا ہے تو بڑا جواب یہ ہوتا ہے کہ اوپر سے اسی طرح ہوتی آئی ہے غرض خاندانی بات کی بڑی پچ ہوتی ہے۔ اور یہی حکمت ہے حدیث الائمة من قريش (مسند احمد) میں کہ وہی تخصیص کی وجہ ہے وہ یہ کہ دین اسلام کا ظہور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوا اور آپ قریش میں سے ہیں تو گویا دین قریش کے گھر کی چیز ہے سو جس قدر ان کو حمایت دین کی ہوگی اس

قدر دوسرے کو نہ ہوگی باقی یہ کہ بنی ہاشم کو خاص کیوں نہیں کیا تو وجہ یہ ہے کہ بنی ہاشم بہ نسبت قریش کے بہت کم ہیں اور قریش زیادہ ممکن ہے کہ ان میں سے کسی وقت صاحب صلاحیت کی تلاش میں دقت ہوتی بہر حال اس حکمت سے تائید ہوگئی کہ خاندانی شے سے بہت تعلق ہوتا ہے اور خصوصاً عرب میں کہ وہاں حمیت قومی کا بڑا جوش تھا جب یہ ثابت ہوگیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ترغیب دینے کے لئے فرماتے ہیں کہ میاں یہ قربانی کرنا تو کوئی باہر کی بات نہیں ہے یہ تو تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ ہے یہ تو خاندانی مذہب ہے اس کو کیوں چھوڑتے ہو۔ دیکھا آپ نے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت پر کس قدر شفقت ہے کہ طرح طرح کے عنوانوں سے آپ ہم کو ترغیب دیتے ہیں کہ شاید عنوان موثر ہو جائے شاید وہ عنوان کافی ہو جائے اللہ اکبر۔ بہر حال مقصود فضیلت بیان کرنا ہے اضحیہ کی۔

اثبات فضیلت

رہا یہ امر کہ اس سے فضیلت کیسے ثابت ہوئی تو اس کا سمجھنا چند مقدمات کے سمجھنے پر موقوف ہے اول یہ معلوم کرنا چاہیے کہ ابراہیم علیہ السلام کی سنت جو فرمایا تو اس کی کیا وجہ ہے ابراہیم علیہ السلام نے کیا کیا تھا کہ جس کی وجہ سے اضحیہ سنت ابراہیمی ہوئی سو کوئی مسلمان ایسا نہ ہوگا کہ اس کو معلوم نہ ہو کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ انہوں نے یہ کیا تھا کہ بامر الٰہی اپنے پیارے بیٹے کے ذبح کرنے کا عزم مصمم کر لیا تھا۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ عزم شئے اس شیء کے کر دینے کے حکم میں ہے جو ثواب یا عقاب کسی فعل کے ارتکاب کرنے پر مرتب ہوتا ہے۔ وہ ہی اس فعل کے عزم پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ دیکھئے اگر دولہا کے پاس جو بیوی کو پہچانتا نہ ہو کسی عورت کو اجنبی عورت کو کہہ کر بھیج دیا جائے حالانکہ وہ اس کی منکوحہ ہو اور وہ اس سے مجامعت کرے تو زنا کا گناہ ہوگا اور اگر منکوحہ بتلا کر اجنبی کو بھیج دے تو کچھ گناہ نہیں ہے اسی طرح اگر حلال کھانے کو کسی نے مغصوب کہا تو اس کا کھانا حرام ہے اور اگر حرام کو حلال کہہ دیا اور اس کا کوئی شبہ تو یہ نہیں ہوا تو اس کا کھانا حلال ہے ان مسائل سے معلوم ہوا کہ ثواب وعذاب کا مدار عزم پر ہے تو گو ابراہیم علیہ السلام نے ذبح نہیں کیا لیکن عزم تو فرمایا بلکہ فعل کا وجود بھی ہوا گو اثر مرتب نہیں ہوا یعنی چھری پھیر دی اور یہی سمجھ کر چھری پھیری کہ بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں لیکن حق تعالیٰ نے بجائے ان کے مینڈھے کو بھیج دیا۔ پس حسب قاعدہ مذکورہ ان کو تو فضیلت ذبح ولد کی حاصل ہوگئی تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ دیکھنا چاہیے کہ بیٹے کے ذبح کرنے اور اللہ کی راہ میں نثار کرنے کا کتنا ثواب ہے تو قواعد شرعیہ سے یہ امر معلوم ہوتا ہے کہ جس شئے کو خرچ کیا ہے وہ جس قدر زیادہ محبوب ہوگی اسی قدر زیادہ ثواب ہوتا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (تم ہرگز بھلائی حاصل نہ کر سکو گے جب تک کہ اپنی محبوب چیز خرچ نہ کرو) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس قدر زیادہ محبوب کا انفاق ہوگا اسی قدر

بر حاصل ہوگی اگر کوئی کہے کہ اس آیت سے تو نفس بر کا حاصل ہونا معلوم ہوا۔ فضیلت اس سے کیسے معلوم ہوئی جواب یہ ہے کہ بر سے مراد بر کامل ہے اور دلیل اس کی اگلی آیت ہے فرماتے ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ یعنی یوں جو بھی تم خرچ کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والے ہیں یعنی اس کا ثواب دے ہی دیں گے تو اس آیت سے معلوم ہوا کہ خواہ محبوب شئے خرچ کی جائے یا غیر محبوب ثواب تو ہر صورت میں ہوتا ہے اس لئے کہ شئے بیان ہے ما کا اور وہ عام ہے شامل ہے ہر قلیل و کثیر کو پس خلاصہ دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ نفس ثواب تو تم کو ہر شئے کے انفاق میں مل جائے گا لیکن بر خاص محبوب ہی کے انفاق میں ہے۔ تو یہ اسلوب دال ہے اس پر کہ بر سے مراد ثواب کامل ہے پس وہ مدعا ثابت رہا کہ شئے منفق جس درجہ محبوب ہوگی اسی درجے کا ثواب زیادہ ہوگا پس جب یہ امر ثابت ہو چکا تو دیکھنا چاہئے کہ بیٹے سے آدمی کو کس قدر محبت ہوتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ بیٹے کے ساتھ اپنے نفس سے زیادہ محبت ہوتی ہے اپنے لئے جو کمال انسان کو محبوب ہوتا ہے وہ ہرگز نہیں چاہتا کہ دوسرے کو ہو لیکن بیٹے کے لئے چاہتا ہے کہ ہر کمال میں مجھ سے بڑھ جائے ان مقدمات سے ثابت ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے وہ کام کیا کہ اس سے بڑھ کر ہو نہیں سکتا۔ تو ظاہر ہے کہ اس کا ثواب نہایت ہی عظیم الشان ہوگا۔

اس کے بعد معلوم کرنا چاہیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اضحیہ کو سنت ابراہیم علیہ السلام فرمایا ہے حالانکہ جو عمل ابراہیم علیہ السلام نے کیا وہ اور ہے اور تضحیہ دوسرا عمل ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کا عمل ذبح ولد ہے اور تضحیہ ذبح حیوان ہے۔ پھر اضحیہ سنت ابراہیمی کیسے ہوئی تو یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ ہم کو اضحیہ میں اسی قدر ثواب ملے جس قدر کہ ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد میں ملا تھا۔ دونوں عملوں کی غایت کی اتحاد کی وجہ سے دونوں عمل کو ایک فرمایا گو عمل متغائر ہوں گویا یہ فرمایا اے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم تم کو جانور کے ذبح میں وہی اجر ملے گا جو ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد میں ملا تھا۔ دیکھئے کہ کس قدر فضیلت اضحیہ کی اس حدیث سے معلوم ہوئی اور ایک نکتہ اس سے اور معلوم ہوا وہ یہ کہ جب کوئی بادشاہ انعام تقسیم کرتا ہے جو لوگ زیادہ مقرب ہوتے ہیں اور مرتبہ ان کا زیادہ ہوتا ہے ان کو ان کے مرتبے کے موافق انعام ملا کرتا ہے پھر ان سے جو کم درجے کے ہیں ان کو اسی درجے کا انعام ملے گا۔ مثلاً وزراء وارکان دولت کو بہت بڑا انعام ملے گا اور ادنیٰ ادنیٰ چپڑاسیوں اور خدام کو کم۔ پس حق تعالیٰ کے نزدیک انبیاء علیہم السلام کا مرتبہ سب مخلوق سے زیادہ ہے اور انبیاء علیہم السلام میں ابراہیم علیہ السلام بہت بڑے جلیل القدر ہیں کہ خلیل اللہ ہیں تو جو انعام ان کو دیا گیا ہوگا ظاہر ہے کہ بہت بڑا انعام ہوگا کہ باوجود اتحاد فعل کے بھی دوسرے شخص کو اتنا انعام نہ دیا جانا چاہیے۔ یعنی اگر یہی فعل ذبح ولد کا دوسرا کرتا تو وہ اس قدر انعام پانے کا مستحق نہ سمجھا جاتا جس قدر کہ ابراہیم علیہ السلام کو دیا گیا ہے اور جہاں فعل بھی اس فعل سے

ادون ہوا وہاں تو اتنا ملنے کی گنجائش ہی نہیں مگر باوجود اس کے کہ یہ عمل ہمارا ذبح ولد سے بدرجہا ادون ہے پھر وہی انعام ہمارے لئے تجویز ہوا ہے اللہ اکبر کتنا بڑا انعام ہے اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ برکت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کیسا لطف وکرم ہے یہ فضیلت تو اضحیہ کی ایسی ہے کہ اگر کسی کے ذمہ واجب بھی نہ ہوتو اس ثواب کی تحصیل کے واسطے وہ بھی نہ چوکے اور جس طرح بن پڑے بغیر کئے نہ رہے۔

قربانی پر انعام

آخر دنیا کے بہت سے کام بلا ضرورت محض تفریح کے واسطے کرتے ہو اللہ تعالیٰ کی رضا مندی کے لئے اگر تھوڑا سا خرچ کر دو گے تو کیا حرج ہوگا اور اگر ضرورت ہی پر مدار رکھتے ہو اور یوں کہتے ہو صاحب جو فرائض و واجبات ہیں ہم تو وہی ادا کریں گے۔ تو دنیا کے کاموں میں اس پر عمل کیوں نہیں۔ ضرورت تو اس قدر ہے کہ سد رمق جو کی روٹی اور گرمی سردی مہلک سے بچاؤ کے واسطے گاڑھے گزی کا کپڑا مل جاوے پھر یہ پلاؤ اور زردے اور کوفتے کیوں کھاتے ہو اور ململ وتن زیب و مخمل کیوں پہنتے ہو۔ اللہ اکبر نفس کے خوش کرنے کو تو غیر ضروری کام بھی کر لیں اور دین کے کام میں یہ پوچھتے ہیں کہ صاحب کیا بہت ضروری ہے اس کے معنی تو یہ ہیں کہ اگر اس کا ترک بہت بڑا حرج ہے تو اس کا اہتمام کریں ورنہ ترک کر دیں صحت اعتقاد کے لئے تو بیشک ضرور پوچھو کہ ضروری ہے یا نہیں کیونکہ ضروری کو ضروری اور غیر ضروری کو غیر ضروری اعتقاد رکھنا ضروری ہے لیکن کرنے کے لئے تو یہ پوچھنا کافی ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ اس سے خوش ہوتے ہیں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اس عمل سے خوش ہوتے ہیں بلا تامل نہایت مستعدی اور رغبت سے اس کو کرو بہت لوگ محبت دین کا دم بھرتے ہیں اور بدنی اعمال میں مستعد ہیں لیکن روپیہ خرچ کرنے کا جہاں وقت آیا تو وہ حیلہ حوالہ کرتے ہیں اس پر مجھ کو ایک حکایت یاد آئی کہ ایک بدو کو کسی نے دیکھا کہ نہایت پریشان بدحواس ہے اور رو رہا ہے اور پاس روٹیوں کا تھیلا بھرا رکھا ہے کسی نے پوچھا کہ کیوں روتے ہو کہا کہ میرا کتا مر رہا ہے اس شخص نے کہا کہ تھیلے میں کیا ہے کہنے لگا روٹیاں ہیں اس نے کہا کہ پھر اس کو کیوں نہیں دیتا۔ کہنے لگا کہ اتنی محبت نہیں رکھتا کہ روٹی دوں کہ اس کو دام لگے ہیں صرف آنسو بہانے کی محبت ہے کہ مفت کے ہیں تو بعض لوگوں کی محبت کا دعویٰ بھی ایسا ہی ہوتا ہے کہ جہاں ٹکا خرچ ہو وہاں صفر ہے اور یہاں تو درحقیقت خرچ بھی نہیں ہوتا کیونکہ صدقات وخیرات میں جو کچھ خرچ ہوتا ہے وہ کہیں جاتا نہیں جو کچھ ہے اپنے ہی لئے ہے بلکہ قربانی تو ایسی شئے ہے کہ کچھ ہاتھ سے بھی نہیں نکلتا اس لئے ثواب کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اجزاء قربانی کے تقسیم ہی کر دو بلکہ اختیار ہے خواہ تقسیم کر دو یا خود منتفع ہو، ہاں بیچنے کی اجازت نہیں ہے۔ غرض سب اپنے پاس رکھو جب بھی ثواب ملتا ہے۔

کیا قربانی خلاف عقل ہے

اگر کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ خرچ کرا کر لیتے بھی نہیں پھر کیا چیز مطلوب ہے کیوں خرچ کرواتے ہیں اس سے مقصود کیا ہے۔ اگر کہو گوشت کھلانا ہم کو منظور ہے تو منیٰ اور مکہ معظمہ میں ہزاروں جانور ذبح ہوتے ہیں ان کا کوئی گوشت بھی نہیں کھاتا بالکل ضائع ہوتے ہیں اور یہ عقل کے خلاف ہے تو جواب اس کا یہ ہے کہ جناب من ہے تو فحش بات لیکن تفہیم کے لئے عرض ہے کہ اگر تمہاری عقل میں کسی شئے کا نہ آنا خلاف عقل ہونے کی دلیل ہے تو ہمارا آپ کا پیدا ہونا جس طریقے سے ہے وہ بھی عقل کے خلاف ہے اور اس کا امتحان یہ ہے کہ ایک بچہ ایسا تجویز کیا جائے کہ وہ تہہ خانہ میں پرورش کیا جائے اور اسکے سامنے کبھی اس کا تذکرہ نہ کیا جائے کہ آدمی کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ جب بیس برس کا ہو جائے تو اس سے دفعۃً کہا جائے کہ آدمی اس طور سے پیدا ہوتا ہے تو ہرگز اس کی عقل میں نہ آئے گا اور ہم چونکہ رات دن دیکھتے ہیں سنتے ہیں کہ اس طریقے سے انسان پیدا ہوتا ہے اس لئے ہم کو خلاف عقل معلوم نہیں ہوتا تو جناب ہم تو جب سے پیدا ہوئے ہیں ہمارے تمام حالات ہی خلاف عقل ہیں۔ ہماری عقل تو بس کھانے کمانے کی ہے۔ ایسے ہی جیسے کسی بھوکے سے پوچھا تھا کہ دو اور دو کتنے ہوتے ہیں کہا کہ چار روٹیاں۔ ایسے ہی ہماری عقل صرف اس قدر ہے کہ کھالو اور پی لو اور باتیں بنالو۔ جب اتنی عقل ہے تو اسرار شریعت کہاں سے سمجھ میں آئیں۔ ایسے ہی نفس اضحیہ بلا تقسیم لحم کے بھی حکمت ہے اگر ہماری عقل میں نہ آئے تو قابل انکار کیسے ہوگئی اور اس لئے ہمارے ذمہ ضروری نہیں ہے کہ اس حکمت و راز کو بیان کریں لیکن تبرعاً بتائے دیتے ہیں کہ وہ یہ کہ اصل میں یہ سنت ابراہیمی کا اتباع ہے اور شئے محبوب کا انفاق مقصود ہے اور وہ صرف جانور ذبح کرنے سے حاصل ہو جاتا ہے گوشت خواہ رکھیں یا تقسیم کریں دوسری بات یہ ہے کہ اصل عمل تو یہ تھا کہ بیٹے کو ذبح کریں لیکن اول تو سب کے بیٹا ہوتا نہیں دوسرے یہ کہ اگر یہ حکم ہوتا تو بہت کم ایسے نکلتے جو یہ عمل کرتے یہ حق تعالیٰ کا فضل ہے کہ جانور کو قائم مقام ذبح ولد کے کر دیا اور یہاں سے ایک امر اور بھی ثابت ہوا وہ یہ ہے کہ جب قائم مقام ولد کے ہے تو اس جانور کے اندر ضرور ایسے صفات ہونا ضروری ہیں کہ جن سے قائم مقام ولد کے ہو اور وہ یہ کہ خوب موٹا تازہ جانور ہو کہ جس کو ذبح کرتے ہوئے کچھ تو دل دکھے جیسے ذبح ولد میں دل دکھتا ہے۔ بالکل مریل نہ ہو کہ جس کے ذبح ہو جانے کو غنیمت سمجھے کہ مرتا تو یہ ضرور خیر اچھا ہوا اس سے یہی کام نکل آیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک ناقہ ذبح کی تھی جس کی قیمت تین سو اشرفیاں تھیں۔ یہ جو لوگوں کی عادت ہے کہ ردل خدل کم قیمت جانور ذبح کر دیتے ہیں یاد رکھو کہ وہاں بھی ایسا ہی ملے گا اور جب کہ وہ پھر تم کو ہی ملنے والا ہے تو جس قدر اس میں خرچ کرو گے اپنی ہی واسطے ہے۔

اضاعۃ مال کا شبہ

اور یاد رکھو صدقہ سے مال گھٹتا نہیں حدیث شریف میں ہے۔ **لا ینقص مال من صدقۃ قط** (صدقہ دینے سے مال کم نہیں ہوتا) (مسند احمد) اور اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اگر دس روپے پاس تھے تو دس ہی رہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ برکت ہوتی ہے اور کام آتا ہے اگر صدقہ نہ دیتا تو وہ ادھر ادھر ضائع ہو جاتا اور صدقہ دینے سے جس قدر باقی رہتا ہے وہ سب اسی کے کام آتا ہے اور اس میں برکت ہوتی ہے۔ اس لئے یہ کہنا کہ قربانی میں مال ضائع کرنا ہے جیسے آج کل نوتعلیم یافتہ اصحاب کا خیال ہے سراسر غلط ہے۔ اور قربانی کا مقصود اظہار محبت ہے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اور وہ اس میں حاصل ہے۔ پھر مال ضائع کہاں ہوا اور اگر کہا جائے کہ جی دکھتا ہے کہ ہماری شئے جاتی رہی جواب یہ ہے کہ وہ تمہاری شئے ہے کہاں تم خود تو اپنے ہو ہی نہیں تمہاری شئے کہاں سے آئی تم خود مملوک ہو غلام کسی شئے کا مالک نہیں ہوا کرتا اگر کوئی کہے کہ ہم مملوک نہیں ہیں اول تو کون ایسا ہوگا جس کا یہ اعتقاد ہو کہ ہم اللہ کے مملوک نہیں ہیں دوسرے یہ کہ اس کی ایک دلیل بھی ہے وہ یہ کہ دیکھو خودکشی حرام ہے اگر تم اپنے مالک ہوتے تو اپنے اندر جو چاہتے تصرف کر سکتے تھے۔ پس آپ بھی خدا کے ہیں اور جانور بھی خدا کے اگر کوئی کہے کہ جناب مال خرچ کرنے سے تو دل تنگ نہیں ہوتا بلکہ اس سے دل دکھتا ہے کہ جانور کی جان ضائع ہوتی ہے جواب یہ ہے کہ آپ بے فکر رہیے جب خود مالک ہی ضائع کرائے تو آپ کون ہیں بڑے دردمند نکل کر آئے ہیں۔

ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر ست (جس عیب کو بھی بادشاہ پسند کرے وہ ہنر ہے)

چوں طمع خواہد زمن سلطان دین خاک برفرق قناعت بعد ازیں

(اگر دین کا بادشاہ مجھ سے یہ خواہش کرے کہ میں لالچ اور حرص کروں تو اس کے بعد قناعت پر خاک ڈال دینا چاہیے)

اور اگر کسی طرح اس کی حکمت سمجھ میں نہ آئے تو اس طرح سمجھو کہ بعض دوائیں تو موثر بالکیفیت ہوتی ہیں اور بعض موثر بالخاصہ۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ نصوص سے ثابت ہوگیا کہ یہ اعمال صالحہ موثر بالخاصہ ہیں ہم کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمانے سے معلوم ہوا کہ اضحیہ ہمارے لئے نافع ہے۔ اس میں یہ خاصہ ہے کہ ہم کو لم اور علت معلوم نہیں ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اے عزیز محمد بن زکریا طبیب اگر کہہ دیں کہ فلاں دواء میں یہ خاصہ ہے تو اس کے کہنے پر تو ایسا یقین رکھتا ہے کہ اس میں شبہ ہی نہیں ہوتا اور محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) اگر کسی فعل کا خاصہ بیان فرما دیں تو اس میں تجھ کو شبہ ہوتا ہے۔ بفضلہ تعالیٰ بقدر ضرورت فضیلت اضحیہ کی ثابت ہوگئی۔ اس وقت میں اسی پر اکتفا کرتا ہوں۔ فقط

اَلضَّحَایَا

۷ ذی الحجہ ۱۳۳۱ھ کو جامع مسجد تھانہ بھون میں ''فضائل قربانی'' کے موضوع پر ۲ گھنٹہ چالیس منٹ تک بیٹھ کر بیان فرمایا۔
سامعین کی تعداد تقریباً ۲ صد تھی ۔ حضرۃ مولانا محمد عبداللہ گنگوہی مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلَیْہِ وَعَلٰٓی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمْ . امابعد
فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللہ الرحمن الرحیم
وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ کُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ لِّیَشْھَدُوْا مَنَافِعَ لَھُمْ وَیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ فِیْٓ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَھُمْ مِّنْۢ بَھِیْمَۃِ الْاَنْعَامِ. فَکُلُوْا مِنْھَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِیْرَ

ترجمہ:۔اور (حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ بھی کہا گیا کہ) لوگوں میں حج فرض ہونے کا اعلان کر دو کہ جس سے کہ لوگ تمہارے پاس حج کو چلے آئیں گے پیادہ بھی اور جو اونٹنیاں سفر کے مارے دبلی ہوگئی ہوں گی ان اونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی تا کہ اپنے دینی اور دنیوی فوائد کے لئے آ موجود ہوں اور (اس لئے آئیں گے) تا کہ ایام مقررہ (یعنی ایام قربانی) میں ان مخصوص چوپایوں پر اللہ کا نام لیں (یعنی بسم اللہ اللہ اکبر) کہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کئے ہیں پس (ان قربانی کے جانوروں میں سے تم (کو) بھی اجازت مع الاستحباب ہے کہ) کھایا کرو اور (مستحب ہے کہ) مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلایا کرو۔

تمہید:۔ یہ چند آیتیں ہیں جن کا موقع ہے تو حج کے متعلق مگر چونکہ حج مناسک میں بعض ایسے امور بھی ہیں کہ وہ غیر حج میں بھی پائے جاتے ہیں اور ان آیات میں ان بعض مناسک کا ذکر ہے۔ بلکہ اس کے متعلقات کا بھی ذکر ہے۔ اس لئے ان آیتوں کو تلاوت کیا گیا اور وہ قربانی ہے جو ان آیتوں میں مذکور ہے اور اس کے بعض متعلقات بھی مذکور ہیں جس کے اندر غور کرنے سے اس کے فضائل بھی معلوم ہوتے

ہیں لیکن قبل اس کے کہ میں ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر بیان کروں اول ایک مقدمہ سمجھ لینا چاہیے وہ یہ ہے کہ عبادت کی فضیلت کے اسباب ہوا کرتے ہیں اور ان اسباب کی وجہ سے عبادت کے فضائل دو قسم کے ہو گئے ہیں۔ ایک تو وہ فضائل جو مشترک ہوں تمام عبادات میں اور دوسرے وہ جو مختص رہوں پھر جو مشترک فضائل ہیں ان کی دو قسمیں۔ ایک وہ جو حقیقۃً عبادت کے اعتبار سے ہوں مثلاً عبادت مطلقہ کی حقیقت ہے۔ تذلل اور افتقار ظاہر کرنا سوا لا بے نیاز کی درگاہ میں اس حقیقت میں تمام عبادات مشترک ہیں اور اس کے اعتبار سے جو فضائل ہوں گے وہ مشترک ہوں گے۔ دوسرے وہ فضائل ہیں جو آثار و عوارض مشترکہ کے اعتبار سے ہیں اور وہ بھی مشترک ہوں گے اور ان عوارض و آثار میں غایات بھی داخل ہیں۔ مثلاً مطلق عبادت کی غایت ابتغاء مرضات اللہ ہے۔ یعنی اللہ کی رضامندی کا طلب کرنا یعنی عبادت کا عبادت ہونا اس پر موقوف ہے کہ اس سے مقصود حق تعالیٰ کی رضا ہو اگر یہ نہ ہو تو وہ عبادت عبادت نہیں ہے محض صورت عبادت ہے۔ جیسے اگر کسی شخص نے بلا وضو نماز پڑھی یعنی نماز کی ہیئت بنائی۔ تو نماز کے اجزاء تو ظاہراً پائے گئے مگر چونکہ اس میں ایک شرط مفقود ہے اس لئے اس کو نماز نہ کہیں گے۔ جب شرط کے مفقود ہونے سے جو کہ اصلی مقصود بھی نہیں نماز نہیں ہوتی۔ تو جو غرض اصلی ہے یعنی اِبْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ مفقود ہو تو نماز کیسے ہوگی۔ مثلاً نماز پڑھی اور مقصود یہ ہو کہ لوگ ہمارا اعتبار کرنے لگیں اور نمازی کہیں تو یہ عبادت نہیں۔ لیکن چونکہ اِبْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰہِ (رضائے الٰہی طلب کرنا) ایک امر مبطن ہے اس لئے اس نماز کو ایسا فاسد نہ کہیں گے جیسے ترتیب نہ ہونے سے یا در کھئے سجدہ نہ ہونے سے فاسد کہا جاتا ہے احکام دنیا میں ایسی نماز کو صحیح کہا جاتا ہے لیکن یہ نماز موجب نجات نہ ہوگی۔ حالانکہ صورت پائی گئی غرض یہ عارض یعنی غایت بھی تمام عبادتوں میں مشترک ہے۔ بہر حال بعض امور جو مدار فضیلت ہیں وہ ہیں جو حقیقت میں داخل ہیں اور بعض وہ ہیں جو خارج ہیں مگر ہیں دونوں مشترک سو مجھے قربانی کے متعلق ایسے فضائل بیان کرنا مقصود نہیں ایسے فضائل تو بہت ہیں۔ مجھ کو بیان کرنا صرف ان فضائل کا ہے جو قربانی کے ساتھ مختص ہیں جو کہ فضائل کی دوسری قسم ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ہر عبادت کے اندر جیسے کہ فضائل مشترکہ عامہ ہوتے ہیں جیسا کہ اول بیان کیا گیا ہے اسی طرح ہر عبادت کے کچھ فضائل خاصہ بھی ہوتے ہیں کہ وہ ایسی عبادت کے اندر پائے جاتے ہیں مثلاً نماز کی کچھ خصوصیات ہیں کہ وہ روزہ میں نہیں۔ اسی طرح روزہ کی خصوصیات حج میں نہیں اور حج کی خصوصیات روزہ اور نماز میں نہیں اور انہیں خصوصیات کی وجہ سے وہ عبادت خصوصیت کے ساتھ نظر شارع میں مقصود ہوا کرتی ہے۔ ورنہ اگر وہ خصوصیات مقصود نہ ہوتیں تو چاہیے تھا کہ تلاوت کی جگہ نماز اور نماز کی جگہ روزہ اگر کوئی کر لیتا تو کافی ہو جاتی۔ مگر ایسا نہیں ہے۔

شرف قربانی

پس معلوم ہوا کہ عبادت صرف درجہ اطلاق ہی کے اعتبار سے مقصود نہیں ہے بلکہ ہر عبادت کی

صورت نوعیہ بھی مقصود ہوتی ہے۔ پس اسی طرح قربانی کے اندر بھی کچھ خصوصیات ہیں کہ وہ دوسری عبادات کے اندر نہیں پائی جاتیں۔ میں انہیں خصوصیتوں کو بیان کروں گا لیکن بیان مختصر ہی ہوگا۔ اول یہ سمجھنا چاہیے کہ کسی عبادت کے خواص کہ جو مبنیٰ فضیلت کے ہیں ان کی چند قسمیں ہیں۔ حصر عقلی تو ہو نہیں سکتا۔ لیکن تتبع اور استقراء سے وہ پانچ خواص ہیں کہ جو فضائل مبنی اور اسباب بن سکتے ہیں۔ اول سبب تو وہ ہے کہ جس کا مرجع اس عبادت کی حقیقت کی طرف ہے اس لئے کہ ہر عبادت کی ایک حقیقت ہے اس کے اعتبار سے گا ہے اسی کو فضیلت ہی ہوتی ہے جیسے نماز کی حقیقت رکوع، سجدہ، قیام، قراءت اور روزہ کی حقیقت **امساک عن الاکل والشرب والجماع** (کھانے، پینے اور جماع سے بچنا) ہے۔ اسی طرح قربانی کی بھی ایک حقیقت ہے۔ **اراقة الدم فی زمان مخصوص لوجه الله** (مخصوص زمانہ میں رضائے الٰہی کیلئے خون بہانا) دوسری فضیلت کی وجہ زمانہ کی فضیلت کے اعتبار سے ہونا ہے یعنی اس عبادت کا زمانہ چونکہ بابرکت ہے۔

اس لئے اس کو فضیلت ہے۔ جیسے فرض روزہ کی فضیلت زمانہ کی فضیلت کی وجہ سے ہے اور ظاہر ہے کہ زمانہ حقیقت سے خارج ہے لیکن اس کو دخل ضرور ہے چنانچہ اس کے شرف سے عبادت کا شرف بھی بڑھ جاتا ہے اور بعض زمانہ ایسے بھی سمجھے گئے ہیں کہ ان میں عبادت منع ہے۔ تیسری وجہ مکان ہے کہ مکان عبادت کا ایسا مقرر کیا گیا ہے کہ جس کے شرف سے اس عبادت کا شرف بڑھ گیا جیسے نماز ہے کہ فی نفسہ بھی اس میں فضیلت ہے لیکن مسجد میں ہو تو زیادہ فضیلت بڑھ جاتی ہے ہاں بعض عوارض کی وجہ سے جیسے کہیں اخفاء مقصود ہو تو اس سے نوافل گھر میں افضل ہو جاتے ہیں اور اس قاعدہ سے سنن مؤکدہ بھی گھر میں ہی افضل ہونا چاہیے لیکن ان کا مسجد میں ہی پڑھنا اس لئے افضل ہے کہ مسلمانوں میں بعض فرقے ایسے پیدا ہو گئے تھے کہ ان کے نزدیک سنن ہی معمول بہ نہیں ہیں تو اگر کوئی شخص نہ پڑھے گا تو شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید یہ شخص اسی فرقہ میں ہو باقی فرضوں کے لئے یہی افضل ہے کہ مسجد ہو اور اس کی فضیلت اس لئے ہے کہ مسجد ایک شریف جگہ ہے وہاں ملائکہ کا اجتماع ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت ہے۔ علی ہذا حج کی فضیلت کہ وہ بوجہ مکان کے بھی ہے چوتھی وجہ فضیلت کی غایت ہے اور غایت سے مراد غایت مختصر ہے اور وہ غایت خواہ دنیا میں مرتب ہو۔ جیسے روزہ میں قوت بہیمیہ کا انکسار ہے یا آخرت میں جیسے حدیث میں آیا ہے کہ صائمین جنت کے باب الریان سے جاویں گے اور اگر اس پر کوئی کہے کہ اگر کوئی شخص نماز نہ پڑھے اور روزہ رکھے تو باب الریان سے کیسے جاوے گا اس لئے کہ ترک صلوٰۃ سے دوزخ میں جاوے گا۔ جواب یہ ہے کہ مطلب یہ ہے کہ روزہ کا فی نفسہ مقتضیٰ یہ ہے کہ وہ باب الریان سے جاوے بشرطیکہ کوئی مانع نہ ہو۔ اور یہاں ترک صلوٰۃ مانع ہے اور اگر یہ اشکال ہو کہ جو شخص نماز اور روزہ دونوں ادا کرے تو نماز کا اقتضاء تو یہ

ہے کہ باب الصلوٰۃ سے جاوے اور روزہ کا مقتضیٰ یہ ہے کہ باب الریان سے جاوے تو دونوں بابوں سے کیسے جاوے گا۔ جواب یہ ہے کہ جو صفت جس پر غالب ہوگی اس دروازے سے جاوے مثلاً اگر کسی کو نماز سے زیادہ دلچسپی ہے تو باب الصلوٰۃ سے جاوے گا۔ اور اگر روزہ سے زیادہ لگاؤ ہے تو باب الریان سے جاوے گا۔ پانچواں سبب فضیلت کا یہ ہے کہ بانی یعنی بادی اس عبادت کا ایک فضیلت رکھتا ہے یا تو وہ فعل اس نے خود کیا تھا اور اللہ تعالیٰ کو پسند آ گیا اور اس کو عبادت بنا دیا اور یا ابتداءً اللہ تعالیٰ نے اس پر فرض کیا ہے اور پہلی صورت میں اللہ تعالیٰ کے پسند آنے کی قید اس لئے بڑھائی کہ کسی فعل کے عبادت ہونے کے لئے محض رائے کافی نہیں ہے تاوقتیکہ وحی سے اس کی تاکید وتقویت نہ ہو۔

افعال عادیہ کی قبولیت

باقی رہا یہ شبہ کہ جس نے اول کیا اس نے محض رائے سے کیوں کیا۔ بات یہ ہے کہ اس نے اس کو علی وجہ الخصوصیت عبادت سمجھ کر نہیں کیا بلکہ اس کو اپنے اجتہاد سے کسی کلی مصلحت سے کیا تھا۔ پھر وہ فعل اللہ تعالیٰ کو پسند آ گیا اور اس کو عبادت بنا دیا۔ چنانچہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کا قصہ مجھ کو یاد آ گیا کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام شیر خوار بچے تھے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ ہاجرہؑ کو مع ان کے بچہ کے مکہ معظمہ کے میدان میں چھوڑ دو۔ اللہ اکبر کیسے حکم کے امتثال کرنے والے تھے کہ اس وادی میں جہاں نہ پانی تھا نہ دانہ ذرا خیال نہ آیا کہ ان کا کیا حشر ہوگا۔ فوراً ان کو وہاں لے جا کر چھوڑ دیا۔ خیر ابراہیمؑ تو پھر بھی مرد تھے اور صاحب وحی تھے لیکن ہاجرہؓ ان کی بی بی تو صاحب وحی نہ تھیں۔ اس حالت میں کہ دودھ پیتا بچہ ساتھ اور میدان ایسا کہ وہاں نہ دانہ نہ پانی اور احتمال یہ کہ کوئی بھیڑیا کوئی درندہ آ کر کھا جاوے لیکن ان سب باتوں کا کچھ خیال نہیں کیا اور نہ اس کے متعلق کچھ سوال کیا۔ سوال تو کیا کہ یہ پوچھا کہ ہم کو آپ یہاں اپنی رائے سے چھوڑے جاتے ہیں یا خدا کا حکم ہے۔ فرمایا خدا کا حکم ہے کہنے لگیں اذا لا یضیعنا جب یہ خدا کا حکم ہے تو اللہ تعالیٰ ہم کو ضائع نہ کریں گے۔ دیکھئے کہ ابراہیم علیہ السلام کے اس جملہ سے کہ یہ حکم خداوندی ہے ان کو بالکل اطمینان ہو گیا کیسی قوت توکل حق تعالیٰ نے عطا فرمائی تھی۔ ابراہیم علیہ السلام تھوڑا سا پانی ان کے لئے اور کچھ کھجوریں دے گئے تھے۔ پانی ختم ہو گیا۔ اب اسماعیل علیہ السلام کو پیاس لگی وہاں دو پہاڑیاں تھیں صفا اور مروہ ان کا اب بھی نشان باقی ہے اس وقت جنگل میں تھیں۔ اب ان کے درمیان بہت بڑا بازار ہے حضرت ہاجرہؓ پریشانی میں پانی کی تلاش کے واسطے ایک پہاڑی پر چڑھیں تا کہ دیکھیں کہ کہیں پانی تو نہیں ہے۔ ادھر ادھر نظر دوڑائی کہیں پانی نظر نہ پڑا۔ وہاں سے اتر کر دوسری پہاڑی کی طرف جانے لگیں اور اسماعیل علیہ السلام کو برابر دیکھتی جاتی تھیں ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان میں ایک نشیب تھا جب وہاں پہنچیں تو اسماعیل علیہ

السلام نظروں سے غائب ہو گئے اس لئے اس کو دوڑ کر قطع کیا تا کہ جلدی پھر وہ پیش نظر ہو جاویں اور وہاں سے نکل کر دوسری پہاڑی پر جا کر نظریں دوڑائیں لیکن کہیں پانی نہ ملا وہاں سے اتریں تو پھر صبر نہ آیا اور اسی طرح پھر پہلی پہاڑی پر پہنچیں کہ شاید اب پانی نظر آوے اسی بے چینی میں وہ سات مرتبہ ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آئی گئیں۔ اس مضطربانہ حرکت پر حق تعالیٰ کی رحمت متوجہ ہوئی اور جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ جا کر اسماعیل علیہ السلام کے لئے اپنے بازو سے پانی زمین سے نکالو۔ چنانچہ جبرائیل علیہ السلام آئے اور جہاں اسماعیل علیہ السلام پیاس سے بےتاب ہو کر رو رہے تھے۔ ایڑی ماری وہاں سے پانی کا چشمہ ابلا جس کا نام اس وقت زمزم ہے یہ تو قصہ ہے باقی میرا مقصود اس سے یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو اپنے مقبول بندوں کا بعض فعل پسند آ جاتا ہے گو وہ بطور عبادت کے بھی نہ ہو یوں ہی علی سبیل العادت ہی ہو۔ دیکھو تمہارے اولاد ہو یا کوئی عزیز ہو اور اس سے محبت ہو یا کوئی محبوب ہو تو اس کے کمالات تو پسند آتے ہی ہیں اس کے معمولی حرکات بھی پسند آتے ہیں حتیٰ کہ ٹھوکر کھا کر گرنا بھی پسند آتا ہے اور یہ حالت ہوتی ہے۔

زفرق تابقدم ہر کجا کہ ے نگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجا است

(سر سے لیکر پاؤں تک جہاں نظر پڑتی ہے کہ کرشمہ دل کا دامن کھینچتا ہے کہ یہی جگہ سب سے زیادہ حسین ہے اور یہاں تک کہ اس کا موت اور گوہ بھی پسند آتا ہے مثلاً بچہ کو قبض ہو گیا اب تم بے چین ہو حکیم صاحب سے رجوع کیا۔ انہوں نے دوا دی اور ماں نے اسی روز عمدہ جوڑا بدلا تھا اس نے اسی پر پائخانہ پھیر دیا تو ماں ذرا بھی چیں بچیں نہ ہو گی بلکہ شکر کریگی کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے میرے بچہ کو صحت ہوئی اور کپڑوں کی کیا پرواہ ہے اللہ تعالیٰ اور دیں گے جبکہ ماں کی یہ کیفیت ہے تو اللہ تعالیٰ کو تو ماں سے بھی زیادہ محبت ہے اگر اس کو بھی اپنے مقبول بندوں کے عادی حرکات پسند ہوں۔ بشرطیکہ معصیت نہ ہوں تو کیا تعجب ہے چنانچہ حضرت ہاجرہؓ کا یہ بے تابانہ اور مضطربانہ پانی کی تلاش میں دوڑنا ایسا پسند آیا کہ قیامت تک کے لئے اس کو حج میں داخل فرما دیا۔ اب وہ گڑھا تو نہیں رہا۔ مگر نشان کے لئے اس کی مبتدا و منتہیٰ پر دو پتھر لگے ہیں جب صفا و مروہ کے درمیان چلتے ہیں تو ان دو پتھروں کے بیچ میں دوڑ کر چلتے ہیں کوئی پوچھے اس میں کیا بات ہے جو ملحد ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ مجنونانہ حرکت ہے لیکن ہم کو ان کا یہ کہنا ناگوار نہیں ہے ہم تو اس لقب کو قبول کر کے یہ شعر پڑھتے ہیں۔

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم مست آں ساقی وآں پیمانہ ایم

(ہم اگر مفلس و دیوانے ہیں تو اس کی ذمہ داری اس ساقی اور اس پیمانہ پر ہے جس نے ہم کو مست کر دیا ہے) یاد رکھو حق تعالیٰ کی اطاعت ان مجنونانہ حرکات ہی سے معلوم ہوتی ہے اور جس کی وجہ

معلوم ہوگئی اس کو کرنا تو کوئی کمال نہیں۔

زبان تازہ کردن باقرار تو نیگیختن علت از کار تو

(تیرے ذکر سے ہم زبان تازہ کرتے ہیں اور تیرے کاموں میں چون و چرا نہیں کرتے اور بندگی تو حقیقت میں یہ ہے کہ یہ حالت ہو۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(اگر تو زندہ کردے تو تیری عطا ہے اور اگر تو مار ڈالے تو ہم تجھ پر قربان ہیں۔ دل تیرا مبتلا ہو چکا ہے اب جو تیری مرضی ہو وہ کر دو اور ان کا اتباع اختیار کرو۔

فہم و خاطر تیز کردن نیست راہ جز شکستہ می نگیرد فضل شاہ

(فہم و خاطر کو تیز کرنا راہ سلوک نہیں بلکہ شکستگی پیدا کرتا ہے اللہ تعالیٰ کا فضل سوائے شکستگان اور کسی پر نہیں ہوتا)

اس میں اپنے ارادے اور اختیار کے فنا کرنے کی ضرورت ہے پستی و شکستگی کی حاجت ہے ۔

ہر کجا پستی است آب آنجا رود ہر کجا مشکل جواب آنجا رود

ہر کجا دردے دوا آنجا رود ہر کجا رنجے شفا آنجا رود

(جہاں پستی ہوتی ہے وہیں پانی جاتا ہے جہاں اشکال ہوتا ہے وہیں جواب دیا جاتا ہے)

(جہاں مرض ہوتا ہے وہیں دوا استعمال کی جاتی ہے جہاں رنج ہوتا ہے وہیں شفاء پہنچتی ہے)

طلب اور درد اور شکستگی حاصل کرنا چاہیے اب تو یہ حال ہے کہ جو بزرگ سمجھے جاتے ہیں شکستگی ان میں بھی نہیں۔

ایک صاحب کی حکایت یاد آئی جو ظاہر میں بزرگ اور نیک سب کچھ تھے ایک بار وہ یہاں جمعہ کے روز آئے وعظ میں شریک ہوئے۔ مکان ان کا اتنی نزدیک تھا کہ بعد وعظ کے جاتے تو شام تک پہنچ جاتے چنانچہ اکثر لوگ وعظ سن کر چلے بھی جاتے تھے ان کے ایک عزیز نے اس احتمال سے ان سے پوچھ لیا کہ اگر شام کو یہاں قیام ہو تو میں کھانے کا انتظام کروں۔ بس بزرگ صاحب کہاں تھے خفا ہوگئے کہ یہ بھی کوئی تہذیب ہے کہ آپ ہم سے پوچھتے ہیں کہ کھانے کا انتظام کیا جاوے یا نہیں۔ تم کو کھانا تیار کرنا چاہیے تھا پھر چاہے ہم ٹھہریں یا نہ ٹھہریں۔

خدا کی پناہ! اس تکبر کی بھی کوئی انتہاء ہے کہ آپ سے بلا پوچھے ہی کھانا تیار کیا جائے پھر اگر

بعد میں آپ نے کہہ دیا کہ ہم جاتے ہیں تو اس غریب کا سارا پکا پکایا کھانا برباد جائے غرض یہ سب طرارے یہیں چھوڑ دو۔ حج میں تو سب اپنے کمالات گم کر دینا چاہیے۔

عورتوں کے لئے حج میں ہدایت

عورتوں پر اور بھی تعجب ہے یہ مردوں سے بھی زیادہ حج کا ارادہ کر کے اپنے کو بڑا سمجھنے لگتی ہیں بلکہ آج عموماً ویسے بھی عورتوں میں بڑائی کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ بعض دفعہ تو یہ مردوں سے خوشامد کراتی ہیں ان کو شرم اور غیرت بھی نہیں آتی کہ مردرات دن جان کھپا کر ان کے واسطے کما کر لاتے ہیں کیا مردوں کی عنایت کا یہی نتیجہ ہے کہ یہ مردوں کے سر چڑھیں۔ میں سچ کہتا ہوں کہ اگر عورتیں ذرا صبر و تحمل سے کام لیا کریں تو ان کو مردوں سے زیادہ ثواب ملے کیونکہ یہ ضعیف اور کمزور ہیں۔ ضعفاء کا تھوڑا سا عمل بھی قوی آدمی کے بہت سے اعمال سے بعض دفعہ بڑھ جاتا ہے مگر عورتوں میں جس قدر ضعف ہے یہ اسی قدر مردوں پر شیر ہوتی ہیں اور یہ مردوں کا تحمل ہے کہ ان کو سر چڑھا لیتے ہیں ورنہ ان کے سامنے عورتوں کی حقیقت ہی کیا ہے۔ اگر مرد کو غصہ آ جائے تو ایک دن میں ان کو درست کر سکتا ہے۔ چنانچہ سخت مزاج لوگ ایسا بھی کر لیتے ہیں بزرگوں نے نقل کیا ہے **یغلبن العاقل ویغلبهن الجاهل** کہ عاقل مرد پر تو عورتیں غالب ہو جاتی ہیں مگر جاہل مرد ان پر غالب ہوتا ہے اس کا راز یہی ہے کہ عاقل تحمل سے کام لیتا ہے اور جاہل تحمل نہیں کرتا۔ اس لئے جاہلوں سے یہ خوب درست ہو جاتی ہیں بہرحال عورتوں کو تکبر کرنا بہت نازیبا ہے ان کو حج میں طرارے سے کام لینا نہ چاہیے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قبل حج ہی اپنے ملکات رذیلہ کو نکالو اور نفس کی اصلاح کرو۔

حج میں فکر اصلاح

اب یہ سوال باقی رہا کہ اب تو حج کو جا رہے ہیں اب قبل حج یہ مسہل کیسے ہو تو میرا یہ مطلب نہیں کہ آپ قبل حج کامل بن جائیے کیونکہ کمال ایک دن یا ایک ہفتہ میں حاصل ہونا عادۃً دشوار ہے۔ ؎

صوفی نشد صافی تا در نکشد جامے　　بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے

میرا مقصود یہ ہے کہ اس وقت سے اس کی فکر میں تو لگ جایئے وہ بھی اثر میں مثل اصلاح ہی کے ہے جیسا قرآن میں یہ حکم نازل ہوا **اتقوا الله حق تقته** کہ خدا سے ایسا ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے تو صحابہ گھبرا گئے۔ اور گھبرا کیوں گئے؟ میرا ذوق یہ کہتا ہے کہ وہ اس واسطے گھبرا گئے کہ صیغہ امر اصل میں موضوع ہے۔ وجوب کے لئے اور اگرچہ مطلق امر کے واسطے فور ضروری نہیں۔ مگر فور متبادر ضرور ہے ہاں اگر وہ فعل یقینی طور پر تدریجی ہو تو وہاں فور متبادر نہیں ہوتا ورنہ عموماً امر سے متبادر یہی ہوتا ہے کہ یہ کام ابھی فوراً کیا

جائے پس فَاتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ (پس اللہ تعالیٰ سے ڈرو جیسا اس سے ڈرنے کا حق ہے) سے صحابہؓ یہ سمجھے کہ ہم کو اسی وقت کامل تقویٰ والے بھی مختلف ہیں۔ بعض تو ایسے ہیں کہ دوستی کا محض دم بھرتے ہیں نفلیں بہت پڑھ لیں گے۔ قرآن پڑھ لیں گے لیکن ان سے ایک پیسہ خرچ نہیں ہوسکتا۔ اور جن لوگوں کو محبت ہے ان کو اس سے حیرت ہوتی ہے ان کی کیفیت تو یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے مقابلہ میں ان کو کسی شے کی بھی وقعت نہیں ہے طلحہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں ان کے پاس ایک باغ تھا۔ نہایت سرسبز اور شاداب تھا اور ایسا گنجان کہ ایک روز ایک پرندہ نے ہر چند چاہا کہ نکل جاؤں۔ مگر جدھر جاتا تھا۔ شاخیں حائل ہوتی تھیں۔ ابوطلحہؓ نماز پڑھ رہے تھے یہ قصہ دیکھ کر خیال آ گیا کہ اب تو میرا باغ خوب پرورش پا گیا ہے اور اس خیال سے خوش ہوئے سلام پھیرنے کے بعد فوراً ہی خیال آیا کہ اللہ اکبر اس باغ کی وجہ سے میں تھوڑی دیر حق تعالیٰ کی یاد سے غافل رہا۔ فوراً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ باغ تو میرے لئے فتنہ ہو گیا ہے میں اس کو رکھنا نہیں چاہتا۔ اللہ کے واسطے پیش کرتا ہوں آپ کو اختیار ہے کہ آپ جہاں چاہیں صرف فرمادیں بس ان کو اس امر کا قلق ہوا کہ میرا دل خدا تعالیٰ سے دوسری طرف کیوں ہوا اس کو غیرت کہتے ہیں۔

بہر چہ از دوست دامانی چہ کفران حرف چہ ایمان بہر چہ از یار دور افتی چہ زشت آں نقش چہ زیبا

(دوست کے دامن سے جو کچھ ملتا ہے اس میں یہ کہنے کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ کفر ہے اور یہ ایمان ہے اسی طرح سے یار کے نقش قدم سے تو کتنا ہی دور پڑا ہوا ہو تیرے لئے یہ کہنا مناسب نہیں ہے کہ یہ نقش برا ہے یا اچھا)

ایک اور قصہ ایسا ہے لیجئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کہیں تشریف لے جا رہے تھے ایک مکان قبہ دار دیکھا پوچھا یہ کس کا مکان ہے کسی نے عرض کیا کہ فلاں انصاری کا ہے۔ آپ سن کر چپ ہو رہے جب وہ انصاری آئے تو انہوں نے سلام کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سلام کا جواب نہیں دیا۔ انہوں نے دوسری جانب جا کر سلام کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منہ پھیر لیا انہوں نے ایسا منظر کیوں دیکھا تھا۔ دیکھ کر روح ہی تو قبض ہو گئی اب آہستہ آہستہ ہر ایک سے پوچھتے پھرتے ہیں کہ کیا بات ہے۔ کسی نے کہا اور تو ہم کو کچھ بات معلوم نہیں۔ صرف اتنی بات ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری طرف تشریف لے جا رہے تھے اور پوچھا تھا کہ یہ مکان کس کا ہے بس اس سے زیادہ کوئی بات نہیں ہے ابھی پورا یقین اس کا نہیں ہے کہ مبنیٰ ناخوشی کا یہی مکان ہے محض شبہ ہی ہوا کہ شاید یہ مکان ہی سبب ناراضی کا ہو محض اسی شبہ پر جا کر اس مکان کو خدا جانے کتنی لاگت کا ہوگا جڑ سے کھدوا کر پھینک دیا کہ میں کیا آگ لگاؤں گا۔ اس مکان کو جو سبب ہو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضگی کا۔ خیر شبہ پر تو مکان کو اکھاڑ دیا۔ یہ تو ہوا ہی تھ

اس سے بڑھ کر لیجئے کہ آ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع نہیں کی جتلایا نہیں کہ میں نے ایسا کیا اس لئے کہ آپ پر کیا احسان تھا۔ اتفاق سے جب آپ کسی اور دن اس طرف تشریف لے گئے اور وہ مکان نہ دیکھا تو پوچھا کہ وہ مکان کیا ہوا۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ان کو یہ شبہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہیں اس لئے اس کو منہدم کرادیا۔ آپ نے فرمایا کہ ہاں جو تعمیر ضرورت سے زیادہ ہو وہ وبال ہی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مال کا خرچ کرنا بڑی علامت محبت کی ہے پس قربانی کو ایک تو اس حیثیت سے فضیلت ہوئی کہ اس کی حقیقت جنسیہ انفاق مال ہے۔

انفاق محبوب

اب دیکھنے کی بات یہ ہے کہ انفاق مال کا کون سا فرد پسندیدہ ہے۔ تو اس کی نسبت سے ارشاد لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ یعنی تم نیکی کو ہرگز نہ پہنچو گے یہاں تک کہ اس شے سے خرچ کرو، جس کو تم چاہتے ہو۔ اب تو یہ حالت ہے کہ چھانٹ چھانٹ کر نکمی چیزیں اللہ کے نام خرچ کی جاتی ہیں۔ کھانا جب سڑ جاوے گا اور باورچی یا ماما آ کر کہے گی کہ اس میں سے بو آنے لگی ہے تو کہیں گے کہ اللہ کے واسطے دیدو۔ کپڑا پھٹا ہوا جو کسی قابل نہ ہو کہیں گے دیدو کسی طالب علم کو اللہ واسطے۔ غرض اللہ واسطے وہ شے تجویز کرتے ہیں جو بالکل سڑیل اور اپنے سے نکمی ہو۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ یاد رکھو جیسی شے تم دیتے ہو ایسی ہی وہاں تم کو ملے گی بھی۔ چنانچہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تشریف لائے ایک خوشہ دیکھا کھجور کا جس میں گلی ہوئی کھجوریں تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا یاد رکھو وہاں ایسا ہی ملے گا۔ کسی شخص نے ایک واعظ کو ایک انگوٹھی دی تھی اس پر نگین نہ تھا تو اس نے دعا دی کہ اے اللہ! اس کو جنت میں ایسا گھر دیجئے کہ جس پر چھت نہ ہو ہاں اگر کسی کے پاس عمدہ چیز ہی نہ ہو تو وہ دوسری بات ہے اس کی وہی عمدہ ہے خلاصہ یہ کہ اللہ کے واسطے پیاری چیز دینا چاہیے۔

اسی طرح قربانی کے اندر جو جانور خریدا جاوے اس کو خوب دیکھ لینا چاہیے کہ تمام عیوب سے سالم ہو۔ قیمت میں اچھا ہو اس کے محبوب ہونے کی بھی صورت ہے اب لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ سڑیل سے سڑیل جانور قربانی کے لئے خریدتے ہیں۔ کانپور میں ایک شخص تھے انہوں نے ایک مینڈھے کی قربانی کی تھی جس کی کیفیت یہ تھی کہ تمام عیوب اس کے اندر تھے۔ کان کٹا بھی، دم کٹا بھی، دبلا بھی، ایک محلہ دار نے ان سے کہا کہ اس کی قربانی ناجائز ہے اس نے کہا واہ جائز ہے۔ ہر عیب اس میں چوتھائی سے کم ہے۔ اس نے پوچھا کہاں لکھا ہے کہا ہماری بیوی کہتی ہے اور فوراً گھر پہنچے اور بیوی صاحبہ سے کہا دیکھو تمہارے مسئلہ پر فلاں شخص اعتراض کرتا ہے انہوں نے اسی وقت اردو کا شرح وقایہ منگا کر اس اور میں جہاں وہ

مسئلہ تھا نشانی رکھ کر باہر بھیج دیا کہ دیکھ لو یہ لکھا ہے۔ آج کل یہ حالت ہے کہ دین کے بارے میں ہر ایک کو جرأت ہوتی ہے مگر ہم نے یہ نہ دیکھا کہ اردو کی کتاب دیکھ کر کسی نے بیوی کو مسہل دیدیا ہو اور بعض ایسے دلیر ہوتے ہیں کہ اردو کی کتابوں سے علاج بھی کرتے ہیں۔ مگر غیروں کی چنانچہ مطبع نظامی میں ایک خط آیا تھا اس میں لکھا تھا کہ میرے پاس ہر فن کی کتابیں ہیں چنانچہ اردو کا شرح وقایہ (اس نے اسی طرح لکھا تھا) بھی ہے اس سے فتویٰ لکھ لیتا ہوں مگر لوگ کہتے ہیں کہ طب کا فیض بھی جاری کردو۔ اس لئے آپ طب احسانی بھیج دیجئے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو لوگوں کے جان و مال دونوں کو تباہ کرتے ہیں۔ ایک جاہل طبیب کی نسبت کسی نے کہا کہ وہ ایسے حکیم ہیں کہ جس کو ہاتھ لگاتے ہیں مرض نہیں رہتا۔ میں نے کہا مرض نہ رہنے کی دو صورتیں ہیں یا تو مریض رہے اور مرض نہ رہے اور یا یہ کہ مریض ہی نہ رہے بالمعنی الثانی یہ صحیح ہے اگر کوئی کہے کہ تم اردو کی کتابوں کی مذمت کرتے ہو حالانکہ بڑے بڑے عالموں نے اردو میں ترجمہ مسائل کا اور دیگر مفید کتابوں کا کیا ہے بات یہ ہے کہ عالموں نے اس لئے ترجمہ کردیا ہے کہ تم آسانی سے کسی عالم سے سبقاً سبقاً ان کو پڑھ لو۔ اس لئے ترجمہ نہیں کیا کہ خود دیکھ کر مفتی ہو جاؤ اور علماء ہی پر اعتراض کرنے لگو اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر فن اور ہر صنعت کے لئے استاد کی ضرورت ہے خواہ وہ فن کیسا ہی ادنیٰ درجہ کا ہو۔ اسی طرح دین بھی ایک فن ہے جب تک کسی سے سیکھا نہ جاوے وہ آتا نہیں لیکن عجب بات ہے کہ اور ہر شئے کے لئے استاد کی ضرورت تسلیم کرتے ہیں لیکن اگر ضرورت نہیں تو بس دین میں نہیں اس میں ہر شخص مجتہد ہے غرض وہ اردو کا شرح وقایہ ان کی بیگم صاحبہ نے بھیج دیا کہ جس کو شبہ ہو دیکھ لو۔ اس شخص نے کہا کہ ہم اس کو نہیں جانتے تم جامع مسجد چلو وہاں مدرسہ ہے وہاں علماء موجود ہیں ان سے پوچھیں گے انہوں نے کہا کہ ہم کیوں جائیں۔ جب ہمارے گھر میں خود علامہ موجود ہے۔ غرض وہ نہ گئے۔ بعضے لوگ باوجود استطاعت کے ڈھونڈا کرتے ہیں کہ سستا حصہ ملے۔

انداز تشکر

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب سورہ بقرہ ختم کی تو ایک قیمتی اونٹنی ذبح کی تھی۔ جس کی قیمت تین سو اشرفی ملتی تھیں گو وہ اشرفی تقریباً تین روپیہ کی ہوتی تھی مگر تب بھی نوسو روپے کے قریب قیمت ہوئی اور اتنی قیمت تو ملتی تھی۔ غالب یہ ہے کہ اس سے زیادہ ہی کی ہوگی گویا ایک ہزار روپیہ کی سمجھو اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ ان حضرات کی نظر میں قرآن مجید اور اس کی تعلیم و تعظیم کی کس قدر وقعت تھی۔ ایک آج کل دیکھئے کہ معلموں کی ذرا قدر نہیں اگر حافظ قرآن صرف کھانا طلب کرے تو یہ بڑا جرم ہے کہتے ہیں کہ میاں جی کو تو کھانا ملا کرتا ہے اور کھانے میں بھی بڑا احسان سمجھتے ہیں اور اگر عیدی بقرعیدی بھی دیدی تو گویا خرید ہی لیا۔

اور اگر ختم قرآن پر ہی دیدیئے تو ساری عمر گاتے پھریں گے دیکھئے قدر دان یہ لوگ تھے کہ سورہ بقرہ جو قرآن کا بارہواں حصہ بلکہ کسی قدر کم ہی حصہ ہے۔اس کے ختم کے شکریہ میں انہوں نے ایک اونٹنی ذبح کی۔جس کی قیمت آپ کوابھی معلوم ہوئی حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اغنیاء صحابہ میں سے نہیں تھے ہمیشہ ان کی یہی حالت رہی حتیٰ کہ جب وفات فرمائی تو قرض ذمہ پر تھا۔زندگی میں ادا کرتے رہتے تھے۔انتقال کے وقت حضرت عبداللہ بن عمرؓ اپنے بیٹے کووصیت فرمائی کہ میرا قرض ادا کردیجیو۔باوجود اس حالت کے بھی اتنی قیمتی اونٹنی انہوں نے ذبح کردی۔اور باوجود اس حالت کے بھی کہ واجب بھی نہ تھی۔محض شکریہ اور خوشی کے واسطے ذبح کی بہر حال قربانی کے لئے جو جانور خریدا جاوے عمدہ ہونا چاہیے۔

دیکھو اگر صاحب کلکٹر تم سے یہ فرمائش کریں کہ ہمارے لئے دودھ پینے کے واسطے ایک عمدہ گائے لاؤ۔تو عمدہ سے عمدہ تمام گاؤں سے بھی اور آس پاس بھی خوب دیکھ بھال کر گائے لوگے۔بڑے غضب کی بات ہے کہ ایک حاکم ضلع کی جو ظاہری اور مجازی حاکم ہے اس کے حکم کا تو آپ کو اتنا اہتمام ہو اور احکم الحاکمین اور حاکم حقیقی نے جو تم سے جانور مانگا ہے پھر وہ بھی تمہارے ہی لئے اور پھر دام بھی خود اسی نے تم کو دیئے۔اس میں تم کفایت پر نظر کرتے ہو بڑی ناشکری کی بات ہے۔چاہیے کہ عمدہ سے عمدہ جانور لو میرا مطلب یہ نہیں کہ تم سو روپے کی گائے خریدو جب کہ وہ تمہاری حیثیت سے زیادہ ہو۔میرا مقصود یہ ہے کہ اپنی حیثیت واستطاعت کے موافق عمدہ جانور لو۔اور بہتر ہے کہ کچھ حصہ نفل کے طور پر بھی کیا کرو۔

کانپور میں ہمارے مکرم خان صاحب عبدالرحمٰن خان صاحب کے یہاں ساٹھ ساٹھ ستر ستر جانور ذبح ہوتے تھے اور اپنے تمام بزرگوں ورشتہ داروں کے حصے وہ کرتے تھے کہ یہ باپ کا ہے یہ دادا کا ہے اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی کرتے تھے۔حالانکہ ان کی حالت یہ تھی کہ کبھی کبھی ان کے یہاں کھانے کا غرہ بھی ہو جاتا تھا۔محبت بھی عجیب شئے ہے کہ وہ سب کچھ کرا دیتی ہے جو لوگ قربانی کے اندر حیلہ کرتے ہیں اگر ان کو آج بیٹے کی شادی پیش آجاوے تو ابھی سینکڑوں روپیہ اگل دیں گے۔خلاصہ یہ ہے کہ انفاق مال جو اس کی حقیقت ہے اس کے اعتبار سے بھی قربانی کو فضیلت ہوگی۔

فضیلت نوعی

اب حقیقت نوعیہ یعنی اراقۃ دم للہ کے اعتبار سے لیجئے اراق دم للہ کے معنی خدا کے نام پر جان کا قربان کرنا ہے۔تعجب ہوگا کہ میں اس کو بناء فضیلت قرار دیتا ہوں اور مخالفین اس کو بناء اعتراض قرار دیتے ہوں اور ان کا بناء اعتراض قرار دینا بھی دلیل اس کی حقانیت کی ہے اس لئے کہ بے وقوف جس بات پر اعتراض کریں وہ عین حق ہوتا ہے۔اگر کوئی کہے کہ یہ تو بیوقوف نہیں بلکہ فلاسفر اور مہذب قوم اور لیڈر سمجھے جاتے ہیں۔بات یہ

ہے کہ اس سے زیادہ بے وقوفی نہیں کہ اپنے مالک کو بندہ بھول جاوے۔ جس کو اتنی فکر نہ ہو کہ میرا مالک کس بات سے خوش ہوگا اور کون سی بات سے ناخوش وہ خواہ عقل میں ارسطا طالیس ہو وہ بے وقوف ہی ہے یہ بات دوسری ہے کہ کسی امر میں اس کو تجربہ ہو جاوے کہ اس کو عقل نہ کہیں گے مثلاً کپڑا بننا آ گیا۔ یا یہ کہ زخموں کے کاٹ تراش میں کمال پیدا کر لیا۔ اس سے عاقل نہیں ہو سکتا عقل اور شے ہے تجربہ دوسری شے۔ صنعتوں کے اندر کمال پیدا کر لینے والے کو تجربہ کار کہیں گے مگر عاقل ہونا اس کا ضروری نہیں۔ خدا تعالیٰ سے جو شخص جس قدر دور ہے اسی قدر اس کی عقل بھی منسوخ ہے۔ پس ایسا شخص جس شے کو زیادہ برا سمجھے گا وہی شے زیادہ اچھی ہوگی۔ آج کل بڑا عاقل وہ سمجھا جاتا ہے کہ بڑا لسان ہو اور ہر دعوے پر بزعم خود دلیل عقلی رکھتا ہو۔ گو وہ دلیل واقع محض لچر اور غیر مقبول ہو اس عقل اور بے عقلی پر مجھ کو دو حکایتیں یاد آئیں۔ میرے ماموں زاد بھائی ایک فٹن پر سوار جاتے تھے۔ میرٹھ کا قصہ ہے پاگل خانہ کے سامنے سے گزر ہوا دیکھا دو پاگل اچھل کود رہے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ دیکھو یہ بھی عجیب بے وقوف ہیں کہ ایسی سواری میں بیٹھے اگر گھوڑے فٹن کو خندق کی طرف لے کر چل دیں تو ابھی یہ گر پڑیں۔ دیکھو ان پاگلوں نے بات معقول کہی اس لئے کہ احتمال عقلی تو خندق کی طرف جانے کا ہی ہے گو اس کا وقوع شاذ و نادر ہو لیکن اس دلیل مردود سے ان پاگلوں کو کوئی عقل مند نہیں کہے گا۔

ایک اور شخص تھا اور جنون میں پاخانہ کھایا کرتا تھا اگر کوئی اس سے کچھ کہتا تو جواب دیتا تھا کہ اس میں کیا برائی ہے یہ میرے ہی اندر سے تو نکلا ہے اگر پھر میرے ہی اندر چلا جائے تو کیا حرج ہے تو دیکھو عقلی ہی دلیل یہ بھی تو ہے مگر مردود ایک اور شخص تھا وہ جنون میں اپنی ماں سے برا کام کرتا تھا اور یہ کہا کرتا تھا کہ میں جب کہ سب کا سب اس میں تھا تو اگر میرا جز اس کے اندر چلا جائے تو کیا حرج ہے۔ پس ایسے ہی دلائل آج کل عقل پرستوں اور مہذبین کے ہیں میں بقسم کہتا ہوں کہ اہل باطل کے پاس کسی مدعا پر کوئی دلیل صحیح نہیں ہے اہل باطل کبھی عاقل ہو ہی نہیں سکتے۔ میں اکثر یہی کہا کرتا ہوں کہ وہ جس بات کو ناپسند کریں گے وہ پسندیدہ ہوگی اور جس کو پسند کریں گے وہ ناپسند ہوگی۔ بعض بزرگوں نے فرمایا ہے کہ آدم علیہ السلام کا مسجود ملائکہ ہونا جیسے ان کے کمال کی دلیل ہے اسی طرح شیطان کا ان کو سجدہ نہ کرنا بھی دلیل ان کے کمال کی ہے۔ اس لئے اگر شیطان سجدہ کر لیتا اور تھا یہ اصل میں خبیث تو بقاعدہ الجنس یمیل الی الجنس۔ اس سے شبہ ہوتا کہ خدانخواستہ آدم علیہ السلام میں کوئی نقص ہے اس پر مجھ کو ایک اور نکتہ یاد آیا وہ یہ ہے کہ ہمارے حاجی صاحب فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص کی طرف اہل دنیا مائل ہوں تو اس کے اندر ہی دنیا کا شائبہ ہے۔ ورنہ دنیادار اس کی طرف نہ جھکتے سچے درویشوں کی تو یہ کیفیت ہوتی ہے کہ ان کی طرف غرباء کا میلان ہوتا ہے جلاہوں کا مومنوں کا طلبہ کا اور یہی کیفیت انبیاء کی ہوئی ہے

کہ ان کی طرف غرباء ہی اول جھکے ہیں پس سچے ورثۃ الانبیاء کی بھی یہی کیفیت ہونا چاہیے۔

الجنس یمیل الی الجنس پر ایک اور حکایت یاد آئی جالینوس چلا جاتا تھا راستہ میں ایک مجنون اس سے دوڑ کر ملا اور بڑی محبت اور ملاطفت سے باتیں کیں۔ اگر کوئی نادان ہوتا تو بہت خوش ہوتا اور اس کو اپنی کرامت سمجھتا۔ لیکن چونکہ جالینوس دانا تھا فوراً واپس آیا۔ اور شاگرد سے کہا کہ وہ معجون لاؤ جو جنون کو مفید ہے شاگرد نے عرض کیا کہ خیر و عافیت تو ہے کیسا مزاج ہے کہا کہ آج مجھ سے ایک مجنون بڑی ملاطفت سے پیش آیا اور قاعدہ عقلی ہے کہ الجنس یمیل الی الجنس معلوم ہوتا ہے کہ میرے اندر بھی کچھ جنون کا مادہ ہے۔ ایک مرتبہ ایک طاؤس اور کوا ساتھ ساتھ چلے جاتے تھے۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ یہ کیا بات ہے دو ناجنس آپس میں چلے جا رہے ہیں۔ ایک فلسفی نے کہا کہ ان میں ضرور کچھ مناسبت ہے دیکھا تو واقعی مناسبت ہے کہ دونوں لنگڑے تھے۔ پس اہل باطل کو جس شئے کی طرف بالکل رغبت نہ ہو وہ شے سب سے بڑھ کر اچھی ہوگی۔ پس اس بناء پر کچھ ضرورت تو نہیں رہی کہ ان کے اعتراض کو یہاں نقل کیا جاوے کیونکہ ان کا اعتراض کرنا بھی کافی دلیل ہوگی۔ اس اراقۃ کے استحسان کی۔ لیکن تاہم شاید کسی کو اب بھی شبہ رہے۔ خصوصاً بعض عوام کو شاید یہ جواب کلی کافی نہ ہو اس لئے تبرعاً مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اعتراض نقل کر کے جواب خاص دیا جاوے۔

قربانی پر بے رحمی کا شبہ

تو جاننا چاہیے کہ حاصل ان کے شبہ کا یہ ہے کہ قربانی کرنا بے رحمی ہے خواہ مخواہ بلاقصور جانوروں کا خون کرنا سخت بے رحمی و بے انصافی و سنگدلی ہے اور نیز صرف اپنی خواہش نفسانی پورا کرنے کے لئے کسی جان کو ضائع کر دینا بعید از عقل و ہمت ہے۔ بظاہر تو یہ اعتراض بہت قوی ہے لیکن نظر غور سے معلوم ہوگا کہ بالکل لچر ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ مسلمانوں کو بے رحم اور اس فعل کو بے رحمی کہنا ہی غلط ہے مطلق رحم سے تو کوئی شخص خالی نہیں ہو سکتا ہے اس لئے کہ یہ مادہ تو حق تعالیٰ نے ہر ایک کے اندر رکھا ہے باقی جس کو یہ سنگدلی کہتے ہیں وہ واقعی میں شجاعت ہے اور جس کا نام انہوں نے رحم رکھا ہے وہ ضعف قلب ہے قوی القلب قاسی القلب نہیں ہوتا اور نہ ضعیف القلب کا رحم ہونا ضروری ہے اور مسلمانوں سے زیادہ تو رحمدلی کسی کے اندر ہی نہیں ان کو تو تعلیم ہی رحم کی گئی ہے ان کے رحم کی یہ کیفیت ہے کہ کسی شخص پر غصہ ہو اور اس نے بہت ستایا ہو بہت ایذا پہنچائی ہو لیکن وہ کہے کہ بھائی مجھے معاف کر دو تو یہ حکم ہے کہ معاف کر دو اور بالکل اس سے کینہ نہ رکھو اور لیجئے دشمنوں پر ان کو رحم کرنے کا حکم ہے چنانچہ لڑائی میں حکم ہے کہ بوڑھوں کو عورتوں کو بچوں کو اور درویشوں گوشہ نشین کو مت مارو اور

ناک کان مت کاٹو جب کہ یہ اپنے دشمنوں پر رحم کرنے والے ہیں تو جانوروں پر کیوں نہ رحم کریں گے۔ یہ بے انتہاء رحمدل ہیں لیکن رحم ان کا عقل کے ساتھ ہے۔ بے عقلی کے ساتھ نہیں رحم کی بھی دو قسمیں ہیں ایک بے عقلی کے ساتھ جیسے ماں کا رحم کہ بچہ مچل رہا ہے کہ میں مکتب میں نہ جاؤں گا اور مکتب میں جانے سے اس کو وحشت ہوتی ہے روتا ہے اور ماں اس کی حمایت کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ اچھا ہے نہ جاوے اس کا جی برا ہوگا۔ اور ایک رحم عقل کے ساتھ ہوتا ہے جیسے باپ کا رحم ہے کہ اس نے بچہ کی یہ ضد دیکھی تو دو تین چپت مارے اور پکڑ کر مکتب میں پہنچا دیا تو بظاہر تو یہ بے رحمی معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت میں ماں کا اس کی موافقت کرنا یہ اس کے حق میں ظلم ہے کہ انجام اس کا جہل ہے جس کو ذلت وخواری لازم ہے اور باپ کا مارنا عین رحم ہے کہ انجام اس کا اس کے لئے بہتر ہے ماں کے رحم کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بڑھیا کے گھر شاہی باز چلا آیا اس نے دیکھا کہ اس کی چونچ بہت بڑی ہے بہت کڑھی کہ اے ہے یہ دانہ کس طرح چنتا ہوگا معلوم ہوتا ہے کہ تیری ماں مرگئی ہے کسی نے تراشی نہیں اسی واسطے چونچ تیری بہت بڑھ گئی ہے قینچی لے کر اس کی چونچ کتر دی پھر دیکھا کہ ناخن بہت بڑے ہیں ناخن کچھ تراش دیئے غرض اس کو جس کام کا وہ تھا اس سے بالکل نکما کر دیا بچ ہے۔۔

دوستی بے خرد پر دشمنی است (بے وقوفوں کی دوستی دشمنی سے بھری ہوئی ہے)

ایک سرحدی کی حکایت مشہور ہے کہ ہندوستان میں آئے تھے کہیں کسی سے لڑائی ہوگئی اس میں زخم وغیرہ بہت لگے تھے۔ ایک شخص کو رحم آ گیا اس نے مرہم پٹی کی تندرست ہو گئے بہت خوش ہوئے اور کہا کہ تم کبھی ہمارے یہاں آوے گا تو ہم تم کو اس کا عوض دے گا۔ اتفاقاً اس کا جانا ادھر ہوگیا وہ سرحدی دوست بھی یاد آ گئے ان کے پاس گیا بہت خوش ہوئے اور کہا کہ ہم تم کو تمہاری خدمت کا عوض دے گا جب وہ سرحدی صاحب نظروں سے ذرا غائب ہوئے تو ان کی بیوی نے کہا کہ جلدی چلا جا۔ ورنہ یہ تم کو زخمی کریگا اور زخمی کر کے تمہارا معالجہ کرے گا۔ جس طرح تم نے ان کا کیا تھا۔ وہ شخص بے چارا اپنی جان بچا کر بھاگا ایسی ہی رحمدلی اہل باطل میں ہے کہ وہ جانوروں کے ذبح نہ کرنے کو رحم سمجھتے ہیں۔

ہمارے مدرسہ کے پاس بعض اہل باطل زندہ چوہے چھوڑ جاتے ہیں یہ رحم چوہوں پر تو کیا اور اپنی بنی نوع کو نقصان پہنچایا اسی طرح سانپ کو زندہ چھوڑ دیتے ہیں۔ سانپ پر تو رحم ہو لیکن اپنی بنی نوع پر ظلم ہوا۔ یہ کیا رحم ہے یہ تو اچھا خاصہ ظلم اور سنگدلی ہے۔

اہل اللہ کا تراحم

سچا مسلمانوں ہی میں ہے کہ ان کو اپنے ہم جنسوں پر بھی رحم ہے اور جانوروں پر بھی رحم ہے ان کو اس کی تعلیم بھی ہے اور ان کا اس پر عمل بھی ہے جو واقعات روزمرہ سے معلوم ہو سکتے ہیں چنانچہ

قدرت کے وقت مخالف سے درگزر کرنا ذرا سماجت پر ان کا نرم ہو جانا یہ روزمرہ مشاہدہ کیا جاتا ہے بلکہ بعض اوقات ان بیچاروں کو اس سے دنیوی نقصان بھی اٹھانا پڑتا ہے اور یہ رحم تو عام طور پر سب مسلمانوں میں ہے اور اہل اللہ کے تراحم کا تو کچھ حساب ہی نہیں۔

حضرت شبلیؒ نے سفر میں کہیں شکر خریدی اور کپڑے میں مضبوط باندھ لی۔ گھر آ کر جو اس کو کھولا دیکھا تو اس میں ایک چیونٹی ہے سوچے کہ یہ چیونٹی راستہ میں تو کہیں چڑھی نہیں کیونکہ بندش کپڑے کی مضبوط ہے ضروری بات ہے کہ شکر والے کی دوکان سے آئی ہے اور یہ کسی کا جوڑا ہو گا اس کا ساتھی ضرور پریشان ہو گا۔ اس کو لے کر وہاں کئی منزل پر گئے اور اس کو اسی دوکان پر چھوڑ آئے۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت ہے کہ کسی نے ان کو خواب میں دیکھا پوچھا کہ حق تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا معاملہ فرمایا کہ ارشاد ہوا کہ تم نے ایک روز ایک بلی کا بچہ دیکھا تھا کہ جاڑے میں سکڑا پڑا ہے تم نے اس کو گرم کپڑے میں لپیٹ دیا ہم تم کو اس وجہ سے بخشتے ہیں کہ تم نے ہماری مخلوق پر رحم کیا۔

حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد ہیں ان کی حکایت ایک بزرگ سے سنی ہے کہ شاہ صاحب چلے جاتے تھے جاڑے کے دن تھے دیکھا کہ ایک نالی کے اندر ایک کتے کا بچہ پھنس رہا ہے اور جاڑے میں ٹھٹھر رہا ہے خادم سے فرمایا کہ اس کو نکال لو۔ خادم تھے ذرا نفیس اور نازک مزاج ان کو اسکے نکالنے میں ذرا تامل ہوا جن بزرگوں کے اخلاق بہت بڑے ہوتے ہیں ان کے خادم بھی ایسے ہی ہوتے ہیں وہ خادم خادم نہیں رہتے بلکہ مخدوم ہو جاتے ہیں۔ وہ بزرگ خود ان کی خدمت کرتے ہیں۔ اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ بزرگوں کو اس قدر نرم اور خلیق بھی نہ ہونا چاہیے۔ کبھی کبھی ذرا پھنکارنا بھی چاہیے۔ ایک مثل ہے کہ ایک سانپ کسی بزرگ کا مرید ہو گیا تھا۔ اس بزرگ نے ستانے کاٹنے وغیرہ سب باتوں سے توبہ کرائی چنانچہ اس نے کاٹنا چھوڑ دیا اور ایک جگہ معتکف ہو گیا جب جانوروں نے دیکھا کہ یہ تو کسی کو کچھ نہیں کہتا سب اس کو ستانے لگے۔ کوئی پکڑ کر گھسیٹتا ہے کوئی نوچتا ہے۔ غرض بے چارہ کی بہت بری گت بنائی ایک روز پیر صاحب کا اس طرف کو گزر ہوا دیکھا بیچارہ نچا ہوا گھسٹا ہوا پڑا ہے۔ پوچھا کیا حال ہے کہا حضرت جی آپ نے جب سے کاٹنے سے توبہ کرائی ہے میں نے کاٹنا چھوڑ دیا تھا جانوروں نے میرا یہ حال بنا دیا ہے۔ ان بزرگ نے کہا میں نے تو تجھ کو کاٹنے سے منع کیا ہے۔ پھنکارنے سے تو ممانعت نہیں کی کاٹو مت پھنکار دیا کرو۔ ایسے ہی بزرگوں کو کہتا ہوں کہ کسی کو ستاویں نہیں لیکن پھنکار دیا کریں۔

غرض خادم صاحب کو جب دیکھا کہ نہ نکالیں گے شاہ صاحب نے خود آستینیں چڑھا کر اس کو

نکال لیا جاڑے کی وجہ سے وہ بالکل بے حس وحرکت تھا۔ حمام قریب تھا حمامی کو کچھ پیسے دے کر اس کو حمام کرایا وہ ذرا حرکت کرنے لگا۔ محلّہ داروں سے فرمایا کہ اگر تم لوگ اس کی نگرانی کرو اور دو وقت روٹی پانی سے اس کی خبر گیری کرتے رہو تو ہم اس کو یہاں چھوڑتے ہیں ورنہ ہم ساتھ لے جاتے ہیں۔ محلّہ داروں نے ذمہ لیا۔ حکایت تو یہ لمبی ہے مگر میرا مقصود اس میں سے صرف اسی قدر تھا۔ تاکہ یہ دکھلاؤں کہ اہل اللہ کے اندر اس درجہ کا رحم ہوتا ہے لیکن چونکہ بقیہ حکایت سے بھی ایک بہت بڑا نفع ہے اس لئے اس کو پورا کئے دیتا ہوں۔ اس قصہ کے بعد شاہ صاحب ایک مرتبہ ایک چھوٹی سی بٹیا یعنی پگڈنڈی پر چلے جا رہے تھے جس کے دونوں طرف کیچڑ بھری تھی سامنے سے ایک کتا آ گیا شاہ صاحب تو منتظر تھے کہ کتا اترے تو میں آگے چلوں اور کتا اس کا منتظر کہ شاہ صاحب اتریں جب کھڑے ہوئے دیر ہوگئی تو شاہ صاحب نے اس کی اصطلاح میں فرمایا کہ اترو اس نے کہا وجہ شاہ صاحب نے فرمایا کہ میں مکلّف ہوں اگر میں اترا تو میرے کپڑے اور بدن ناپاک ہو جائیں گے تو نماز نہ پڑھ سکوں گا اور تو مکلّف نہیں تو اگر آلودہ ہو جائے گا تو پھر سوکھ کر ایسا ہی ہو جائے گا کتے نے کہا کہ یہ تو حیلہ شرعی ہے یاد رکھو کہ اگر میں اترا تو تمہارے اندر عجب پیدا ہوگا اور وہ ایسی نجاست ہے کہ ہفت قلزم سے صاف نہ ہوگی۔ شاہ صاحب پر ایک حالت طاری ہوئی اور فوراً اتر پڑے اور کتا نکل کر چلا گیا۔ اسی وقت ندا آئی اور الہام ہوا کہ اے عبدالرحیم خبر بھی ہے کہ ہم نے تم کو اس کتے سے جو ایک علمی فائدہ پہنچایا ہے اس کی وجہ کیا ہے۔ یاد کرو تم نے فلاں دن اس کی بنی نوع کے ساتھ احسان کیا تھا ہم نے نہ چاہا کہ اس پر تمہارا احسان رہے۔ ہم نے اس کے بھائی سے تم کو یہ فائدہ پہنچا دیا۔ اس وقت شاہ صاحب پر پھر ایک حالت طاری ہوئی یہ باتیں ہوتی ہیں اللہ والوں سے۔

اس حکایت کی تقریب سے ایک اور حکایت یاد آئی حضرت سید احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ یہ بہت بڑے شخص ہیں سادات میں سے ہیں اور اس رتبہ کے ہیں کہ جس وقت یہ مدینہ طیبہ پہنچے تو روضہ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضر ہو کر عرض کیا کہ السلام علیکم یا جدی وہاں سے جواب آیا وعلیکم السلام یا ولدی چونکہ امید اور عادت کے خلاف یہ جواب سنا تو حضرت سید صاحب پر ایک حالت طاری ہوگئی اور اسی حالت میں یہ شعر پڑھا ہے۔

فی حالتہ البعد روحی کنت ارسلہا   تقبل الارض عنی وھی نائبتی
وھذا نوبۃ الاشباح قد حضرت   فامد یمینک کے تحظی بہا شفتی

ترجمہ ان اشعار کا یہ ہے کہ (آپؐ سے دوری کی حالت میں اپنی روح کو بھیجتا تھا کہ وہ میری طرف سے میرے نائب ہو کر زمین بوسی کرتی تھی اور اب یہ نوبت ظاہری جسم کے حاضری کی آئی۔ تو آپؐ اپنا دست مبارک دراز کیجئے تا کہ میرے لب اس سے متمتع ہوں)

حضرت سید صاحب نے جوان اشعار کا تکرار جوش وخروش کے ساتھ کیا تو عجیب قدرت حق تعالیٰ کی ظاہر ہوئی۔ چنانچہ راوی حکایت لکھتے ہیں **خرجت یدہ الکریمہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم** یعنی آپ کا دست کریمہ نکلا اور حالت یہ ہوئی کہ اس کے نکلنے سے آفتاب ماند پڑ گیا اور تمام مسجد منور ہو گئی اس وقت نوے ہزار آدمی وہاں موجود تھے۔ سید صاحب کی برکت سے سب کو زیارت ہوئی اور سید صاحب نے دوڑ کر دست شریف کو بوسہ دیا اس کے بعد سید صاحب کو خیال ہوا کہ چونکہ مجھ سے ایک عجیب واقعہ ظاہر ہوا ہے کہ ایسا واقعہ کسی سے ظاہر نہیں ہوا۔ ممکن ہے کہ اس سے میرے نفس میں عجب پیدا ہو جائے مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے پر آ کر لیٹ رہے اور سب کو کہا کہ سب میرے اوپر کو پھاند کر جاویں اس درجہ کے تو یہ شخص تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ ایک کتے کو دیکھا کہ خارش ہو رہی ہے اور پیپ اور خون میں آلودہ ہے۔ ایک دوا بنائی اور دونوں وقت اپنے ہاتھ سے لیپ کرتے تھے۔ غرض یہ حالت ہے اہل اسلام کے ترحم کی پھر باوجود اس رحم کے ان سب بزرگوں نے بھی **فاذبحوا : البقرۃ** پر عمل کیا۔

محبت کا امتحان

پس جس شخص کے اندر اس درجہ رحم ہو اور پھر وہ اس پر عمل کرے اس سے صاف معلوم ہوا کہ بے رحمی اس کی بناء نہیں ہے بلکہ اس کے اندر ایک اور باریک بات ہے وہ یہ ہے کہ یہ حکم امتحان رحم کا ہے حق تعالیٰ دیکھتے ہیں کہ ہماری محبت زیادہ ہے یا مخلوق کی دیکھیں ہمارا حکم مانتے ہیں یا اپنی اقتضائے طبعی وتراحم فطری پر عمل کرتے ہیں۔ ایاز کی سی مثال ہے کہ لوگوں نے سلطان محمود سے پوچھا تھا کہ آپ ایاز کو زیادہ کیوں چاہتے ہیں کہ اس کے اندر کیا بات ہے۔

سلطان نے کہا کہ کسی وقت دکھلا دیں گے کہ اس کے اندر کون بات زائد ہے ایک روز خزانہ میں سے ایک بڑا قیمتی موتی نکلوایا اور وزیر اعظم کو حکم دیا کہ اس کو توڑ ڈالو۔ وزیر اعظم نے سمجھا کہ معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ کو آج کچھ خلل دماغ ہے عرض کیا کہ حضور پھر ایسا نایاب میسر نہ ہوگا اس حکم پر پھر نظر ثانی کر لیجئے اس کے بعد دوسرے وزیر کو حکم دیا اور وزیر ثانی نے سوچا کہ جب وزیر اعظم نے باوجود مجھ سے زیادہ سمجھدار ہونے کے نہیں توڑا تو میں کیوں توڑوں اس نے بھی عذر کیا۔ غرض سب نے انکار کر دیا تو ایاز کو حکم دیا۔ ایاز نے کہا بہت اچھا فوراً دو پتھر لا کر ایک کے اوپر موتی رکھا اور دوسرے کو اس پر دے مارا وہ چکنا چور ہو گیا۔ وزیر اعظم نے ملامت کی کہ ایسا موتی توڑ ڈالا ایاز نے کہا کہ تم پاگل ہو۔ تم نے بادشاہی حکم توڑا اور میں نے موتی توڑا اور یہ کہا۔

نقض امر از کسر درد شوار تر   لاجرم بستم بامراد کمر

(موتی کے توڑنے سے حاکم کا حکم توڑنا زیادہ برا ہے اسی لئے میں نے اس کے احکام بجالانے کی کمر باندھ رکھی ہے)

پس مسلمانوں کی مثال ایاز کی سی ہے کہ باوجود اس کے کہ گائے بکری سے بے حد محبت چنانچہ جس وقت یہ ذبح کرتے ہیں ان پر بے حد اثر ہوتا ہے جس کو مخالف معترض کیا جانیں لیکن محبوب حقیقی کے حکم کے سامنے اپنے اس جوش محبت کو روک لیا اور حکم شاہی کو نہیں توڑا حکم ہوا کہ ان کا گلا کاٹ ڈالو بلا چون وچرا تسلیم کرلیا کہ بہت بہتر اور دل اندر سے گھلا جاتا ہے اور پگھلا جاتا ہے لیکن حکم کو خوشی خوشی بجالاتے ہیں۔

ہمارے استاد حضرت مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک گائے کا بچہ قربانی کے لئے پالا تھا۔ اس کی بڑی خدمت کی جاتی تھی اور خود اس کو جنگل میں لے جا کر اس کے ساتھ دوڑتے تھے۔ غرض اس سے بہت ہی محبت تھی اور تازہ اس قدر ہوئی تھی کہ قصائی اس کے ۸۰ روپے دیتے تھے جس روز اس کو ذبح کیا ہے تو میں نے سنا تھا کہ مولانا کے آنسو جاری تھے۔ اور گھر بھر کو رنج ہوا۔ دیکھو اگر مسلمانوں کے اندر رحم اور محبت نہیں تو یہ رونا اور آنسو بہانا کیوں تھا لیکن کیا بات ہے اس سے زیادہ محبت حق تعالیٰ کے ساتھ ہے اس لئے اس کے حکم کے سامنے سب مقتضیات طبعیہ ہیچ ہو جاتے ہیں۔

قربانی اولاد و نفس

جانور تو جانور اس کی تو کچھ حقیقت ہی نہیں۔ حق تعالیٰ کی محبت میں مسلمان اپنی اولاد کی جان کو قربان کر دیتا ہے۔ ایک بڑھیا کے دو بیٹے تھے۔ لڑائی میں دونوں کو بھیج دیا اور خوش تھی کہ اللہ کی راہ میں جان دیں گے۔ ایک ان میں سے بچ کر آ گیا تو یہ کہا کہ میں تو خوش تھی کہ یہ بھی کام آ جاتا۔ جب مسلمان اپنی اولاد کے قربانی کرنے پر آمادہ ہیں تو کیا اولاد پر بھی رحم نہیں۔ رحم تو سب سے زیادہ ہے لیکن حق تعالیٰ کے مقابلہ میں وہ کسی کو نہیں سمجھتے اپنی جان تک کی پرواہ کرتے ہی نہیں بڑی خوشی سے جان دیتے ہیں بہت سے مسلمانوں کو خاص کر طاعون میں دیکھا ہے بہت خوشی خوشی دنیا سے رخصت ہوئے۔ بخلاف کافر کے دیکھا تو نہیں پر سنا ہے کہ کافر کو موت کے وقت بڑی دحشت ہوتی ہے اور مسلمان ہنسی خوشی جاتے ہیں اور کیوں نہ جائیں جب کہ ان کو اپنے مولیٰ سے اس قدر محبت ہے تو اپنے محبوب سے تو ہر شخص ملنا چاہتا ہے۔ حدیث شریف میں ہے **من احب لقاء الله احب الله لقاء ہ** (صحیح مسلم) یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ کے ملنے کو چاہے اللہ تعالیٰ اس سے ملنا چاہے گا۔ موت واللہ بڑی بھاری نعمت ہے اور جو کچھ گھبراہٹ طبعی اور وحشت موت سے ہوتی ہے اور عین وقت پر کچھ نہیں چنانچہ حدیث میں بھی ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث مذکور سنائی تو حضرت عائشہؓ نے عرض کیا یا

رسول اللہ کلنا یکرہ الموت (یعنی یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم میں ہر ایک موت کو ناپسند کرتا ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ اے عائشہؓ یہ اس وقت نہیں موت کے وقت ہے یعنی اس وقت خوش ہو جاتا ہے۔ اس وقت تسلی کی جاتی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ...... نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِیْمٍ

یعنی بے شک جن لوگوں نے یہ کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر اس پر مستقیم رہے ان پر موت کے وقت فرشتے اترتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم ڈرومت اور نہ غمگین ہو اور خوشخبری پاؤ اس جنت کی جس کے تم سے وعدہ کئے گئے ہم تمہارے دوست ہیں دنیوی زندگی میں اور آخرت میں اور تمہارے لئے وہ ہے جو تمہارا جی چاہے اور تمہارے لئے وہ ہے جو تم مانگو۔ دیکھئے اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے صرف ایمان پر بشارت دی ہے عمل صالح کی قید بھی نہیں لگائی۔ حضرت مسلمان اگر گنہگار بھی ہو تب بھی مرنے کے وقت اس کی خوشی ہوتی ہے۔ دیکھئے اگر کسی سے محبت ہو تو گویا اس کا یقین ہو کہ محبوب مجھ کو مارے پیٹے گا لیکن جانتا ہے کہ بلا سے پٹوں لیکن ان کو دیکھنا تو نصیب ہو گا اور یوں کہتا ہے۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم ——— راحت جاں طلبم وزپے جاناں بروم

(وہ دن کتنا اچھا ہو گا کہ میں اس ویران منزل سے چلا جاؤں گا راحت جاں طلب کروں گا اور اپنے محبوب کے پیچھے ہوں گا)

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے ——— تا درمیکدہ شاداں و غزل خواں بروم

(میں نے نذر مانی تھی کہ اگر یہ غم کسی دن ختم ہو جائے تو میکدے کے دروازے تک شاداں اور غزل خواں جاؤں گا۔)

کوئی شخص اگر کہے کہ یہ شعر تو اطمینان کے وقت گھڑے ہوئے ہیں۔ مرنے کے وقت نانی یاد آئی ہو گی۔ سو سنئے کہ عین نزع کے وقت ایک بزرگ کہتے تھے۔

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم ——— جسم گذارم سراسر جاں شوم

(وہ وقت آ گیا ہے کہ میں عریاں ہو جاؤں یعنی جسم کے لباس کو چھوڑ دوں فقط روح رہ جائے)

تو کیا اپنی جان سے ان کو محبت نہیں لیکن اس محبوب حقیقی سے ایسی محبت ہے کہ اس کے سامنے سب محبتیں گرد ہیں۔ ایسی ہی جانور سے بھی محبت ہے اور اندر سے دل رکھتا ہے لیکن عقل اور دین کا تقاضا ایسا ہوتا ہے کہ اس پر وہ غالب آ جاتا ہے۔ زبان حال سے کہتا ہے۔

ہر کہ جاں بخشد اگر بخشد رواست ——— نائب است اودست اودست خداست

(جو جاں دیتا ہے اگر وہی مارے ڈالے تو جائز ہے کیونکہ وہ نائب خدا ہے اور اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے)

دیکھو اگر نوکر سے ہم کسی بات کا امر کریں اور وہ اپنی عقل کو دخل دے اور چون و چرا کرے تو کس قدر ناگوار ہوتا ہے اور اس کا نافرمان اور عاصی قرار دیا جاتا ہے۔ حالانکہ نوکر کا تعلق بہت ہی ضعیف ہے جب اس ضعیف تعلق پر یہ کیفیت ہے تو خدا تعالیٰ سے تو بندہ کا تعلق بہت بڑا ہے اس نے جب حکم دیا تو اس کے حکم کے سامنے تو یہ حالت ہونا چاہیے۔

ہمچو اسماعیل پیشش سر بنہ — شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

(اسماعیلؑ کی طرح اسکے سامنے سر رکھدے اور اسکی تلوار کے سامنے ہنستے ہوئے جان دیدے)

نیم جاں بستاند وصد جاں دہد — آنچہ درو ہمت نیاید آں دہد

(فانی اور حقیر جان لیتے ہیں اور اس کے بدلہ میں باقی جان عطا کرتے ہیں جو خواب و خیال میں نہیں ہوتا وہ عطا کرتے ہیں)

معترضین سے سوال

پھر ان معترضین سے کوئی پوچھے کہ تم نے اس کا تو انسداد کیا کہ اللہ کے کہنے سے مسلمان نہ کاٹیں۔ مگر اس کا بھی کچھ انسداد کیا کہ اللہ میاں بھی جان نہ لیں کیا۔ نعوذ باللہ یہ اللہ میاں کی بے رحمی ہے، جو جواب اس کا ہے وہی جواب ہمارا ہے۔ پھر ان معترضین سے پوچھنا چاہیے کہ کیوں صاحب مطلق تکلیف بے رحمی ہے یا خاص ذبح کرنا ہی بے رحمی ہے اگر خاص ذبح کرنا بے رحمی ہے تو وجہ تخصیص بتلایئے اور اگر مطلق تکلیف بے رحمی۔ ہے تو ہلوں میں چلا کر جوڈنڈوں سے انہیں پیٹتے ہو اور گاڑیوں میں جوت کر آرے انہیں چھیدتے ہو یہ بے رحمی نہیں ہے اور پھر ہزاروں چیزیں چمڑے کی بنتی ہیں۔ اور یہ معترضین بھی برتتے ہیں یہ رحم کے خلاف نہیں ہے۔ یہ بے رحمی کا سبب بنتا نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ عقل اور سمجھ سے کام لیا جاوے تو ذبح کرنا جانوروں کا بالکل عقل کے موافق ہے اور ان معترضین کے مذہب پر مجھے پوری طرح نظر نہیں لیکن تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ خود ان کے یہاں بھی یہ عمل تھا مگر اس کی تحقیق نہیں ہے کہ کب سے ترک ہوا معلوم ہوتا ہے کہ کسی فلسفی نے مشورہ دیا ہوگا کہ گھی دودھ کے لئے ان کو باقی رکھنا چاہیے۔ خیر مجھ کو ان معترضین کی شکایت نہیں ہے اس لئے کہ ان کا تو یہ مذہب ہی ہے، مجھ کو تو شکایت اپنے بعض بھائیوں کی ہے۔

من از بیگانگاں ہرگز نہ نالم — کہ با من انچہ کرد آں آشنا کرد

(میں غیروں سے شکایت نہیں رکھتا کیونکہ میرے ساتھ جو کچھ بدی کی ہے وہ اس دوست نے کی ہے)

گاؤکشی اور اتحاد

وہ کیا شکایت ہے کہ بعضے رائے دے رہے ہیں کہ اگر قربانی چھوڑ دی جاوے تو باہم ہم وطنوں میں اتحاد ہو جائے گا۔ بے شک بہت اچھی شے ہے مگر کلام اس میں ہے کہ گاؤکشی چھوڑنے سے اتفاق ہو گا یہ دیکھنا چاہیے۔ (ان کے درویش اور جوگی کا ترک حیوانات پر عمل ہوگا اس کی تقلید کی ہے۱۲) کہ بنائے مخاصمت کیا ہے اس کا انسداد کرنا چاہیے بنائے مخاصمت گائے کی قربانی نہیں۔ یہ تو ہمیشہ سے ہوتی چلی آئی ہے اگر یہی بناء منازعت ہوتی تو نا اتفاقی ہمیشہ سے ہوتی۔ حالانکہ پہلے ہندو اور مسلمان باہم شیر و شکر تھے۔ چنانچہ پرانے خیال کے ہندو جواب بھی دیکھے جاتے ہیں ان میں وہ بات ہو۔ نئے خیال والوں میں نہیں تو غور سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب سے تاریخ کی تعلیم ہوئی ہے اس وقت سے یہ نا اتفاقی کا زہر پھیلا ہے اس لئے کہ اس سے پرانے خیالات اور پرانی عداوتیں تازہ ہوئیں ان کے طبائع میں جوش پیدا کر دیا اور گاؤکشی تو ہمیشہ سے ہے ہم دیکھتے ہیں کہ پہلے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اس قدر اتفاق تھا کہ شادی غمی کے موقع پر آپس میں لین دین تک ہوتا تھا اور ہر ایک ایک دوسرے کے کام آتا تھا۔ بظاہر کچھ بھی جھگڑا نہ تھا باقی مذہبی اختلاف کے ہوتے ہوئے جو اصلی اتفاق ہے وہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن ظاہری اتفاق تو تھا اب وہ اتفاقی ظاہری بھی نہیں رہا۔ اس کی کیا وجہ ہے اور کیا راز ہے۔

راز درون پردہ زرنداں مست پرس　　　　کیں حال نیست صوفی عالی مقام را

(چھپے ہوئے رازوں کو تو رندوں سے پوچھ کیونکہ صوفی عالی مقام اس حال سے بے خبر ہے)

تاریخ کا جادو

واللہ اس کا راز بس یہی ہے کہ تاریخ پڑھی جاتی ہے یہ تاریخ وہ بلا کا جادو ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم باہم ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ ایک بار کفار نے دیکھ کر حسد کیا اور چاہا کہ ان میں لڑائی کرا دیں۔ دو قبیلے تھے انصار میں اوس اور خزرج ان میں باہم زمانہ جاہلیت میں چھیڑ چھاڑ رہتی تھی چنانچہ یہود نے وہ اشعار پڑھ دیئے جو آپس میں انہوں نے ایک دوسرے کے مقابلہ میں پچھلے زمانہ میں کہتے تھے۔ بس اشعار کا پڑھنا تھا کہ مادہ مدفونہ کو جوش آیا اور آپس میں وہ دو چار باتیں تیز تیز ہو کر تلواریں نکل آئیں اور دونوں طرف صفیں آراستہ ہو گئیں اور قریب تھا کہ جنگ شروع ہو جائے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئے اور آپ نے سب کو ٹھنڈا کیا۔ تاریخ وہ جادو ہے کہ ذرا سی دیر میں کچھ سے کچھ کر ڈالے اور جب سے عنایت فرما آریئے پیدا ہوئے ہیں اس وقت سے اور بھی زیادہ انہوں نے نار عداوت مشتعل کر دی ہے۔

گائے کی قربانی کا ترک

یہ تو اس رائے کے متعلق تاریخی کلام تھا اور ایک مذہبی کلام ہے وہ یہ کہ آیا شرعاً گائے کی قربانی روکنا جائز بھی ہے یا نہیں۔ بعضے بھولے لوگوں کو اس میں غلطی ہوئی ہے وہ کہتے ہیں کہ مطلق قربانی واجب ہے خواہ بکری کی ہو یا گائے کی پھر کیا ضرورت ہے آپس میں رنج ڈالنا پس گائے کی قربانی چھوڑ دیں۔ بکری کی کرلیا کریں۔ بظاہر تو یہ رائے بہت مناسب ہے لیکن غور کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ بالکل لچر اور پوچ بات ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ دیکھنا چاہیے کہ گائے کی قربانی ترک کرنا دوسری قوم کے نزدیک مذہبی امر پر مبنی ہے یا مصلحت ملکی پر تو واقع میں ان کے یہاں یہ جزو مذہب ہے پس اس وقت ہمارا ترک کرنا کفر کی رعایت کرنا ہے اس لئے ہرگز جائز نہیں ہے۔ بعضے لوگ گاؤ کشی کے متعلق اخباروں میں اپنی رائے لکھ کر ہم سے بھی درخواست کرتے ہیں کہ ہم بھی اخباروں میں اس کے متعلق اپنی رائے لکھیں مگر ہمارے نزدیک اخباروں میں آج کل ایسا مضمون لکھنا حکام کو اپنی طرف سے بدگمان کرنا ہے کیونکہ نامہ نگاروں کو حکام عموماً مفسد سمجھتے ہیں اس لئے ہم کسی کو بدگمان کرنا نہیں چاہتے۔ ہمارے اصول میں ہے اتقوا مواضع التهم کہ تہمتوں کے مواقع سے بچو یہ کہ اخبار میں مضمون لکھ کر اس مضمون کو متبذل کر دینا ہے اس مضمون کی عام مسلمانوں اور دینداروں کی نظروں میں کچھ وقعت نہیں ہوتی اس لئے ہم کو اخبار میں مضمون لکھنا پسند نہیں اور یہ بھی پسند نہیں کہ ہندوؤں کو چڑ چڑا کر گاؤ کشی کریں کہ اس میں دل آزاری اور بلا ضرورت فتنہ ہے۔ جیسے پہلے سے کرتے ہو اسی طرح کرتے رہو۔ اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ جانور کا ذبح کرنا عین عقل کے موافق ہے بلکہ علامت ہے کمال ایمان اور حق تعالیٰ کے ساتھ محبت کی اور بیان سے اس کی حقیقت نوعیہ کے اعتبار سے بھی فضیلت سمجھ میں آ گئی ہوگی۔

فضیلت زمانی

دوسری فضیلت ہوتی ہے زمانہ کی فضیلت کی وجہ سے سو جس زمانہ میں یہ قربانی مشروع ہے اس کی بھی بہت بڑی فضیلت ہے چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ان ایام میں اس عمل سے بہتر کوئی عمل نہیں ہے اور آیا ہے کہ ماہ ذی الحجہ میں یکم سے لے کر ۹ ذی الحجہ تک اگر کوئی روزے رکھے تو ایک ایک روزہ کے بدلے ایک ایک سال کے روزوں کا ثواب ملتا ہے اور عرفہ کے دن روزہ رکھنے سے دو برس کے گناہ معاف ہوں گے نیز ان ایام میں حج اور مناسک حج بھی مقرر ہے پس ان ایام میں یہ عمل افضل الاعمال قرار دیا گیا ہے۔

فضیلت مکانی

تیسری وجہ فضیلت کی مکان کا شرف ہے اس کو میں بے تکلف ثابت نہیں کر سکتا لیکن ایک حدیث سے

اس کا استنباط ہوسکتا ہے وہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جس وقت حجاج لبیک کہتے ہیں تو تمام شجر اور حجر اور مدر سب لبیک کہتے ہیں اور ان سے سن کران کے متصل کے شجر اور حجر کہتے ہیں حتیٰ ینتھی الارض من ھھنا وھھنا (یہاں تک کہ زمین یہاں سے وہاں تک ملحق ہوجاتی ہے) اس سے ثابت ہوا کہ اس زمانہ میں تمام امکنہ حکماً ملحق ہوجاتے ہیں حرم کے ساتھ اور نیز یہ مسئلہ ہے کہ اگر مسجد میں نماز ہوتی ہو اور صفوف باہر تک آجاویں تو بیرونی جگہ بھی بعض احکام میں مسجد ہی کے ساتھ ملحق ہوجائے گی اسی طرح گویا تمام مواقع قربانی کے بھی برکت میں بحکم حرم ہوجاتے ہیں پس اسی طرح سے مکانی فضیلت بھی سب قربانی والوں کو میسر ہوجاتی ہے اور اس میں کوئی بعد نہیں ہے اللہ کا نام تو وہ شے ہے کہ دنیا بھر میں ایک بھی اللہ اللہ کہنے والا ہو تو اس کی برکت تمام زمین کو بھر دیتی ہے پس اس معنی کر ہمارا تھانہ بھون اور جلال آباد بھی حرم محترم کے ساتھ ملحق ہو رہا ہے پس اس طرح سے مکان کا شرف بھی قربانی میں حاصل ہے گو بواسطہ ہی سہی لیکن برکت سے خالی نہیں۔

مرا از زلف تو موئے پسند است ہوس را راہ مدہ بوئے پسند است

(تیری زلف میں سے صرف ایک بال ہی مجھے پسند ہے اور اگر ہوس کو چھوڑ دوں تو صرف خوشبو ہی پسند ہے) خیر متا نہیں تو ہنا تو ہے قافیہ بھی مل گیا پس مکان کا شرف بھی بحمد اللہ ثابت ہوگیا۔

فضیلت باعتبار ربانی

اب رہ گیا بانی و بادی کا شرف سو اس کی نسبت یہ ہے کہ حدیث میں آیا ہے **قالوا ما ھذا الاضاحی یا رسول اللہ قال سنۃ ابیکم ابراھیم** (الدر المنثور) یعنی صحابہ نے کہا یا رسول اللہ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) قربانیاں کیا ہیں فرمایا تمہارے باپ ابراہیم کا طریقہ ہے سنۃ ابیکم ابراھیم میں ایک عجیب لطیفہ ہے وہ یہ ہے کہ قربانی کو ابراہیم علیہ السلام کی سنت فرمایا۔ حالانکہ ان کا فعل ذبح ولد ہے اور ہمارا فعل ذبح البقرہ ہے جب تغائر ہوا تو پھر اضاحی کو سنت ابراہیم کہنا کیسے صحیح ہوا؟

اور اگر کوئی کہے کہ انہوں نے تو بکری کو ذبح کیا تھا بیٹے کو کہاں ذبح کیا ہے تو جواب یہ ہے کہ انہوں نے تو قصداً بیٹے ہی کو ذبح کیا تھا چنانچہ چھری چلا ہی دی تھی۔ لیکن حق تعالیٰ نے بجائے ان کے مینڈھے یا بکری کو قائم مقام کر دیا پس سنت ابراہیم تو اضاحی اس وقت ہوں جبکہ ہم ہی اپنی اولاد کو ذبح کریں پھر سنت ابراہیم جو اس کو فرمایا تو نکتہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتلایا ہے کہ تم کو اس عمل کا ثواب اتنا ہی ملتا ہے جس قدر کہ ان کو ذبح ولد پر ملا تھا۔ اول تو ذبح ولد ہی ایک بہت بڑا عمل ہے دوسرے یہ کہ ابراہیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کا ذبح کہ اس پر ثواب بھی بے انتہاء ہوگا تو گویا ارشاد ہے کہ تم کو اس عمل پر وہی ثواب ہوگا جس قدر کہ ابراہیم علیہ السلام کو ذبح ولد پر ہوا تھا۔ سبحان اللہ! یہ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

برکت ہے کہ تین روپیہ میں وہ اجر ہم کو ملتا ہے۔ جو بیٹے کے ذبح کرنے سے ایک پیغمبر کو ملتا ہے۔ اللہ اکبر ۔

طوبیٰ لنا مفسر الاسلام ان لنا من العنایة کنا غیر منهدم

(اسلام کا معاشرہ ہمارے لئے خوشخبری ہے ہم پر اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت سے ایسا رکن عطا ہوا جو نہ گرنے والا ہے)

یہ فضیلت تو واللہ ایسی ہے کہ جسکے ذمہ قربانی واجب نہیں وہ بھی اگر چھوڑے تو اسکو ایک بڑی بھاری فضیلت کو چھوڑنے والا کہا جائیگا اور جسکے ذمہ واجب ہے وہ اگر ترک کرے تو بڑا ہی خاسر ہے یہ شرف قربانی کا بانی کیوجہ سے ہوا۔

فضیلت غائی

اب غایت کے اعتبار سے لیجئے غایت اس کی دو ہیں دنیا کے اعتبار سے بھی اور آخرت کے اعتبار سے بھی۔ دنیا میں تو یہ ہے کہ وہ جانور ذبح ہو کر پھر تمہارے کام آ سکتا ہے چنانچہ قربانی کے گوشت کی اگر تم ایک بوٹی بھی کسی کو نہ دو اور سب کا سب خود ہی کھالو تو بھی قربانی میں کوئی فرق نہیں آتا۔ یہ عجیب انفاق مالی ہے کہ وہ شئے تمہارے ہی پاس رہے اور پھر عبادت ادا ہو گئی اور انفاقات مالیہ جس قدر ہیں ان میں یہ بات نہیں جب تک ملک سے علیحدہ نہ کرو اس وقت تک ادا نہیں ہوتے ہیں اور ثواب نہیں ملتا ہے۔ اس امر میں یہ عمل انفاقات مالیہ سے ممتاز ہے۔ ایک لطیفہ جو ابھی ذہن میں آیا اس میں یہ ہے کہ اس میں دنیا کے اعتبار سے ایک اور فضیلت ہے وہ یہ ہے کہ اور انفاقات مالیہ میں تو چونکہ مال ملک سے نکلتا ہے اور نفس کو معلوم ہوتا ہے کہ تیرے پاس سے یہ شے جاوے گی اس لئے ان میں تو ممکن ہے کہ نفس حیلہ کرے اور غالب ہو کر اس عبادت سے محروم رہے اور قربانی میں چونکہ نفس کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ذبح ہو کر وہ جانور میرے ہی ملک میں رہے گا اور میں ہی اس سے منتفع ہوں گا تو اس کے ادا کرنے میں حیلہ بہانہ کرے گا۔ اور اس سے محروم نہ رہے گا۔ تو اس سے یہ امر معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو یہ عمل بہت ہی محبوب و مرغوب ہے کہ اس کے اندر اس قدر سہولتیں رکھی ہیں کہ کوئی بھی روک اس کے کرنے میں بندوں کو نہ ہوا اور آخرت میں غایت یہ ہے کہ انها علی الصراط مطایاکم (لم أجد الحديث في موسوعة) کہ بیشک وہ پل صراط پر تمہاری سواریاں ہونگے پس یہ شرف قربانی غایت کی وجہ سے ہوا الحمد للہ کہ قربانی کا فضل پانچوں وجہ سے ثابت ہو گیا اور یہ معلوم ہو گیا کہ قربانی بھی عجیب عمل ہے کہ ہر حیثیت سے اس میں فضیلت ہے اب باقی رہ گیا آیت سے ان پنجگانہ وجوہ فضیلت کا استنباط سو اس کی تقریر بیان کی جاتی ہے۔

استنباط فضائل

اول ترجمہ و تفسیر کیا جاتا ہے اس کے بعد عام اجزاء فضیلت پر اس کا انطباق بیان کر دیا جائے گا حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ اس میں ابراہیم علیہ السلام کو خطاب ہے ارشاد ہے کہ اے ابراہیم لوگوں میں پکار دو حج کے واسطے چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اس فرمان کی اس طرح تعمیل کی کہ

پہاڑ پر کھڑے ہو کر پکارا کہ اے لوگو! تمہارے رب نے ایک گھر بنایا ہے اس کا حج کرو۔ حدیث میں آیا ہے کہ اس آواز کو تمام جہان کے لوگوں نے سنا۔ بزرگوں نے کہا کہ جس نے خود یا اس کی روح نے لبیک کہا اس کو حج نصیب ہوتا ہے اور جس نے نہیں کہا وہ نہیں جاتا آگے ارشاد ہے۔ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِيْنَ یعنی اس آواز دینے اور پکارنے کا اثر یہ ہوگا کہ لوگ تمہارے پاس پیادہ اور ہر دبلی سواری پر آویں گے۔ مطلب یہ ہے کہ بڑی بڑی دور سے آویں گے کہ آتے آتے جانور سواری کے دبلے ہو جاویں گے۔ ياتين من كل فج عميق آویں گے وہ سواریاں ہر راستہ دور دراز سے ایک حکایت یاد آئی کہ بوستاں میں جو ہے حوالیہ من کل فج عميق ایک میاں جی نے اس کا ترجمہ یہ بتلایا تھا کہ خانہ کعبہ کے گرد بڑی بڑی کھائیاں ہیں لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ تا کہ حاضر ہوں وہ اپنے منافع پر یعنی یہاں آ کر کچھ منافع ہوں گے۔ اور وہ منافع عام ہیں خواہ اخروی ہوں کہ ثواب ہوتا ہے اور یا دنیوی کو حج کے اندر لوگ جمع ہوتے ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوتے ہیں۔ اور بہت سے منافع دنیویہ اس سے حاصل ہوتے ہیں۔ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ م بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ. (اور تا کہ ان ایام مقررہ (یعنی ایام قربانی میں) ان (مخصوص) چوپایوں پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیں (یعنی بسم اللہ اللہ اکبر) کہیں۔ جو ہم نے ان کو عطا کئے ہیں) یعنی آنے پر دو غایتیں مرتب ہوں ایک تو منافع اخرویہ و دنیوی جس کا بیان لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (تا کہ اپنی دینیہ و دنیوی فوائد کے لئے آ موجود ہوں) میں ہے اور دوسری یہ کہ اللہ کا نام ذکر کریں۔ چند ایک ایام معلومہ میں ان اہلی جانوروں پر جو اللہ نے ان کو دیئے ہیں فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ. پس ان سے تم بھی کھاؤ اور تنگ دست فقیر کو بھی کھلاؤ ہر چند کہ یہاں ذکر حج کا ہے لیکن قربانی جس کے متعلق یہ آیتیں ہیں وہ تو عمل مشترک ہے اس لئے ان آیتوں سے مطلق قربانی کی فضیلت بھی مستنبط ہو سکتی ہے۔ بہر حال یہ تو تفسیر تھی ان آیتوں سے کہ اب وجوہ فضیلت کا استنباط سنئے عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ م بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ (ایام مقررہ (ایام قربانی) میں مخصوص چوپایوں پر جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا کئے ہیں) میں اشارہ ہے اس کے عمل کی حقیقت جنسیہ و نوعیہ کی طرف اس لئے کہ جانور بدوں مال کے خرچ کئے ہوئے نہیں آتا۔ اور ان پر اللہ کا نام لینے سے مراد ذبح کرنا ہے کہ جو اشارہ ہے حقیقت نوعیہ کی طرف فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ (ایام مقررہ (یعنی ایام قربانی) میں) سے اس زمانہ کی فضیلت ثابت ہوئی اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جانی پہچانی دن فرمایا لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (تا کہ اپنے منافع پر حاضر ہوں) سے مکان کی طرف اشارہ ہے اس لئے کہ حاضر ہونا مکان میں ہوتا ہے مشہود مکان ہوتا اور شاہد زمان اس میں مشہود مکان کو شہود منافع سے تعبیر فرمایا ہے۔ رہا بانی کا ذکر وہ وَاَذِّنْ فِى النَّاسِ میں ہے غایت کا ذکر لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ (تا کہ اپنے منافع پر حاضر ہوں) میں ہے کہ جو متضمن ہے نفع دنیوی و نفع اخروی کو اور على ما رزقهم (جو اللہ تعالیٰ نے انکو عطا کئے) سے اشارہ اس طرف ہے کہ باوجود ذبح ہونے کی بھی نسبت اس کی

اہم سے یعنی ذبحیں سے قطع نہیں ہوئی۔ چنانچہ آگے فکُلُوا مِنھَا وَاَطْعِمُوا (پس اس میں سے خود کھاؤ اور کھلاؤ) اس پر صاف دلیل ہے کہ وہ جانور ملک سے نکلتا نہیں ہے اور یہ اس واسطے فرمادیا تا کہ نفس اس بات سے مچلے نہیں۔ اور اس کو سہولت نظر آتی رہے اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کا شکر اگر اپنے انتفاع پر موقوف ہوتو آدمی کو چاہیے کہ کھایا پیا کرے اور وَیَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ (اور اللہ کا نام لیں) یہ تو ظاہر ہی ہے کہ اللہ کا نام لینا نفع اخروی ہے مگر اس میں ایک نفع دنیوی بھی ہے وہ یہ کہ اللہ کا نام لینے سے جانور کے اندر حلت آجاتی ہے اور وہ کھانے کے لائق ہو جاتا ہے اور یہاں سے ایک شبہ بھی دفعہ ہوتا ہے تقریر شبہ کی یہ ہے کہ اہل جاہلیت کہا کرتے تھے کہ اس کی کیا وجہ ہے تمہارا مارا ہوا جانور تو حلال ہو اور اللہ کا مارا ہوا حرام یعنی ذبیحہ حلال ہو اور مردار حرام اس کا جواب یہاں سے نکل آیا کہ ذبیحہ جو کھانے کے قابل ہوتا ہے وہ بھی اللہ ہی کے نام کی برکت ہے پس دونوں اللہ تعالیٰ ہی کے مارے ہوئے ہیں ہمارا مارا ہوا نہیں کیونکہ جان تو وہی نکالتا ہے باقی یہ فرق کہ ایک حلال اور ایک حرام تو وجہ یہ ہے کہ یہاں اللہ کا نام لیا گیا ہے اس کی برکت سے اس میں حلت آگئی اور وہاں نہیں لیا گیا اس لئے حرام رہی اور دوسرے فرق کی وجہ یہ ہے کہ ذبیحہ میں دم مسفوح جو نجس ہے نکل جاتا ہے اور مردار میں وہ خون تمام بدن میں سما جاتا ہے پس حلت دونوں باتوں کے مجموعہ کا یعنی یَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ اور خروج دم مسفوح کا اثر ہے۔ اور کُلُوْا سے یہ مسئلہ مستنبط ہوتا ہے کہ غنی کو بھی کھانا جائز ہے یہ حق تعالیٰ کا بڑا انعام ہے جو بہ برکت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم کو عطا ہوا ہے ورنہ امم سابقہ میں یہ ہوتا تھا کہ قربانی کو ایک پہاڑ پر رکھ دیتے تھے ایک آگ آتی تھی جس کی قربانی کو اس نے جلا دیا وہ مقبول ہوتی تھی ورنہ مردود الحمدللہ کہ پانچوں وجہ فضائل کے قرآن مجید سے بھی صاف طور پر ثابت ہوگئیں میرا مقصود فضائل بیان کرنے سے یہ ہے کہ لوگوں کو قربانی کی حقیقت معلوم ہو جاوے اور اس کی طرف رغبت ہو باقی احکام اگر کسی کو دریافت کرنا ہو تو مدرسہ میں آکر دریافت کر لے اب اس سننے کا اثر یہ ہونا چاہیے کہ جن کے ذمہ واجب ہے وہ تو ضرور ہی کریں اور ان شاء اللہ تعالیٰ کریں گے باقی جن کے ذمہ واجب نہیں لیکن وسعت اس قدر ہے کہ اگر ایک حصہ قربانی کا کرلیں تو اس زائد خرچ کی وجہ سے کسی حق واجب میں فرق نہ آوے وہ لوگ بھی مناسب ہے کہ کریں اس کی فضیلت ایسی ہے کہ اس کا چھوڑنا بہت بڑے نفع سے محروم رہنا ہے اور جس کو بالکل ہی وسعت نہ ہو وہ مجبور ہے۔

غریب کی قربانی

اور غریب کو قربانی کرنے کا مناسب اور مستحب ہونا بھی اسی آیت سے معلوم ہوتا ہے اس لئے کہ ارشاد یہ ہے یَاْتُوْکَ رِجَالًا یاتوک رجالا کہ آویں گے تیرے پاس پیادہ جو پیادہ آویگا وہ ظاہر ہے کہ غریب ہی ہوگا یہ بیان ختم ہوا آپ حضرات ضرور ہمت کیجئے اور جو لوگ یہاں موجود نہیں ہیں ان کو بھی سنا دیجئے۔ اب اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ توفیق عطا فرماویں۔ آمین واللہ الموفق والمستعان

السوال فی شوال

۹ شوال ۱۳۳۶ھ کو بعد نماز جمعہ حج و قربانی اور امساک باراں کے بارے میں یہ وعظ ارشاد فرمایا۔ حضرتؒ کرسی پر جلوہ افروز تھے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی مرحوم نے اسے قلمبند فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ساٹھ تھی۔

عارف جہاں بیٹھتا ہے وہی اس کا مکہ اور مدینہ ہے کیونکہ مکہ کی حقیقت تجلی الوہیت اور مدینہ کی حقیقت ہے تجلی عبدیت اور عارف اپنے اندر ہر وقت تجلی الوہیت و تجلی عبدیت کا مشاہدہ کرتا ہے وہ جہاں بیٹھے گا مکہ مدینہ (زادھما اللہ شرفاً و کرامۃً) اس کے ساتھ ہے۔ پس وہ ہر جگہ خوش رہے گا کیونکہ مقصود سے ہر دم اس کو قرب حاصل ہے ؎

ہر کجا دلبر بود خرم نشیں
فوق گردوں ست نے قعر زمیں

(از حضرت حکیم الامۃؒ)

خطبہ ماثورہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ نَحْمَدُهٗ وَنَسْتَعِيْنُهٗ وَنَسْتَغْفِرُهٗ وَنُؤْمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيْهِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَيِّاٰتِ اَعْمَالِنَا مَنْ يَّهْدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنْ يُّضْلِلْهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَنَشْهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوْلٰنَا مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّمَ.

امابعد: فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم

يَسْئَلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ (الرحمٰن آیت نمبر ۲۹)

ترجمہ:۔ اس سے سب اپنی اپنی حاجتیں سب آسمان والے اور سب زمین والے مانگتے ہیں وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں رہتا ہے۔

تمہید:۔ مجھ کو اس وقت تین متفرق مضامین بیان کرنا ہیں۔ اور باوجود تفرق کے ان میں ایک وجہ جامع بھی ہے اس وجہ جامع کی بناء پر میں نے یہ آیت تلاوت کی ہے یعنی تفصیلاً تو اس آیت میں ان تینوں کا ذکر نہیں ہے لیکن آیت میں ایک ایسی چیز کا ذکر ہے جو ان تینوں میں مشترک ہے اور اس کی وجہ سے باوجود تفرق کے ان میں ایک خاص ارتباط ہے پس اول میں ان تینوں کی تقریر کرتا ہوں پھر وجہ جامع بیان کروں گا جس سے آیت کے ساتھ ان مضامین کا تعلق واضح ہو جائے گا تو ان میں سے ایک تو حج کا مضمون ہے دوسرے قربانی کے متعلق کچھ بیان کرنا ہے تیسرے امساک باراں کا سبب اور اس کا علاج بتلانا ہے دو مضمون اول کے تو تشریع عام کے اعتبار سے ان ایام کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور تیسرے مضمون کا اتفاقاً اس زمانہ سے تعلق ہو گیا کیونکہ آج کل امساک باراں ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے لوگ پریشان ہیں تو یوں

کہئے کہ اس زمانہ کے ساتھ دو کا تعلق تو تشریع عام کی وجہ سے تھا۔ تیسرے کا تکوین خاص کی وجہ سے ہو گیا۔

اول کا تعلق توان ایام سے بہت ہی ظاہر ہے کہ شوال اشہر حج میں سے ہے کیونکہ اشہر حج تین ہیں خود نص میں ارشاد ہے۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ (حج کے چند مہینے مقرر ہیں) اور حدیث نے اس کی شرح کر دی ہے کہ شوال وذیقعدو ذی الحجہ اس کا مصداق ہیں تو شوال بھی اشہر حج میں سے ایک مہینہ ہے۔ باقی یہ بات تو اہل علم کو معلوم ہی ہوگی کہ اس ماہ سے حج کو تعلق کیسا اور کس قسم کا ہے یہ تو معنی ہیں نہیں کہ شوال میں حج ہوتا ہے حج تو ذی الحجہ میں ہوتا ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ اس ماہ میں احرام حج بلا کراہت جائز ہے۔

رہی قربانی سو اس کا تعلق اس ماہ سے یہ ہے کہ حدیث میں ہے۔

سمنو اضحایا کم فانها علی الصراط مطایا کم (اسنده الدیلمی من طریق ابن المبارک عن یحییٰ بن عبیدالله عن ابیه عن ابی هریرة رفعه بهذا ویحییٰ ضعیف جداقال ابن الصلاح ان هذا الحدیث غیر معروف ولا ثابت فیما علمناه من المقاصد ص ۲۷)

ترجمہ:۔ اپنی قربانی میں فربہ جانور کیا کرو اس لئے کہ وہ پل صراط پر تمہاری سواریاں ہوں گی۔

نیز مدلول حدیث کی تائید قرآنیہ سے بھی ہوتی ہے۔

وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَی الْقُلُوْبِ

ترجمہ:۔ جو شخص دین خداوندی کے ان یادگاروں کا پورا لحاظ رکھے گا یہ لحاظ رکھنا اللہ تعالیٰ سے دل سے ڈرنے کے ساتھ ہوتا ہے۔

تعمیم تعظیم میں تفخیم بدن اور تعمیم شعائر میں ضحایا بھی داخل ہے چنانچہ عنقریب آتا ہے۔

اور ظاہر ہے کہ تسمین کی صورت یہی ہے کہ حج کے وقت سے پہلے جانور خریدا جائے اور اس کو کھلا پلا کر موٹا تازہ کیا جائے تو وقت حج سے پہلے ذیقعدہ بھی ہے مگر شوال کو اس پر یہ ترجیح ہے کہ اس کو شارع نے مبتداء افعال حج بنایا ہے کہ اس سے احکام حج شروع ہوتے ہیں دوسرے یہ کہ شوال سے احرام باندھنے کے ساتھ بعض سوق ہدی بھی ہوتا ہے کیونکہ احرام کی ایک قسم وہ بھی ہے جو سوق ہدی کے ساتھ ہو تو اس صورت میں شوال ہی سے احرام کے ساتھ قربانی کی بھی تیاری ہوگی غرض حج اور قربانی شرعاً دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف میں حج وقربانی کو مقرون بالذکر کیا گیا ہے چنانچہ سورۂ حج میں ہے۔

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ .... بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ

(اور لوگوں میں حج کے ہونے کا اعلان کر دو، لوگ تمہارے پاس چلے آئیں گے پیادہ بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی تاکہ اپنے فوائد کے لئے آموجود ہوں اور اس لئے آئیں تاکہ ایام مقررہ میں ان مخصوص چوپایوں پر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیں۔)

اس کے بعد ارشاد ہے۔ ثُمَّ لْيَقْضُوْا .... بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ

(پھر لوگوں کو چاہیے کہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنے واجبات کو پورا کریں اور اس مامون گھر کا طواف کریں۔)

اس آیت میں تو افعال حج کا ذکر ہے اس کے بعد کی آیت میں قربانی کا بھی ذکر ہے۔

ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ .... تَقْوَى الْقُلُوْبِ

(بات یہ ہے کہ جو شخص دین خداوندی کے ان یادگاروں کا پورا پورا لحاظ رکھے گا تو ان کا یہ لحاظ رکھنا خدا تعالیٰ سے دل کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے۔)

تعریف شعائر اللہ

شاید کسی کی سمجھ میں نہ آیا ہوگا کہ اس میں قربانی کا ذکر کہاں ہے تو سمجھئے کہ شعائر وہ ہیں جن سے شان وشوکت اسلام کی ظاہر ہوتی ہے تو جیسے حج وسعی وطواف وغیرہ شعائر میں سے ہیں ایسے ہی قربانی بھی شعائر میں سے ہے کیونکہ ان سب میں یہ بات مشترک ہے کہ ان سے اسلام کی شان وشوکت ظاہر ہوتی ہے۔ کیونکہ ان میں شان تعبدی زیادہ ہے اور عقل کو ان میں دخل کم ہے اور ایسے افعال کا بجالانا جن میں عقل کو دخل نہ ہو یا کم ہو موجب اطاعت زائدہ وعلامت عبدیت کاملہ ہے اور جس قدر ہماری عبدیت کا ظہور ہوگا حق تعالیٰ کی عظمت کا انکشاف ہوگا۔ ہم پر بھی اور دوسروں پر بھی یہی اسلام کی شان وشوکت ہے۔ اسلامی شان وشوکت توپ خانہ اور سرخ جھنڈیوں سے نہیں بلکہ عبدیت کے اظہار سے ہے۔

کیونکہ اسلام کے معنی ہیں گردن بہ طاعت نہادن ظاہر ہے کہ اس معنی کی شان وشوکت تو یہی ہے کہ کمال عبدیت ونہایت فناء کا ظہور ہے اور یہ معنی حج وقربانی دونوں میں مشترک ہیں پس:

تعظیم شعائر اللہ

وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ میں جس طرح تعظیم حج کا امر ہے اسی طرح تعیم اضحیہ کا بھی امر ہے خصوصاً جبکہ اس کے ساتھ ہی یہ آیت متصل ہے۔

وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ الخ.

(اور قربانی کے اونٹ اور گائے کو تمہارے لئے ہم نے اللہ کے دین کی یادگار بنایا ہے ان جانوروں میں تمہارے اور بھی فائدے ہیں)

حج کی تعظیم تو یہ ہے کہ رفث وفسوق وغیرہ سے اجتناب کیا جائے یہ معنوی تعظیم ہے اور اضحیہ کی تعظیم دو طرح ہے صورۃً بھی معنی بھی۔ معنوی تعظیم تو یہ ہے کہ اس میں اخلاص کا اہتمام کیا جائے اور

تعظیم صوری یہ ہے کہ قربانی کا جانور بہت اچھا اور عمدہ ہو اسی لئے بعض مفسرین نے وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ (اور جو شخص ان دین خداوندی کی یادگاروں کا لحاظ رکھے گا) کی تفسیر حدیث سمنو اضحایاکم (اپنی قربانی میں جانور فربہ نہ کیا کرو) (لم اُجد الحدیث فی موسوعۃ) سے کی ہے کہ تعظیم شعائر اللہ یہ ہے کہ قربانی کے جانوروں کو موٹا تازہ کر کے ذبح کیا جائے لیکن یہ مطلب نہیں کہ تعظیم شعائر اللہ کا اسی میں انحصار ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ بھی تعظیم شعائر کی ایک فرد ہے۔

حج و قربانی میں مناسبت

پس قربانی کو حج سے ایک مناسبت تو اقتران فی الذکر کی وجہ سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ بے جوڑ چیزوں کو ذکر میں مقترن نہیں فرمایا کرتے اور میں نے وجہ جامع بھی بتلادی ہے جس کی وجہ سے دونوں کو مقترن بالذکر کیا گیا ہے۔

دوسری مناسبت یہ ہے کہ ایام حج و ایام قربانی متحد ہیں یا یوں کہئے کہ متصل ہیں کیونکہ حج کا ایک رکن طواف زیارت ہے یہ تو دسویں ذی الحجہ سے بارہ ہی تک ہوتا ہے اور یہی ایام قربانی کے ہیں اس کے لحاظ سے تو ایام حج و ایام اضحیہ متحد ہیں اور رکن اعظم حج کا وقوف عرفہ ہے یہ نویں کو ہوتا ہے اس رکن کے اعتبار سے یوں کہنا چاہیے کہ ایام قربانی ایام حج سے متصل ہیں تو جو لوگ حج کرتے ہیں وہ حج کے ساتھ یا یوں کہئے کہ اس کے متصل ہی قربانی بھی کرتے ہیں بہت سے حجاج پر قربانی واجب ہوتی ہے جو قارن یا متمتع ہوں اور بہت سوں کے لئے مستحب ہے جو مفرد بالحج ہوں۔

شاید یہاں یہ شبہ کیا جائے کہ یہ وجہ مناسبت تو حجاج کیساتھ مخصوص ہوئی اور قربانی تو غیر حاج بھی بہت کرتے ہیں۔

اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ مناسبت کے لئے اقتران فی الجملہ بھی کافی ہے گو اقتران کلی نہ ہو۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر غور کیا جائے تو یہ کہنا بعید نہیں ہے کہ غیر حاج پر قربانی کا واجب ہونا تشبہ بالحاج کے لئے ہے کہ جو لوگ مکہ میں نہیں اور حج میں مشغول نہیں وہ حاجیوں کے ساتھ مشابہت ہی کر لیں۔ چنانچہ جیسا حج میں تلبیہ ہوتا ہے یہاں اس کے مشابہ تکبیر تشریق ہے جو ہر مسلمان عاقل بالغ پر ایام تشریق میں واجب ہے جبکہ جماعت سے نماز پڑھے اور مفرد کے لئے مستحب ہے۔

نیز جو لوگ قربانی کرنے والے ہیں ان کے لئے یہ بھی مستحب ہے کہ یکم ذی الحجہ سے قربانی تک اپنے ناخن اور بال وغیرہ نہ کٹوائیں بلکہ قربانی کے بعد حلق یا قصر کریں اس میں حالت احرام کے ساتھ تشبہ ہے (اور جن پر قربانی واجب نہیں اگر وہ بھی ایسا کریں تو بہت ثواب ہے) اب تو قربانی کی مناسبت حج سے بالکل ہی ظاہر ہے۔

تیسرے حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے سوال کیا ما الحج یارسول اللہ کہ حج کی حقیقت کیا ہے تو حضور نے جواب میں فرمایا العج والثج (الترمذی) کہ

حج کی حقیقت ہے آواز بلند کرنا (تلبیہ میں) اور خون بہانا (قربانی میں) اب تو مناسبت بوجہ اکمل ظاہر ہوگئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی کو داخل حقیقت حج کیا ہے گو وہ ارکان میں سے نہ ہو مگر اس کو تعلق حج کے ساتھ ایسا قوی ہے کہ گویا داخل حج ہے۔

اور حج کے افعال شوال سے شروع ہوجاتے ہیں تو قربانی کے احکام بھی اسی وقت سے شروع ہوجانے چاہئیں گو حکم مستحب ہی سہی یعنی تسمین نیز تعلق اضحیہ کا حج کے ساتھ اس سے بھی ظاہر ہے شرعاً سوق ہدی تلبیہ کے قائم مقام ہے کہ جو شخص احرام حج کے ساتھ سوق ہدی بھی کرے تو اس کا احرام تقلید ہدی سے منعقد ہوجاتا ہے تلبیہ پر موقوف نہ رہے گا پس اگر کوئی شخص شوال کے مہینہ میں احرام مع سوق الہدی کا ارادہ کرے تو اس کے ذمہ اسی ماہ میں ہدی کا خریدنا لازم ہے گو بعض صورتوں میں اس ماہ میں واجب نہ ہو مگر مناسبت کے واسطے یہ لطائف کافی ہیں کیونکہ یہ مضمون مبانی ومقاصد میں سے تو نہیں ہے جس کے لئے دلائل قطعیہ کی حاجت ہو۔ بہرحال جن تین مضامین کے بیان کا اس وقت ارادہ ہے ان میں سے دو کا تعلق تو اس ماہ سے بخوبی ظاہر ہوگیا ایک کا تعلق تو بدیہی تھا (یعنی حج کا) اور ایک کا تعلق وارتباط اس تقریر سے ظاہر ہوگیا۔

رہ گیا تیسرا امر سو اس کو اس ماہ سے مناسبت اتفاقاً ہوگئی ہے کہ اس ماہ میں امساک باراں ہوگیا ہے تو باوجود تفرق کے ان سب میں ارتباط بھی ہے پس ایک جلسہ میں ان تینوں کا بیان کرنا مناسب ہوگیا۔

حکمت باری تعالیٰ

اور ان میں ایک مناسبت معنویہ اور بھی ہے جو سیاق تقریر میں ابھی واضح ہو جائے گی اور ان عبادات کو عبادات رمضان سے جو تعلق ہے اس کا معلوم کرنا طرب کے لئے کافی ہے جس سے حق تعالیٰ کی عجیب حکمت کا انکشاف ہوتا ہے کیونکہ ایسے مہینہ کم ہیں جن میں مسلسل نئی نئی عبادات ہوں مگر ان مہینوں میں رمضان سے ذی الحجہ تک مسلسل عبادات ہیں پھر ان میں باہم جو تعلق وارتباط ہے اس کا معلوم کرنا طرب ووجد میں لاتا ہے حالانکہ ہمارا علم مشوب بالجہل بھی ہے جب یہ علم ناقص طرب ووجد پیدا کرتا ہے تو حقیقت اصلیہ اگر واضح ہو جاتی تو نہ معلوم کیا ہوتا۔

جرعہ خاک آمیز چوں مجنوں کند　　صاف گر باشد نہ دانم چوں کند

چنانچہ رمضان میں روزہ اور تلاوت قرآن ہے اس کے بعد حج کا سلسلہ شروع ہوگیا کہ شوال وذیقعدہ احرام حج میں مشغول ہیں اس کے بعد ذی الحجہ میں حج ہوتا ہے اور قربانی تو اس ماہ میں سب کے لئے مشروع ہے حج کرنے والے کے لئے بھی اور غیر حاجی کے لئے بھی۔ مگر یہ تسلسل اور ترتیب حج کرنے والوں میں زیادہ ظاہر ہے حج نہ کرنیوالوں کے اندر یہ سلسلہ اور ترتیب ظاہر نہیں ہوتی کیونکہ وہ نہ احرام باندھتے ہیں نہ مکہ

جاتے ہیں مگر باطناً ان میں بھی یہ ترتیب ظاہر ہوتی ہے وہ اس طرح کہ رمضان کے بعد حجاج کی روانگی ہوتی ہے تو غیر حجاج کے دل پر بھی ایک نشتر سا لگتا ہے اور وہ بھی حسرت کے ساتھ ان جانے والوں کو دیکھتے ہیں اور اس وقت ہر مسلمان کے دل میں ایک خاص داعیہ پیدا ہوتا ہے کہ ہائے ہم بھی اس وقت حج کو جاتے اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک مومن کی نیت ہی بڑی چیز ہے روایات میں ہے۔ نية المومن خير من عمله (المعجم الکبیر للطبرانی) پس اب یہ تسلسل وترتیب غیر حاج کے حق میں بھی واضح ہوگئی جو لوگ سچ مچ کو جارہے ہیں وہ رمضان کے بعد عملاً حج میں مشغول ہیں کیونکہ ان کو اپنے نہ جانے پر حسرت ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک غزوہ میں صحابہ سے فرمایا کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو اس وقت ظاہراً تمہارے ساتھ نہیں مگر عنداللہ وہ ہر منزل اور ہر مقام میں تمہارے ساتھ ہیں اور ثواب میں برابر کے شریک ہیں اور یہ وہ معذورین ہیں جو عذر کی وجہ سے تمہارے ساتھ شریک سفر نہ ہو سکے مگر ان کا دل یہ چاہتا تھا کہ وہ بھی تمہاری طرح جہاد کرتے اس حدیث سے مشتاقان حج کا حجاج کے ساتھ شریک حج ہونا واضح ہوگیا بس اب یہ ترتیب سب کے حق میں عام ہوگئی۔

مناسبت معنویہ

اب میں ان عبادات میں تعلق و ارتباط بیان کرتا ہوں جس کو ابھی مناسبت معنویہ سے تعبیر کیا ہے سو رمضان میں تو وہ روزہ اور تلاوت قرآن ہے اور ان دونوں کو میں نے ایک اس توجیہ پر کہا ہے جس کی بناء پر من وسلویٰ کو قرآن شریف میں طعام واحد کہا گیا ہے یعنی دونوں کو اقتران کی وجہ سے میں نے ایک عبادت کہہ دیا ہے اس کے بعد شوال سے زمانہ حج ہے جو نویں ذی الحجہ کو ادا ہوتا ہے پھر قربانی ہے جو دسویں ذی الحجہ سے بارہ تک ہوتی ہے اور ان عبادات میں ترتیب نہایت ہی عجیب ہے چنانچہ روزہ کو مقدم کیا گیا ہے کیونکہ دربار شاہی میں جانے کے لئے اول پاک صاف ہوا کرتے ہیں۔

روح حج

لیکن اس کا سمجھنا روح حج کے لئے سمجھنے پر موقوف ہے پس اول روح حج کو معلوم کرنا چاہیے سو روح حج وصول الی اللہ ہے۔ جس کی صورت حج البیت ہے مولانا اسی کو فرماتے ہیں۔

حج زیارت کردن خانہ بود　　حج رب البیت مردانہ بود

(خانہ کعبہ کی زیارت کرنا ظاہری حج کی صورت ہے حقیقت میں حج سے مقصود رب البیت ہے)

یعنی اصل میں مقصود حج رب البیت ہے زیارت خانہ کعبہ اس کی صورت ہے اس حقیقت کو حضرت حاجی

صاحبؒ نے ایک مرتبہ جوش میں بیان فرمایا تھا کہ اس وقت حکام مکہ حضرت سے کچھ برہم تھے مگر کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جو لوگ اپنے کو مٹاتے ہیں ان کو رفعت حاصل ہوتی ہے کسی شاعر نے خوب کہا ہے ؎

دیکھو اللہ ہے چھوٹوں کو بڑائی دیتا ۔۔۔ آسمان آنکھ کے تل میں ہے دکھائی دیتا

واقعی جو لوگ اپنے کو مٹاتے ہیں خدا تعالیٰ ان کو بلندی عطا فرماتے ہیں۔ حدیث میں ہے من تواضع للہ رفعه اللہ (مشکوٰۃ) مگر یاد رکھو جو بقصد رفعت تواضع کرے گا اس کو رفعت حاصل نہ ہوگی کیونکہ اس نے تواضع للہ نہیں کی بلکہ لغیر اللہ کی ہے تو تواضع للہ یہ ہے کہ حقیقت میں وہ اپنے کو لاشے اور ہیچ سمجھ کر تواضع کرے اور اپنے کو رفعت کا اہل نہ سمجھے اور سچ مچ اپنے کو مٹانے کا قصد کرے حضرت حاجی صاحبؒ تو یوں چاہتے تھے کہ اپنے کو خاک میں ملا دیں اور جن لوگوں نے حضرت کو دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ حضرت میں کس قدر غلبہ فنا تھا مگر جتنا وہ مٹاتے تھے اتنا ہی بلند ہوتے تھے حتیٰ کہ حکام بھی آپ سے مرعوب تھے۔

تو جس زمانہ میں حکام مکہ حضرت سے برہم تھے۔ اسی زمانہ میں شریف صاحب کے ایک مصاحب حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے ہم لوگوں نے یہ خیال کیا کہ شاید حضرت ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں گے مگر حضرت نے ان کے ساتھ ایسا سخت برتاؤ کیا کہ ہم خدام بھی ڈر گئے کہ خدا خیر کرے فرمایا یاد رکھو شریف صاحب میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں بیش بریں نیست کہ مجھے مکہ سے نکال دیں گے سو خوب سمجھ لو کہ عارف جہاں بیٹھتا ہے وہی اس کا مکہ اور مدینہ ہے۔ کیونکہ مکہ کی حقیقت تجلی الوہیت اور مدینہ کی حقیقت ہے۔ تجلی عبدیت اور عارف اپنے اندر ہر وقت تجلی الوہیت و تجلی عبدیت کا مشاہدہ کرتا ہے وہ جہاں بیٹھے گا مکہ مدینہ اس کے ساتھ ہے پس وہ ہر جگہ خوش رہے گا کیونکہ مقصود سے ہر دم اس کو قرب حاصل ہے۔

ہر کجا دلبر بود خرم نشیں ۔۔۔ فوق گردوں ست نے قعر زمیں

(جس جگہ محبوب ہو وہاں خوش و خرم بیٹھ وہ جگہ مرتبہ میں آسمان سے بلند ہے نہ زمین پست) اور

ہر کجا یوسف رخے باشد چو ماہ ۔۔۔ جنت است آں گرچہ باشد قعر چاہ

(جہاں محبوب ہو وہ جگہ جنت ہے اگرچہ کنواں ہی کیوں نہ ہو)

پھر چونکہ حضرت محقق تھے اس لئے مسئلہ کے دوسرے پہلو کو بھی سنبھالا اور فرمایا مگر جو محقق ہے وہ صورت کو بھی ہاتھ سے نہیں دیتا بلکہ حتیٰ الامکان صورت و معنی کو جمع کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔

بہرحال مجھے حضرت حاجی صاحبؒ کی اس حکایت سے اس مسئلہ کی تائید کرنا مقصود تھی کہ روح حج وصول الی اللہ ہے جس کی صورت یہ حج بیت ہے۔

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب روزہ اور تلاوت قرآن سے اس کا ربط سمجھ میں آنا آسان ہوگا کہ

حضرت حق نے اول تو رمضان میں روزہ کا حکم فرمایا کہ اپنے کو پاک صاف کرو کیونکہ روزہ سے قوت بہیمیہ منکسر ہوتی اور معاصی سے رکاوٹ ہوتی ہے اور دل میں رقت پیدا ہوتی ہے پھر تخلیہ رذائل کے ساتھ ساتھ تراویح میں تلاوت قرآن کا حکم ہے یہ تحلیہ ہے کیونکہ تکثیر صلوٰۃ سے انسان کے اندر اخلاق حمیدہ پیدا ہوتے اور انوار طاعات زیادہ ہوتے ہیں اور قرآن کی تلاوت سے بھی قلب میں نور پیدا ہوتا اور زنگ دور ہوتا ہے۔
جب روزہ اور تلاوت قرآن وتراویح سے پاک صاف ہو کر آراستہ ہو گئے تو اب اجازت ہوئی دربار میں حاضر ہونے کی بجائے چنانچہ حج اسی کا نام ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں **الحج عرفة**

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حج عرفات میں جانے کا نام ہے اور یہ ایسا رکن کہ اگر یہ فوت ہو جائے تو اس کا بدل کچھ نہیں ایک مقدمہ تو یہ محفوظ رکھئے دوسرا مقدمہ یہ سمجھئے کہ حج میں بعض اعمال تو ایسے ہیں جو بظاہر عبادت معلوم ہوتے ہیں جیسے طواف خانہ کعبہ مگر وہ حج نہیں۔ کیونکہ جو شخص تنگ وقت میں مکہ پہنچے اس کو حکم ہے کہ سیدھا عرفات پہنچ جائے اور طواف وغیرہ کو ترک کردے اور عرفات میں جانا ایسا عمل ہے کہ وہاں بظاہر کوئی عبادت نہیں نہ کسی خاص چیز کی تعظیم ہے نہ وہاں کوئی خاص نماز مقرر ہے پنج وقتہ نماز تو سب جگہ ہے وہاں بھی ہے مگر عرفات میں جانا ہی سب کچھ ہے حج اسی کا نام ہے کہ نویں تاریخ کو نصف النہار کے بعد سے ۱۰ ذی الحجہ کی صبح تک کسی ایک منٹ میں ایک قدم عرفات کے اندر رکھ دے بس اسی وقت مذکور میں اگر کسی وقت بھی ایک قدم عرفات میں پڑ گیا خواہ جاگتے ہوئے یا سوتے ہوئے ہوش میں یا بیہوشی میں تو حاجی بن گئے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وقوف عرفات کی حقیقت حاضری دربار شاہی ہے۔ جب ہی تو اس میں اور کچھ شرط نہیں صرف ایک قدم وہاں ڈال دینا شرط ہے۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ کے پاس پہنچنا کتنا آسان ہے کہ صرف ایک قدم رکھ دیا اور واصل ہو گئے اے سالکین یہ دیر جو آپ کو ہوتی ہے راستہ میں ہوتی ہے وصول میں کچھ دیر نہیں ہوتی وہ تو ایک قدم سے ہو جاتا ہے۔

نذرانہ جاں

اب وصول کے بعد حکم ہوا کہ کچھ نذر پیش کرو کیونکہ دربار شاہی میں پہنچ کر نذر پیش کرنا قاعدہ عقلیہ ہے اور نذر کے لئے قاعدہ شرعیہ ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (تم خیر کامل کو کبھی حاصل نہ کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے) اور یہی قاعدہ عقلیہ بھی ہے اور سب سے پیاری چیز اپنی جان ہے جب تک کہ وصول نہ ہو اور بعد وصول کے تو اللہ ورسول سے زیادہ کوئی چیز پیاری نہیں رہتی اور جو چیز بعد وصول کے پیاری

ہے وہ حقیقت میں تو ابتداء ہی سے احب الاشیاء ہے یعنی اللہ و رسول مگر وصول سے پہلے اس احبیت کا انکشاف نہیں ہوا تھا اور پھر ان دونوں میں بھی فی نفسہ ایک ہی چیز زیادہ پیاری ہے یعنی اللہ تعالیٰ شانہ اور رسول کی احبیت اللہ تعالیٰ ہی کی وجہ سے ہے اور اللہ تعالیٰ کا احب الاشیاء ہونا اس لئے ہے کہ احبیت کا مدار قرب پر ہے اور جان اگرچہ سب سے زیادہ قریب ہے مگر بعد ریاضات و مجاہدات کے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے زیادہ قرب حق تعالیٰ شانہ کو ہے بھلا حضرت حق کو تو بڑی شان ہے۔ حضرات صحابہؓ کو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہ تعلق تھا کہ جان و مال اولاد سب کو آپ پر فدا کر دیا تھا حضرت حسانؓ فرماتے ہیں۔

فان ابی و والدتی وعرضی لعرض محمد منکم وقاء

(بلاشبہ میری جان، میری والدہ اور میری آبرو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو کیلئے تم سے وقایہ ہے)

ایک صحابیہ کا واقعہ ہے کہ ایک غزوہ میں اس کا شوہر اور بھائی باپ سب شہید ہو گئے واپسی کے وقت لوگوں نے اس کو صبر کی تلقین کی کہ تیرے سب عزیز مارے گئے تو وہ پوچھتی ہیں کہ یہ بتلاؤ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی خیریت سے ہیں؟ صحابہ نے کہا ہاں حضور تو خیریت سے ہیں تو کہا بس اب ساری مصیبت ہلکی ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی جان سے زیادہ قرب ہے اور حق تعالیٰ نے بھی اس قرب کو بیان فرمایا ہے۔

اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ (نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مومن کے ساتھ خود ان کے نفس کے ساتھ بھی زیادہ تعلق رکھتے ہیں) تو پھر حضرت حق کے قرب کا کیا حال ہوگا۔ اور وصول کے بعد تو اس قرب کا انکشاف ہو ہی جائے گا لیکن وصول سے پہلے بھی عقلاً اس بات کا علم ہو سکتا ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کو ہم سے قرب زیادہ ہے کیونکہ جان کا تعلق جو ہمارے ساتھ ہے وہ محدث ہے اور خدا تعالیٰ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ تو جان کے ساتھ جو ہمارا تعلق ہے وہ حضرت حق کے تعلق پر موقوف ہے پس حضرت حق کے ساتھ ہم کو تعلق سب سے پہلے ہے پس قرب بھی ان کو ہی زیادہ ہے اور احبیت کا مدار قرب پر ہی تھا تو حق تعالیٰ احب الاشیاء ہوئے پس ایسے محبوب کا حق یہ ہے کہ اس کے بعد جو چیز سب سے زیادہ پیاری ہو اس کو اس کے سامنے بطور نذر کے پیش کیا جائے اور حق تعالیٰ کے بعد سب سے زیادہ پیاری چیز اپنی جان ہے جو قبل از وصول مطلقاً سب سے زیادہ پیاری معلوم ہوتی تھی۔ اب اس کو حق تعالیٰ پر فدا کر دینا چاہیے۔

آنکہ جان بخشد اگر بکشد رواست نائب ست اودست اودست خداست

(جو جان عطا کرنیوالا ہے اگر مار ڈالے جائز ہے اگر یہ کام نائب سے نہ لے لیا تو نائب کا ہاتھ اس کا ہاتھ ہے)

یہ تو نائبین حق کے واسطے بھی جان دینا روا رکھتے ہیں پھر حق تعالیٰ تک وصول ہو جانے کے بعد تو جان کا فدا کر دینا بہت ہی انسب ہو گا۔ پس بعد وصول کے معنی حکم ہوتا ہے۔ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (کہ اپنے آپ کو قتل کرو) پس وصول کے بعد جان فدا کرنے سے دریغ نہ کرنا چاہیے مگر چونکہ سب کی

ہمت یکساں نہیں ہے چنانچہ حق تعالیٰ خود فرماتے ہیں۔

وَلَوْ اَنَّا کَتَبْنَا عَلَیْھِمْ ....اِلَّا قَلِیْلٌ مِّنْھُمْ

(اور اگر ہم یہ فرض کردیتے کہ تم خودکشی کیا کرو یا شہر بدر ہو جاؤ تو بہت کم لوگ کرتے۔)

اس لئے جان دینا سب کو آسان نہ تھا۔ نیز جو حکمت ہے ابقاء نوع انسان میں جس کو صوفیہ کرام بیان کیا کرتے ہیں جس کی تفصیل کا اب موقع نہیں ہے۔ اجمالاً اتنا کہے دیتا ہوں کہ ابقاء نوع انسان سے ظہور اسماؤ صفات مطلوب ہے اس صورت میں یہ حکمت بھی فوت ہوتی ہے اس لئے حق تعالیٰ نے جان کے عوض میں اس کا ایک بدل مقرر فرمایا کہ اس کو پیش کردو۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے جارج پنجم کے دربار میں جانے کے لئے اصل نذرانہ تو گنی ہے پھر نوٹ کو اس کے قائم مقام کردیا جائے ویسے ہی حق تعالیٰ نے ہماری جان کا ایک بدل مقرر فرمادیا پھر بدل میں بھی اصل بدل وہ تھا جو واقعہ ابراہیم علیہ السلام میں بتلایا گیا ہے ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا تھا کہ اپنے بیٹے کی جان کو ہم پر فدا کرو۔ حقیقت میں سب سے زیادہ محبوب اپنی جان ہے اس کے بعد اولاد کی جان ہے مگر وہ ایسی احب ہے کہ بعض دفعہ شبہ ہو جاتا ہے کہ شاید اپنی جان سے بھی بڑھ کر محبوب ہے مگر تعارض کے وقت معلوم ہوتا ہے کہ اپنی جان کے ساتھ تعلق زیادہ ہے۔

جیسے ایک بڑھیا کی حکایت ہے کہ اس کی بیٹی مہستی نام بیمار تھی بڑھیا دعا کرتی تھی کہ میں مر جاؤں اور یہ اچھی ہو جائے اتفاقاً ایک گائے کسی کے باورچی خانہ میں جا گھسی اور دیگچی میں منہ ڈالدیا اور دیگچی پھنس گئی وہ پریشان ہو کر اس بڑھیا کے گھر میں آ گھسی اس نے کبھی ایسی منکر ہیئت دیکھی نہ تھی سمجھی کہ یہ موت ہے جس کو میں روزمرہ بلاتی تھی اب مجھ کو لینے آئی ہے ڈر گئی اور مہستی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگی۔

گفت اے موت من نہ مہستی ام   پیر زال غریب محنتی ام

(بڑھیا نے کہا کہ اے موت میں مہستی نہیں ہوں میں غریب بڑھیا محنتی ہوں)

بہرحال فرزند کے ساتھ بھی بے حد محبت ہوتی ہے تو ابراہیم علیہ السلام کو اس بدل کے پیش کرنے کا حکم ہوا انہوں نے اس حکم کو اسمٰعیل علیہ السلام سے بیان کیا۔

فیض حضرت ابراہیم علیہ السلام

اس واقعہ میں زیادہ عجیب اسمٰعیل علیہ السلام کا راضی ہو جانا تھا کہ وہ اس نوعمری میں کہ بارہ تیرہ سال کی عمر تھی خدا تعالیٰ پر اپنی جان فدا کرنے کو تیار ہو گئے۔ ابراہیم علیہ السلام تو نبی ہو چکے معرفت کامل ہو چکی تھی۔ خلیل اللہ کا لقب ان کو مل چکا تھا۔ ان کا اس حالت میں ذبح ولد پر آمادہ ہو جانا اس قدر عجیب تھا

جتنا اسمٰعیل علیہ السلام کا اس حکم کو سن کر بدون پس وپیش کے مذبوحیت کے لئے آمادہ ہونا عجیب ہے۔

شاباش آں صدف کہ چناں پرورد گہر　　آبا ازو مکرم و ابنا عزیز تر

(اس صدف کو آفریں جس نے ایسے موتی کو پرورش کیا کہ آباء اس سے مکرم اور ابناء عزیز تر ہیں)

اور درحقیقت یہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کا فیض تھا کہ ان کی طرح ان کی اولاد بھی خدا کی عاشق تھی۔ چنانچہ حضرت اسمٰعیل نے فرمایا۔ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ .... مِنَ الصّٰبِرِیْنَ

کہ اے باپ جو کچھ آپ کو حکم ہوا کہ ڈالئے ان شاء اللہ آپ مجھ کو صابرین میں سے پائیں گے یعنی میں تحمل واستقلال سے کام لوں گا۔ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ (غرض دونوں نے خدا کے حکم کو تسلیم کیا اور باپ نے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے کروٹ پر لٹایا) چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو پیشان کے بل ڈال کر ذبح کرنا شروع کیا اور پورا زور لگا دیا مگر وہاں اثر بھی نہ ہوا کیونکہ ابراہیم علیہ السلام کو حکم اتھا۔ اذبح (ذبح کرو) اور سکین کو حکم تھا لاتذبح (نہ کاٹی جا تو) (بنیا للمفعول) حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جھلا کر چھری سے کہا کہ تجھے کیا ہوا کاٹتی کیوں نہیں اس نے کہا اے ابراہیم تو اپنا کام کر و میں اپنا کام کروں گی مجھے اور حکم ہے تم کو اور حکم ہے۔

واقعی ظاہر میں یہ اسباب موثر نظر آتے ہیں ورنہ حقیقت میں سوائے حضرت حق کے کوئی موثر نہیں یہ اسباب بھی ان کے حکم کے بعد ہی کام کرتے ہیں مولانا اسی کو فرماتے ہیں ۔

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند　　بامن و تو مردہ باحق زندہ اند

(خاک، ہوا، پانی، آگ خدا کے بندہ اور تابعدار ہیں میرے اور تیرے نزدیک مُردہ اور حق تعالیٰ کے سامنے زندہ ہیں) بہر حال سکین کو حکم تھا کہ کند ہو جا وہ کند ہو گئی اور حضرت ابراہیم کو حکم تھا کہ ذبح کرو وہ ذبح کی کوشش میں تھے کہ غیب سے آواز آئی۔

یابرھیم. قد صدقت الرءیا (اے ابراہیم علیہ السلام واقعی تم نے اپنے خواب کو سچا کر دیا)

اصل مقصود عمل ہے

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اصل مقصود عمل ہے ترتب نتیجہ مقصود نہیں۔ یہ سالکین کے بہت کام کی بات ہے کیونکہ آج کل بہت سالکین ثمرات کے منتظر رہتے ہیں اور جب اعمال پر کیفیات وثمرات کا ترتب نہیں ہوتا وہ تو عمل کو بیکار سمجھتے ہیں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا ابراہیم علیہ السلام کا فعل ناقص تھا؟ آپ کے مذاق پر تو ناقص ہی ٹھہرے گا کیونکہ ان کو حکم تھا ذبح کا اور ذبح پر ثمرہ کا ترتب ووقوع کہاں ہوا صرف قصد ذبح وسعی فی الذبح کا تحقق ہوا تھا معلوم ہوا کہ مقصود عمل ہے نتیجہ مقصود نہیں کیونکہ

عمل تو کسی درجہ میں آپ کے اختیار میں ہے اور نتیجہ صرف حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور ظاہر ہے کہ انسان سے وہی شئے مقصود ہو سکتی ہے جو اس کے اختیار میں ہو پس کار خود کن کار بیگانہ مکن

(اپنے کام میں لگو دوسرے کے کام کی فکر مت کرو)

تم اپنے کام میں لگو اور نتیجہ کی فکر میں نہ رہو بلکہ نتیجہ کے متعلق یہ مذاق پیدا کرو

یابم او رایانیابم جستجوئے می کنم حاصل آید یا نیاید آرزوئے می کنم

(اس کو پاؤں یا نہ پاؤں اس کی جستجو کرتا ہوں وہ ملے یا نہ ملے میں آرزو کرتا ہوں)

غرض ابراہیم علیہ السلام کے فعل پر نتیجہ ذبح مرتب نہیں ہوا لیکن پھر بھی حق تعالیٰ نے ان کے فعل کی نہایت تفخیم ظاہر فرمائی ہے کیونکہ جب انہوں نے اپنی طرف سے سب کچھ کر لیا تو بڑا کام کیا وہ جس وقت ذبح ولد کے لئے تیار ہوئے تھے اور ان کے گلے پر چھری پھیر رہے تھے اس وقت تو ان کو یہ علم نہ تھا کہ چھری کو لاتذبح کا حکم ہو جائے گا اور وہ اپنا کام نہ کرے گی بلکہ وہ تو یہ سمجھ کر تیار ہوئے تھے کہ چھری پھیرتے ہی بچہ کا کام تمام ہو جائے گا کیونکہ وہ اس کو خوب تیز کر چکے تھے اب اس کے بعد نتیجہ کا مرتب نہ ہونا ان کے اختیار سے باہر تھا پس واقعی انہوں نے بہت بڑا کام کیا۔

ابتداء قربانی

اسی کو حق تعالیٰ فرماتے ہیں اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ.................. بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (ہم مخلصین کو ایسا ہی صلہ دیا حقیقت میں یہ تھا بھی بڑا امتحان۔ اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض دے دیا) اس کے بعد ایک دنبہ اسماعیل علیہ السلام کا فدیہ ہو کر آ گیا اور اس کو بجائے ان کے ذبح کیا گیا یہ قربانی کی ابتداء ہے۔

چنانچہ سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جب صحابہؓ نے دریافت کیا۔ **ما هذا الاضاحی یا رسول الله** (اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم قربانیاں کیا ہیں؟) تو جواب میں ارشاد فرمایا۔ سنة ابیکم ابراهیم کہ یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے تو اصل عوض تو ہماری جان کا ہماری اولاد کی جان تھی مگر رحمت حق سے جانوروں کی جان ہماری جان کا عوض ہو گئی۔

سنت ابراہیمی کا مصداق

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ اس حدیث سے یہ کیونکر معلوم ہوا کہ جانوروں کی جان ہماری جان کا عوض ہے اس سے تو صرف یہ معلوم ہوا کہ قربانی کرنا حضرت ابراہیمؑ کی سنت ہے اور حضرت ابراہیمؑ نے دنبہ ذبح کیا تھا؟ تو بات یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا اصل فعل تو ذبح ولد تھا اور ذبح کبش ان کا فعل نہ تھا بلکہ یہ تو

بدوں ان کے ارادہ کے غیب سے فدیہ اسماعیل بنایا گیا پس سنة ابیکم ابراهیم (تمہارے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے) (الدر المنثور) سے وہی فعل مراد لینا چاہیے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اصل فعل تھا اور وہ ذبح ولد تھا اور ذبح کبش کا وقوع بطور فدیہ کے ہوا ہے چنانچہ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (اور ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض دے دیا) میں لفظ فَدَيْنٰا اس پر صراحۃً دال ہے۔

تو حاصل حدیث کا یہ ہوا کہ اضحیہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سنت ہے اور وہ سنت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ولد کو ذبح کیا تھا پھر حق تعالیٰ نے کبش کو فدیہ ولد بنا دیا پس معلوم ہوا کہ قربانی کے جانور کو ذبح کرنا قائم مقام ذبح ولد کے ہے کیونکہ واقعہ ابراہیم علیہ السلام میں ایسا ہی ہوا تھا۔

اور اگر اس دلالت کے غیر صریح ہونے سے کوئی اس پر اشکال کرے تو ہم کو مضر نہیں کیونکہ اول تو یہ مضمون عقائد کی قبیل سے نہیں جس کے لئے حدیث صحیح الدلالۃ کی ضرورت ہو بلکہ منجملہ ترغیبات و فضائل کے ہے جس کے لئے فی الجملہ دلالت حدیث کافی ہے دوسرے اگر یہ حدیث اس دعوے پر صریح الدلالۃ نہیں تو ہم دوسری حدیث کو جو اپنے عموم سے دلالت میں صریح ہے اس سے ملا کر اپنا مدعیٰ پورا کرلیں گے حدیث میں ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

انا عند ظن عبدی بی (مسند احمد) کہ میں اپنے بندہ کے گمان کے ساتھ ہوں سو ہم کو تو اس وجہ دلالت کی بناء پر جو سنة ابیکم ابراهیم (الدر المنثور) کے متعلق اوپر مذکور ہوئی حق تعالیٰ کے ساتھ یہ گمان پختہ ہے کہ ان شاء اللہ قربانی کا جانور قائم مقام ذبح ولد کے ہے اور ہم کو اس میں وہی ثواب ملے گا جو ذبح ولد میں ملتا اب تو کچھ اشکال نہیں رہا اور جس کو اب بھی اشکال ہو وہ اپنا ثواب کم کرلے وہ قربانی کو ذبح ولد کا عوض نہ سمجھے اسے اختیار ہے۔

نوعیت جانور

اب سمجھنا چاہیے کہ جب یہ جانور کا ذبح کرنا ذبح ولد کے قائم مقام ہے تو قربانی کا جانور ایسا ہونا چاہیے جو اپنی نوع میں احب و مرغوب ہو تاکہ اس کو احب الاشیاء کا عوض کسی درجہ میں تو کہا جاسکے نہ یہ کہ تمام جانوروں سے دلدر سارے تھانہ بھون کا گوہ قربانی کیلئے تجویز کیا جائے۔ نعوذ باللہ بھلا غور تو کرو اگر ایک حاکم ضلع درخواست کرے کہ ہمارے لئے ایک گائے لاؤ تو کیا تم ایسا ہی جانور اس کے سامنے پیش کرو گے جیسا قربانی میں تجویز کیا جاتا ہے۔ ہرگز نہیں پھر شرم تو نہیں آتی کہ سب سے بڑے حاکم احکم الحکمین کے لئے ایسا دلدر ذبح کیا جاتا ہے یوں تاویل کرنے کو تو ہم تاویل کرلیں گے کہ حکام دنیا معمولی جانور سے راضی نہیں ہوتے اور اللہ میاں راضی ہوجاتے ہیں اس لئے یہاں ویسا اہتمام نہیں ہوتا جیسا حکام دنیا کیلئے کیا جاتا ہے مگر یہ تاویل عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہے اللہ تعالیٰ کے راضی ہوجانے کا یہی بدلہ ہے جو تم نے دیا افسوس۔

اے گراں جاں خوار دیدتی مرا   زانکہ بس ارزاں خرید ستی مرا

(اے کاہل تو نے مجھ بے قدر سمجھ رکھا ہے وجہ یہ ہے کہ میں تم کو مفت مل گیا ہوں)

اللہ تعالیٰ سستے مل گئے ہیں اس واسطے ان کی قدر نہیں کی جاتی۔

اس پر مجھے بھانڈوں کا ایک قصہ یاد آیا کہ انہوں نے ایک دفعہ نقل کی تھی گو نقل تو خلاف ادب تھی مگر واقعی اھل زمانہ کی حالت کا فوٹو اتار دیا تھا۔ انہوں نے اصل میں شیعوں کی حالت کا نقشہ اتارا تھا مگر آج کل اکثر مسلمانوں کی یہی حالت ہے انہوں نے نقل اس طرح کہ ایک شخص مجتہد بنا باقی لوگ اس کے معتقد بنے ان میں سے ایک شخص نے آ کر خواب بیان کیا کہ حضور میں نے رات ایک خواب دیکھا ہے مجتہد نے کہا بارک اللہ بیان کرو کہا حضور میں نے ایک میدان میں یہ دیکھا کہ دور سے ایک سواری آ رہی ہے جس کے ساتھ بہت سے سوار ہیں اور بڑی فوج ہے اور جو سواری سب سے آگے ہے اس کا لباس اور زین ولگام بہت ہی نفیس ہے جواہرات سے مرصع ہے اور ان کے ساتھی بھی بہت شان وشوکت کا لباس پہنے ہوئے ہیں جب وہ میرے سامنے سے گزرے تو میں نے ایک شخص سے پوچھا یہ کون ہیں کہا امام حسین ہیں۔ میں جلدی سے آگے بڑھا اور آپ سے مصافحہ کیا۔

بس یہ سنتے ہیں مجتہد کھڑا ہو گیا اور اس شخص کو گلے لگا لیا کہ تو بڑا خوش نصیب ہے اس نے کہا حضور ابھی خواب اور بھی باقی ہے پھر میں نے دوسری سواری دیکھی اس کے ساتھ بھی بہت آدمی ہیں مگر پہلی جماعت سے کم میں نے پوچھا یہ کن کی سواری ہے معلوم ہوا کہ امام حسن رضی اللہ عنہ ہیں میں جلدی سے آگے بڑھا اور ان سے بھی مصافحہ کیا اس کے بعد ایک اور سواری دیکھی مگر اس کے ساتھ آدمی پہلے سے بھی کم ہیں اور سامان بھی کچھ نہیں معمولی ہے جب وہ میرے قریب آئی میں نے دریافت کیا یہ کون ہیں معلوم ہوا حضرت علی رضی اللہ عنہ ہیں میں نے ان سے بھی مصافحہ کیا پھر چوتھی سواری دیکھی ان کے ساتھ ہی کم جماعت ہے اور سامان بھی بہت گھٹیا ہے میں نے پوچھا یہ کون ہیں معلوم ہوا کہ سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں میں نے آپ سے بھی مصافحہ کیا جب وہ بھی گزر گئی تو سب سے آخر میں ایک اور سواری آئی جس کے ساتھ کوئی نہ تھا اور ٹٹو بھی بہت ہی معمولی تھا جو بہت ہی آہستہ آہستہ چلتا تھا زین ولگام بھی شکستہ و پیوند زدہ تھا اور اس پر ایک بوڑھے میاں سوار تھے جن کا لباس بھی معمولی سا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر سوال کیا کہ حضرت آپ کون ہیں فرمایا میں رب العالمین ہوں میں نے حیرت سے کہا کہ حضور آپ ہی کا تو سب ظہور ہے پھر آپ کی یہ کیا حالت ہے۔ فرمایا بھائی ہم نے مخلوق کو پیدا کیا تھا اول تو سب ہمارے ساتھ تھے پھر ہم نے اپنے نبی کو پیدا کیا اور ان کے دونواسے ہوئے جن میں

سے ایک کربلا میں شہید ہوئے۔ بس میری خدائی کے زیادہ حصہ پر تو اس چھوٹے نواسے کا قبضہ ہو گیا سب لوگ اسی کے نام کی نیاز کرتے ہیں اور اسی کی منتیں مانتے ہیں جو اس سے بچے ان کے زیادہ حصہ پر دوسرے بھائی نے قبضہ کر لیا وہ ان کے نام کی نیاز کرتے ہیں جو ان سے بچے ان پر ان کے باپ کا قبضہ ہو گیا وہ اس کی نذر و نیاز کرتے ہیں کچھ آدمی نبی کے ساتھ ہو گئے وہ ان کے نام کا مولود فاتحہ کرتے ہیں حتیٰ کہ میرے ساتھ کوئی بھی نہ رہا مجھے کوئی نہیں پوچھتا نہ میرے نام کی نذر ہے نہ نیاز ہے۔

خیر یہ نقل تو واہیات تھی اللہ تعالیٰ کی شان میں اس خواب کے گڑھنے والے نے بڑی گستاخی کی اگر ان کو ساری مخلوق بھول جائے اور چھوڑ دے تو ان کی سلطنت وشوکت وعظمت میں کیا کمی آ سکتی ہے کچھ نہیں مگر واقعی ہماری حالت کا فوٹو صحیح اتارا۔ ہماری حالت یہی ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کے نام کی نذر و نیاز کریں گے تو بڑے سامان کئے جائیں گے اور اللہ نام کی جو چیز ہوگی وہ وہی ہوگی جو سب سے دلدر ہو اکثر لوگ بڑے پیر صاحب کے نام کی نیاز کرتے ہیں جس میں کئی قسم کے کھانے اور مٹھائیاں ہوتی ہیں اور اس کے لئے بڑا اہتمام ہوتا ہے کوئی ان لوگوں سے قسم لے کر پوچھے کہ اس طرح کبھی اللہ تعالیٰ کے لئے بھی نیاز دی ہے ہر گز نہیں۔

ہمارے ماموں صاحب ایک قصہ بیان کرتے تھے کہ ایک عورت نے گھر کے لئے کھیر پکائی تھی اتفاق سے ایک رکابی میں کتا منہ ڈال گیا تو عورت نے دوسرے برتن میں اس لوٹ کر اپنے بچہ کو دیا کہ جا یہ مسجد کے ملا کو اللہ واسطے کے نام کی دے آ۔ نعوذ باللہ منہ۔ بچہ جو ملا جی کے پاس کھیر لایا تو وہ اس کے ہاتھ سے لیتے ہی فوراً کھانے لگے اور ادھر ہی سے کھانا شروع کیا۔ جدھر سے کتے نے کھائی تھی لڑکے نے گھبرا کر کہا میاں جی ادھر سے مت کھاؤ ادھر تو کتا منہ ڈال گیا تھا یہ سن کر ملا جی کو غصہ آیا اور رکابی کو دیوار میں دے کر مارا رکابی کے پھوٹنے پر لڑکا رونے لگا ملا جی نے کہا ابے مٹی ہی کی تو تھی روتا کیوں ہے۔ لڑکے نے کہا میری ماں مارے گی ملا جی نے کہا کیوں مارے گی کہنے لگا اس میں میرے چھوٹے بھائی کی گوہ اٹھایا کرتی تھی اس واسطے مارے گی یہ سن کر تو ملا جی لگے قے کرنے کہ جا مردود اول سے آخر تک مجھے گوہ ہی کھلایا اس سے قیاس کر لیجئے کہ آج کل خدا کے نام پر کیسی چیزیں دی جاتی ہیں کیا خدا تعالیٰ کے انعامات کا یہی بدلہ ہے جو ہم ادا کر رہے ہیں۔ **استغفر اللہ العظیم**

صاحبو! کچھ تو شرم کرنا چاہیے۔ کم از کم قربانی کا جانور ایسا تو ہو جس کے ذبح کرنے سے دل پر چوٹ لگے۔

ہمارے حضرت مولانا محمود حسن (اس وقت حضرت قدس سرہٗ بقید حیات تھے ۱۲ ظ) صاحب نے ایک مرتبہ قربانی کے لئے ایک گائے پالی تھی جس کو سال بھر تک دانہ کھلایا اور عصر کے بعد اپنے ساتھ اسے جنگل لے جاتے اور دوڑاتے تھے تا کہ بدن خوب کھلے اور فربہ ہو تو وہ ایسی فربہ اور تیار ہو گئی تھی کہ اس ارزانی کے زمانہ میں جبکہ اچھی خاصی گائے دس پندرہ کو ملتی تھی قصائی اس کی قیمت اسی

روپے دے رہے تھے مگر مولانا نے نہیں دی اور بقرعید کے موقع پر اس کو ذبح کر دیا سنا ہے کہ مولانا کی آنکھوں میں اس وقت آنسو بھر رہے تھے۔

شبہ بے رحمی

ہندو کہتے ہیں کہ مسلمان بہت بے رحم ہیں گئو ہتیا کرتے ہیں یہ واقعہ ان کا دندان شکن جواب ہے بھلا جس شخص کی آنکھ میں ذبح کے وقت آنسو بھرے ہوں وہ بے رحم ہے؟ وہ تو اعلیٰ درجہ کا رحمدل ہے مگر مسلمان کا یہی بڑا کمال ہے کہ باوجودیکہ ذبح کے وقت اس کے دل میں رقت ہے اور جانور کی صورت دیکھ کر دل پسیج رہا ہے پھر بھی خاموش کھڑا ہو کر حق تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں مشغول ہے۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب ذبح سے رنج ہوا تو ثواب کم ہوگا زیادہ ثواب تو اس میں ہے کہ خوشی کیساتھ ذبح کرے تو یاد رکھو کہ رنج کی دو قسمیں ہیں ایک رنج طبعی ایک رنج عقلی سو رنج طبعی منقص ثواب نہیں بلکہ مکمل ثواب ہے چنانچہ اولاد وغیرہ کے مرنے پر جو طبعی رنج ہوتا ہے اس پر ثواب کا وعدہ ہے ہاں عقلی رنج منقص ثواب ہے سو عشاق کو عقلی رنج نہیں ہوا کرتا عشق کے آگے عقل بیچاری کی کیا چل سکتی ہے۔

عشق آں شعلہ است کو چوبر فروخت ہرچہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے تو وہ سوائے محبوب کے سب کو فنا کر دیتا ہے)

آزمودم عقل دور اندیش را بعد ازیں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دور اندیش کو میں نے بارہا آزمایا اس کے بعد اپنے آپ کو دیوانہ بنالیا)

سو جس کا یہ مذاق ہو اس کے پاس رنج عقلی کب پھٹک سکتا ہے بہرحال قربانی میں ایسے گائے تو پیش کرے جیسی حاکم ضلع کے لئے پیش کیا کرتے ہیں ایسی گائے البتہ کسی قدر اپنی جان کا عوض ہو سکتی ہے۔ یہ ضروری مضمون تھا قربانی کے متعلق سو دیکھئے ان عبادات میں یہ کیسی عجیب ترتیب ہے کہ اول روزہ سے تخلیہ ہوا اور ساتھ ساتھ تراویح و تلاوت قرآن سے تحلیہ ہوا پھر دربار میں حاضر ہونے کی اجازت ہوئی اور دربار میں پہنچنے کے بعد نذر پیش کرنے کی اجازت ہوئی جس میں بعض عشاق نے تو جان بھی قربان کر دی ہے۔

عشاق کا حج

چنانچہ مالک بن دینار رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ سفر حج میں ایک نوعمر لڑکا ہمارے ساتھ تھا بدون زاد و توشہ کے میں نے پوچھا کہ صاحبزادے تم نے توشہ نہیں لیا تو اس نے برجستہ جواب دیا۔

وقدت علی الکریم بغیر زاد من الحسنات والقلب السلیم

قان الزادا قبح کل شئے ادا کان الوفود علی الکریم

(میں حسنات اور قلب سلیم سے بغیر زادراہ کے دربار میں جارہا ہوں اس لئے کہ جب کریم کے دربار میں جائے ہر چیز سے بری چیز زادراہ ہے)

اس وقت میں سمجھا کہ یہ معمولی لڑکا نہیں بلکہ مرد طریق ہے پھر احرام باندھنے کا وقت آیا تو سب نے لبیک کہا اس لڑکے نے نہ کہا اور حیران ہو کر سب کا منہ تکنے لگا میں نے کہا صاحبزادہ لبیک کیوں نہیں کہتے کہا ڈرتا ہوں کہ میں لبیک کہوں اور وہاں سے جواب آئے۔

لا لبیک و لا سعدیک و حجک مردود علیک

(تیرا نہ لبیک قبول ہے اور نہ سعدیک اور تیرا حج تجھ پر مردود ہے)

پھر حج سے فارغ ہو کر منیٰ میں ہم سب آئے تو سب نے قربانی کی اس لڑکے نے آسمان کی طرف نظر کی اور کہا الٰہی سب اپنی ہمت کے موافق آپ کی جناب میں نذریں پیش کر رہے ہیں اور میرے پاس بجز اپنی جان کے کچھ نہیں اگر یہ نذر قبول ہو جائے تو زہے قسمت اور یہ کہہ کر چیخ مار کر جان بحق تسلیم ہوا۔ غیب سے آواز آئی کہ اس ولی کی قربانی کی بدولت سب کی قربانیاں قبول ہو گئیں۔ اور اس کے حج کی بدولت سب کا حج قبول ہو گیا۔ سبحان اللہ، اللہ کے بندے کیسے کیسے ہوئے ہیں۔

یہ واقعہ تو روض الریاحین یا کسی اور کتاب میں مذکور ہے اور ایک واقعہ زبانی سنا ہوا ہے کہ ایک شخص جواز ادوضع تھا حج کو جا رہا تھا ہاتھ میں ایک دف تھا اور گاتا بجاتا چلا جاتا تھا لوگ یہ سمجھے کہ کوئی مسخرہ ہے بعض لوگ وضع کے پابند ہیں مگر ان کا دل بھی پابند ہے کہ میدان عشق میں ترقی نہیں کرتا کیونکہ ان لوگوں میں تکبر ہے جو سد راہ ہے اور بعض لوگ وضع سوز ہوتے ہیں ان کا دل تکبر سے پاک ہوتا ہے بشرطیکہ وہ وضع سوز ہی ہوں شرع سوز نہ ہوں ہمارے ماموں صاحب فرماتے تھے کہ شوخی علامت ہے روح کے زندہ اور نفس کے مردہ ہونے کی اور متانت علامت ہے نفس کے زندہ اور روح کے مردہ ہونے کی غرض وہ شخص وضع سوز تھا لوگ اس کو مسخرہ سمجھتے تھے جب مکہ معظمہ پہنچا اور معلم کے ساتھ سب کے سب طواف کعبہ کو چلے اور دروازہ کے قریب پہنچ کر بیت اللہ پر نظر پڑی اور معلم نے کہا **ھذا بیت اللہ** (یہ اللہ کا گھر ہے) تو اس شخص پر وجد طاری ہو گیا اور بے ساختہ یہ شعر زبان سے نکلا

چوں رسی بکوئے دلبر بسپار جان مضطر | کہ مبادا بار دیگر نہ رسی بدیں تمنا

(جب محبوب کے در پر پہنچ گئے ہو تو اپنی جان کو فدا کر دو شاید پھر اس تمنا کے حصول کا موقع نہ ملے)

یہ کہا اور گر کر وہیں جان دیدی بیت اللہ تک پہنچنے سے پہلے ہی رب البیت کے پاس پہنچ گیا گو

اس شخص نے ظاہر میں نہ طواف کیا نہ حج کیا مگر یاد رکھئے کہ عشاق کا درجہ قرب میں عمال سے بڑھا ہوا ہے گو مناصب عمال کے زیادہ ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک تو ایاز تھا اور ایک حسن میمندی تھا۔ اختیارات تو حسن میمندی کے زیادہ تھے کیونکہ وہ وزیر تھا مگر قرب سلطان ایاز کو زیادہ تھا بعض وقت سلطان سے بات کرنے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی بجز ایاز کے، اسی طرح بعض اللہ کے بندے ایسے ہیں جو کسی خدمت پر مامور نہیں نہ تکوینی پر نہ تشریعی پر نہ قطب ہیں نہ غوث ہیں نہ مدرس ہیں نہ واعظ مگر خدا تعالیٰ کے پیارے ہیں غرض بعض لوگ حقیقتاً بھی جان فدا کردیتے ہیں مگر حق تعالیٰ کی رحمت وسیع ہے اس لئے انہوں نے جانوروں کی جان کو ہماری جان کا عوض بنادیا۔

صورت حج

اور حج کے متعلق یہ تو اوپر معلوم ہو گیا کہ روح حج کی وصول الی اللہ ہے لیکن صورت حج کو اگر دیکھا جائے تو اس صورت کو بھی سارا قصہ عاشقوں کا سا قصہ ہے چنانچہ احرام سے حج شروع ہوتا ہے اسی وقت سے یہ صورت ہو جاتی ہے کہ ؎

لنگلے زیرو بالا نے غم وزد نے غم کالا

(ایک تہ بند باندھے ہوئے تو ایک اوڑھے ہوئے نہ چور کا خطرہ نہ اسباب کا غم)

سر کھلا ہوا ہے سلے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتے گویا اسی وقت سے مجنونوں کی صورت اختیار کر لی اور کچھ پرواہ نہیں کہ کوئی کیا کہے گا کہ اس نے کیا صورت بنائی ہے ؎

نہ ساز د عشق را کنج سلامت خوشا رسوائی کوئے ملامت

(سلامتی کا گوشہ عشق کے موافق نہیں ہے کوچہ ملامت کی رسوائی بہتر ہے)

اس وقت اس رسوائی ہی میں عشاق کو مزا آتا ہے ایک اور شاعر کہتا ہے

؎ عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن (عاشقی کیا ہے؟ کہہ دو محبوب کا بندہ ہو جانا)

واقعی احرام کی صورت بالکل بندگانہ وغلامانہ صورت ہے

عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

(اگر کوئی پوچھے عاشقی کیا ہے تو کہہ دو کہ محبوب کا بندہ بن جانا۔ دل کو دوسرے کے ہاتھ میں دے دینا اور حیران رہ جانا)

اس وقت سب لوگ ایک حال میں ہوتے ہیں امیر بھی غریب بھی سلطان بھی رعایا بھی عاشق بھی اور غیر عاشق بھی کسی کے لئے کوئی خاص امتیاز نہیں ہوتا کیونکہ عشق کے لئے امتیاز سد راہ ہے امتیاز سے شہرت ہوتی ہے اور شہرت بہت سی بلاؤں کا پیش خیمہ ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

اشتہار خلق بند محکم است بند ایں از بند آہن کے کم است

(مخلوق میں مشہور بن جانا ایک سخت حجاب ہے جو فیوض سے محروم رکھتا ہے راہ خداوندی میں۔ یہ حجاب قید آہنی سے کم نہیں ہے)۔

. خویش را رنجور ساز و زار زار تا ترا بیروں کنند از اشتہار

(اپنے رنجور، زار و نزار، پست و شکستہ بنالو تا کہ عوام الناس شہرت سے خارج کردیں)

اسی واسطے عشاق اپنے کو گمنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ شہرت سے لوگ ان کے درپے نہ ہوں اور محبوب کے درمیان اور ان کے درمیان حائل نہ ہوں تو حق تعالیٰ نے احرام میں سب کی صورت یکساں بنا دی تاکہ عشاق و غیر عشاق میں امتیاز نہ رہے کیونکہ عشاق تو احرام میں عاشقانہ صورت بناتے ہیں ان سے تو اس وقت لباس وغیرہ کا اہتمام نہ ہوسکتا پھر اگر تنہا وہی اس صورت میں ہوتے تو ان کا بھانڈا پھوٹتا ان کا عشق طشت از بام ہوجاتا اس لئے محبوب نے ان کی پردہ پوشی کے لئے سب کو عاشقانہ صورت بنانے کا حکم فرمادیا تاکہ عشاق کا عشق مخفی رہے ان کو امتیاز نہ ہو اور امتیاز سے شہرت نہ ہو اور شہرت سے عجب و پندار پیدا نہ ہو۔

نیز شہرت میں دنیا کے بھی خطرے ہیں مولانا فرماتے ہیں ۔

چشمہاؤ خشمہاؤ اشکہا برسرت ریزد چو آب از مشکہا

(لوگوں کی نظریں، انکے غیض و غضب، انکے حسد، ایسے شخص پر جیسے مشک سے پانی گرتا ہے برسنے لگے)

اہل شہرت ہی کے سب لوگ درپے ہوتے ہیں کوئی ان پر اعتراض کرتا ہے کوئی طعن کرتا ہے کوئی حسد کرتا ہے اور گمنام آدمی ان بلاؤں سے محفوظ ہے چنانچہ جو لوگ دنیوی وجاہت رکھتے ہیں وہ دنیا کے قصوں میں بہت پھنسائے جاتے ہیں آج حکام کی خوشامد ہے کل کو فوج کی بھرتی کا انتظام ان کے سپرد ہے اور اگر کہیں بدامنی ہوجائے تو سب سے پہلے ان کے مچلکے لئے جاتے ہیں غریبوں کو کون پوچھتا ہے اس لئے غریبوں کی زندگی نہایت بے فکر زندگی ہے۔

حضرت ابراہیم ادھمؒ سے جب کوئی فقر و فاقہ کی شکایت کرتا تو فرماتے کہ تم کو یہ دولت مفت مل گئی ہے اس لئے قدر نہیں مجھ سے قدر پوچھو کہ سلطنت چھوڑ کر فقر و فاقہ خریدا ہے تو حق تعالیٰ نے احرام میں سب کی صورت یکساں بنا کر عشاق کو شہرت کے تمام خطرات سے بچادیا دینی خطرات سے بھی اور دنیوی خطرات سے بھی۔ بس ذرا سا امتیاز جائز رکھا گیا ہے کہ کوئی گاڑھے کی لنگی چادر پہن لے اور کوئی لٹھے کی یا اس سے بھی قیمتی کپڑے کی کوئی کمبل اوڑھ لے کوئی شال اوڑھ لے۔

اس میں ایک تو یہی حکمت ہے کہ امتیاز طبعی خاصہ انسان کا ہے اور طبعی جذبات کو بالکل فنا کرنے سے تکلیف ہوتی ہے سو حق تعالیٰ تکلیف دینا نہیں چاہتے دوسرے اس میں یہ بھی حکمت ہے کہ سائلین

کو اطلاع ہو جائے کہ یہ دوشالہ اوڑھنے والا مالدار ہے یہ خیرات دے سکتا ہے ان حکمتوں سے کسی قدر امتیاز جائز رکھا گیا ورنہ اصل وضع میں سب مساوی ہیں اور وضع میں زیادہ دخل لباس کی ہیئت ہی کو ہے مادہ کو نہیں۔ پھر سب کو حکم ہے کہ سر کھول دو تا کہ سب کا حال معلوم ہو جائے کہ ان کا سر کیسا ہے بعض لوگ گنجے ہوتے ہیں اس وقت سر کھولتے ہوئے ان کی عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ غرض احرام کے وقت تو یہ صورت بنائی جس سے سراپا نیاز مندی اور عبدیت کا ظہور ہوتا ہے۔ پھر جب دربار میں پہنچے اور طواف شروع ہوا جس میں رمل بھی مشروع ہے تو چال بھی ڈھنگ کی نہ رہی حالانکہ یہی حاضری دربار کا وقت تھا ادب و وقار کا مگر نہیں یہی وقت ہے فناء وقار کا اور یہاں کا ہی ادب ہے۔

چو سلطان عزت علم برکشد   جہاں سر بہ جیب عدم درکشد

(جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے تو سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں)

دربار حق میں جب عظمت حق کا علم بند ہوتا ہے وہاں کسی کی عزت کیونکر باقی رہ سکتی ہے بلکہ سب کو اپنی عزت و وقار کو فنا کر دینا چاہیے اور اگر کوئی اس ہیئت کو دیکھ کر انہیں دیوانہ کہے تو وہ یوں کہتے ہیں۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد   مرعسس را دیدو درخانہ نہ شد

(جو دیوانہ نہیں ہوا وہی دیوانہ ہے جس طرح جو شخص کوتوال کو دیکھتا ہے گھر میں چلا جاتا ہے اسی طرح جب محبوب حقیقی کا عشق غالب ہوتا ہے عقل رفو چکر ہو جاتی ہے) اور یوں کہتے ہیں۔

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم   مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(اگر ہم قلاش اور دیوانہ ہیں تو کیا پرواہ یہی دولت کیا کم ہے کہ ہم محبوب حقیقی اور اسکی محبت کے متوالے ہیں)

واقعی طواف میں رمل کی ہیئت بتلاتی ہے کہ یہاں کوئی بڑا دربار ہے جسکے سامنے سب کا وقار مٹ گیا سب کی عزت خاک میں مل گئی سب کے سب مجنونوں کی طرح شانے ہلاتے ہوئے دوڑ رہے ہیں یہ تو حج کی صورت تھی۔

روح قربانی

اب قربانی کی ہیئت دیکھیے کہ وہ بالکل نذر کی صورت ہے جیسے کسی کے سامنے نذر پیش کر رہے ہوں کیونکہ کھانے پینے کے لئے قربانی ہوتی تو ہر شخص کو ایک سے زیادہ قربانی کی اجازت نہ ہوتی کیونکہ اس سے زیادہ کھانے کے کام میں نہیں آ سکتی بلکہ ایک ایک قربانی بھی کریں تب بھی بہت سا گوشت بچ رہتا ہے مگر باینہمہ ایک شخص ہزار بکرے ذبح کرے تو شریعت اس کو منع نہیں کرتی جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کی روح نذر ہے۔

یہاں سے ان ملحدوں کا منہ بند کر دیا گیا جو یوں کہتے ہیں کہ اس قدر جانوروں کے ذبح میں فضول رقم ضائع کی جاتی ہے یہ رقم رفاہ عام میں خرچ کرنا چاہیے میں کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص جارج پنجم کے سامنے دس

لاکھ روپیہ نذرانہ پیش کرے تو وہاں کوئی نہیں کہتا کہ یہ روپیہ رفاہ عام میں خرچ کرنا چاہیے بلکہ وہاں تو تعریف ہوتی ہے کہ فلاں شخص نے بڑی ہمت سے کام لیا کہ دس لاکھ روپے نذرانہ میں پیش کئے افسوس خدا کے سامنے کوئی نذر پیش کرے تو اس کی رقم کو فضول ضائع کرنا کہا جاتا ہے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ آج کل جو بعض مسلمانوں میں عقل کی کمی ہے اور وہ شریعت کے احکام پر اشکال کرتے ہیں تو اس کا بڑا سبب خدا سے تعلق کی کمی ہے اگر ان کو خدا تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہوتا تو ان کی عقلیں درست ہو جاتیں ان لوگوں کو رقم ضائع ہونے کا شبہ اس لئے ہوا کہ انہوں نے قربانی کی غرض گوشت کھانا سمجھا حالانکہ اس کی یہ غرض نہیں بلکہ اس کی غایت صرف خدا کے نام پر جان فدا کرنا ہے مکہ معظمہ میں جا کر اس کا نمونہ نظر آتا ہے کہ قربانی کی کوئی حد ہی نہیں بالکل مقتل نظر آتا ہے کہ ایک جگہ ہزاروں لاکھوں جانیں خدا تعالیٰ کے نام پر قربان کی جاتی ہیں۔

اب ہمارے رفارمر وہاں بھی رائے دیتے ہیں کہ سلطان کو ان جانوروں کی کھالیں کھینچنا چاہیے اور ان سے رفاہ عام کا کام نکالنا چاہئے حالانکہ رئیس العقلاء سید الحکما افضل الانبیاء حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ الحج العج والثج۔ کہ حج نام ہے شور برپا کرنے کا جو حرکت ہے۔ دیوانوں کی مراد اس سے بلند آواز سے لبیک کہنا ہے اور نیز حج نام ہے اس کے نام پر خون بہانے کا جو نذرانہ دربار ہے حضور نے فقط جان لینا اور خون بہانا فرمایا ہے۔ کھانے تک کا بھی تو ذکر نہیں فرمایا بس معلوم ہوا کہ اصل روح قربانی کی نذر الی اللہ ہے اور حج کی روح دیوانہ شدن ہے۔ یہ اسرار ہیں اور یہ راز ہیں افعال حج کے اور یہ تو وہ ہیں جہاں تک ہم جیسوں کی عقلیں پہنچ گئیں اور جو حکماء امت ہیں وہ تو اور زیادہ بیان کر سکتے ہیں۔ میں اسی لئے کہا کرتا ہوں کہ علماء اور طلبہ کو چھیڑو نہیں ان کے تھیلے میں سب کچھ ہے یہ اسرار کو بھی سب سے زیادہ جانتے ہیں مگر

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ‌ ‌ ‌ ورنہ در مجلس رنداں خبرے نیست کہ نیست

(مصلحت نہیں ہے کہ راز افشا ہو جاتے ورنہ رندوں کی مجلس میں کوئی خبر ایسی نہیں جو کہ نہ ہو)

اور یہ جتنا کچھ بھی میں نے بیان کیا ہے رغبت سے بیان نہیں کیا کیونکہ علوم مکاشفہ سے مجھے زیادہ رغبت نہیں۔ مجھے زیادہ رغبت علوم معاملہ سے ہے جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے علوم ہیں مگر بعض طبائع کی خاطر سے یہ اسرار بیان کر دیئے ہیں کہ اگر کسی کے یہاں احباب کی دعوت آموں کی ہو تو وہ پال کے آم بھی پیش کرتا ہے اور ڈال کے بھی تا کہ جس کو جس سے رغبت ہو ویسے ہی کھالے کسی کو کھٹے آم پسند ہوتے ہیں کسی کو میٹھے اور کسی کو ایسے پسند ہوتے ہیں جو کچھ کھٹے ہوں کچھ میٹھے اس لئے میں نے بھی اس وقت ہر قسم کے مضامین جمع کر دیئے ہیں اب میں حج اور قربانی کا مضمون ختم کرتا ہوں۔ مضمون حج کا نام العج ہے اور مضمون قربانی کا نام الثج ہے۔ اور یہ نام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے رکھے ہوئے ہیں اس لئے ہم دوسرے نام کیوں رکھیں حضور تو اگر ہمارے بیٹوں کے اور ہمارے نام بھی رکھ دیتے تو ہم اس کو اپنی سعادت سمجھتے ہیں اور ہرگز خود کوئی نام نہ رکھتے۔

امساک باراں (تیسرا مضمون)

اب میں تیسرے مضمون کا بیان شروع کرتا ہوں اور ارادہ یہ تھا کہ تیسرے مضمون کو لمبا بیان کروں گا کیونکہ اس کی ضرورت دور تک ہے تو اس کا بیان دیر تک ہونا مناسب تھا۔ مگر بعض دفعہ تھوڑی بارش بھی کافی ہو جاتی ہے اس لئے اس کو مختصر ہی بیان کروں گا کیونکہ وقت کم ہے اور وہ مضمون یہ ہے کہ آج کل ہماری جو حالت ہے ظاہر ہے کہ امساک باراں ہو رہا ہے۔ جس سے لوگ پریشان ہیں مگر ہماری حالت یہ ہے کہ بارش کی صرف تمنا کرتے ہیں اس کی اصلی تدبیر نہیں کرتے اصل علاج یہ ہے۔ جس کو مولانا فرماتے ہیں

؎ انما استدبیر تبدیل المزاج (مزاج کا بدل دینا تدبیر ہے)

کہ مزاج کو بدلنا چاہیے مگر اس تدبیر سے کوئی کام نہیں لیتا ہم لوگ صرف تمنا کرتے ہیں کام نہیں کرتے اور نری تمنا سے کیا ہوتا ہے۔

عرفی اگر بگریہ میسر شدے وصال صد سال می تواں بہ تمنا گریستن

(عرفی اگر رونے ہی سے وصال محبوب میسر ہو جاتا تو اس کی تمنا میں سو برس رو سکتے تھے)

یہ تو گریہ کو بھی نا کافی کہتا ہے اور ہمارے پاس تو گریہ بھی نہیں۔

رفع قحط کی بے ڈھنگی تدبیریں

آج کل لوگوں نے رفع قحط کے لئے ایک آسان نسخہ یاد کر لیا ہے کہ گھر گھر سے گیہوں جمع کرتے ہیں کہ کھانا پکوا کر تقسیم کریں گے مگر اس سے کیا ہوتا ہے اول تو اس کو رفع قحط میں دخل کیا؟ اگر کہو یہ صدقہ ہے والصدقة تطفی غضب الرب، (مجمع الزوائد) "صدقہ خدا تعالیٰ کے غصہ کو فرو کرتا ہے" تو صدقہ کی اور بہت صورتیں ہیں جن میں سے بہتر صورت یہ ہے کہ ہر شخص بجائے خود خفیہ طور پر صدقہ کرے دوسرے صدقہ کرنا اور مسکینوں کو کھانا کھلانا تو ایک مستحب فعل ہے واجب نہیں اور ظاہر ہے کہ مستحب سے مقدم واجبات کا ادا کرنا ہے۔ پس تم نے جو لوگوں کی موروثی زمین دبا رکھی ہے لڑکیوں عورتوں کی میراث دبا رکھی ہے شریکوں کا حق مار رکھا ہے پہلے اس سے توبہ کرو اور موروثی وغیرہ کو چھوڑو۔ پھر مستحبات کے درپے ہونا۔

تیسرے یہ بھی تو دیکھو کہ یہ گیہوں جمع کر کے جو کھانا پکتا ہے تو اس کو کھاتا کون ہے۔ غریبوں کو تو بہت کم پہنچتا ہے زیادہ تر حضرات مہتممین اور ان کے متعلقین کھاتے ہیں۔ غرباء کا تو محض بہانہ ہے۔

چوتھے یہ کام حدود شرع سے تجاوز کر کے کیا جاتا ہے کیونکہ عام حالت یہ ہے کہ خوشی کے ساتھ چندہ بہت کم لوگ دیتے ہیں۔ اکثر لوگ شرم یا دباؤ ہی سے شریک ہوتے ہیں پھر ایسے صدقہ سے کیا

نفع جس میں حدودشرع کی بھی رعایت نہیں افسوس ہم لوگ دین کا کام سمجھ کر بھی کوئی کام کرتے ہیں تو اس کو بھی دنیا کے طریقہ پر کرتے ہیں اسی کو ایک دردمند کہتا ہے۔

؎ تن ہمہ داغ داغ شد پنبہ کجا کجا نہم (تمام بدن داغ داغ ہو گیا پھایہ کہاں کہاں رکھوں)

ایک دوسرا دردمند کہتا ہے

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب   خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

(اے وہ ذات (صلی اللہ علیہ وسلم) جو یثرب (مدینہ منورہ) میں آرام فرما ہے اٹھئے مشرق و مغرب خراب ہو گیا)

اس دردمند کو نعوذ باللہ حضور پر اعتراض مقصود نہیں کہ آپ خواب میں ہیں اور عالم خراب ہو رہا ہے بلکہ محض محبت و عشق میں حضور کو یاد کر کے اظہار حسرت کر رہے ہیں کہ ہائے وہ آنکھیں کہاں گئیں جن سے رونق دینداری تھی اور عالم میں انوار عبادت پھیل رہے تھے۔ جیسا کہ مولانا جامیؒ فرماتے ہیں

زمہجوری برآمد جان عالم   ترحم یا نبی اللہ ترحم

نہ آخر رحمۃ للعالمینی   زمحروماں چرا فارغ نشینی

زخاک اے لالہ سیراب برخیز   چونرگس خواب چند از خواب برخیز

بروں آور سراز برد یمانی   کہ روئے تست صبح زندگانی

شب اندوہ مارا روز گرداں   زرویت روز ما فیروز گرداں

تو ابر رحمتی آں بہ کہ گاہے   کنی برحال لب خشکاں نگاہے

(جدائی سے تمام عالم کی جان نکل رہی ہے رحم فرمایئے اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم رحم فرمائے۔ آخر تو آپ رحمۃ للعالمین ہیں۔ محروموں سے کس لئے بے فکر ہیں۔ اے محبوب صلی اللہ علیہ وسلم روضہ اطہر سے اٹھیے نرگس کی طرح کب تک نیند میں رہیں گے۔ خواب سے بیدار ہو جائے بردیمانی سے سر نکالیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ انور صبح زندگانی ہے ہماری شب غم کو دن بنا دیجئے اپنے چہرہ انور سے کامیابی کا دن کر دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم رحمت کے بادل ہیں یہ بہتر ہے کہ کبھی خشک ہوں کے حال پر بھی رحمت فرمادیں)

(اس وقت حضرت مولانا پر عجیب حالت طاری تھی مگر غایت ضبط سے کام لیا سامعین تڑپ رہے تھے ۱۲)

غرض اس وقت دردمندان شریعت کی حالت یہ ہے کہ وہ بار بار حضور کے وجود باجود کو یاد کر کے روتے ہیں کہ ہائے امت کیسا انقلاب ہو گیا مسلمان کیا تھے اور کیا ہو گئے ان کا کوئی کام بھی تو ڈھنگ کا نہیں رہا۔

اب اگر ان کو قحط سالی میں اس طرح اناج جمع کرنے سے روکو تو جاہل اعتراض کرتے ہیں کہ دیکھو مولوی لوگ اللہ واسطے اناج دینے سے منع کرتے ہیں۔ ارے بھائی اللہ واسطے اناج دینے سے کون منع کرتا ہے بلکہ بے ڈھنگے پن سے منع کیا جاتا ہے۔ اگر صدقہ خیرات کے لئے طریقہ اور ڈھنگ کی ضرورت نہیں تو پھر حج کے لئے

بھی اس کے خاص طریقہ کی مثلاً بیت اللہ جانے کی ضرورت نہیں بس بمبئی ہی میں حج کرلیا کرو اگر کہو کہ بمبئی تو حج کا موقع نہیں تو میں کہتا ہوں کہ اناج جمع کرنے کا بھی وہ موقع نہیں جو تم نے اختیار کر رکھا ہے۔

بعض لوگ گاؤں میں جمعہ پڑھتے ہیں اور جو منع کیا جائے تو کہتے ہیں کہ اس کی کیا وجہ کہ قصبہ میں تو جمعہ جائز ہو اور گاؤں میں ناجائز ہو۔ تو میں کہا کرتا ہوں کہ اس کی کیا وجہ کہ حج مکہ میں تو جائز ہو بمبئی میں جائز نہ ہو وہ کہتے ہیں بمبئی تو حج کی جگہ نہیں میں کہتا ہوں کہ اسی طرح گاؤں بھی جمعہ کا محل نہیں۔ غرض اس وقت امساک باراں کی مصیبت مخلوق کو پریشان کر رہی ہے بعض جگہ سے ہیضہ کی خبریں آرہی ہیں کوئی جگہ مصیبت سے خالی نہیں سمندر بھی بلا سے خالی نہیں (کیونکہ جنگ کا زمانہ تھا سمندر میں ناکہ بندی تھی ۱۲ جامع) بس وہ حال ہے۔

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ .... لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ

(خشکی اور تری میں لوگوں کے اعمال کے سبب بلائیں پھیل رہی ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ ان کے بعض اعمال کا مزہ ان کو چکھادے تاکہ وہ باز آجائیں۔)

کسی جگہ آج کل چین و آرام نہیں بس وہ حالت ہے جس کو مولانا فرماتے ہیں۔

گر گریزی برامید راحتے ہم آزاں جا پیشت آید آفتے

(اگر کچھ راحت کی امید پر کسی جگہ بھاگ کر جاؤ گے اس جگہ تم کو کوئی آفت پیش آئے گی)

اور یہ سب بلائیں ہماری شامت اعمال سے آرہی ہیں چنانچہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ

(اور تم کو جو مصیبت پہنچتی ہے تو وہ تمہارے ہی ہاتھوں کے دیئے ہوئے کاموں سے پہنچتی ہے اور بہت سے تو درگزر کر ہی دیتا ہے۔)

اللہ اللہ یہ سزا تو ہمارے بعض اعمال کی ہے اور بہت سی خطاؤں کو تو وہ معاف ہی فرماتے رہتے ہیں اگر ساری خطاؤں پر گرفت ہوا کرتی تو پھر کہاں ٹھکانہ تھا۔ چنانچہ خود ہی فرماتے ہیں۔

وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ .... كَانَ بِعِبَادِهٖ بَصِيْرًا

(اور اگر اللہ تعالیٰ ان لوگوں پر ان کے اعمال کے سبب داروگیر فرمانے لگتا تو روئے زمین پر ایک متنفس کو بھی نہ چھوڑتا۔ اللہ تعالیٰ ان کو ایک میعاد معین تک مہلت دے رہا ہے پس جب وہ میعاد آپہنچے گی تو اس وقت اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آپ دیکھ لے گا۔)

اصل علاج

پس ہم کو اس کا علاج کرنا چاہیے اور وہ علاج یہی ہے کہ اپنے اعمال سیئہ کو حسنات سے بدلا جائے

اور گذشتہ گناہوں سے استغفار کیا جائے واللہ سوا اس کے ان بلاؤں کا کچھ علاج نہیں مولانا فرماتے ہیں۔

ہیچ کنجے بے دو و بے دام نیست　　جز بخلوت گاہ حق آرام نیست

(کوئی گوشہ بغیر دوڑ دھوپ اور جال کے نہیں ہے سوائے تعلق مع اللہ کے اور کہیں آرام نہیں ہے)

خلوت گاہ سے مراد یہی ہے کہ حق تعالیٰ سے تعلق جوڑا جائے جس کے طریقہ کا جزو اعظم استغفار ہی ہے جس میں علاوہ فلاح آخرت کے فلاح دنیا بھی ہے۔ چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام فرماتے ہیں۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا (میں نے ان سے کہا کہ تم اپنے پروردگار سے اپنے گناہ بخشواؤ بے شک وہ بڑا بخشنے والا ہے۔) یہ تو فلاح آخرت تھی کہ حق تعالیٰ استغفار کی برکت سے تمہاری خطائیں معاف فرمادیں گے اور تمہارے اوپر نظر عنایت فرمائیں گے اور اپنے غضب وسخط کو رضا و رحمت سے بدل دیں گے۔ آگے فرماتے ہیں۔ يُّرْسِلِ السَّمَآءَ .... وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا

(کثرت سے تم پر بارش بھیجے گا اور تمہارے مال واولاد میں ترقی دے گا اور تمہارے لئے باغ لگادے گا اور تمہارے لئے نہریں بہادے گا۔)

کہ تم پر استغفار کی برکت سے موسلا دھار بارش نازل ہوگی اور اموال واولاد میں ترقی ہوگی اور باغات وانہار میں افزونی ہوگی۔ اور ہود علیہ السلام فرماتے ہیں۔

وَيٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ .... وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِيْنَ

(اور اے میری قوم تم اپنے گناہ اپنے رب سے معاف کراؤ پھر اس کی طرف متوجہ رہو وہ تم پر خوب بارش برسادے گا تم کو اور قوت دے کر قوت (موجودہ) میں ترقی کر دے گا اور تمہارے لئے باغ لگادے گا اور تمہارے لئے نہریں بہادے گا۔) اور حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں۔

وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ

(اور تم اپنے رب سے اپنے گناہ معاف کراؤ بے شک میرا رب بڑا مہربان بڑی محبت والا ہے)

اس میں بشارت ہے کہ استغفار وتوبہ کی بدولت حق تعالیٰ کی رحمت ومودت تمہارے ساتھ ہوگی۔

واللہ یہ وہ چیز ہے کہ اگر بارش بھی نہ ہو تو جس چیز کے لئے بارش کی ضرورت ہے اس کی بارش شروع ہو جاتی ہے کیونکہ روح بارش کی جمعیت قلب ہے۔ بارش سے فوراً تو غلہ نہیں پیدا ہوتا غلہ تو بعد میں پیدا ہوتا ہے جس میں ہنوز بہت سے خطرات کا اندیشہ ہے چنانچہ بعض دفعہ بارش کے بعد بھی کسی آفت کی وجہ سے غلہ نہیں پیدا ہوتا لیکن پھر بھی لوگوں کو بارش کی تمنا ہوتی ہے کیونکہ طبعاً بارش سے جمعیت واطمینان قلب ہو جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ بارش کی روح جمعیت قلب ہے اور میں دعوے سے کہتا ہوں اور یہ دعویٰ خدا تعالیٰ کے ارشاد کے بھروسہ پر ہے کہ استغفار کے بعد یہ دولت معاً حاصل ہو جائے گی۔ گو بارش نہ بھی ہو اور یہ وہ دولت ہے جس کے سامنے بارش بھی کوئی چیز نہیں۔ اس وقت وہ حال نصیب ہوگا کہ انسان ہر حال میں

راحت واطمینان سے رہے گا۔ مصیبت کی تلخی اس کے لئے لذیذ ہوجائے گی۔ جیسا کہ مولانا فرماتے ہیں۔

ناخوش تو خوش بود برجان من دل فدائے یار دل رنجان من

(محبوب کی جانب سے جو امر پیش آئے گو طبیعت کے خلاف ناخوش ہی کیوں نہ ہو وہ میری جان پر ناخوش اور پسندیدہ ہے جو میری جان پر رنج دینے والا ہے اپنے دل کو قربان کرتا ہوں)

غرض استغفار وتوبہ کی برکت سے آپ کا وہ حال ہوجائے گا جیسا کہ ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ میں نے قحط کے زمانہ میں بغداد کے اندر ایک غلام کو دیکھا جو بڑا موٹا تازہ ہورہا تھا اور بڑی بے فکری کے ساتھ اچھلتا کودتا جارہا تھا میں نے اس سے کہا اے شخص تو بڑا بے فکر ہے حالانکہ مخلوق قحط سے پریشان ہے تیری اس مستی اور بے فکری کا کیا سبب ہے؟

کہا مجھے فکر کی کیا ضرورت ہے میں تو ایک ایسے شخص کا غلام ہوں جس کے پاس ایک گاؤں ہے جس کی وافر آمدنی ہے اور میرا کھانا کپڑا اس کے ذمہ ہے۔ اب چاہے قحط ہو یا سرسبزی میں بے فکر ہوں کہ مجھے تو آقا ہر حال میں کھانے کو دے گا۔ مجھے اس تحقیق کی کیا ضرورت ہے کہ روٹی کا آج کیا بھاؤ ہے اور کل کیا نرخ تھا۔ یہ جواب سن کر بزرگ کو تنبہ ہوا اور نفس سے کہا کہ اے نفس افسوس تجھ کو اپنے آقا پر اتنا بھی اعتماد نہیں جتنا اس غلام کو ایک عاجز ومحتاج آقا پر ہے۔ اس کے آقا کے پاس تو ایک ہی گاؤں ہے اور تیرے آقا کی یہ شان ہے۔

وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اور آسمانوں اور زمین کے تمام خزانے انہی کے ملک ہے)
غرض اس غلام کی حالت دیکھکر ان بزرگ کا توکل درست ہوگیا اور متوکلین سے زیادہ بے فکر کوئی نہیں ہوسکتا۔

حضرت بہلول دانا کو کسی نے دیکھا کہ قبرستان میں ایک تودۂ خاک پر بیٹھے ہوئے ہیں کہا اے بہلول روٹی بہت گراں ہوگئی تمہیں کچھ خبر بھی ہے فرمایا مجھے اس کی خبر رکھنے کی کیا ضرورت ہے خدا تعالیٰ نے مجھ سے عبادت کا مطالبہ کیا ہے اور رزق کا وعدہ کیا ہے۔

وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُکُمْ وَمَا تُوْعَدُوْنَ (تمہاری روزی اور جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آسمان میں ہے) پس میں اپنے کام میں لگا ہوا ہوں مجھے رزق کی فکر سے کیا واسطہ وہ خود اپنے وعدہ کو پورا کریں گے حضرت اسی طرح خدا تعالیٰ سے جب آپ تعلق جوڑلیں گے اور توبہ واستغفار سے خدا تعالیٰ کو راضی کرلیں گے تو آپ کے قلب پر یہ بارش نازل ہوگی جس کے سامنے دنیا کی سب بارشیں ہیچ ہیں۔ اس وقت آپ کے دل پر آب غیب کی بارش ہوگی جس کا اثر چہرہ پر بھی نمایاں ہوگا کہ بجائے رنج وغم کے فرحت وسرور کے آثار پیدا ہوں گے۔

غیب راابرے و آبے دیگر ست آسمانے آفتابے دیگر ست

(غیب کا ابر اور پانی دوسرا ہے اور آسمان اور آفتاب دوسرا ہے)

اور یہ وہ آب غیب ہے جو کہ آب حیات ہے جس سے دائمی حیات نصیب ہوتی ہے جس کی نسبت عارف فرماتے ہیں۔ ؂

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق　　　ثبت ست بر جریدۂ عالم دوام ما

(جس شخص کو عشق حقیقی سے روحانی حیات حاصل ہوگئی وہ اگر مر بھی جائے تو واقع میں بوجہ اس کے کہ لذت قرب اس کو کامل درجہ حاصل ہو جاتی ہے اس لئے اس کو زندہ کہنا چاہیے)

غرض اعمال صالحہ وتوبہ استغفار سے ظاہری بارش بھی ہوگی اور باطنی بارش بھی ہوگی اس لئے دل وجان سے کوشش کرنا چاہیے اگر ظاہری بارش میں تاخیر بھی ہوئی اور یہ اگر محض بطور فرض وتقدیر کے لئے ہے ورنہ دل سے توبہ واستغفار کیا جائے تو ہرگز تاخیر نہ ہوگی لیکن فرض کرلو اگر تاخیر بھی ہوئی تو باطنی بارش تو فوراً ہی شروع ہو جائے گی پھر آپ کو نہ قحط سے تکلیف ہوگی نہ گرانی غلہ سے پریشانی ہوگی کیونکہ

بدریا نہ خواہد بدن بط غریق　　　سمندر چہ داند عذاب الحریق

(دریا میں بطخ نہ ڈوبے گی سمندر (جانور) آگ کے عذاب کو کیا جانے اس کا مسکن ہی آگ ہے)

آپ کے اندر غیبی سمندر موجزن ہوگا پھر بھوک اور پیاس کب پاس آ سکتی ہے پس توبہ و استغفار کا اہتمام کرو اور اعمال صالحہ کی فکر کرو۔

غفلت اور نماز استسقاء

بعض احباب نے آج کل مجھے مشورہ دیا تھا کہ نماز استسقاء پڑھی جائے مگر مجھے ڈر لگتا ہے کیونکہ ہماری حالت یہ ہے کہ سر سے پیر تک معاصی میں گرفتار ہیں اور دل پر بھی قحط کا کچھ زیادہ اثر نہیں کیونکہ ہر شخص اسی مستی میں اب بھی گرفتار ہے جس میں قحط سے پہلے گرفتار تھا۔ کسی نے اپنی حالت کو نہیں بدلا نہ کسی کے دل پر خوف وخشیت کا غلبہ ہے نہ کچھ ندامت وتوجہ الی اللہ کا اثر ہے۔ الا ماشاء اللہ۔ اس بے فکری اور بے توجہی کی حالت میں اگر نماز استسقاء پڑھی اور وہی غفلت ومستی ہوئی تو اور زیادہ عتاب کا اندیشہ ہے۔

میں نے کانپور میں سنا تھا کہ قحط کی خبریں سن کر وہاں کے صاحب کلکٹر نے ارادہ کیا تھا کہ زمینداروں پر سے لگان کم کر دیں مگر ایک دفعہ وہ رات کو گشت کے لئے نکلے تو دیکھا شہر میں بازاروں کے بالاخانوں سے گانے بجانے کی خوب آوازیں آرہی ہیں یہ حالت دیکھ کر اس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور لگان معاف نہ کیا اور کہا کہ مخلوق قحط سے کچھ پریشان نہیں ہے بلکہ لوگ بہت آرام سے ہیں ناچ رنگ ہو رہا ہے۔ تو حضرت ہماری حالت اب بھی ایسی ہے جس کو دیکھ کر ایک ادنیٰ حاکم کو بھی غصہ آتا ہے جس کو دل کی بھی کچھ خبر نہیں تو بتلاؤ جس احکم الحکمین کو ہمارے قلوب کی سنگدلی معلوم ہے جو ہمارے دلوں کی شرارتوں سے واقف ہے اس کو اگر غصہ آئے تو کیا تعجب ہے؟

اور سب سے بڑا غضب یہ ہے کہ ہم کو غضب الٰہی کا بھی احساس نہیں پھر کیونکر نماز استقاء کیلئے ہمت کی جائے ہاں اگر ہماری صورت عاجزوں کی سی ہو جائے اور دل میں خشوع وخضوع پیدا ہو جائے تو اس تدبیر سے بہتر بارش کے لئے کوئی تدبیر نہیں مگر پہلے اس کے قابل تو ہو جاؤ اور اس کا وہی طریقہ ہے جو میں نے بتلایا کہ گناہوں سے توبہ استغفار کرو۔ حقوق العباد کو ادا کرو اور جو ادا نہ ہو سکیں تو معافی چاہ لو اور آئندہ کیلئے اعمال صالحہ کا اہتمام کرو اب میں اس مضمون کو بھی ختم کرتا ہوں اور اس کا نام الحج رکھتا ہوں جس کے معنی ہیں الحاف کے یہ نام اس مضمون کے مناسب ہے کیونکہ توبہ واستغفار میں بھی الحاف یعنی الحاح فی السوال والدجاء اور درخواست معافی کی ہے۔

تفسیر آیت

اب میں خاتمہ کی مختصر تفسیر بیان کرتا ہوں میں نے یہ آیت تلاوت کی تھی۔

يَسْئَلُهُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَاْنٍ

جس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی سے سوال کرتے ہیں آسمانوں والے اور زمین والے اور وہ ہر وقت ایک شان میں ہے یعنی ہر وقت عالم میں مختلف قسم کے تصرفات کرتا رہتا ہے کسی کو حیات بخشتا ہے کسی کو موت دیتا ہے کسی کو خوشی کسی کو غمی کسی کو عزت کسی کو ذلت کسی کو پستی کسی کو رفعت۔

یہاں پر لفظ سوال عام ہے خواہ بہ لسان قال ہو یا بہ لسان حال ہو یہ اس واسطے میں نے کہا کہ شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ مخلوق میں تو بعض لوگ ملحد بھی ہیں جو خدا ہی کو نہیں مانتے اور بعض مانتے تو ہیں مگر زبان سے کبھی خدا سے کچھ نہیں مانگتے تو سمجھ لو کہ ملحدین متکبرین گو زبان قال سے سوال نہ کریں مگر زبان حال سے سب سوال کرتے ہیں کیونکہ سوال بزبان حال کی دو قسمیں ہیں ایک بقصد ایک بلا قصد مریض حکیم کے پاس اپنا ہاتھ بڑھاتا ہے یہ زبان حال سے سوال ہے معالجہ کا گو زبان قال سے کچھ نہیں کہتا یہ تو سوال بزبان حال بقصد ہے اور بلا قصد کی یہ صورت ہے کہ ایک بیمار پڑا ہوا چیخ رہا ہے۔ اس کی حالت بتلا رہی ہے کہ وہ معالجہ کا طالب ہے گو وہ قصد سوال بھی نہ کرتا ہو غرض کوئی زبان قال سے سوال کرتا ہے اور کوئی زبان حال سے بقصد اور کوئی زبان حال سے بلا قصد۔

شریعت میں بھی زبان حال سے قصداً سوال کرنے کی ایک نظیر موجود ہے۔ حدیث میں ہے۔

من شغله القرآن عن ذكرى ومسئلتى اعطيته افضل ما اعطى السائلين
(اتحاف السادة المتقين)

جو شخص قرآن میں اس درجہ مشغول ہو کہ اسے ذکر و دعا کی بھی فرصت نہ ہو یا دعا کی طرف التفات نہ ہو تو حق تعالیٰ اس کو سائلین سے زیادہ عطا فرماتے ہیں۔

کیونکہ تلاوت میں مشغول ہونا یہ بھی سوال بزبان حال قصداً ہے اور بلا قصد میں سب شامل ہیں

جمادات بھی اور نباتات بھی اور ملحدین و متکبرین بھی کیونکہ سب کی حالت حدوث امکان بتلا رہی ہے کہ یہ کسی بہت بڑی ہستی کے محتاج ہیں جس کے قبضہ میں سب کا وجود و بقاء ہے چنانچہ ہر ملحد و متکبر کی حالت دیکھ لی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ احتیاج میں سر سے پیر تک بندھا ہوا ہے جب سوال کو عام لے لیا گیا کہ خواہ بزبان قال ہو یا بزبان حال اور بقصد ہو یا بلا قصد تو اب مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. میں لفظ من اپنے عموم پر ہے خاص کرنے کی ضرورت نہیں البتہ اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ لفظ من میں ذوی العقول کی تغلیب ہے غیر ذوی العقول پر کہ ذوی العقول کے لفظ میں غیر ذی العقول کو بھی شامل کر لیا گیا اور اگر اہل تحقیق کا قول لے لیا جائے تو پھر تغلیب کی بھی ضرورت نہ رہے گی کیونکہ ان کے نزدیک جمادات و نباتات وغیرہ سب ذوی العقول ہیں غیر ذوی العقول نہیں گو ان کی عقل اس درجہ نہ ہو جو تکلیف بالاحکام کے لئے کافی ہو مگر معرفت حق کے لئے ضرور کافی ہے چنانچہ حیوانات و جمادات و نباتات سب کے سب خدا کو پہچانتے ہیں بلکہ انبیاء و اولیاء تک کو پہچانتے ہیں۔

ہاں اگر یہ کہا جائے کہ لغت سب پر حاکم ہے محققین پر بھی اور غیر محققین پر بھی کیونکہ قرآن کا نزول لغت پر ہوا نہ کہ محققین کی تحقیقات پر اور لغت میں لفظ من ان ذوی العقول کے لئے خاص ہے جو ظاہر میں ذوی العقول ہیں تو بیشک تغلیب کا ماننا ضروری ہوگا اور یہی صحیح ہے۔

لیکن اب یہ سوال ہوگا کہ پھر تغلیب میں نکتہ کیا ہے سو اس میں نکتہ اسی وقت سمجھ میں آیا ہے کہ اس میں ذوی العقول کو تنبیہ ہے کہ خدا سے مانگنا اصل میں ذوی العقول کا کام ہے اور جو تمہارا کام تھا اس میں غیر ذوی العقول بھی تمہارے شریک ہیں پھر تمہارا خدا سے سوال نہ کرنا بڑی حماقت ہے آخر تم خدا کو چھوڑ کر اور کس سے سوال کرو گے اور بتلاؤ کہ خدا سے سوال نہ کرنے کی آخر کیا وجہ ہے؟

کسی سے سوال نہ کرنے کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس کے خزانے میں کمی ہو یا اس میں شفقت و رحم نہ ہو یا سخاوت نہ ہو اور جس میں یہ سب باتیں موجود ہوں کہ اس کے خزانے بھی بے انتہا ہوں شفقت و رحم بھی کامل درجہ کا ہو سخاوت بھی اعلیٰ درجہ کی ہو اس سے سوال نہ کرنا تو بڑا غضب ہے پس خدا تعالیٰ سے ضرور سوال کرنا چاہیے۔

شاید آپ یہاں ایک بات کہیں وہ یہ کہ ہم نے بعض دفعہ سوال کیا ہے اور کرتے رہتے ہیں مگر مطلوب نہیں ملتا سو اس کا ایک تو جواب یہ ہے کہ آپ نے سوال کی طرح سوال ہی نہیں کیا خدا تعالیٰ سے اس طرح تو مانگو جس طرح کسی دنیا کے بادشاہ سے مانگا کرتے ہیں کیا بادشاہ سے مانگنے کے وقت آپ کی وہی صورت ہوتی ہے جو دعا کے وقت ہوتی ہے ہرگز نہیں ایک ادنیٰ بادشاہ سے بھی کوئی سوال کرتا ہے تو اس کا دل رعب و جلال سے پر ہوتا ہے صورت پر عاجزی خشوع کا پورا اثر ہوتا ہے اور سوال کے وقت کوئی بات بادشاہ کی مرضی کے خلاف اس میں نہیں ہوتی اور ہماری یہ حالت ہے کہ عین دعا کے وقت ہم سینکڑوں گناہوں میں مبتلا ہوتے ہیں کسی کے پاس پرایا حق دبا ہوا ہے کسی نے بالخصوص عورتوں کا حق دبا رکھا ہے کسی کے پاس موروثی زمین دبی ہوئی ہے بعض

کی صورت بھی دعا کے وقت شریعت کے موافق نہیں ہوتی بلکہ باغیانہ شکل ہوتی ہے۔

پھر طرہ یہ کہ دعا میں بھی لجاجت والتجا نہیں ہوتی دل حاضر نہیں ہوتا اوپر سے دل سے دعا کرتے ہیں صورت پر بھی عاجزی وزاری نہیں ہوتی۔ اس حالت میں بتلاؤ یہ سوال سوال ہے؟ یا گستاخی ہے؟ کسی دنیوی بادشاہ سے مانگنے اس طرح کوئی نہیں جاتا اور اگر کوئی جائے تو کان پکڑ کر نکال دیا جائے حق تعالیٰ کی یہ کتنی بڑی رحمت ہے کہ اس حالت میں بھی ہماری بہت سی دعائیں قبول کر لیتے ہیں اور جو لوگ پوری طرح حق تعالیٰ کے مطیع ہیں ان سے پوچھو کہ ان کی ہزاروں دعاؤں میں سے شاذ و نادر ہی کوئی دعا ایسی ہوگی جس کا اثر کسی مصلحت سے ظاہر نہ ہوا ہو ورنہ قریب قریب سب قبول ہوتی ہیں یعنی سب کی قبولیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد موجود ہے کہ دعائیں سب کی قبول ہوتی ہیں پھر کبھی تو وہی مل جاتا ہے جو مانگا تھا اور کبھی اس سے افضل چیز عطا ہوتی ہے اور کبھی دنیا میں کچھ عطا نہیں ہوتا بلکہ اس کا اجر آخرت میں جمع کر کے اس کو دیا جائے گا اس وقت ثواب کو دیکھ کر آپ تمنا کریں گے کہ کاش ہماری سب دعائیں آخرت ہی میں ذخیرہ رہتیں دنیا میں ایک بھی نہ ملتی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر مسلمانوں کا ایمان ہے اس لئے بے فکر رہنا چاہیے اور یقین کر لینا چاہیے کہ ہماری سب دعائیں بالمعنی الاعم قبول ہی ہوتی ہیں گو ہماری حالت اور ہماری دعائیں اس قابل نہیں ہیں کہ قبول ہوں جیسا کہ جواب اول میں کہا گیا تھا مگر وہ تو عقل کا فتویٰ تھا لیکن حق تعالیٰ ہمارے ساتھ عقل کے فتوے کے موافق برتاؤ نہیں فرماتے وہ ہمارے ساتھ وہ معاملہ نہیں فرماتے جو ہماری شان کا مقتضی ہے بلکہ وہ معاملہ فرماتے ہیں جو ان کی شان کریمی کا مقتضی ہے مولانا فرماتے ہیں۔

ایں قبول ذکر کر تو از رحمت ست   چوں نماز مستحاضہ رخصت ست

(یہ آپ کا ہمارے ذکر کو قبول فرمانا رحمت سے ہی ہے جیسے مستحاضہ کی نماز رخصت کی بناء پر قبول فرما لیتے ہیں)

واقعی عجب مثال دی ہے کہ ہماری دعا و ذکر کا قبول ہونا ایسا ہی ہے جیسے مستحاضہ اور سلسل البول والے کی نماز قبول ہوتی ہے کہ گو ظاہر میں وہ گندگی سے ملوث ہے اور عقل کا فتویٰ یہ ہے کہ اس حالت میں نماز قبول نہ ہو کیونکہ نماز دربار شاہی کی حاضری ہے اور گندہ آدمی حاضری دربار کے لائق نہیں ہوتا مگر شان رحمت کا فتویٰ یہ ہے کہ سب قبول ہے یہاں سے معلوم ہوا کہ ہم کو اپنی جس عقل پر ناز ہے وہ ہماری دشمن ہے اگر حق تعالیٰ اسی کے موافق ہم سے برتاؤ کرنے لگیں تو ہم ہلاک و تباہ ہو جائیں پس اب میں بشارت دیتا ہوں کہ مسلمان کی ہر دعا ہر حال میں قبول ہے مگر اس کا شکر یہ ہے کہ ایسے کریم و رحیم خدا پر سو جان سے قربان ہو جائیں اور اس کی نافرمانی کا نام بھی نہ لیں ہر دم اسی کے راضی کرنے کی فکر میں رہیں۔

آیت اور مضامین میں ربط

اب میں اس آیت کے ساتھ ان تینوں مضامین کا ارتباط بتلاتا ہوں جو اس جلسہ میں بیان کئے گئے ہیں کہ ان مضامین کو آیت سے کیا مناسبت ہے سو یہ تو ظاہر ہے کہ آیت میں سوال کا تو مصرحاً ہی ذکر ہے اس کے بعد یہ بھی ظاہر ہے کہ حج وقربانی اور استغفار یہ تینوں عبادتیں ہیں اب ایک مقدمہ یہ سمجھئے کہ عبادت درحقیقت سوال ہی ہے۔ رہی یہ بات کہ عبادت سوال کیسے ہے تو واقعی کریم کی خدمت کرنا اس سے مانگنا ہی تو ہے آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض جگہ فقیر لوگ پنکھا جھلتے پھرتے ہیں بعض جگہ غریب لوگ پانی پلاتے پھرتے ہیں اور زبان سے کچھ نہیں کہتے مگر ان کا پنکھا جھلنا اور پانی پلانی ہی مانگنا ہے پھر حق تعالیٰ کی عبادت کرنا سوال کیسے نہ ہوگا یہاں تو جن کو غربا پانی پلاتے یا پنکھا جھلتے ہیں وہ لوگ ان چیزوں کے محتاج بھی ہیں جس کے بعد کچھ دینا من وجہ معاوضہ اور وہ خدمت اس درجہ میں عقد معاوضہ ہے اور خدا تعالیٰ تو کسی عبادت کے محتاج نہیں اس لئے وہ طاعت سوال محض ہی ہے۔

پھر دنیا کے امراء میں کرم کا محض نام ہی نام ہے جب اس پر بھی یہ خدمت سوال ہے تو خدا تعالیٰ کی عبادت یقیناً سوال ہے کہ حضور کچھ دلوایئے اور اسی لئے قرآن میں عبادت کو جا بجا عنوان دعا سے تعبیر کیا گیا جس میں بتلایا گیا ہے کہ تم جو ہماری عبادت کرتے ہو حقیقت میں ہم سے مانگتے ہو چنانچہ نص میں تدعون بجائے تعبدون کے بکثرت وارد ہے۔

اور اسی وجہ سے اس مسئلہ میں جو اختلاف ہوا ہے کہ نداء غیر اللہ جائز ہے یا ناجائز تو تابعین نے استدلال میں انہیں نصوص کو پیش کیا ہے جن میں دعاء غیر اللہ پر وعید وارد ہے مجوزین نے اس کا جواب دیا ہے کہ ان نصوص میں تدعون بمعنی تعبدون ہے جس میں سے عبادت غیر اللہ کی حرمت ثابت ہوئی نہ کہ نداء غیر اللہ کی حرمت۔

میں قصر مسافت کر کے ان مجوزین کو جواب دیتا ہوں کہ ہم نے مان لیا کہ ان نصوص میں تدعون (تم پکارتے ہو) کی تفسیر تعبدون (تم عبادت کرتے ہو) ہے۔ اور یہ آپ کو بھی مسلم ہے کہ عبادت غیر اللہ حرام ہے۔ اب ہم ثابت کرتے ہیں کہ دعا بھی عبادت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں الدعآء مخ العبادة پس نداء غیر اللہ اس لئے حرام ہے کہ وہ عبادت کی فرد ہے اور عبادت غیر اللہ حرام ہے۔ پس اوپر تو میں نے یہ ثابت کیا تھا کہ عبادت کی حقیقت دعاء ہے اور اب یہ ثابت ہوا کہ دعا بھی عبادت ہے تو طرفین سے تلازم ہو گیا کہ کوئی عبادت سوال ودعا سے خالی نہیں اور کوئی دعا وسوال عبادت سے خالی نہیں۔ اور میرا پہلا دعویٰ عرف و عادت سے تو ثابت ہے ہی حدیث سے بھی ثابت ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

افضل الدعاء دعاء یوم عرفة وافضل مادعوت به فیه انا والنبیون قبلی لا اله الا الله وحده لا شریک له له الملک وله الحمد وهو علیٰ کل شیء قدیر۔ (کنز العمال)

ترجمہ:۔یعنی افضل دعا یوم عرفہ کی دعا ہے اس یوم عرفہ میں میں نے جن الفاظ کے ساتھ دعا کی ہے مجھ سے پہلے انبیاء علیہم السلام نے انہی الفاظ کے ساتھ دعا کی ہے سوائے اللہ تعالیٰ کے معبود نہیں وہ یکتا ہے اس کا کوئی شریک نہیں اس کا تمام ملک ہے

اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ذکر کو دعا فرمایا ہے حالانکہ اس میں دعا کا صیغہ بظاہر کوئی نہیں اس کی توجیہ میں یہی کہا گیا ہے۔ **ان الثناء علی الکریم دعاء** کہ کریم کی تعریف کرنا دعاء و سوال ہی ہے اور اس ذکر میں حق تعالیٰ کی ثناء ہے تو یہ دعا ہی ہے۔

نیز ایک حدیث میں ہے کہ سجدہ میں خوب دعا کیا کرو۔ **فقمن ان یستجاب لکم** (پس کھڑے ہو تمہاری دعا قبول کی جائے گی) وہ موقع قبولیت کے زیادہ لائق ہے لیکن حضور نے جو الفاظ سجدہ کے لئے مقرر فرمائے ہیں یعنی **سبحان ربی الاعلیٰ** (میرا پروردگار ہر عیب سے پاک ہے) ان میں بھی دعا کا صیغہ ظاہر میں نہیں ہے یہاں بھی وہی جواب ہے کہ ثنائے کریم دعا ہی ہے اور جب ثناء دعا ہے جو ادنیٰ افراد عبادت ہے تو جو اعظم افراد عبادات ہیں یعنی صلوٰۃ و زکوٰۃ و حج وغیرہ وہ کیونکر دعا نہ ہوں گے۔

پس اب حاصل آیت کا یہ ہوا کہ تمام مخلوق جو آسمان و زمین میں ہے حق تعالیٰ کی عبادت کرتی ہے۔ اب ایک سوال پیدا ہوگا کہ معنی عبادت کو لفظ سوال سے کیوں تعبیر کیا گیا اس میں کیا نکتہ ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس میں ایک نکتہ تو یہ ہے کہ مخلوق عبادت کر کے کچھ ہم پر احسان نہیں کرتی بلکہ اپنا ہی بھلا کرتے ہیں کہ صورت سوال پیدا کر کے کچھ ہم سے لے لیتے ہیں۔

دوسرے اس میں اس پر بھی تنبیہ ہے کہ عبادت کے اندر سوال کی شان ہونا چاہیے عبادت اس طرح کرنا چاہیے جس طرح سوال کیا کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ سوال میں صورت بھی عاجزانہ ہوتی ہے دل میں بھی تقاضا وطلب ہوتا ہے اور جس سے سوال کرتے ہیں اس کی طرف آنکھیں لگی ہوتی ہیں دل بھی ہمہ تن متوجہ ہوتا ہے کہ دیکھئے درخواست کا کیا جواب ملے تو یہی شان عبادت میں ہونا چاہیے اس سے تکمیل عبادت کا سہل طریقہ معلوم ہو گیا کہ عبادت کیونکر کامل ہوتی ہے لیجئے یہ انمول جواہرات آپ کو مفت بلا مشقت مل گئے ان کی قدر کیجئے۔

اور یہاں سے علوم قرآن کا اندازہ ہوا ہوگا کہ لفظ لفظ میں کتنے علوم ہیں اور یہ تو وہ ہیں جہاں ہم جیسوں کی فہم پہنچی ہے اور حکماء امت و عارفین اور صحابہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر جہاں تک پہنچی ہوگی ان کی کیا شان ہوگی۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اس وعظ کا مجموعی نام السوال فی شوال تجویز کرتا ہوں جس کے معنی یہ ہیں کہ ماہ شوال میں مضمون سوال کا ذکر ہوا تھا یہ مطلب نہیں کہ شوال میں سوال منحصر ہے کیونکہ سوال کی حقیقت عبادت ہے اور صورت دعاء ہے اور عبادت و دعا شوال کے

ساتھ مخصوص نہیں بالخصوص حج وقربانی تو شوال میں ہو ہی نہیں سکتے صرف قدرے ارتباط ان کو اس ماہ سے بھی ہے اس لئے ذکر کر دیئے گئے اور استغفار وتوبہ تو کسی وقت کے ساتھ بھی مخصوص نہیں۔

خلاصہ وعظ

اب میں مختصر طور پر سارے وعظ کا خلاصہ عرض کر کے ختم کرتا ہوں کہ ہم کو تمام عبادات میں سوال کی صورت بنانا چاہیے اور جن پر فرض ہے وہ تو حج کی تیاری کریں راستہ بند نہیں ہے وہ ذرا تحقیق تو کریں طالب کے لئے راستہ ہمیشہ مفتوح ہو جاتا ہے وہ ذرا قدم تو اٹھائے مولانا فرماتے ہیں۔

گرچہ رخنہ نیست عالم را پدید　　خیرہ یوسف وار می باید دوید

(اگر چہ دنیا میں کوئی رخنہ وراہ نکلنے کی ظاہراً نہیں معلوم ہوتی مگر پھر بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی طرح دوڑنا شروع کرنا چاہیے خود راستہ مل جائے گا)

کہ ہر چند کہ طالب کو راستہ نظر نہیں آتا مگر وہ یوسف علیہ السلام کی طرح ایک دفعہ دوڑے تو سہی۔ راستہ خود بخود نکلتا چلا آئے گا۔ اسی طرح حج کا قصد کرنے والے محض افواہی باتوں سے ارادہ ملتوی نہ کریں بلکہ تحقیق کریں تو ان شاء اللہ معلوم ہوگا کہ راستہ کھلا ہوا ہے۔

مقصود یہ نہیں کہ امن شرط نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ عدم امن کی افواہیں مانع نہ ہونا چاہیں۔ دوسرے حق تعالیٰ کے سامنے توبہ استغفار کریں یہ کام سب کے لئے ضروری ہے اور جن پر حج فرض نہیں اور قربانی واجب ہے وہ قربانی کے لئے ابھی سے ہمت پختہ کریں اور زیادہ توفیق ہو تو ابھی سے جانور خرید کر کے اس کو تیار کریں۔ بس اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو سب آفات سے نجات دے اور باران رحمت نازل ہو اور اللہ تعالیٰ ہماری خطاؤں کو معاف فرمائیں اور آئندہ کے لئے اپنی مرضیات و طاعات کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین ثم آمین۔

وصلی اللہ علیٰ سیدنا ومولانا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

تعظیم الشعائر

کے موضوع پر ۱۹ ذی الحجہ ۱۳۳۹ھ کو
جامع مسجد تھانہ بھون میں بیان فرمایا۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّاٰتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّداً عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ.

امابعد! فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم قال اللہ تبارک وتعالیٰ. ذٰلِکَ وَمَنۡ یُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّھَا مِنۡ تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ (الحج آیت ٣٢)

ترجمہ: یعنی یہ بات بھی ہو چکی اب ایک بات اور سن لو کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے شعائر یعنی علامات کی تعظیم کرے گا تو ان کا یہ تعظیم کرنا خدائے تعالیٰ سے دل کے ساتھ ڈرنے سے ہوتا ہے۔

تمہید: میں نے تقریباً دو جمعہ پہلے کچھ ترغیب وترہیب متعلق قربانی کے بیان کرنے کا وعدہ کیا تھا کہ ضروری احکام اس کے متعلق بیان کروں گا۔ لیکن بوجہ اضمحلال طبیعت اور تکان سفر کے موقع نہ ملا تھا۔ آج اس وعدہ کا ایفا کرتا ہوں۔ یہ آیت سورہ حج کی ہے۔ ان آیتوں میں مع سیاق وسباق کے قربانی کے احکام مذکور ہیں ہر چند کہ یہ احکام حج کی قربانی کے متعلق ہیں مگر اکثر احکام اضحیہ اور حج کی قربانی کے مشترک ہیں اس لئے اس آیت کو میں نے اختیار کیا۔ خلاصہ آیت کا یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ایک قاعدہ کلیہ جس میں قربانی وغیرہ کے تمام احکام داخل ہو گئے ارشاد فرمایا ہے چنانچہ فرماتے ہیں ذالک یہ مبتداء ہے خبر اس کی محذوف ہے یا خبر ہے مبتدا اس کا محذوف ہے مطلب اس جملہ کا قریب قریب اس کے ہے جیسے ہماری زبان میں کہتے ہیں کہ یہ بات گذشتہ تو ختم ہو گئی ایک اور بات سنو۔ اس سے کلام سابق اور کلام لاحق میں فصل ہو جاتا ہے عربی میں اس غرض کے لئے مفید لفظ ذالک ہے اور دوسری کتب مؤلفہ ومصنفہ میں گو ایسے الفاظ کم وارد ہوتے ہوں لیکن

قرآن مجید کا طرز تصنیف وتالیف کا نہیں بلکہ محاورات وعادات کے موافق ہے۔ مصنفین کا طرز دوسرا ہے پس ارشاد ہے کہ دوسری بات سنو کہ جو شخص اللہ کے شعائر یعنی علامات کی تعظیم کریگا جزا آگے ہے۔

مفہوم شعائر

اول دو چیزیں سمجھنا چاہئیں اول یہ کہ شعائر کیا ہیں اوران کی تعظیم کیا ہے۔ شعائر بمعنی علامات اعمال ہیں دین کے۔ اس لئے کہ ان اعمال سے معلوم ہو جاتا ہے کہ دیندار ہے جیسے نماز حج وغیرہما۔ اگر کوئی کہے کہ صلوٰۃ تو خود دین ہے۔ علامت دین کے کیا معنی؟ بات یہ ہے کہ ہر شے کی ایک صورت ہوا کرتی ہے اور ایک حقیقت اور وہ صورت علامت ہوتی ہے وجود حقیقت پر اسی طرح دین کی ایک صورت ہے اور ایک حقیقت۔ مثلاً صلوٰۃ ارکان مخصوصہ اس کی صورت ہے اور حقیقت صلوٰۃ جدا شے ہے۔ جس کا تعلق زیادہ قلب سے ہے چنانچہ اگر ایمان ونیت نہ ہو حقیقت نماز کی نہ پائی جائے گی اوران دونوں کا تعلق ظاہر ہے کہ قلب سے ہے اسی طرح ہر عمل کو سمجھنا چاہیے پس صورت دین اور شے ہوئی اور حقیقت دین اور شے۔ اور یہ صورتیں اعمال کی علامات ہیں دین کی ان کو ہی شعائر فرمایا ہے پس مفہوم شعائر کا متعین ہو گیا۔

تعظیم شعائر

اب تعظیم شعائر کی حقیقت معلوم کرنا چاہیے کہ وہ کیا ہے۔ تعظیم شعائر یہ ہے کہ ان اعمال کا حق جس طرح شریعت مطہرہ نے حکم فرمایا ہے۔ ادا کیا جائے حاصل آیت کا یہ ہوا کہ جو شخص اعمال دین موافق احکام الٰہیہ ادا کرے۔ اب اس ترجمہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ مضمون عام ہے قربانی اور غیر قربانی سب اس میں داخل ہیں۔ میں نے جو اول اس مضمون کے عموم کا دعویٰ کیا تھا وہ ثابت ہو گیا۔ خلاصہ پوری آیت کا یہ ہے کہ جو شخص علامات دین یعنی اعمال کی تعظیم کرے گا یعنی ان کو موافق شریعت کے ادا کرے گا۔ فَإِنَّهَا یہ ان اعمال کی تعظیم مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ قلوب کے تقویٰ سے ناشی ہونے والی ہے یعنی یہ علامت ہے کہ خدا تعالیٰ کا خوف اس شخص کے دل میں ہے کیونکہ خوف خدا ہی ایک ایسی شے ہے کہ جو تعظیم شعائر اللہ کا باعث ہے۔

اگر کوئی کہے کہ حکومت سے بھی تعظیم شعائر کی متصور ہو سکتی ہے۔ جواب یہ ہے کہ حکومت سے جو تعظیم ہوگی وہ صورت تعظیم ہوگی۔ تعظیم کی جو حقیقت ہے وہ نہ ہوگی جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں منافقین نماز پڑھتے تھے لیکن اس لئے نہ پڑھتے تھے کہ خدا ہم سے راضی ہو بلکہ یہ غرض تھی کہ مسلمان ہم سے راضی ہو جائیں۔ بتلایئے کہ حکومت سے حقیقت کہاں پائی گئی پس جو کوئی تعظیم شعائر اللہ کی کریگا وہ قلوب کے تقویٰ ہی سے ہوگی۔ یعنی خوف خدا ہی اس کا منشاء ہوگا۔ کسی قاعدے اور قانون اور ضابطے سے نہ ہوگی۔ اور جملہ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (یعنی ان کی تعظیم قلوب کے تقویٰ سے ہوتی ہے) قائم

مقام جزا کے ہے اور اس جزا کی علت ہے جزا محذوف ہے اور جزا یہ ہے فانہ متق قلبہ' (اس کا قلب متقی ہے) یعنی جو شعائر اللہ کی تعظیم کرے اس کا قلب متقی ہے) کیونکہ یہ تعظیم تقویٰ ہی سے ہوتی ہے۔

اور قلوب کا لفظ جو بڑھایا ہے اس سے ایک مسئلہ واضح ہو گیا وہ یہ کہ تقویٰ قلب کی صفت ہے چنانچہ حدیث شریف بھی ہے التقوی ھھنا واشار الیٰ صدرہ (الدر المنثور ۱/۲۲۱) (یعنی تقویٰ اس جگہ ہے اور آپ نے اپنے قلب کی طرف اشارہ کیا) اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ محض اپنے کو متقی جاننے سے متقی نہیں ہوتا جب تک قلب اضداد تقویٰ سے پاک نہ ہو البتہ دوسروں کی نسبت تو یہ عمل چاہیے کہ

ہرکرا جامہ پارسا بینی ۔ پارسا بین و نیک مرد انگار

(جس شخص کو پارسائی لباس میں دیکھو اس کو پارسا اور نیک مرد سمجھو)

تقویٰ کا گھمنڈ

لیکن اپنے کو متقی جاننا جیسا آج کل مرض ہے یہ آفت ہے حالانکہ دیکھتا ہے کہ میرے قلب میں سینکڑوں امراض مثل کینہ، حسد، حب دنیا، حب مال، حب جاہ موجود ہیں لیکن چونکہ داڑھی بڑھا رکھی ہے۔ ٹخنوں سے اوپر پاجامہ ہے۔ کرتا نیچا ہے۔ ہاتھ میں تسبیح۔ اس لئے لوگ متقی سمجھتے ہیں اور ان کے متقی سمجھنے سے خود اس کو بھی یقین ہو گیا کہ آخر یہ سب لوگ جھوٹے تو ہیں نہیں کچھ تو بات ہے جو مجھ کو ایسا سمجھتے ہیں جیسے کسی بے وقوف کے پاس ایک شریر گھوڑا تھا ہر چند اس کو دباتا تھا اور قابو میں لاتا تھا لیکن وہ رسید ہی نہ دیتا تھا کسی نے کہا کہ اس کو بیچ دو۔ مالک صاحب نے کہا کہ آپ ہی اس کو بکوا دیں۔ اس شخص نے چوک میں کھڑے ہو کر کہنا شروع کیا کہ یہ گھوڑا بکتا ہے اور ایسا قدم باز ہے کہ اپنا نظیر نہیں رکھتا اور طرح طرح کے اوصاف اس کے بیان کئے۔ مالک صاحب یہ سن کر کہنے لگے کہ میاں اگر ایسا ہے تو لاؤ میں ہی نہ رکھوں کیوں بیچوں۔ اس نے کہا کہ کیا تمہارا عمر بھر کا تجربہ میرے چند الفاظ سے جاتا رہا۔ یہی حالت ہم لوگوں کی ہے کہ صریحاً دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے اندر ریاء فریب حسد، شہوت، غضب کا اتباع موجود ہے اور تمام عمر گزر گئی کہ نفس سے سابقہ پڑ رہا ہے سرکشی اس کی مشاہد ہے کہ چاہتے ہیں کہ فلاں کام کرے اور نہیں کرتا ہے ان سب امور پر تو خاک ڈال دی اور یقین کس چیز پر آیا کہ ساری بستی کے لوگ مجھ کو بزرگ سمجھتے ہیں اس لئے میں بزرگ ہوں۔

دوسری حکایت اور یاد آئی ایک میاں جی تھے وہ لڑکوں کو بہت دق کرتے تھے۔ لڑکوں نے آپس میں صلاح کی کہ جیسے یہ دق کرتے ہیں ان کو بھی دق کرنا چاہیے۔ چنانچہ ایک لڑکا مکتب میں آیا اور السلام علیکم کہہ کر میاں جی سے کہا میاں جی! کیا بات ہے آج کچھ چہرہ اداس سا ہے۔ دوسرا آیا حافظ جی کیا کیفیت ہے طبیعت تو اچھی ہے۔ تیسرا آیا خیر تو ہے کچھ بخار کا اثر چہرہ سے نمایاں ہے غرض حافظ جی

کو اس کہنے سننے سے یقین ہو گیا کہ میں یقیناً بیمار ہوں گھر آ کر لیٹ گئے۔ بی بی سے لڑائی شروع کی کہ تمام لڑکوں نے عیادت کی مگر تو نے نہیں کی۔ غرض خوب لڑائی ہوئی یہ حکایت مولانا یہ کہہ کر فرماتے ہیں کہ ارے احمق! تو لوگوں کی تعظیم وتکریم سے اوہام میں مبتلا ہو گیا ہے اپنے کو بزرگ سمجھتا ہے اور کچھ بزرگی پر منحصر نہیں بلکہ ایسی ہی بنا پر کسی کو ریاست کا گھمنڈ ہے کسی کو مولویت کا کسی کو بہادری کا۔

اصل بات یہ ہے کہ جب تک اونٹ پہاڑ کے نیچے کو نہیں گزرتا ہے تو سمجھتا ہے کہ مجھ سے اونچا کوئی نہیں اور جب پہاڑ پر نظر پڑتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اور مخلوق بھی مجھ سے بلند ہے۔ اس لئے رئیس کو چاہیے کہ اپنے سے بڑے رئیس کو دیکھے۔ مولوی کو چاہیے کہ اپنے سے بڑی مولوی کو دیکھے اور آج کل کی کیا ریاست اور کیا مولویت ریاست تو یہ ہے کہ کسی غریب کو دودھ پلگوا دیئے یا اس پر چوکیدارہ بڑھوا دیا کسی غریب کی گھاس چھین لی چار پیسے کی شے دو پیسے میں لے لی۔ یہ تو ریاست ہے۔ مولویت یہ ہے کہ چند مسئلے یاد کر لئے مولوی بن بیٹھے مینڈک جب تک کنوئیں میں مقید ہے سمجھتا یہی عالم ہے ہر فن والے کو چاہیے کہ اپنے سے بڑے پر نظر کرے۔

نظر حقیقت بین

اور بالفرض اگر کوئی اس سے بڑا نہ ہوتا کہ اس پر نظر کرے تو حق تعالیٰ تو ہر صفت کمال میں سب سے بڑے ہیں ممکن کی صفت کمال ہی کیا مستعار اور معرض زوال میں ہیں۔ حقیقی صفت کمالیہ کے ساتھ تو حق تعالیٰ شانہٗ ہی موصوف ہیں اور جن حضرات کی نظر حقیقت بین ہو گئی ہے ان کی نظر میں اپنا وجود ہیچ در ہیچ ہو گیا ہے اسی واسطے بزرگان دین قسمیں کھا کھا کر کہتے ہیں کہ ہم کچھ نہیں۔ ایک دوست نے دریافت کیا کہ فلاں بزرگ قسم کھا کر لکھتے ہیں کہ میں کچھ نہیں ہوں اگر سچے ہیں تو بزرگ نہیں اور اگر واقع میں بزرگ ہیں تو جھوٹی قسم کیوں کھائی۔ میں نے کہا کہ وہ سچے ہیں اور بزرگ بھی ہیں اور یہی بزرگی ہے کہ ان کی نظر کمالات خداوندی پر ہے اور کمالات خداوندی کے سامنے کوئی شے نظروں میں نہیں آتی۔ جیسے طلوع شمس سے ستارے نظر سے غائب ہو جاتے ہیں حالانکہ ستارے رہتے ہیں جیسے شیخ علیہ الرحمۃ نے لکھا ہے کہ کسی نے جگنو سے پوچھا تھا کہ تو دن کو کہاں رہتا ہے اس نے جواب دیا۔

کہ من روز وشب جز بصحرا نیم ولے پیش خورشید پیدا نیم

(یعنی میں رات دن سوائے جنگل کے کہیں اور نہیں رہتا لیکن آفتاب کے سامنے ظاہر نہیں ہوتا ہوں)

پس حضرت حق کے سامنے کسی کا کوئی کمال نہیں اس لئے ان بزرگ کی قسم سچی ہے۔ حتیٰ کہ حضرات انبیاء علیہم السلام اپنے کو ہیچ سمجھتے تھے۔ حق تعالیٰ کے روبرو کوئی بڑا نہیں سب چھوٹے ہیں۔ وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اسی کو بڑائی ہے آسمانوں اور زمین میں) پس چند آدمیوں کے کہنے

ہے کہ آپ شاہ صاحب ہیں یا مولوی صاحب ہیں یا رئیس صاحب ہیں کیا ہوتا ہے۔

صاحبو! اگر ہمارا ظاہر و باطن یکساں بھی ہوتا تب بھی اس دلیل مذکور سے ثابت ہو گیا کہ ہمیں اپنے کو صاحب کمال نہ سمجھنا چاہیے چہ جائیکہ ہمارا تخالف ظاہر و باطن کا یہ ہے کہ

؎ از بروں چوں گور کافر پر حلل　　　　واندروں قہر خدائے عز و جل

(ظاہری حالت ہماری ایسی ہے جیسے کافر کی قبر باہر سے مزین ہوتی ہے اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ کا قہر و غضب نازل ہوتا ہے) واللہ! اگر ٹٹول کر دیکھا جائے تو ہمارے قلب میں وہ خرافات ہیں کہ اگر دوسروں کو معلوم ہو جائیں تو کوئی پاس بھی نہ بیٹھنے دے۔

حقیقت تقویٰ

بات یہ ہے کہ تقویٰ کی حقیقت ہی اب تک معلوم نہیں ہوئی جو اپنے کو متقی سمجھ بیٹھے۔ صورت تقویٰ اور شے ہے اور حقیقت تقویٰ جدا شے ہے اور ظاہر میں صورت تقویٰ والا اور حقیقت والا یکساں ہے۔

؎ انچہ مردم میکند بوزینہ ہم

جو کچھ آدمی کرتے ہیں بندر بھی اس کی نقل کرتا ہے۔

آپ بھی مکان بناتے ہیں اور بچے بھی بناتے ہیں۔ ریت جمع کرتے ہیں اور اس سے مکان یعنی صورت مکان بناتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ میری سہ دری ہے یہ میرا دالان ہے۔ یہ میرا دروازہ ہے آپ اپنے گھر کے سامنے اس ریت کے گھر کو حقیر سمجھتے ہیں۔ اسی طرح بصیرت کی نظر میں ہمارے اعمال خالی عن الحقیقت حقیر ہیں۔ غرض نقل اور صورت شے اور شے ہے اور حقیقت اور چیز ہے۔ تقویٰ کی جڑ قلب میں ہے اگر جڑ ہوگی۔ تو پھول ہمیشہ شاداب رہیں گے اور اگر پھول توڑ کر گلدستہ بنایا جائے تو دیکھنے میں بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ ان کی جڑ نہیں دو روز میں سیاہ ہو جائیں گے حق تعالیٰ اسی کی نسبت ارشاد فرماتے ہیں اَلَمْ تَرَ کَیْفَ ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلًا کَلِمَةً طَیِّبَةً کَشَجَرَةٍ طَیِّبَةٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ (کیا آپ کو اللہ تعالیٰ نے کیسی مثال بیان فرمائی ہے کلمہ طیبہ یعنی کلمہ توحید کی کہ وہ ایک پاکیزہ درخت کے مشابہ ہے جس کی جڑ خوب محکم ہو اور اس کی شاخیں اونچائی میں جا رہی ہوں) اس کا حاصل بھی وہی ہے جو میں عرض کر چکا ہوں۔ خلاصہ یہ ہے کہ تقویٰ قلب میں ہوتا ہے اسی واسطے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صاف لفظوں میں فرمایا الا ان التقوٰی ھٰھُنا و اشار الیٰ صدرہ (الدر المنثور ۱/۲۲۱) (آگاہ رہو کہ تقویٰ اس جگہ ہے اور آپؐ نے اپنے قلب کی طرف اشارہ کیا) جیسا مذکور ہوا۔ پس ظاہری تقویٰ گلدستہ کے

پھولوں کی طرح ہے کہ رہتا نہیں، بہت جلد قلعی کھل جاتی ہے۔ سچی بات عمر بھر چلتی ہے اسی حقیقت کی تمنا اور صورت بے معنی کی عدم اعتماد کی نسبت عراقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں

؎ صنمارہ قلندر سزدار بمن نمائی   کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(زہد خشک جو حقیقت سے خالی ہے، بہت دور دراز کا رستہ ہے مجھے تو طریق عشق میں جو حقیقت سے پر ہے چلایئے)

خیر یہ ایک مستقل مسئلے کی طرف اشارہ تھا۔ جس پر اضافت تقویٰ کی قلوب کی طرف دال ہے۔ باقی اصل مقصود بیان کرنا اس بات کا ہے کہ جو اعمال کرو وہ حکم کے موافق کرو۔ منجملہ ان اعمال کے قربانی بھی ہے اس کو بھی حکم کے موافق ادا کرنا چاہیے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ ہر کام اس کی غایت کی وجہ سے مقصود ہوتا ہے اور اعمال شرعیہ میں غایت رضائے حق ہے تو جب ضابطے کے موافق نہ ہوگا تو رضا کے فوت ہونے سے وہ عمل بے کار ہو جائے گا۔ بعض ضوابط مذکور ہوتے ہیں۔

صحت قربانی

سو جاننا چاہیے کہ قربانی کے اندر دو قسم کی خرابیاں لوگ کرتے ہیں بعض تو مقبول ہونے کی رعایت نہیں کرتے اور بعضے صحیح ہونے پر بھی نظر نہیں کرتے۔ چنانچہ ایک مقام پر ایک شخص نے دوسرے سے کہہ دیا کہ بھائی میرے بھی دو حصے کر دیجیو! قربانی کے حصے تو لے لئے اور خود غائب ہو گئے اور دام بھی نہ دیئے عقلائے وقت کا اس میں اختلاف ہے کہ تباہی قوم کا کیا سبب ہے میرے نزدیک تو اصل سبب تباہی کا بد معاملگی ہے بعض قوم کے ریفارمر کہتے ہیں کہ سود کے بند کرنے سے تباہی آئی جو قومیں سود لیتی ہیں وہ خوب ترقی کر رہی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ مسلمانوں میں بھی بہت سے سود لیتے ہیں لیکن ان کے کچھ بھی کام نہیں آتا کیونکہ مال سے مقصود تمتع دنیوی ہے۔ اور سود خور جمع کرتے کرتے مر جاتے ہیں اور بسا اوقات جن کے لئے جمع کرتے ان کو بھی نہیں ملتا ہے۔ اور فرض کرو اگر متمتع بھی ہوئے تو روحانی ضرر سے تو خالی رہتے ہی ہیں نہیں یعنی سخت دل ہو جاتے ہیں کسی پر ان کو رحم نہیں آتا۔ کسی کی مصیبت سے ان کا دل نہیں دکھتا۔ اور اپنے رشتہ دار سے بھی سود نہیں چھوڑتے جیسے بیرسٹروں کا حال ہے کہ وہ اپنوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔ سمجھتے ہیں کہ اگر ان سے نہ لیا تو نرخ بگڑ جائے گا۔ اور اکثر سود خواروں کو ترقی دنیوی بھی نہیں ہوتی۔ اکثر سود خواروں کا مال ضائع ہی ہوتے دیکھا اور فرض کرو اگر ترقی بھی ہوئی تو جب دین برباد ہوا تو اس ترقی کو لے کر کیا کریں گے۔

؎ مبادا دل آں فرو مایہ شاد   کہ از بہر دنیا دہد دین بباد

(خدا کرے اس کمینہ کا دل کبھی خوش و خرم نہ ہو جو دنیا کی وجہ سے دین برباد کرے)

یہ تو دینی غلطی تھی کہ سود کو ترقی کا سبب قرار دیا۔ دوسرے ایک دنیوی غلطی بھی ہے وہ یہ ہے کہ ترقی کا سبب وہ شے ہو سکتی ہے جس سے عام لوگ منتفع ہوں۔ اس لئے کہ ترقی یافتہ وہی قوم ہوگی جس

کے سب افراد کو ترقی ہو اور عام طور سے ان میں غنی پیدا ہوں اور سود ایسی شے ہے کہ ساری قوم میں شائع نہیں ہوسکتا اول تو سب کے پاس مال نہیں دوسرے آخر لے گا کون! اس لئے لامحالہ بعض لیں گے اور بعض نہیں تو جو لیں گے وہ ترقی کریں گے اور جو نہیں لیں گے وہ ترقی نہیں کریں گے بلکہ جو دیں گے وہ تباہ ہوں گے۔ پس یہ طریقہ ترقی کا نہیں ہوسکتا ترقی کا صحیح طریقہ خوش معاملگی اور اعتبار ہے مسلمانوں میں خدا کے فضل سے افلاس نہیں مسلمانوں میں تاجر اہل ملک رئیس سب طرح کی مخلوق ہے مگر بات کیا ہے کہ دوسری قوموں کو سود دیتے ہیں اس وجہ سے تباہی آتی ہے تو ایسی صورت ہونا چاہیے کہ سود نہ دینا پڑے۔ اور وہ طریقہ صرف خوش معاملگی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ مسلمان کو روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے اور اپنے بھائیوں سے بلاسودی ملتا نہیں۔ اس لئے غیر قوم سے سودی قرض لینے کی ضرورت ہوتی ہے اور تباہ ہوتے ہیں اور بے سود قرض نہ ملنے کی وجہ یہ نہیں کہ دوسرے مسلمانوں کے پاس روپیہ نہیں ہے۔ ابھی میں عرض کرچکا ہوں کہ مسلمانوں میں بہت مالدار ہیں لیکن وہ بوجہ خوف بدمعاملگی کے قرض نہیں دیتے بہت لوگ ایسے ہیں کہ خود چاہتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کی امداد کریں اور ان کو قرض دیں مگر ڈرتے ہیں کہ دیکر کیا لے لیں گے۔ اگر خوش معاملگی مسلمانوں میں شائع ہو جائے تو خود آپس ہی میں ایک دوسرے کی حاجت پوری ہوتی رہے اور سود دینے کی ضرورت نہ پڑے تو جو تباہی کا سبب ہے وہ رفع ہو جائے پس ثابت ہوا کہ بدمعاملگی تنزل کا سبب ہے، ہم لوگوں کی یہ حالت ہے کہ کسی کا روپیہ لے کر دینا نہیں چاہتے حتیٰ کہ اگر کسی غریب کے چار پیسے ہوں گے وہ بھی ٹال کردیں گے۔ اور اس کو لازمہ ریاست سمجھتے ہیں کہ ہم سے تقاضہ کرنے کی مجال نہیں ہوئی۔ اسی طرح قرض خواہ کو نہ دیں گے اور بہانہ کردیں گے کہ بھائی ابھی خرچ آیا نہیں اور اسی حالت میں اگر بچے کی ختنہ درپیش ہو جائے یا کوئی شادی کرنا ہو تو بہتیرا روپیہ اگل دیں گے۔ غرض بدمعاملگی کا مرض عام ہے چنانچہ ان صاحب نے یہ بدمعاملگی کی کہ حصے تو قربانی کے لے لئے اور خود غائب ہو گئے۔ اب گائے ذبح ہوگئی اور گوشت کی بوٹیاں بن گئیں اور وہ حصے والے موجود نہیں اب دام کس سے لیں۔ ایک مجتہد صاحب بولے کہ بھائی وہ تو غائب ہو گئے اب کوئی اور لے لو جس کو دو حصے قربانی کے لینے ہوں۔ وہ بھلے مانس سمجھے کہ گوشت مقصود ہے حالانکہ قربانی سے مقصود گوشت نہیں بلکہ اراقة دم لله ہے۔ (اللہ تعالیٰ کے لئے ایک جانور کا خون بہانا ہے) اگر شریک کی نیت بھی گوشت کی ہوگی تو سب کی قربانی برباد ہوگی۔ غرض مقصود اللہ کے واسطے ایک جان کا خون بہانا ہے اور گوشت کا تو اختیار ہے خواہ خود کھاؤ یا کھلاؤ۔ ہاں اگر کوئی گائے ایسی ہوتی کہ

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

(ہر وقت غیب سے اس کو ایک جان عطا ہوتی ہے) کی مصداق ہوتی تو اس کی دو مرتبہ قربانی ہو سکتی تھی غرض ایک شخص عقلمند بھی مل گیا۔ جس نے کٹے ہوئے وہ دو حصے خرید لئے اور بزعم خود اپنی قربانی درست سمجھ لی۔ اور ان ظالموں نے مل کر اس خریدار گوشت کی قربانی برباد کی بعض بعض صورتیں ناواقفی سے ایسی پیش آ جاتی ہیں کہ قربانی قبول تو کیا صحیح بھی نہیں ہوتی۔

قبولیت قربانی

اور بعض صورتوں میں گو صحیح ہو جائے مگر قبول نہیں ہوتی۔ کانپور میں ایک مستری تھے انہوں نے ایک بھیڑ خریدی کوئی عیب ایسا نہ تھا جو اس میں نہ ہو لیکن ہر عیب تہائی سے کم تھا۔ ضابطے اور قانون کی رو سے اس بھیڑ کی قربانی جائز تھی ایک شخص نے کہا کہ میاں ایسی بھیڑ کیوں کرتے ہو کیا اچھا جانور میسر نہیں آتا۔ کہنے لگے واہ ہماری بیوی کہتی ہیں کہ جائز ہے اور گھر پہنچے بیوی سے تذکرہ کیا کہ ایک شخص نے تمہارے مسئلے پر اعتراض کیا۔ بیوی نے فوراً اردو کا شرح وقایہ نکالا اور قربانی کا بیان نکال کر وہاں نشانی رکھ کر باہر بھیج دیا کہ دکھلا دو۔ ان کو میں کہتا ہوں کہ اگر قربانی ہو بھی گئی یعنی ضابطے کی رو سے اس کی صحت کا حکم کر دیا گیا لیکن ایسی قربانی کیا قبول ہو سکتی ہے۔ جس کو یہ شخص مخلوق کیلئے پسند نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (اللہ تعالیٰ کے یہاں قربانی کے گوشت اور خون نہیں پہنچتے لیکن ان کے پاس تو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے) خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو نیت کو دیکھتے ہیں کہ ہمارے نام پر اس نے کتنی پیاری شے کو خرچ کیا ہے اور جب ایسی خوبصورت قربانی ہوگی تو نیت کا حال اس سے خود ہی معلوم ہوتا ہے کہ کیسی ہے تو کیا قبول ہونے کی امید کی ہے ہاں اگر اس سے اچھی میسر ہی نہیں تو وہ دوسری بات ہے دیکھئے۔ اگر حاکم ضلع کسی رئیس سے فرمائش کرے کہ ہمارے واسطے ایک گائے لاؤ تو سچ بتلاؤ کیسی گائے لے جاؤ گے۔ خصوصاً اس صورت میں جبکہ یہ بھی معلوم ہو کہ جس قدر عمدہ گائے ہم لے جائیں گے حاکم ہم سے خوش ہوگا۔ کان ناک آنکھ ہاتھ پاؤں سب کی ہی خوبصورتی کا خیال کریں گے حتیٰ الوسع قیمتی اور خوبصورت کی تلاش ہوگی افسوس کی بات ہے کہ ایک ادنیٰ حاکم مجازی کہ جس سے نفع پہنچنا موہوم اس کی یہ رعایت اور حاکم حقیقی جس کی طرف سے ہر وقت نعمتوں کی بارش ہم پر ہے وہ ایک جانور مانگتے ہیں اور وہ بھی ہمارے ہی نفع کے لئے اس میں اس قدر تساہل۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سورۃ بقرہ کے ختم کے شکریہ میں ایک اونٹنی ذبح کی تھی اس کی ان کو تین سو اشرفیاں ملتی تھیں۔ مگر دی نہیں اور اللہ کے نام پر اس کو ذبح کر دیا۔ ایک اشرفی دس درہم کی ہوتی تھی اور ایک درہم سوا چار آنہ کا تخمیناً ہوتا ہے حساب لگا لیجئے اب تو اگر عمدہ جانور لیتے بھی ہیں تو اس میں بھی خلوص نہیں ہوتا اس میں بھی یہ چاہتے ہیں کہ نام ہو جائے۔

شرائط قبولیت وصحت

حاصل کلام یہ کہ دو قسم کے احکام کی ضرورت ہے ایک تو وہ جو موقوف علیہ صحت کے ہیں دوسرے وہ جن پر قبولیت موقوف ہے قبولیت کے لئے تو خوشدلی کی ضرورت ہے کراہت اور غرض فاسد کی آمیزش سے اس کو پاک کرے اور صحت کی شرائط بتلانا ضروری ہیں چنانچہ جو آیت میں نے تلاوت کی ہے اس میں تعظیم شعائر سے مراد عرض کر چکا ہوں کہ اعمال کو حکم کے موافق ادا کرنا ہے جس کے عموم میں قربانی بھی داخل ہے اس کو بھی احکام کے موافق ادا نہ کی تو قربانی صحیح نہ ہوگی اس لئے ان احکام کا معلوم کرنا ضروری ہے۔

اور یہاں پر ایک اور بات پر بھی تنبیہ ضروری ہے وہ یہ ہے کہ تعمیل حکم کو تعظیم سے تعبیر فرمانا اشارہ اس طرف ہے کہ احکام پر وہ شخص عمل کر سکتا ہے۔ جس کے دل میں ان احکام کی عظمت ہو اور جس کے دل میں عظمت نہ ہو وہ حیلے نکالتا ہے اور احکام کی علل پوچھتا ہے اگر عظمت ہو تو بلا چون وچرا تسلیم کر لے۔ آج کل اس مرض میں بھی بہت لوگ مبتلا ہیں کہ احکام کی علت کی تحقیق میں اپنا وقت ضائع کرتے ہیں۔ اس مرض کا علاج دو چیزیں ہیں اول قلب میں حق تعالیٰ کی عظمت پیدا کرنا اگر عظمت پیدا ہوگی تو یہ سوال زبان پر تو کیا دل میں بھی خطور نہ کریگا۔ دیکھو ایک سپاہی سے اگر کلکٹر یہ کہے کہ یہ چٹھی فلاں شخص کو دے آؤ تو وہ فوراً اس کی تعمیل کرے گا اور یہ نہ کہے گا کہ صاحب میں تو جب جاؤں گا جب یہ بتلا دو کہ آپ کیوں بھیجتے ہیں اور اس میں کیا مضمون ہے اگر کہے گا تو کان پکڑ کر نکال دیا جائے گا۔ پس مانع اس سوال سے صرف عظمت حاکم کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ جو احکام کی علل کے پیچھے پڑے ہیں ان کے قلب میں ان احکام کی اور حاکم حقیقی کی عظمت نہیں ہے۔ دوسرا علاج اس کا محبت ہے اگر محبت کسی سے ہوتی ہے تو محب اس کے احکام کی بلا تامل تعمیل کرتا ہے۔

آثار محبت

دیکھو! اگر کوئی کسی کسبی یا لڑکے پر عاشق ہو جائے اور وہ یوں کہے کہ میں جب راضی ہوں کہ جب تو اپنی بیوی کے گلے کا ہار مجھ کو لادے۔ اگر محبت میں سچا ہے تو فوراً لے آئے گا اور علت سے ہرگز سوال نہ کرے گا۔ افسوس ہے کہ ایک مردار کی تو یہ اطاعت اور خداوند جل جلالہ کے احکام کی علتیں پوچھی جاتی ہیں اور استہزاء کیا جاتا ہے ایسا شخص بڑا منحوس اور بد بخت ہے

؎ عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود   گوئے گشتن بہر اولیٰ بود

در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں   شرط اول قدم آنست کہ مجنوں باشی

(خدائے تعالیٰ کا عشق لیلیٰ کے عشق سے کب کم ہوئے۔ محبوب حقیقی کے لئے تو گیند ہونا ہر حیثیت سے اولیٰ وبہتر ہے منزل لیلیٰ میں بہت سے خطرات کا سامنا ہے اس راہ میں قدم رکھنے میں اول شرط یہ ہے کہ مجنوں بن

جاؤ۔یعنی راہ خدا میں بہت سے خطرات پیش آتے ہیں اس راہ میں قدم رکھنے کی اول شرط یہ ہے کہ محبت پیدا کرو)
تو بھائیو! اول محبت پیدا کرو جب محبت پیدا ہوگی اول تو خود بخود تمام اسرار منکشف ہو جائیں گے اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو زبان تو ضروری بند ہو جائے گی۔ اور بدوں اس کے تو اگر کوئی جواب بھی دیدے تو سمجھنے کی قابلیت نہ ہوگی۔ اس لئے یہ سوال کرنا ایسا ہوگا جیسے کوئی نابالغ پوچھے کہ صحبت کرنے میں کیا لطف ہے۔ تو بھلا وہ کیا سمجھ سکتا ہے اس لئے اس کو یہی جواب دیا جائے گا کہ جب تم بالغ ہو جاؤ گے اس وقت تم کو معلوم ہو جائے گا مولانا فرماتے ہیں

خلق اطفالند جز مست خدا　　　نیست بالغ جز رہیدہ از ہوا

(بجز عشق الٰہی کے مست کے تمام مخلوق گویا اطفال ہیں پس بالغ وہی ہے جو ہوائے نفسانی سے چھوٹ گیا ہے)
یہ لم کیف نابالغوں کے سوالات ہیں بالغ ہو جاؤ سب سوالات منقطع ہو جائیں گے۔ جس اندھے کی کبھی آنکھیں نہ کھلی ہوں وہ کیا جانے سرخ رنگ کیا ہے اس سے یہی کہا جائے گا کہ آنکھیں کھولو اور دیکھ لو۔ اور اگر نہ دیکھ سکو تو کسی بینا کا اتباع اختیار کرو غرض محبت اور عظمت پیدا کر لو خود بخود تمہارے تمام سوالات حل ہو جائیں گے خواہ انکشاف سے خواہ تسلیم و رضا سے۔

احکام قربانی

اب میں قربانی کے متعلق ضروری احکام بیان کرتا ہوں جن کی اکثر ضرورت پڑتی ہے اور ان کے نہ جاننے سے قربانی بعض اوقات قبول تو کیا قاعدہ سے بھی صحیح نہیں ہوتی۔ قربانی کے ساتھ اگر عقیقہ کا حصہ لے لے تو جائز ہے بعض لوگ شبہ کیا کرتے ہیں کہ اگر ساتواں دن نہ ہو تو کیا کیا جائے۔ یاد رکھو ساتواں دن ہونا ضروری نہیں صرف مستحب تھا۔ اسی کے متعلق یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ عقیقہ کا مصرف بھی وہی ہے جو قربانی کا ہے۔ اگر تمام گوشت خود رکھو تو بھی کچھ حرج نہیں۔ قربانی نام تو اللہ کے واسطے جان کا قربان کرنا ہے۔ جب جانور ذبح ہو گیا وہ ادا ہو گئی۔ اب گوشت کا اختیار ہے اکثر لوگ ایسا کرتے ہیں کہ اپنے کسی عزیز کی طرف سے قربانی کرتے ہیں اور اس کو اطلاع نہیں ہوتی۔ اس صورت میں قربانی ادا نہیں ہوتی۔ اس میں بڑی احتیاط چاہیے اس لئے کہ اگر ایسی کوئی صورت پیش آ جائے گی کہ جس سے ایک حصہ کی قربانی صحیح نہ ہو تو کسی کی بھی قربانی صحیح نہ ہوگی۔ اس لئے کہ قربانی نام اراقۃ دم کا ہے اور وہ قابل تقسیم نہیں جیسے ایک کنواں مشترک ہوا اور ایک شریک کہے کہ ہم تو اپنے کنوئیں میں پیشاب کریں گے ظاہر ہے کہ سارا ہی کنواں ناپاک ہوا۔ اسی واسطے ساجھی اگر بناؤ تو دینداروں کو بناؤ اور اگر دیندار نہ ملیں تو بہتر صورت یہ ہے کہ جس قدر شریک ہوں وہ کسی عالم کے پاس آ جائیں

اور سب اپنی اپنی کہدیں اور جس طرح وہ عالم فیصلہ کرے اس کے موافق کریں۔
اسی طرح سمجھو کہ اگر ایک حصہ میں کسی نے دو شخص کی نیت کر لی تو اس کا حصہ تو گیا ہی تھا اس کے ساتھ سب کا ہی ضائع ہو گیا جیسے ایک نبی کے ساتھ انکار کرنا سب انبیاء علیہم السلام کا انکار ہے۔ مولانا نے شاہ یہودی کے قصہ میں یہی مضمون لکھا ہے

شاہ احوال کرد در راہ خدا　　آں دو دمساز خدائی راجدا

(اس باطنی احول (بھینگے) بادشاہ نے دین کے معاملہ میں ان دونوں حضرات موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام کو جو دین میں متحد اور متفق ہیں جدا جدا کر رکھا تھا۔ ایک کی تصدیق کرتا دوسرے کی تکذیب)
تو اسی طرح سے قربانی کے لئے میں نے بیان کیا کہ اگر ایک حصہ بھی فاسد ہوگا تو تمام حصے فاسد ہو جائیں گے اور قربانی درست نہ ہوگی۔ سو کسی عالم سے پورا واقعہ صاف صاف بیان کر کے مسئلہ پوچھ لیا کرو۔ مجھ سے بعض لوگوں نے یہ مسائل پوچھے ہیں اس لئے میں کہتا ہوں کہ ان کی طرح کہیں اور کسی نے بھی ایک حصہ میں گھر بھر کے لئے نیت نہ کر لی ہو۔ اگر ایک ہی کی طرف سے حصہ کرو تب بھی اس کو خبر کر دو۔

میت کی طرف سے قربانی

بعض لوگ پوچھتے ہیں کہ میت کی طرف سے قربانی کریں یا نہیں۔ اور اگر کریں تو کیونکر کیا کریں۔ تو قربانی مردوں کی طرف سے بھی جائز ہے ماں باپ پیر استاذ حتیٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی کر سکتے ہیں مگر ایک حصہ کئی مردوں کی طرف سے درست نہیں۔ اور شاید کسی کو اس حدیث سے شبہ ہو کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ قربانی میں ساری امت کو یاد فرماتے تھے۔ اور اس سے کوئی سمجھ جائے کہ آپؐ نے ایک حصہ میں ساری امت کو شریک کیا تو ہمیں بھی جائز ہے کہ ایک حصہ میں کئی آدمی شریک ہو جایا کریں تو کچھ خبر بھی ہے کہ وہ کس کا حصہ تھا وہ ایک حصہ لاکھوں کے برابر تھا۔ یہ تو عاشقانہ جواب ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ آپؐ نے قربانی سب کی طرف سے نہیں کی تھی بلکہ اپنی طرف سے کر کے ثواب ساری امت کو بخش دیا۔ جیسے تم نفل قربانی صرف اپنی طرف سے کر دو اور پھر اس کا ثواب کئی آدمیوں کو بخش دو یہ جائز ہے باقی یہ شبہ نہ کیا جائے کہ آپؐ نے امت کو ثواب بخشا تو امت اس وقت موجود کہاں تھی جواب یہ ہے کہ لوگوں کا یہ خیال کہ ثواب مردوں کو ہی پہنچتا ہے غلط ہے بلکہ زندوں اور آئندہ آنیوالوں سب کو پہنچتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان زندہ اور مردہ سب یکساں ہیں۔ جس کو ثواب پہنچاؤ اس کو پہنچتا ہے۔ پہنچانے والوں کو اختیار ہے کہ چاہیں زندوں کو پہنچائیں یا مردوں کو۔ مگر ایسا ثواب نہیں پہنچتا جیسا جاہل گمان کرتے ہیں کہ اگر

ٹھنڈی چیز دوتو مردے کوٹھنڈک پہنچتی ہےاور گرم دوتو گرمی کا اثر ہوتا ہے۔

جیسا کسی پیر کی فاتحہ گرم کھیر پر دی تھی تو پیر نے کہا میری زبان میں چھالہ پڑ گیا یہ بالکل غلط اور میں اس کی غلطی آج ہی ثابت کر دوں گا۔ زندوں کوثواب پہنچنا تو ثابت ہے پس اس کا امتحان آج ہی کر لو۔ کوئی گرم گرم کھانا کسی زندہ پیر کو بخشو پھر اس کا منہ کھول کر دیکھو کہ چھالے پڑے یا نہیں۔ اب محرم کا مہینہ قریب آتا ہے لوگ شربت کی سبیلیں جا بجا مقرر کریں گے تو شربت کی تخصیص کیوں کرتے ہو۔ اسی خیال سے کہ شہداء پیاسے انتقال فرما گئے تھے۔ شربت سے ان کو تسکین ہوگی۔ تو صاحبو کیا آپ کے نزدیک شہداء اب تک پیاسے ہیں اور اسی تمہارے شربت کے پیاسے ہیں استغفر اللہ! انہوں نے مرتے ہی حوض کوثر کا وہ شربت پیا ہے کہ جس سے پیاس کا نام بھی نہیں رہا۔ اور اگر تمہارے دلوں میں شہداء کی اتنی ہی قدر ہے اور تم سمجھتے ہو کہ وہ اب تک پیاسے ہیں تو پیاس تو شربت سے بجھتی ہے وہ ان کے پاس کہاں پہنچا وہ تو دنیا ہی کے دس بیس آدمی پی گئے۔ ان کو تو اس کا ثواب پہنچا تو کیا وہ ٹھنڈا ہے خیال تو کیجئے کتنی بے اصل بات ہے اگر شربت ہی بخشنا ہے تو چاہئے کہ جب محرم کا مہینہ جاڑوں میں آئے تو چائے پلایا کرو۔ اس وقت شربت پلانے کے کیا معنی جس سے پینے والوں کو الٹا زکام ہو جائے گا اور پھر وہ بزبان حال بددعا دیگا۔ غرض یہ خیالات تو غلط مگر اموات کو ثواب بے شک پہنچتا ہے۔

محسن اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی

مگر سب سے زیادہ اس کے مستحق تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ آپؐ کے احسانات بے شمار ہیں۔ پھر غضب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھول جائیں اور آپ کی طرف سے قربانی نہ کریں۔ خصوصاً جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں کسی موقع پر فراموش نہیں فرمایا۔ یہاں تک کہ قربانی میں بھی یاد فرمایا تو اگر سال بھر میں دو تین روپے آپ کی طرف سے قربانی کرنے میں صرف ہو گئے تو کون سی دشوار بات ہے اور خوب سمجھ لو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو میں نے اموات کے ذیل میں بیان کیا ہے اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ یہ حیات انبیاء علیہم السلام کے خلاف ہے کیونکہ بوجہ ظاہری موت کے آپ کو میت کہہ سکتے ہیں ورنہ واقع میں آپ زندہ ہیں اور آپ کی حیات بہت قوی ہے جو دوسروں کو حاصل نہیں انبیاء علیہم السلام کی حیات ایسی قوی ہے جو کہ دوسروں کو حاصل نہیں۔ انبیاء علیہم السلام کی حیات ایسی قوی ہے کہ ان کی بیبیوں سے نکاح کرنا بعد ان کی وفات کے بھی جائز نہیں جیسے کسی زندہ خاوند کی بیوی سے نکاح جائز نہیں اور سب کی بیبیوں سے بعد خاوند کی وفات کے شادی کرنا جائز ہے۔ حتیٰ کہ شہداء جن کی حیات بعد شہید ہونے کے اموات مومنین سے قوی ہوتی ہے کہ ان کے بدن کو زمین نہیں کھا سکتی مگر ان کی بھی بیبیوں سے بعد مر جانے

کے نکاح جائز ہے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام کی حیات شہداء کی حیات سے قوی تر ہے۔ حدیث ابن ماجہ میں ہے ان نبی اللہ حی یرزق (انبیاء اللہ زندہ ہیں ان کو رزق دیا جاتا ہے) اب یہ بات رہ گئی ہے کہ جب مردوں کی طرف سے قربانی جائز ہے تو گوشت کو کیا کیا جائے۔ اس میں تفصیل ہے اگر مردہ یہ وصیت کر کے مرا ہے کہ میرے مال میں سے قربانی کر دیجیو مثلاً ذی قعدہ میں کوئی مرا اور اس نے یہ وصیت کی تو اس کے قربانی کے گوشت کو تو خیرات کرنا واجب ہے اور اگر اس کے مال سے نہیں کی خواہ وصیت کی ہو یا نہ کی ہو تو اس کے گوشت کا وہی حکم ہے جو اپنے مال سے قربانی کرنے کا ہے۔

غنی اور فقیر کا فرق

ایک مسئلہ یاد کرنے کے قابل اور ہے جس کی بہت ضرورت ہوتی ہے کہ اگر غنی قربانی کرے تو اس کے اور احکام ہیں اگر قربانی کرنے والا غنی ہو تو یہ حکم ہے کہ اگر وہ کوئی حصہ خریدے تو اس کو جائز ہے کہ اس کے عوض میں دوسرا بدل لے اور اگر دوسرا حصہ خرید لیا اور پہلا بھی موجود تھا تو اس کے ذمہ ایک ہی واجب ہے لیکن اگر دوسرا حصہ پہلے سے کم قیمت ہو تو درمیانی قیمت کا تصدق مستحب ہے۔ مثلاً پہلا حصہ تین روپے کا تھا اور دوسرا حصہ دو روپے کا تو اس غنی کو ایک روپیہ صدقہ کر دینا مستحب ہے اور اگر دونوں کو ذبح کر دے تو بہتر ہے اور اگر وہ محتاج ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اس کے ذمہ ابتداءً قربانی واجب نہیں۔ مگر جانور خریدنے سے واجب ہو جاتی ہے تو جتنے جانور یا جتنے حصے خریدے گا سب کی قربانی واجب ہو جائے گی۔ البتہ اگر حصہ اپنا بدل لے تو ایک ہی حصہ واجب رہتا ہے۔ اور حصوں کے وجوب میں لوگ کہا کرتے ہیں کہ غریب پر زیادہ سختی ہے حالانکہ شریعت نے کیا کیا اس نے خود اپنے اوپر سختی کی کہ اول ایک جانور خریدا پھر دوسرا خرید لیا تو شریعت نے سختی کہاں کی۔ بلکہ اس کی تو یہاں تک رعایت ہے کہ اگر غریب کا جانور مر جائے تو اس کے ذمہ سے قربانی ساقط ہے دوسرا جانور خریدنا واجب نہیں اور اگر غنی اپنے حصہ کو یا جانور کو تبدیل کرے تو جائز ہے۔ مگر درمیانی قیمت کا تصدق واجب ہے اور اگر غنی کا جانور مر جائے تو دوسرا خرید کر قربانی کرنی پڑے گی۔ پس مسئلہ یہ ہے کہ اگر غنی اپنے حصہ کو یا جانور کو تبدیل کرے تو جائز ہے۔ مگر درمیانی قیمت کا تصدق واجب ہے اور اگر غنی نے بہ نیت قربانی کئی جانور خرید لئے تو اس کے ذمہ ایک ہی واجب ہے اور فقیر اگر ایک دو تین جانور خرید لے تو سب کی قربانی واجب ہے خوب سمجھ لو۔ مگر حصہ بدلنے کی صورت نازک ہے اگر غریب نے ایک حصہ خریدا پھر اس کو بدلنا چاہا تو اگر یہ کیا کہ دوسرا حصہ خرید کر پھر نیت پہلے کے بیچنے کی رکھی تو اس صورت میں دونوں واجب ہو گئے تو اس کو یوں کرنا چاہیے کہ دوسرا حصہ پہلے دوسرے آدمی

کو خریدنے دے اس کے بعد اپنے حصہ سے بدل لے تو غریب کو شریک قربانی کرنا مشکل ہے اور ہو تو ایسا ہو کہ طبیعت کا بھی غریب ہو کہ بتلانے سے مان لے یہ بات بہت یاد کرنے کے قابل ہے۔

حرام جانور کی قربانی

ایک یہ مسئلہ ہے کہ بعض لوگ قربانی کرتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ جانور شریعت کی رو سے ملک طیب ہے یا ملک خبیث تو بعض دفعہ ملک خبیث ہوتی ہے وہ خدا کے یہاں مقبول نہیں گو واجب اتر جاتا ہے اور بعض دفعہ ملک ہی نہیں ہوتی۔ جیسے چرائی کا بکرا کہ سال بھر میں ایک دفعہ زمیندار کو دیا جاتا ہے یہ آمدنی حرام ہے کہ لینے سے بھی اس کا کوئی مالک نہیں اور وجہ یہ ہے کہ گھاس کسی کی ملک نہیں اس میں سب کا حق ہے وہ دو طرح ملک ہو سکتی ہے۔ کاٹنے سے یا کھیت کی طرح سینچنے سے بھی ملک ہو جاتی ہے مگر یہ جو ہزاروں بیگھہ کا رقبہ پڑا ہے وہاں کون آبپاشی کرتا ہے تو کسی کی ملک نہیں ہے۔ اس سے سب کا انتفاع جائز ہے اس کی مثال آب باراں ہے کہ اس کا کوئی مالک نہیں تو گھاس کا بھی کوئی بھی مالک نہیں۔ جس کا کھر پا چل جائے تو مالک وہی ہے تو گھاس کے عوض جانور لینا ہرگز جائز نہیں۔ اور اگر کسی نے لیا تو وہ اس کی ملک میں نہیں آتا۔ بلکہ اسی کا ہے جس نے دیا ہے لینے والے کو اس میں کسی قسم کا تصرف جائز نہیں اور اگر اس کی قربانی کی تو ادا نہ ہوگی بلکہ خود اس کے لئے اس کا تجویز کرنا معاذ اللہ ایسا ہے جیسے غلیظ کو کسی بڑے عظیم الشان حاکم کے پاس تحفۃً لے جائے خدا کا خوف کرنا چاہیے اول تو یہ جانور لینا نہ چاہیے اور اگر شیطنت سر پر سوار ہو اور لے ہی لو تو اس کی قربانی تو نہ کرو اور قربانی بھی کرو تو خدا کے لئے اسے خود ہی کھاؤ کسی اور مسلمان بھائی کو تو مت کھلاؤ۔ کوئی خود گوہ کھائے تو دوسروں کو تو نہ کھلائے۔

اکل حلال کا اثر

اور دعوت میں اس کی ہمیشہ رعایت کرو کہ حلال کھانا کھلاؤ خود حرام کھاؤ تو کھاؤ۔ دوسرے کو تو نہ کھلاؤ دیکھو حرام کھانے سے دل میں ظلمت ہوتی ہے اور اہل اللہ کو پتہ بھی چل جاتا ہے اور ان کو سخت تکلیف ہوتی ہے حتیٰ کہ کبھی قے ہو جاتی ہے جیسے مولانا مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ کاندھلوی کی مشہور کرامت تھی کہ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو مشتبہ کھانا کبھی ہضم نہیں ہوا۔ اسی وقت نکل جاتا تھا۔ ورنہ ظلمت اور پریشانی قلب تو ضرور ہوتی ہے۔ تو کھانا ایسا ہونا چاہیے کہ جس میں حکومت وغیرہ کسی چیز کا واسطہ نہ ہو کیونکہ دعوت واجب تو ہے نہیں۔ مستحب ہے اور حرام کھانا کھلانا حرام ہے۔ تو جس کے پاس حلال کھانا نہ ہو اس کو کسی کی دعوت نہ کرنا چاہیے۔ اور اس کی ضرورت کیا ہے کہ کھانا مرغن ہی کھلاؤ سادہ

کھلاؤ مگر حلال ہو۔ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ ایک حکایت بیان فرماتے تھے کہ دیو بند میں ایک عبداللہ شاہ تھے گھاس کھودا کرتے تھے واقعی فقیری ان کی تھی اور آج کل تو فقیری دعوتیں کھانے کا نام رہ گیا تو وہ روزانہ آٹھ پیسے کو گھاس بیچتے تھے جس میں سے چار پیسے اپنی والدہ کو دیتے تھے اور دو پیسے خدا کے واسطے فقیروں کو دیتے تھے اور دو پیسے اپنے خرچ کے لئے خود رکھتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے ان حضرات سے کہا کہ مولوی صاحبو! میں آپ کی دعوت کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ حضرت آپ کے پاس ہے کہاں جو دعوت کریں گے۔ فرمایا وہ جو خیرات کے پیسے نکالتا ہوں وہ جمع کرلوں گا۔ سب نے منظور کرلیا۔ واقعی دعوت بھی ایسوں کی کرے آج کل تو اگر مرغی نہ ہو تو دعوت قبول نہیں کرتے۔ میرے ماموں ایک پیرزادے کی حکایت بیان کرتے تھے کہ وہ ایک جگہ پہنچے اور اپنی ایک مریدنی کے یہاں ٹھہرے اس نے طعام کا سامان کیا تو ایک دوسری مریدنی آئی۔ اس نے اصرار کیا کہ میرے یہاں کھانا کھالیجئے۔ پہلی مریدنی نے کہا کہ تیرے یہاں کیسے کھاسکتے ہیں ٹھیرے تو میرے یہاں دونوں میں خوب لڑائی ہونے لگی تو پیرزادے نے کہا کہ اس میں لڑائی کی کیا بات ہے آج تو یہاں کھانے دو تمہارے یہاں پھر کھالیں گے تو اس نے کہا بہت اچھا مگر میں نے آج مرغ پکایا تھا۔ مرغ کا نام سن کر پیر پھسل پڑے۔ پہلی سے کہنے لگے کہ بی تمہارا ہی کیا حرج ہے آج اسی کے یہاں کھانے دو تو پہلی مریدنی نے دوسری کو بڑی فحش بات کہی کہ جا تو پیر ہی سے ایسا کام کرالے۔

خلاصہ یہ کہ آج کل کی پیرزادگی تو یہ رہ گئی ہے ایک کہ حضرات تھے کہ گھاس کھودنے والے کی خشک دعوت قبول فرمائی اس سے بھی زیادہ میں سناؤں حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ ایک حکیم صاحب کے مکان پر تشریف لائے تو حکیم صاحب نے صاف کہہ دیا کہ میرے یہاں تو آج فاقہ ہے اگر اجازت ہو تو اور کسی دوست کو کھانا پکانے کا مشورہ دوں۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ میں تمہارا مہمان ہوں اگر تمہارے یہاں فاقہ ہے تو ہم بھی فاقہ ہی سے رہیں گے۔ سبحان اللہ! یہ حضرات ہیں اللہ والے شام کو مغرب کے قریب حکیم صاحب کے پاس کہیں سے کچھ روپے آگئے تو خوب دعوت کی۔ چنانچہ عبداللہ شاہ صاحب نے پانچ آنے جمع کئے اور پیسے لاکر دیدیئے کہ میں تو کہاں جھگڑا کروں گا۔ میرے اہل وعیال نہیں ہیں۔ آپ خود میٹھے چاول پکا کر کھالیجئے اور ایک لمبی فہرست بتلادی کہ اتنے آدمیوں کی دعوت ہے جس میں سب بزرگ آگئے اور دعوت کا انتظام مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے سپرد ہوا۔ مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے اس میں بڑی احتیاط سے کام لیا کہ کوری ہانڈی منگائی اور پکانے والے کو وضو کرایا۔ جب وہ کھانا تیار ہوا تو دو دو لقمے سب نے اس میں سے کھائے مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ وہ دو لقمے کھا کر مہینہ بھر تک ایک نور دل میں رہا یوں جی چاہتا تھا کہ سب ماسوی اللہ کو چھوڑ کر یک سو ہو جاؤں۔ میں نے اپنے دل میں

کہا کہ یااللہ! جس کی پاک کمائی کے دولقموں میں یہ نورانیت ہے اس شخص کے قلب کی کیا کیفیت ہوگی جو دونوں وقت یہی غذا کھاتا ہے یہ تو حلال کھانے کی حکایت تھی جس کا یہ اثر ہوا۔

حرام کی نحوست

ایک دوسری حکایت حرام کھانے کی مولانا نے خود اپنی بیان فرمائی کہ ایک رئیس کے یہاں سے لڈو آئے تھے اس میں سے ایک میں نے کھالیا۔ ایک ماہ تک قلب کی یہ حالت تھی کہ یوں وسوسہ ہوتا تھا کہ نعوذ باللہ کوئی حسین عورت ملے تو متمتع ہوں۔ فرماتے تھے کہ خدا خدا کر کے ایک مہینہ کے بعد اس کا اثر زائل ہوا۔ اور میں سخت پریشان رہا۔ اگر حرام سے خود نہ بچو تو دوسروں کو تو مت کھلاؤ خصوصاً ایسے مال سے قربانی کرنا تو ہرگز نہ چاہیے۔ اس صورت میں تو چرائی کا بکرا ملک ہی نہیں ہوتا۔

جانور کی خرید میں احتیاط

ایک وہ صورت ہے کہ ملک تو ہو جاتی ہے مگر خبیث ہوتی ہے جیسے حصے پر جانور لیتے ہیں جس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص نے اپنی گائے کا بچہ کسی دوسرے کو پالنے کے واسطے دیا اور اجرت یہ قرار دی کہ جب یہ بڑا ہو جائے گا تو اس کی قیمت لگا کر نصفا نصف بانٹ لیں گے یا تو مالک آدھی قیمت دیکر اس کو لے لیگا یا پالنے والا آدھی قیمت دیکر لے لے گا یہ عقد ناجائز ہے مگر پہلی صورت میں کہ مالک نے پالنے والے کو آدھی قیمت دیکر جانور اپنے پاس رکھا اس جانور میں کوئی خباثت نہیں وہ حلال طیب ہے اگر چہ عقد فاسد کرنے کا گناہ ہوا۔ اور دوسری صورت میں کہ پالنے والا جانور کو لے اور مالک کو آدھی قیمت دے اس کی ملک خبیث ہے اور برابر خبیث رہے گا۔ اس لئے ایسے جانور کی بھی قربانی جائز نہیں کیونکہ **ان اللہ طیب لایقبل الا الطیب** (الصحیح لمسلم کتاب الزکوۃ ۶۵) (اللہ تعالیٰ پاک ہیں اور پاک ہی چیز کو قبول فرماتے ہیں) اگر چہ قربانی کر دینے سے واجب ذمہ سے ساقط ہو جائے گا مگر مقبول نہیں۔

گوشت کی تقسیم

اور ایک مسئلہ یہ ہے کہ کلہ پارچوں میں کمینوں کا حق سمجھا جاتا ہے تو اگر حق الخدمت سمجھ کر دیا تو اس قدر گوشت کے برابر قیمت تصدق کرنا واجب ہے گو لوگ تو یہ کہا کرتے ہیں کہ قربانی ہی نہ ہوگی تاکہ لوگ اس کو چھوڑ دیں اور بالکل نہ کریں کیونکہ اگر یہ کہا جائے کہ اس قدر گوشت کی قیمت تصدق کر دو تو لوگ دینا تو چھوڑیں گے نہیں اور تصدق بھی نہ کریں گے۔ مگر میں اس کو پسند نہیں کرتا۔ احکام

صاف صاف ہم کو بیان کر دینا چاہیے جس کا دل چاہے مانے یا نہ مانے رہی اس کی دلیل کہ قربانی ہو جائے گی تو میں طالب علم کو بتا دوں گا کہ بعض عوام اس کو نہیں سمجھ سکتے۔ اب رہی یہ بات کہ کمینے گالیاں دیں گے تو اہل ہمت کے لئے تو یہ جواب ہے کہ اگر گالی دیں بلا سے کچھ پرواہ نہ کرو بلکہ اور خوش ہونا چاہیے کہ اس کی نیکیاں تم کو مل رہی ہیں ایک بزرگ کا قاعدہ تھا کہ ان کو جو کوئی گالی دیتا اس کو مٹھائی بھیجتے اور راز اس میں یہی ہے کہ اس نے اپنی نیکیاں تمہیں دیں تو مٹھائی اس سے بہت کم قیمت ہے اس نے تم پر بڑا احسان کیا۔ اس لئے کیا اس کو مٹھائی دے کر بھی خوش نہ کیا جائے۔ مگر اہل ہمت کو میں ایک اور مشورہ دیتا ہوں کہ ان کمینوں کو بالالتزام نہ دیا کریں کبھی کبھی دے دیا کریں۔ مگر جب دیں غریب سمجھ کر دیں۔ خدمت گار سمجھ کر نہ دیں۔ سو اس طرح دینے سے وہ اپنا حق نہ سمجھیں گے اور اگر گالیاں کھانے کی ہمت نہ ہو تو ہمیشہ دیدیا کرو۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی کہہ دو کہ تیرا حق تو کچھ ہے نہیں مگر تجھ کو غریب سمجھ کر دیتے ہیں۔ اس میں بھی حرج نہیں مگر یہ کم ہمتی کی بات ہے ایک مسئلہ یہ ہے جس کو اکثر لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ اگر کئی شخصوں کے حصے ہوں تو سب کو بدوں تقسیم کئے ہوئے یا بعض کو تقسیم کر کے اور بعض کو مشترک تصدق کرنا جائز ہے یا نہیں۔ تو سن لو کہ جائز ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ کچھ مشترک تصدق ہو گیا ہو اور بقیہ کو تقسیم کر لو۔ مگر اندازے سے بانٹنا حرام ہے اگر ایک طرف کچھ زیادہ کم چلا گیا تو سود کا گناہ ہوا۔ دیکھو! اگر چھٹانک بھر بھی ایک طرف زیادہ ہوا تو سود خوروں میں دونوں لکھے جائیں گے۔ ہاں! اگر ایک طرف زیادہ گوشت ہو اور دوسری طرف کلے پائے ہوں تو جائز ہے کیونکہ جنس بدل گئی۔

کھال کا مصرف

ایک مسئلہ یہ ہے کہ کھال کا مصرف معلوم کر لینا چاہیے اس میں اکثر مؤذن ملا مولویوں پر خفا ہوتے ہیں کہ انہوں نے ہماری آمدنی کم کر دی مگر میں ان کو سمجھاتا ہوں کہ ہم کھال دینے سے منع نہیں کرتے کھال مؤذنوں ہی کو دو مگر اس طرح جس طرح ہم کہیں کہ اجرت سمجھ کر مت دو یعنی مؤذن مقرر کرتے وقت یہ نہ کہا جائے کہ بقر عید میں کھال بھی ملا کرے گی۔ یہ تو گویا تنخواہ ہو گئی بلکہ اس سے کہہ دو کہ کھال میں تمہارا کوئی حق نہیں اس کے بعد تنخواہ مقرر کر دو۔ جب تنخواہ دے چکو تو کھال بھی دیدو کیونکہ وہ بھی غریب ہے اور کھال میں غریبوں ہی کا حق ہے۔ تو ہم تو مؤذنوں کے خیر خواہ ہیں کہ تنخواہ الگ دلوائی۔ کھال الگ دلوائی ہاں یہ جو میں نے کہا کہ کھال بھی دے دو یہ صیغہ وجوب کا نہیں۔ بلکہ امر مستحب ہے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ان کی خاطر سے غیر واجب کو ہم واجب کہہ دیں اور یاد رکھو کہ اگر امام و مؤذن کو مسجد میں مقرر کرتے وقت کھال دینے یا نہ دینے کا ذکر بھی نہ ہو۔ تب بھی کھال دینا جائز نہیں۔ کیونکہ المعروف کالمشروط (معروف مثل مشروط کے ہوتا ہے) تو نہ سکوت جائز ہے نہ شرط ہاں

یہ جائز ہے کہ اس وقت نفی کر دو اور وقت پر دیدو۔ اسی طرح سقے کی تنخواہ میں بھی کھال دینا جائز نہیں۔ اچھی آپ لوگوں نے اللہ میاں کے کاموں کی تنخواہ مقرر کی کہ یوں بیگار سمجھ کر قربانی کی کھال سے پوری کی جاتی ہے اور کسی غنی کو خود کھال کا دے دینا یا اپنے کام میں لانا جائز ہے مثلاً ڈول بنوالو یا چرس بنوالو۔ مگر ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ اگر اپنے کام میں لاؤ اور وہ شے پرانی ہو کر فروخت کرو تو یہ دام پھر خیرات کرنے پڑیں گے۔ جیسے چرسہ بنوالیا اور وہ پرانا ہوگیا اور اس کو فروخت کیا تو ان داموں کو خیرات کرنا ضروری ہے اور مصرف اس کا وہی ہے جو تازی کھال کے داموں کا ہے کہ سید کو اور غنی کو اس کا دینا ناجائز ہے اور شروع وقت قربانی ۱۰ تاریخ ذی الحجہ کی بعد نماز عید کے ہے اور ختم ۱۲ تاریخ کے غروب سے پہلے تک ہے لیکن دسویں کو افضل ہے اور گاؤں والوں کو جہاں عید کی نماز نہیں ہوتی نماز سے پہلے بھی ذبح کرنا جائز ہے۔

ذبح کے مسائل

ایک مسئلہ اور قابل یاد رکھنے کے ہے کہ جانور کے گلے میں ایک گھنڈی ہوتی ہے اس کے نیچے سے ذبح کرنا چاہیے اوپر ذبح نہ کرے کہ اکثر فقہاء اس کو حرام کہتے ہیں احتیاط اسی میں ہے دیکھو ایک برتن میں اگر کھانا رکھا ہو اور ایک شخص کہتا ہے کہ اس میں کتے نے منہ ڈالا ہے اور دوسرا کہتا ہے نہیں ڈالا تو تم اس کو ہرگز نہ کھاؤ گے اسی طرح جانور کے ذبح کرنے میں خصوصاً قربانی کے معاملہ میں احتیاط پر عمل کرنا چاہیے یہ بھی اکثر لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ کہاروں اور چماروں کو بھی قربانی کا گوشت دینا جائز ہے۔ جواب یہ ہے کہ جائز ہے بشرطیکہ کسی کام کی اجرت میں نہ دیا جائے کتابوں میں قربانی کے جانور کے ذبح کرنے کی ایک دعا بھی لکھی ہے یاد رکھنا چاہیے کہ بغیر اس دعا کے بھی قربانی جائز ہو جاتی ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس قدر آدمی جانور کو لیتے ہوں سب کو بسم اللہ اللہ اکبر کہنا ضروری ہے اگر ایک بھی نہ کہے گا تو قربانی نہ ہوگی یہ بالکل غلط ہے صرف ذابح کو کہنا ضروری ہے اور ذابح ایسا شخص ہونا چاہیے جو ذبح خوب سمجھتا ہو ہر شخص کے ہاتھ سے ذبح کرانا مناسب نہیں۔

اور بچوں کی طرف سے قربانی واجب نہیں۔ صدقہ فطر پر اس کو قیاس نہ کریں ایک بات زیادہ اہتمام کے قابل ہے وہ یہ کہ قصاب جانور کو ذبح کرنے کے بعد ٹھنڈا نہیں ہونے دیتے کھال کھینچنی شروع کر دیتے ہیں۔ یہ حرام ہے۔ جب جانور خوب ٹھنڈا ہو جائے اس وقت کھال کھینچنا چاہیے بعض لوگ نفس ذبح پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ جانور کو تکلیف دینا ہے ہم کہتے ہیں کہ ذبح میں تکلیف نہیں ہوتی موت طبعی میں زیادہ ہوتی ہے اور اگر ہوتی بھی ہو تو جو محبوب حقیقی کے امر سے ہو وہ سب محبوب ہے۔

ایک مسئلہ ضروری یہ ہے کہ بعض لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ گابھن کی قربانی بھی درست ہے جواب یہ ہے کہ جائز ہے پھر اگر بچہ زندہ نکلے تو اس کو بھی ذبح کر دینا چاہیے۔

اب میں ضروری احکام قربانی کے بیان کر چکا ہوں اگر کوئی اور مسئلہ دریافت کرنا ہو تو زبانی دریافت کر لیا جائے بغیر پوچھے اپنی رائے سے عمل نہ کریں اب اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے کہ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

اَلْحَجُّ الْمَبْرُوْر

اصلاح حجاج کے سلسلہ میں ''الحج المبرور'' سے موسوم یہ وعظ بمبئی میں حکیم اجمیری صاحبؒ کے مکان پر ۱۱ ذی قعدہ ۱۳۴۷ھ کو رات کے وقت ہوا۔ جو دو گھنٹہ تک جاری رہا حضرتؒ نے بیٹھ کر بیان فرمایا۔ مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نور اللہ مرقدہ نے اسے قلمبند فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۲۵ تھی۔ اور مستورات زیادہ تھیں۔

سفر (حج) میں گونہ مشقت اور تکلیف کا ہونا ضروری ہے۔ دل میں (اگر شوق اور محبت ہو تو پھر کوئی بھی تکلیف، تکلیف نہیں رہتی اور جہاں بیت اللہ پر ایک نظر پڑی اسی وقت سب کلفت رفع ہو جاتی ہے اس وقت یاد بھی نہیں آتا کہ اس سے پہلے کیا کیا پیش آیا تھا بس وہ حال ہوتا ہے جو جنت میں پہنچ کر جنتیوں کا ہوگا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُ ۙ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ ۝

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ نَحْمَدُہٗ وَنَسْتَعِیْنُہٗ وَنَسْتَغْفِرُہٗ وَنُؤْمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیْہِ وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا مَنْ یَّھْدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنْ یُّضْلِلْہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنْ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَنَشْھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ.

امابعد! فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ. (الزمر آیت ۱۱)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہہ دیجئے کہ مجھ کو (منجانب اللہ) حکم ہوا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کروں کہ عبادت کو اس کے لئے خالص رکھوں۔

تمہید: یہ ایک چھوٹی سی آیت ہے جس میں حق تعالیٰ نے ایک بڑے ضروری امر کا امر فرمایا ہے اور یہ قرآن شریف کا خاص حصہ ہے کہ تھوڑے سے الفاظ میں مقصود کا ہر پہلو سے بیان ہو جاتا ہے اخلاص کے بارے میں جتنی باتیں بیان کرنا ضروری تھیں وہ سب ان تھوڑے سے لفظوں میں بیان ہو گئی ہیں۔ اگر ان کی تفصیل بیان کی جائے تو اس کے لئے وسیع وقت کی ضرورت ہے اور وعظ کا وقت مستورات کی مصلحت سے رات کا رکھا گیا ہے اس لئے وقت میں زیادہ گنجائش نہیں۔ کیونکہ رات کے وقت دیر تک بیان ہونے سے سننے والے گھبرا جاتے ہیں بعض پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے تو اونگھنے لگتے ہیں جس سے بیان کرنے والے کی طبیعت منقبض ہو جاتی ہے اس لئے میں اس کا خلاصہ عرض کئے دیتا ہوں جو ان شاء اللہ تھوڑے سے وقت میں بیان ہو جائے گا۔

اس آیت میں جس خاص ضروری بات کا امر ہے وہ اخلاص ہے یوں تو اس کی ضرورت ہر وقت ہے اور ہر کام میں ہے اخلاص کے بدون کوئی دین کا کام مقبول نہیں ہوتا۔ مگر اس وقت جس خاص کام کے لئے اخلاص کی ضرورت مجھ کو بیان کرنا ہے اس کے لئے ایک خاص محرک موجود ہے وہ یہ کہ سامعین کو معلوم ہے

کہ اس وقت ان میں سے بہت سے حضرات کا حج کا ارادہ ہے جن میں مرد بھی ہیں اور مستورات بھی ہیں اور مجھے بھی بمبئی تک انہیں پہنچانے کے لئے آنا پڑا ہے۔ اگر چہ میرے مشاغل اس قدر ہیں کہ مجھ کو اس سفر کے لئے مہلت نہ مل سکتی تھی مگر محض اس خیال سے یہاں تک چلا آیا کہ مجھے اگر حج کی توفیق دوبارہ نہیں ہوئی تو کم از کم حجاج کی خدمت اور راحت رسانی ہی کا کچھ ثواب لے لوں۔ اگر چہ میں کسی کی کچھ خدمت بھی نہیں کر سکتا مگر غالباً میرے بمبئی تک ساتھ ہونے سے میرے رفیقوں کو بہت کچھ سہولتیں اس سفر میں ہو گئی ہوں گی۔ اور اگر سب کو نہیں تو خاص میرے متعلقین کو تو قوت اور انس ضرور رہا ہوگا۔

اور یہ عجیب بات ہے کہ میرے یہاں تک آنے سے مشہور یہی ہو گیا کہ میں حج کو جا رہا ہوں خیر یہ بھی ایک نیک فال ہے ان شاء اللہ مجھے حجاج کی معیت میں حج ہی کا ثواب مل جائے گا۔ کیونکہ حدیث میں ہے الدال علی الخیر کفاعلہ کہ نیک کام کا راستہ بتانے والا بھی ثواب میں کرنے والے کے برابر ہے تو جب صرف دلالت کا ثواب کرنے کے مثل ہے تو اس مشقت کا ثواب کہ میں گھر سے بمبئی تک حجاج کی مصلحت سے ان کے ساتھ آیا یہ بھی ان شاء اللہ ثواب حج کے برابر ہی ہو جائے گا۔

پھر میں اس وقت حج کے کامل اور مقبول ہونے کا طریقہ بتلانا چاہتا ہوں اگر اس بیان سے کسی کو نفع ہو گیا تو دلالت علی الخیر بھی پائی گئی جس کا ذکر حدیث میں صراحۃً موجود ہے۔ بہر حال بعض رفقاء کا ارادہ حج اس بات کا محرک ہوا کہ حج کے متعلق کچھ ضروری تنبیہات گوش گزار کر دی جائیں تا کہ جس امر کا انہوں نے خدا کی توفیق سے ارادہ کیا ہے۔ اس کو آداب و شرائط کے ساتھ ادا کریں کیونکہ ہر چیز اپنے آداب و شرائط ہی کے ساتھ کامل ہوا کرتی ہے۔

قاعدہ عقلیہ

چنانچہ ایک ایسے ہی امر کی طرف اس آیت میں تنبیہ کی گئی ہے جس کو میں نے اس وقت تلاوت کیا ہے اور وہ امر جس کی طرف اس آیت میں تنبیہ ہے بہت ہی زیادہ ضروری ہے کیونکہ یہ ایک قاعدہ مسلمہ عقلیہ ہے کہ ہر فعل میں جس چیز کی کمی ہوا کرتی ہے اس کا تدارک دوسرے محسنات سے مقدم ہوتا ہے یعنی اگر ایک کام میں کمی نہ ہو گو زوائد بھی اس میں نہ ہوں وہ تو مقصود کے لئے کافی ہے اور جس کام میں اصل ہی سے کمی ہو گو محسنات بھی اس میں ہوں وہ ناکافی ہوتا ہے پس ہر کام کی تکمیل کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے ان کوتاہیوں کو پورا کیا جائے جن پر اس کی صحت اور مقبولیت موقوف ہے پھر اگر خدا ہمت دے تو ان مستحبات اور نوافل اور زوائد کو بھی پورا کیا جائے جن سے اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور اگر نوافل و زوائد کو پورا بھی نہ کیا جائے تو حسن اصلی تو جب بھی رہے گا اور کوتاہیوں کے ہوتے ہوئے کسی کام میں حسن پیدا نہیں ہو سکتا۔

دیکھئے! اگر ایک مکان میں تمام ضروریات موجود ہوں کسی معتبر چیز کی کمی نہ ہو مگر استرکاری اور بیل بوٹے نہ ہوں تو اس مکان کو ناقص نہ کہا جائے گا۔ اور اگر اس میں باورچی خانہ یا غسل خانہ یا اور کوئی ضروری چیز نہ ہو تو چاہے اس میں ہزار بیل بوٹے ہوں اس کو یقیناً ناقص کہا جائے گا اور سب یہی کہیں گے کہ یہ مکان رہنے کے قابل نہیں اسی طرح ہر چیز میں غور کرلیا جائے تو اس عقلی قاعدہ کی تائید ہر چیز میں ملے گی کہ اول ہر چیز کے نقصانات اور کوتاہیوں کو پورا کرنا ضرور ہوتا ہے محسنات اور زوائد کا مرتبہ بعد میں ہے اس لئے میں نے اس آیت کے مضمون کو زیادہ ضروری قرار دیا کیونکہ اس میں ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس پر ہر نیک عمل کا درست اور مقبول ہونا موقوف ہے اور اس میں آج کل بہت کمی کی جاتی ہے اور وہ اخلاص ہے۔

حج میں اخلاص کی زیادہ ضرورت

اگرچہ اخلاص کی کمی ہمارے اکثر اعمال میں آج کل ہے۔ اس لئے بظاہر حج کی کوئی خصوصیت معلوم نہ ہوئی ہوگی۔ مگر میں ابھی بتلادوں گا کہ اخلاص کی ضرورت حج میں زیادہ ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حج کی ایک خاص شان ہے جس کی وجہ سے وہ اکثر اخلاص سے خالی ہو جاتا ہے اور یہ ہمارے سوء فہم کا نتیجہ ہے کہ اس کی وہ خاص شان اس کو مقتضی ہوگئی کہ اس میں اخلاص کم ہوتا ہے ورنہ اس شان کا اصلی مقتضاء یہ تھا کہ اس میں دوسرے اعمال سے زیادہ اخلاص کا اہتمام کیا جاتا۔

حج کی ایک شان یہ ہے کہ وہ ساری عمر میں ایک بار فرض ہوتا ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جو کام بار بار ہوتا ہے اس میں اگر پہلی بار اخلاص نہ ہو تو آہستہ آہستہ پیدا ہو جاتا ہے۔ نماز دن میں پانچ مرتبہ فرض ہے اگر کسی کو اول روز اخلاص نصیب نہ بھی ہو تو وہ کوشش کر کے دو چار روز یا دو چار ہفتوں میں اخلاص حاصل کرسکتا ہے روزہ میں اتنا تکرار تو نہیں مگر ہر سال رکھنا پڑتا ہے اسی طرح زکوۃ ہے اگر کوئی شخص تمنا کے ساتھ بلوغ کے بعد پچاس سال کی عمر پائے تو پچاس مرتبہ زکوۃ فرض ہوگی اس سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ دوسرے اعمال میں اخلاص کا پیدا ہونا آہستہ آہستہ ممکن ہے اگر پہلی بار میں نہ ہو دوسری تیسری بار میں ہو جائے گا۔

درجات اخلاص

اور وجہ اس کی یہ ہے کہ اخلاص کے وجوداً وعدماً تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ فعل کے وقت غایت صحیحہ کا قصد ہو یہ تو غایت اخلاص ہے اور یہی مقصود اور مرتبہ کمال کا ہے۔ دوسرے یہ کہ غایت فاسدہ کا قصد ہو۔ یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے ایک یہ کہ کچھ بھی قصد نہ ہو نہ غایت صحیحہ کا نہ غایت فاسدہ کا بلکہ یونہی معمول کے موافق ایک کام کرلیا یہ درجہ بین بین ہے۔ اس کو اخلاص سے اتنا بعد نہیں جتنا دوسرے درجہ کو بعد ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم نماز پڑھیں اور قصد یہ ہو کہ خداتعالیٰ ہم سے راضی ہوں

گے اس کے سوا اور کچھ نیت نہ ہو یہ تو اخلاص کا درجہ کمال ہے ایک یہ صورت ہے کہ نماز پڑھتے ہوئے کسی دوسرے شخص کو دکھانے کا خیال ہو کہ فلاں شخص ہمارے خشوع و خضوع کو دیکھ کر ہمارا معتقد ہو جائے گا یہ بالکل اخلاص کے خلاف ہے ایک یہ صورت ہے کہ ہم معمول کے موافق نماز پڑھ لیں نہ وہ خیال دل میں ہو نہ یہ خیال ہو یہ مرتبہ بین بین ہے۔ یہ اگر اخلاص کا درجہ کمال نہیں تو اخلاص کے زیادہ منافی بھی نہیں۔ اس کو اخلاص سے قرب ضرور ہے۔ مگر ظاہر ہے کہ فعل اختیاری فاعل مختار سے بدوں کسی غرض کے تصور کے نہیں ہو سکتا۔ تو اس کی کیا وجہ کہ بعض دفعہ ہم ایک فعل کرتے ہیں اور نیت کچھ نہیں ہوتی۔ یہ محض عادت کی برکت ہے جب کسی کام کی عادت ہو جاتی ہے تو وہ خود بخود صادر ہونے لگتا ہے اس کے لئے اب بار بار ارادہ اور عزم نہیں کرنا پڑتا۔ یہ مطلب نہیں کہ نماز کی نیت بھی نہیں ہوتی بلکہ مطلب یہ ہے کہ کسی غایت پر نظر نہیں ہوتی۔

تکرار کی وجہ سے عادت ہو جاتی ہے اور عادت کے بعد غایات کا لحاظ نہیں ہوا کرتا پس معلوم ہوا کہ جس کام میں تکرار ہو اس میں اخلاص سے من وجہ قرب ہے اور جس میں تکرار نہ ہو اس میں اخلاص اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ غایت صحیحہ کا تصور اور اس کا قصد نہ ہو۔

اسی وجہ سے حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ریاء ہمیشہ ریاء نہیں رہا کرتی کیونکہ ریاء کرتے کرتے پھر اس کام کی عادت پڑ جاتی ہے اور جس کی عادت ہو جاتی ہے اس میں پھر کوئی خیال نہیں آیا کرتا پھر وہ اخلاص سے قریب ہو جاتا ہے۔

اب حج کو دیکھئے تو اس میں تکرار بالکل نہیں یعنی فرض کے اعتبار سے گو نفل کے اعتبار سے کوئی کتنا ہی کرے مگر یہ اجماعی مسئلہ ہے کہ حج ساری عمر میں فرض صرف ایک ہی بار ہے تو اس میں جب تک غایت صحیحہ کا تصور اور قصد نہ کیا جائے گا اس میں اخلاص نہیں پیدا ہو گا کیونکہ اس میں تکرار نہیں اور تکرار کی وجہ سے عادت بھی نہیں اور عادت نہ ہونے کی وجہ سے اس احتمال کی بھی نوبت نہیں آتی کہ بالکل خالی الذہن ہو کر حج کیا جائے بس اس میں دو ہی صورتیں ہیں یا تو غایت صحیحہ کا قصد ہو گا یا غایت فاسدہ کا اس لئے اس میں اخلاص کے اہتمام کی دوسری عبادت سے زیادہ ضرورت ہے یہی اس وقت مجھ کو بیان کرنا ہے کہ یوں تو ہر عبادت کے لئے اخلاص کی ضرورت ہے مگر حج کے لئے خصوصاً اخلاص کی بہت ضرورت ہے کہ ساری عمر میں ایک بار اس کے ادا کرنے کا موقع ملتا ہے۔ پھر نہ معلوم کسی کی قسمت میں دوبارہ بھی ہے یا نہیں۔ تو ایسی عبادت میں بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے اگر خدانخواستہ اس میں کوتاہی رہ گئی تو بڑی ناکامی ہو گی۔ اول تو حج کرنا دوسری عبادات کی طرح آسان نہیں جانی اور مالی دونوں قسم کی مشقتیں اس میں برداشت کرنی پڑتی ہیں دوسرے بار بار اس کی توفیق اور ہمت ہونا بھی محتمل ہے اگر ایسی حالت میں یہ ساری محنت اخلاص سے خالی ہوئی تو نیکی برباد اور گناہ لازم ہوا پھر روپیہ الگ ضائع ہوا۔ اس سے زیادہ ناکامی اور کیا ہو گی۔

عظمت اخلاص

اللہ نے آیت میں بہت اہتمام سے اخلاص کا امر فرمایا ہے۔ قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ فرمادیجئے کہ مجھ کوامر کیا گیا ہے کہ خداتعالی کی عبادت اسی کے لئے خالص کر کے بجالاؤں۔
یہ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہر حکم کوضروری ظاہر فرماتے تھے آپ رسول تھے اور رسول کا فرض منصبی ہے کہ تمام احکام کومخلوق کی طرف پہنچائے لہٰذا اس کی ضرورت نہ تھی کہ حق تعالی خاص طور پر کسی حکم کے لئے یہ فرمائیں کہ اس کو پہنچادو مگر پھر بھی جب کسی حکم کے لئے آپ کو یہ ارشاد ہوگا کہ اس حکم کو پہنچادو تو ضرور اس سے اس حکم کا مہتم بالشان ہونا سمجھا جائے گا چنانچہ یہاں اخلاص کا امر فرماتے ہوئے حق تعالی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لفظ قل سے خطاب فرمایا ہے کہ یہ بات امت سے کہہ دیجئے ایک تو یہی قرینہ ہے کہ آئندہ جو حکم آئے گا وہ بہت قابل اہتمام ہے پھر اس کے بعد اخلصو انہیں فرمایا کہ یوں کہہ دو کہ مجھ کو اخلاص کا حکم کیا گیا ہے اس جملہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مامور بالاخلاص ہونا ظاہر فرمایا گیا اس سے اخلاص کی عظمت، بہت بڑھ گئی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محبوب ہیں اور جس امر کا محبوب بھی مامور ہو وہ کیسا امر ہوگا۔ بہت ہی مہتم بالشان اور ضروری ہوگا۔ کہ رسول اور محبوب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔

محبوب خدا سے خدا کا معاملہ

دنیا والوں کا اگر کوئی محبوب ہو تو اس کو احکام سے مستثنیٰ کر دیتے ہیں مگر حق تعالی کے یہاں یہ قاعدہ نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ حق تعالی کے محبوب ہیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو احکام سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا۔ بلکہ خصوصیت اور محبوبیت اگر ظاہر ہوئی تو اس صورت میں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور زیادہ احکام لازم کئے گئے ۔تہجد دوسروں پر فرض نہیں سنت ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک قول کے موافق فرض تھا۔ اور نافلة لک سے استدلال کیا گیا ہے کہ یہ تہجد آپؐ پر دوسروں سے فرض زائد ہے۔
یہاں سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہوگئی جو اولیاء کے لئے ایک مقام ایسا مانتے ہیں جہاں احکام شرعیہ ان سے معاف ہو جاتے ہیں ۔ یہ بالکل غلط خیال ہے ان لوگوں نے محبوبان خدا کو محبوبان دنیا پر قیاس کیا ہے کہ جس طرح دنیا والوں کے محبوب تکالیف اور احکام سے مستثنیٰ ہو جاتے ہیں اسی طرح محبوبان خدا بھی مستثنیٰ ہو جاتے ہوں گے اور یہ خبر نہیں کہ یہاں محبوب ہی وہ بنتا ہے جو آئندہ بھی دوسروں سے زیادہ احکام کا بجالانے والا ہو۔ حق تعالی کی محبت اضطراری نہیں کہ بلاوجہ کسی سے خواہ مخواہ محبت ہو جائے ان کی محبت اختیاری ہے اور وہ اسی سے محبت کرتے ہیں جو ان کا زیادہ مطیع ہو پس جو چیز محبت کا سبب ہے وہی اگر جاتی رہے گی تو محبوب کہاں رہے گا پھر سب سے زیادہ محبوب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اگر محبوبان خدا

احکام سے مستثنٰی ہوا کرتے تو سب سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مستثنٰی ہوتے۔ مگر احادیث واقوال علماء سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر دوسروں سے زیادہ احکام تھے اور جہاں ظاہر میں آپ کے لئے رخصت ہے وہ بھی حقیقت میں عزیمت ہے وہ رخصت اس شخص کے حق میں ہے۔ جس کو حقوق ادا کرنے کا قصد نہ ہو اور جس کو حقوق ادا کرنے کا خیال ہو اور حق تعالٰی سے عشق ہو اس سے پوچھیے کہ یہ کتنی بڑی مشقت ہے۔

حکمت تعدد ازواج

مثلاً مخالفین کا اعتراض ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاذ اللہ حظ نفس کے لئے تعدد ازواج کیا۔ نو بیبیوں سے نکاح کیا اور افسوس یہ ہے کہ بعض مسلمان بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔ گو اعتراضاً نہیں بلکہ اپنے حظوظ نفس کی گنجائش کے لئے چنانچہ بعض لوگ چند نکاح کر کے کہتے ہیں کہ ہم نے اگر کیا تو کیا حرج ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی تو چند نکاح کئے ہیں۔ مگر وہ یاد رکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حظ نفس کے لئے چند نکاح ہرگز نہیں کئے حضورؐ کے لئے تعدد ازواج مصالح دینیہ کے سبب مشروع ہوا۔ مثلاً آپ کی شان تھی شارع کی کہ آپ تمام امت کے لئے احکام الٰہی بیان فرماتے تھے بعض احکام ایسے بھی ہیں جو عورتوں کے ساتھ مخصوص ہیں اور عورتیں خود حضور سے بلاواسطہ دریافت کر نہ سکتی تھیں اور مردوں کے ذریعہ سے کہاں تک جزئیات کی تحقیق ہو سکتی اس لئے آپ کے احکام کی اشاعت میں تعدد ازواج کی مصلحت تھی کہ دوسری عورتیں ازواج کے واسطے سے سوال با آسانی کر لیا کریں اور جوبات ان کی سمجھ میں نہ آوے اس کو ان ازواج مطہرات کے ذریعہ سے بخوبی سمجھ لیا کریں۔

اب آپ ہی انصاف کریں کہ ہزارہا مسلمان عورتوں کو احکام سمجھانے کے لئے اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نو سے زیادہ بھی نکاح کرتے تب بھی کم تھا۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعدد ازواج میں اعتدال کی تعلیم فرمائی ہے اور خود بھی عدل کے کسی دقیقہ کو نہیں چھوڑا گو بعض اقوال پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر واجب بھی نہ تھا۔ علاوہ اس کے نکاح میں دو جانبین ہیں ایک افراط اور ایک تفریط' افراط یہ کہ باوجود قوت کے نکاح ہی نہ کرے۔ ایک تفریط کہ ضرورت سے زیادہ کرے۔ حضورؐ نے دونوں سے منع فرمایا اور اعتدال کی تعلیم دی کہ جتنی ضرورت ہو اس سے آگے نہ بڑھے اور چار سے زیادہ کی کسی کو بھی ضرورت نہیں اور شاذ کا اعتبار نہیں اس لئے اس سے زیادہ سب کے لئے حرام ہے۔ اب غور کیجئے کہ ایک شخص کو ایک نکاح کی ضرورت تھی اس نے ایک نکاح کر لیا یہ تو اعتدال ہے اور اگر ایک شخص کو دو یا تین کی ضرورت ہو اور اس نے ایک پر اکتفا کر لیا تو یہ مجاہدہ ہے۔

جب یہ بات سمجھ میں آ گئی تو اب سنئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت جو ملاحدہ کا اعتراض ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ ان کو حضورؐ کی قوت کا اندازہ نہیں۔ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معمولی آدمیوں جیسا

سمجھتے ہیں حالانکہ عادۃ اللہ یہ جاری ہے کہ انبیاء علیہم السلام باطنی کمالات کے علاوہ ظاہری اور بشری کمالات میں بھی دوسروں سے زیادہ ہوتے ہیں چنانچہ حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کے سو اور ہزار بیبیاں ہونا۔ اہل کتاب میں مشہور ہے اسی طرح ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی قوت بشریہ میں دوسروں سے بڑھے ہوئے تھے۔ حدیث میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں تیس مردوں کی اور ایک روایت میں چالیس مردوں کی قوت تھی۔ پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیس یا چالیس نکاح بھی کرتے تب بھی اعتدال سے کسی طرح باہر نہ ہوتے۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس قدر قوت حاصل تھی پھر جب اتنی قوت پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نو بیبیوں پر اکتفا کیا تو یہ مجاہدہ ہوا یا کہ حظ نفس؟ بہر حال یہ صورت اعتدال سے آگے کسی طرح نہ تھی بلکہ اعتدال سے گزر کر مجاہدہ میں داخل تھی۔

رعایت عدل

پھر ضروری بات ہے کہ نو بیبیاں ہونے سے حقوق بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذمہ بڑھ گئے خواہ لزوماً یا التزاماً کیونکہ اس میں علماء کا اختلاف بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر عورتوں کی باری مقرر کرنا اور برابری وغیرہ کرنا واجب تھا۔ آپ تبرعاً کرتے تھے بہر حال اس میں چاہے اختلاف ہو مگر اس پر سب کا اتفاق ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم برابری اور عدل کا پورا لحاظ فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ بیماری میں بھی ایک کی باری میں دوسری کے گھر نہ رہتے تھے۔ البتہ مرض وفات میں جب ازواج مطہرات نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حضرت عائشہؓ کے دن کا بہت انتظار رہتا ہے تو سب نے رضامندی کے ساتھ عرض کیا کہ بس اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہؓ ہی کے گھر میں تشریف رکھیں اور اس حالت میں ہر اک کے گھر جانے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کلفت پہنچتی ہے۔ اب خیال کیا جائے کہ جس شخص کو حقوق کے ادا کرنے کا اس درجہ خیال ہو اس کے لئے نو بیبیوں کی اجازت محض ظاہر میں ایک رخصت ہے۔ ورنہ حقیقت میں بڑی مشقت ہے۔ حتیٰ کہ بیبیوں میں عدل کرنا بڑی سلطنت کے عدل سے بھی مشکل تر ہے۔ کیونکہ یہاں محض ضابطہ کا تعلق نہیں کہ صرف ڈانٹ ڈپٹ سے کام لے لے دونوں سے محبت کا تعلق ہے ہر اک کی تکلیف سے دل دکھتا ہے۔

پھر شریعت کی پابندی کا مقتضا یہ ہے کہ ظاہری برتاؤ میں ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دی جائے ایسی حالت میں عدل کرنا بڑے مرد کا کام ہے اور حضورؐ عدل کی اس قدر رعایت فرماتے تھے کہ آپ سے بڑھ کر کوئی نہیں کر سکتا اس کے بعد بھی آپ یہ فرمایا کرتے **اللھم ھذہ قسمتی فیما املک فلا تلمنی فیما تملک ولا املک** (سنن النسائی ۷/۶۴) الٰہی یہ میری تقسیم ہے ان امور میں جو تیرے قبضہ میں ہیں۔ پس مجھ کو اس چیز میں ملامت نہ فرمایئے جو میرے اختیار سے باہر ہے یعنی قلبی محبت اور رجحان مثلاً

میلان زیادہ آپ کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف زیادہ تھا۔ تو یہ بات اختیار سے باہر تھی۔ مگر ظاہری برتاؤ میں آپ سب کے ساتھ عدل پورا فرماتے تھے۔ پس اس مشقت پر نظر کر کے وہ رخصت بھی رخصت نہ رہی بلکہ وہ بھی عزیمت تھی اب کس کا منہ ہے کہ اپنے آپ کو احکام سے مستثنیٰ سمجھے۔

اس لئے فرماتے ہیں قل انی امرت کہہ دیجئے کہ مجھ کو امر کیا گیا ہے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اخلاص کا حکم کیا گیا ہے اور آپ اس کے مامور ہیں تو وہ کیسا بڑا امر ہوگا۔

مسئلہ تصوف کا حل

آگے فرماتے ہیں اَنْ اَعْبُدَ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ (کہ خدا تعالیٰ کی عبادت اسی کے لئے خالص کر کے بجالاؤں) اس میں ایک بہت بڑا مسئلہ تصوف کا حل ہو گیا ہے۔ آج کل ایک فرقہ ہے جس نے تمام شریعت کی روح نکال لی ہے اور واقعی روح ہی نکال دی اور اپنی طرف سے دین کو مردہ کر دیا لیکن اللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ خدا اپنے نور کو پورا کر کے رہے گا۔ اگر چہ بد دین لوگ ناگواری ظاہر کرتے رہیں وہ لوگ احکام وعبادات کو بیکار سمجھتے ہیں۔ نماز کا خلاصہ نکالا ہے ذکر کہ بس خدا کی دھن لگی رہنی چاہیے نماز کی کیا ضرورت ہے زکوٰۃ کا خلاصہ یہ نکالا کہ ہمدردی ہونا چاہئے۔ روپیہ غریبوں کو دینے کی ضرورت نہیں حج کا خلاصہ یہ نکالا کہ تعلقات قطع کر دینی چاہئیں مکہ جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ غرض تمام عبادات میں اخلاق کو اصل سمجھا ہے اور اعمال کو بیکار کر دیا۔

اس آیت میں ان کا جواب موجود ہے۔ حق تعالیٰ نے اس آیت میں امرت کا مفعول ان اعبد کو بنایا ہے اور مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ اس کا حال ہے اور حال میں اصل یہی ہے کہ عامل کی قید اور اس کے تابع ہوتا ہے الا بدلیل مستقل تو اخلاص کو عبادت کا تابع بنایا گیا معلوم ہوا کہ عبادات اصل ہیں اور احوال و کیفیات واخلاق ان کے تابع ہیں۔ اب کسی کا کیا منہ ہے کہ احکام وعبادات کو بیکار کہے سارا قرآن اس سے بھرا پڑا ہے جا بجا عبادات کی تاکید اور ان کے ترک پر وعید ہے ہاں کسی کو قرآن پر ہی ایمان نہ ہو وہ جو چاہے کہے۔

حقیقت اخلاص

اخلاص کے معنی لغت میں خالص کرنے کے ہیں اور شریعت میں بھی اس کے معنی وہی ہیں جو ورود شرع سے پہلے تھے۔ خالص گھی وہ ہے جس میں کوئی دوسری چیز ملی ہوئی نہ ہو۔ اخلاص عبادت کے معنی بھی یہ ہوئے کہ عبادت کو غیر عبادت سے خالی کیا جائے یعنی کوئی ایسی غرض اس میں ملی ہوئی نہ ہو جس کا حاصل کرنا شرعاً مطلوب نہیں ہے۔ مثلاً نماز سے بزرگ مشہور ہونا زکوٰۃ دینے سے نام آوری اور حج سے حاجی کہلانا مقصود نہ ہو اور یوں کوئی نہ کوئی غرض تو ضرور ہوگی کیونکہ فاعل مختار کا فعل غرض سے خالی

نہیں ہوسکتا۔ پس اخلاص کے یہ معنی نہیں کہ رضا حق اور جنت کی بھی غرض نہ ہو کیونکہ یہ غرض تو مطلوب ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَفِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ اسمیں رغبت کرنے والوں کو رغبت کرنا چاہئے اھ اس سے پہلے جنت کی نعمتوں کا ذکر ہے جن کی طرف رغبت کرنے کا امر خود قرآن میں موجود ہے وفی الحدیث اللھم انی اسئلک الجنة و ما قرب الیھامن قول او عمل (مسند احمد ۱/۱۷۱) حدیث میں ہے کہ حضورؐ اس طرح دعا کیا کرتے تھے۔ اے اللہ! میں آپ سے جنت کی درخواست کرتا ہوں اور ان اقوال واعمال کی جو جنت کی طرف نزدیک کردیں۔ معلوم ہوا کہ جنت کی درخواست کرنا سنت ہے اسی لئے میں نے اخلاص کی حقیقت یہ بیان کی تھی کہ عبادت کے ساتھ کوئی ایسی غرض نہ ملائی جائے جس کا حاصل کرنا مطلوب نہیں اور ثواب اور جنت کا اور عذاب سے نجات کا مانگنا مطلوب ہے۔ اس لئے یہ غرض اگر عبادت میں ملی ہوئی ہو تو یہ اخلاص کے منافی نہیں۔

بعض لوگ بے دھڑک کہہ ڈالتے ہیں کہ ہم کو جنت کی پرواہ نہیں دوزخ کی پرواہ نہیں ان لوگوں کو جنت و دوزخ کی حقیقت معلوم نہیں ورنہ ساری شیخی رکھی رہ جاوے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون کامل ہوگا۔ مگر حضورؐ نے بھی جنت کی طلب کی ہے اور جہنم سے پناہ مانگی ہے۔ اور بعض اہل حال سے جو اس قسم کے اقوال منقول ہیں وہ غلبہ احوال میں ان سے صادر ہوئے ہیں۔ یہ کوئی ان کے کمال کی دلیل نہیں حالت اکمل وہی ہے جو سنت کے موافق ہو مگر وہ حضرات بوجہ غلبہ حال کے معذور سمجھے جاتے ہیں۔ اس وقت ان کو جنت کی طرف التفات نہ تھا ورنہ جنت ایسی چیز نہیں جس کی کسی کو پرواہ نہ ہو۔

پھر جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اصل مقصود رضائے حق ہے ہم ان سے یہ کہتے ہیں کہ رضائے حق پر نظر کرتے ہوئے جنت کی درخواست ضروری ہے کیونکہ اول تو وہ محل رضا ہے جنت ہی میں حق تعالیٰ کی رضا کا ظہور ہو گا۔ جب رضا مطلوب ہے تو محل رضا بھی مطلوب ہونا چاہیے۔ ای شئ اذا ثبت ثبت بلوازمہ ہر شے اپنے لوازم کے ساتھ ثابت ہوا کرتی ہے مطلوب کے مقدمات اور وسائل بھی من وجہ مطلوب ہوئے ہیں لہٰذا رضا کے مطلوب ہونے سے بھی جنت کا مطلوب ہونا لازم آتا ہے پھر اس سے بے پروائی کے کیا معنی؟

دوسرے جب حق تعالیٰ کی رضا اصل مطلوب ہے اور رضا حاصل ہوتی ہے۔ امتثال اوامر سے یعنی احکام کی بجا آوری سے اور میں آیت قرآنی سے بتلا چکا ہوں کہ حق تعالیٰ جنت کی طرف رغبت کرنے کا امر فرماتے ہیں تو جنت کی رغبت کرنے اور اس کی درخواست کرنے سے بھی رضائے حق حاصل ہوگی کیونکہ اس میں بھی ایک حکم کا امتثال ہے۔ چنانچہ اسی امتثال حکم کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد دعاؤں میں جنت کی درخواست کی ہے پس کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ عبادات میں جنت اور ثواب کی طرف التفات کرنا اخلاص کے خلاف یا کمال کے منافی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ جنت حق تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ جس کے سامنے دنیا کی نعمتیں ہیچ ہیں۔ مگر ہم کو دنیا کی نعمتوں سے بھی استغناء ظاہر کرنے سے منع کیا گیا ہے اور ان دنیوی نعمتوں کی قدر اور شکر کا حکم کیا گیا ہے تو خدا کی اتنی بڑی نعمت سے استغناء اور بے پروائی کیونکر جائز ہوگی۔ بس جن بزرگوں سے ایسی باتیں منقول ہیں کہ ہم کو جنت کی پرواہ نہیں وہ ان سے غلبہ حال میں صادر ہوئی ہیں اس وقت ان کو جنت کی طرف التفات نہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان عبدیت تو یہ تھی کہ آپ کھانا تناول فرما کر یوں فرمایا کرتے تھے۔ غیر مودع ولا مستغنی عنه ربنا (الصحیح للبخاری ۷/۱۰۶) یعنی میں اس کھانے کو ہمیشہ کے لئے رخصت نہیں کرتا (دوسرے وقت پھر اس کا محتاج ہوں گا) اور نہ اے خدا میں اس سے مستغنی ہوں پھر جنت کی نعمتوں سے کون مستغنی ہوسکتا ہے۔

یہاں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ آج کل جو مریدوں کی عادت ہے کہ مشائخ کے سامنے جب کوئی ہدیہ پیش کرتے ہیں تو اکثر یوں کہا کرتے ہیں کہ آپ کو اس کی کیا پرواہ ہے یہ تو حقیر اور قلیل چیز ہے یہ محاورہ قابل ترک ہے بخدا اس لفظ کو سن کر میرا تو رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے۔ مشائخ کیا چیز ہیں کہ وہ خدا کی نعمتوں سے مستغنی ہوں اور ان کو خدا کی نعمتوں کی پرواہ نہ ہو۔ آخر وہ بھی انسان ہیں ان کو بھی کھانے پہننے اور روپیہ پیسہ کی احتیاج ہوتی ہے۔ اگر ایک وقت پیشاب بند ہو جاوے اس وقت حقیقت معلوم ہو جائے کہ پیر صاحب دنیا کی چیزوں سے کتنے بے پرواہ ہیں یہ محض جہالت ہے اور جو مشائخ اس لفظ کو سن کر خاموش ہو جاتے ہیں ان کی ہمت ہے۔ ایسے الفاظ کبھی شیخ کے لئے استعمال نہ کرنے چاہیں جو انبیاء کے واسطے بھی بولنے جائز نہیں۔ انبیاء علیہم السلام بھی خدا کی سب نعمتوں کے محتاج تھے۔ جب حضرت ایوب علیہ السلام کو خدا تعالیٰ نے مرض سے شفاء عطا فرمائی ہے وہ غسل کر رہے تھے اسی وقت ان کے اوپر سونے کی ٹڈیوں کی بارش آسمان سے ہوئی وہ ان ٹڈیوں کو فوراً جمع کرنے لگے حق تعالیٰ نے فرمایا الم اکن اغنیتک کہ کیا میں نے تم کو غنی نہیں کیا۔ انہوں نے عرض کیا بلے یا رب ولکن لا غنا بی عن برکتک کہ خدایا آپ نے بیشک مجھے غنی بنایا ہے لیکن آپ کے تبرک سے تو بے پرواہ نہیں ہوسکتا۔ پس خدا کی نعمتوں سے بے پروائی کسی کو کسی وقت نہیں ہوسکتی تو ہم خدا تعالیٰ کی رضا کے بھی محتاج ہیں جنت کے بھی محتاج ہیں ثواب کے بھی محتاج ہیں اور وہ یہ مقاصد ہیں جن کا اعمال دینیہ میں مطلوب ہونا ظاہر ہے ان کی نیت عبادات میں کرنا اخلاص کے خلاف نہیں۔

جب آپ کو اخلاص کی ضرورت اور اس کی حقیقت معلوم ہوگئی۔ اب یہ معلوم کیجئے کہ حج کا کن چیزوں سے خالص کرنا ضروری ہے سو سن لیجئے کہ وہ دنیوی اغراض ہیں جن سے حج کا خالص کرنا ضروری ہے دینی

کام کے ساتھ دنیوی غرض کا ملنا ایسا ہے جیسا کہ دودھ میں پانی ملادیا جائے اور کون نہیں جانتا کہ دودھ خالص وہی ہے جس میں پانی نہ ہو اسی طرح عبادت خالص وہی ہے جس میں دنیوی غرض کوئی ملی ہوئی نہ ہو۔ اور دودھ میں پانی ملانے کی تین صورتیں ہیں ایک یہ کہ دودھ میں پانی ملایا جائے۔ دوسرے یہ کہ پانی میں دودھ ملایا جائے تیسرے یہ کہ دونوں کو ایک ساتھ کسی دوسرے برتن میں ڈال دیا جائے۔ حج میں آمیزش کی بھی یہی تین صورتیں ہیں (۱) یہ کہ حج سے پہلے ہی کوئی خرابی اس میں ڈال دی جائے۔ (۲) دوسرے یہ کہ حج کر کے اس کو خراب کر دیا جائے۔ (۳) تیسرے یہ کہ حج کے ساتھ ساتھ خرابیاں بھی ہوتی رہیں۔

حج سے پہلے خرابی ڈالنے کی صورت یہ ہے کہ اس سے پہلے کوئی دنیوی غرض اس کے ساتھ ملالی جائے مثلاً حاجی کہلانے کی نیت ہو یا مال حرام سے سفر کیا جاوے۔ حج کے ساتھ ساتھ خرابیاں ہونے کی صورت یہ ہے کہ سفر حج میں معصیت کرتے رہیں۔ گناہوں سے توبہ نہ کی ہو۔

سفر حج میں اہتمام نماز

مثلاً بعض لوگ حج کے سفر میں نماز چھوڑ دیتے ہیں اور جو کوئی ان سے کہتا ہے کہ بھائی یہ کیسا حج ہے کہ نماز ہی موقوف کر دی تو کہتے ہیں کہ صاحب ایسی گندی حالت میں نماز کیسے پڑھیں۔ جہاز کے پائخانہ غلیظ ہوتے ہیں چھینٹیں اڑ کر کپڑوں پر آتے ہیں کپڑوں کا کیا اعتبار جوتوں کا کیا اعتبار خدا فقہا کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے وسوسہ کو اس قدر قطع کیا ہے کہ کوئی کیا قطع کریگا۔ فقہاء فرماتے ہیں کہ جب تک قسم کھا کر نہ کہہ سکے کہ میرا وضو ٹوٹ گیا اس وقت تک وہ باوضو ہے اسی طرح کپڑوں کا حکم ہے جب تک یقین نہ ہو جائے کہ ان میں ناپاکی لگ گئی ہے اس وقت تک کپڑوں کو پاک سمجھنا چاہیے خواہ کیسی ہی پاخانے غلیظ ہوں احتیاط کر کے بیٹھو اور احتیاط سے اٹھو جب تم کو ناپاکی کپڑوں پر نظر نہیں آتی ان کو پاک ہی سمجھو۔ لیجئے شریعت میں کس قدر آسانی ہے اب بھی اگر کوئی نمازیں برباد کرے وہ خود بھگتے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ یہ دو فرقے دین کے محافظ ہیں۔ فقہاء اور صوفیہ اور فقہاء کا وجود تو مسلمانوں کے حق میں بہت بڑی نعمت تھی۔

علماء نے لکھا ہے کہ کسی کو خبر نہیں کہ میرے ساتھ خدا کو کیا منظور ہے۔ مگر فقہاء کو معلوم ہے کہ خدا کو ان کے ساتھ بھلائی منظور ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے **من یرد اللہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین** جس کے ساتھ خدا کو بھلائی کرنے کا ارادہ ہوتا ہے اس کو دین کی سمجھ یعنی فقہ عطا کرتے ہیں امام محمدؒ کو کسی نے وفات کے بعد خواب میں دیکھا پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا فرمایا مجھ کو حق تعالیٰ کے سامنے پیش کیا گیا تو حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے محمد مانگو کیا مانگتے ہو میں نے عرض کیا کہ میری مغفرت کر دی جائے جواب ملا کہ

اگر ہم تم کو بخشنا نہ چاہتے تو فقہ عطا نہ کرتے۔ ہم نے تم کو فقہ اسی لئے عطا کیا تھا کہ تم کو بخشنا منظور تھا۔

مگر اس سے مامون العاقبت ہونا لازم نہیں آتا۔ یعنی یہ نہ سمجھا جاوے کہ فقہاء پر سوء خاتمہ کا اندیشہ بالکل نہیں اس لئے مطمئن ہو کر بیٹھ جائیں کیونکہ حق تعالیٰ اگر فقیہ کو عذاب کرنا چاہیں گے تو فقہ کو اس سے سلب کر لیں گے کوئی یہ نہ کہے کہ فقہ کیونکر سلب ہو جاوے گا۔ بات یہ ہے کہ فقہ کتابوں کے پڑھ لینے کا نام نہیں۔ فقہ ایک نور ہے جو فقیہ کے دل میں ہوتا ہے جس کی برکت سے اس کو دین کی سمجھ حاصل ہوتی ہے اور اس نور کو حق تعالیٰ جب چاہیں سلب کر لیں وہ کسی کے اختیار میں نہیں ہے اب تم لاکھ کتابیں پڑھتے پڑھاتے رہو۔ مگر چونکہ دین کی سمجھ نہیں رہی تم فقیہ نہیں ہو سکتے اور وہ نور فقہ طاعات اور تقویٰ سے بڑھتا ہے اور معاصی سے سلب ہو جاتا ہے جو فقیہ مطیع اور متقی نہ ہو وہ کتابوں کا فقیہ ہے حقیقی فقیہ نہیں اور نہ اس کے واسطے وہ بشارت ہے جو حدیث میں مذکور ہے اس لئے خاتمہ سے اطمینان کسی حال میں فقیہ کو بھی نہیں ہو سکتا۔

اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ فقہ دین کی سمجھ کا نام ہے تو اس میں کیا شبہ ہے کہ فقیہ صوفی ضرور ہو گا ہمارے فقہاء جتنے ہوئے ہیں سب صاحب نسبت اور صاحب معرفت تھے۔ نسبت اور معرفت کے بغیر دین کی سمجھ کامل نہیں ہو سکتی۔ ایسے ہی فقہاء کی شان میں فرمایا گیا ہے **فقیہ واحد اشد علی الشیطان من الف عابد** ۔ (السنن الترمذی ۲۶/۸۱) کہ ایک فقیہ ہزار عابدوں سے زیادہ شیطان پر بھاری ہے۔ جس کو دین کی سمجھ ہو گی وہ شیطان کے فریبوں کو خوب سمجھے گا۔ اور اس کی ایک چال نہ چلنے دے گا۔ اور کورے عابد کو تو شیطان جس طرح چاہے پٹی پڑھا سکتا ہے۔

ہم نے ایک عابد زاہد کو سفر حج میں دیکھا کہ نماز بالکل چھوڑ بیٹھے تھے۔ شیطان نے ان کو اسی قسم کے پاکی اور ناپاکی کے توہمات میں مبتلا کر دیا تھا فقیہ ان باتوں میں کبھی نہ آئے گا تو حدیث میں جس فقیہ کو ہزاروں عابد سے زیادہ شیطان پر بھاری بتلایا گیا ہے یہ وہی فقیہ ہے جس کو دین کی سمجھ ہو صرف کتابیں پڑھنے والا فقیہ مراد نہیں۔ حضرات فقہاء شیطان کی ان چالوں کو خوب سمجھتے تھے اسی لئے انہوں نے پاکی اور ناپاکی کے مسائل میں بہت توسع فرمایا ہے۔

اور یہ ان کی وسعت نظر کی دلیل ہے کہ جو باتیں ان کو پیش بھی نہ آئی تھیں ان کو سوچ سوچ کر بیان کر گئے اور پھر قواعد ایسے بیان کر دیئے جن سے قیامت تک کی جزئیات کا حکم نکالنا آسان ہو گیا۔ ان مسائل کی ضرورت گھر بیٹھے نہیں معلوم ہو سکتی۔ مگر فقہاء ایسے تنگ نظر نہ تھے کہ گھر سے باہر ان کی نظر نہ جائے۔ فقہاء کے پیش نظر دریا کا تلاطم بھی تھا وہ اس کے احکام بھی بیان کر گئے ہیں کہ اگر چکر آتا ہو کھڑا نہ ہو سکتا ہو تو نماز بیٹھ کر یا لیٹ کر ہی پڑھ لے اور دوران سفر کپڑوں کے پاک کرنے اور دھونے کی

طاقت نہ ہو نہ کوئی رفیق یہ کام کر سکتا ہو نہ زیادہ کپڑے اس کے پاس ہوں تو اسی ناپاک کپڑے سے نماز پڑھ لے۔ فقہاء نے اس میں بھی کلام کیا ہے کہ اگر جہاز وغیرہ میں چکر نہ بھی ہو تب بھی بیٹھ کر نماز جائز ہے یا نہیں اگر چہ مفتی بہ قول یہی ہے کہ چکر نہ ہو تو کھڑے ہو کر ہی نماز پڑھنا واجب ہے مگر اس سے حضرات فقہاء کی وسعت نظر تو معلوم ہوتی ہے کہ انہوں نے جزئیات کا بہت احاطہ کیا ہے۔

استنجے کی بابت بھی فقہاء نے خوب تفصیل لکھی ہے کہ کس حالت میں فرض و واجب ہے اور کس حالت میں سنت ہے۔ حضرت اگر فقہاء کی یہ رخصتیں اور تحقیق نہ ہو جہاز میں تو سب نماز روزے رخصت ہو جاتے۔ یہاں وہم نہیں چل سکتا۔ جہاز میں بڑے بڑے وہمیوں کا وہم رخصت ہو جاتا ہے اور یہاں تو بالعوض رخصت ہوتا ہے اور مدینہ کے راستہ میں بلاعوض رخصت ہو جاتا ہے۔ سفر مدینہ کے بعد پھر وہم پیدا ہی نہیں ہوتا کیونکہ وہاں پانی بھی کم ملتا ہے اور راستہ میں پیاس کی بھی شدت ہوتی ہے بڑے بڑے وہمی وہاں جھک مار کر پانی کم خرچ کرتے ہیں تا کہ پیاسے نہ مر جائیں۔ پھر اس پر غضب یہ ہوتا ہے کہ حاجی اپنا خون خشک کر کے پانی بچاتا ہے اور بدو مشک کھول کر بہت سا پی جاتا ہے۔

ایک مرتبہ مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری کے قافلہ میں بدوؤں نے حاجیوں کا پانی پینا شروع کیا۔ مولانا شیخ البدویین کے پاس تشریف لے گئے ادیب بہت بڑے تھے آپ نے جا کر اس سے کہا کہ ان بدوؤں کو منع کر دو کہ ہمارا پانی نہ پئیں۔ ہم کو سخت تکلیف ہوتی ہے اس میں ایک جملہ آپ نے یہ بھی فرمایا ھم لایشربون ماء نابل یشربون دمائنا یہ لوگ ہمارا پانی نہیں پیتے بلکہ لہو پیتے ہیں شیخ البدویین نے کہا انت فصیح تم بہت فصیح و بلیغ ہو۔ اس فصاحت کا یہ اثر ہوا کہ اس نے بدوؤں کو روک دیا کہ شیخ کا پانی کوئی نہ پئے۔ غرض مدینہ کے راستے میں تو وہم رہتا ہی رہتا نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ وضو وغیرہ میں پانی زیادہ صرف کرتے ہیں ان کو پانی برتنے کا طریقہ نہیں آتا۔ ورنہ اگر طریقہ سے وضو کریں تو بہت کم پانی صرف ہوتا ہے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرماتے تھے کہ وضو وغیرہ میں پانی زیادہ تر بدن کو لگ کر صرف نہیں ہوتا زیادہ حصہ بدن کو لگنے سے پہلے ہی ادھر ادھر گر جاتا ہے تو اگر اس کا خیال رکھا جائے کہ ہر چلو پانی بدن سے اچھی طرح لگ کر زمین میں گرے تو بہت تھوڑے پانی میں بافراغت وضو ہو جاتا ہے۔ تو حج میں ایک کوتاہی تو یہ ہوتی ہے کہ نماز ہی کو بہت سے لوگ حذف کر دیتے ہیں۔

حج کی لڑائی

ایک معصیت خاص حج کے متعلق زیادہ پیش آتی ہے کہ گھر سے نکل کر لڑنا شروع کر دیتے ہیں چنانچہ حج کی لڑائی مشہور ہے۔ اچھے اچھے دوستوں بلکہ باپ بیٹوں میں بھی لڑائی ہو جاتی ہے اور پیر مرید کا تعلق حالانکہ باپ بیٹے سے بھی زیادہ سمجھا جاتا ہے۔ مگر حج میں پیر مرید کو بھی لڑتے دیکھا ہے۔

مگر کمال یہ کہ پیر پھر بھی ان سے خفا نہ تھے۔ باوجودیکہ شریعت میں سب سے زیادہ حق باپ کا ہے اس کے بعد استاد کا اس کے بعد پیر کا مگر یہ طبعی بات ہے کہ محبت پیر کے ساتھ زیادہ ہوتی ہے اور اس کا راز یہ ہے کہ پیر کا تعلق خالص دینی تعلق ہے دنیا کا اس میں لگاؤ نہیں اور جس تعلق میں دنیا کا لگاؤ نہ ہوگا وہ ضرور مستحکم ہوگا۔ پیر چونکہ خالص دین کی تربیت کرتا ہے اس لئے اس سے زیادہ کوئی علاقہ موثر نہیں مگر ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ حج میں پیر اور مرید کا علاقہ بھی لڑائی سے نہیں روکتا۔ اب یا تو یہ اس سفر کی خصوصیت ہے یا ان پیر صاحب کو کچھ دنیا ان سے مطلوب ہوگی اس لئے ان کی وقعت مریدوں کی نظر میں نہ تھی۔ چنانچہ ہمارے قافلہ میں بھی لڑائی شروع ہوگئی ہے اور اس کے آثار دیکھ کر مجھے سخت رنج ہوتا ہے اور ابھی تو جہاز کا سفر بھی شروع نہیں ہوا۔ بمبئی تو گویا گھر ہی کے مثل ہے جب یہیں یہ باتیں شروع ہوگئیں تو آئندہ کا اور اندیشہ ہے اس لئے اسی وقت سے اس کی اصلاح کی ضرورت ہے یاد رکھنا چاہیے کہ گناہوں سے طاعات کا ثواب کم ہوجاتا ہے تو یہ کتنی بڑی نادانی ہے کہ جس ثواب کے لئے روپیہ خرچ کیا جائے جان پر مشقت برداشت کی جائے اس کے ثواب کو دو چار باتوں میں کم کردیا جائے۔ میں کئی روز سے ایسے آثار دیکھ رہا ہوں مگر میری عادت نہیں کہ خود کسی کے معاملہ میں دخل دوں میرے اوپر غیرت کا غلبہ زیادہ ہے۔ اس لئے خود کسی معاملہ میں دخل دینے کو جی نہیں چاہتا۔ یہ خیال ہوتا ہے کہ میرا تو کام نہیں میں کیوں دخل دوں۔ کسی کو لاکھ دفعہ غرض پڑے اپنی اصلاح کا طریقہ دریافت کرے ورنہ میری جوتی کو غرض پڑی ہے کہ اپنے آپ تو کسی کو اپنی اصلاح کا قصد نہ ہو اور میں اس کے پیچھے پڑتا پھروں اگر کسی وقت شفقت کا غلبہ ہوتا ہے تو میں بھی نرمی سے کہہ دیتا ہوں اور بعض بزرگ ایسے بھی ہیں جن پر شفقت کا غلبہ زیادہ ہے وہ خود اپنے متعلقین کے معاملات میں دخل دیتے ہیں۔ مجھ پر بھی اگر کسی وقت یہ رنگ غالب ہوتا ہے تو ایسا کرتا ہوں مگر میرے اوپر غیرت کا غلبہ زیادہ ہے یہ دونوں مذاق ہیں اور دونوں کی اصل قرآن سے ثابت ہے۔ اس لئے کسی مذاق پر طعن کا کسی کو حق نہیں۔ اگر مجھ سے طریقہ دریافت کیا جائے گا بتلادوں گا ورنہ جیسا کریں گے خود بھگتیں گے حج کے سفر میں زیادہ تر لڑائی جھگڑے اس سے پیش آتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے توقع ہوتی ہے پھر جب اس توقع کے خلاف برتاؤ ہوتا ہے تو جھگڑے پیش آتے ہیں اسی لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ سفر حج میں زاد میں کسی کو شریک نہ کرے۔ اس شرکت کی وجہ سے ہر شریک کو دوسرے سے امداد اور راحت رسانی کی توقع ہوتی ہے اور سفر کی حالت میں بعض دفعہ انسان اپنی بھی امداد نہیں کرسکتا تو دوسرے کی کیا خاک امداد کریگا اس لئے ضرورت اس کی ہے کہ ہر شخص اپنا سامان کھانے پینے کا جدا رکھے اور انتظام پکانے کا بھی الگ کرے۔ دوسرے کسی سے کچھ توقع نہ رکھے اس کے بعد اگر کسی سے ذرا سی بھی راحت پہنچ جائے گی۔ اس کی قدر ہوگی اور نہ پہنچے گی تو شکایت نہ ہوگی بہرحال ان وجوہ سے یہ قصے حج سے پہلے ہی شروع ہوگئے ہیں ان کی اصلاح بہت ضروری ہے خدا تعالیٰ اس کو دفع کرے یہ بھی انہی معاصی میں سے ہے جو حج سے پہلے ہوتی ہے۔

حج کی رقم میں احتیاط

بعض لوگ ایک کوتاہی یہ کرتے ہیں کہ رقم کی بابت احتیاط نہیں کرتے۔ رشوت وغیرہ کی رقم لے کر حج کو جاتے ہیں کبھی اور کوئی حرام کمائی ہوتی ہے۔ حدیث میں آتا ہے رب شعث اغبر یطیل سفرہ و ملبسہ حرام و ما کلہ' حرام یرفع یدیہ یدعو اللہ فان یستجاب لہ اھ او کما قال (لم اجد الحدیث فی موسوعۃ) بہت سے پراگندہ بال خستہ حال آدمی جو لمبا سفر کرتے ہیں ہاتھ اٹھا کر خدا سے دعائیں کرتے ہیں اور حالت یہ ہے کہ لباس بھی حرام کا ہے اور غذا بھی حرام ہے پھر ان کی دعا کیونکر قبول ہو اس سے معلوم ہوا کہ حرام کمائی کے ساتھ دعا قبول نہیں ہوتی اور دعا بھی عبادت ہے تو اسی سے دوسری عبادات کا حال بھی سمجھ لیا جائے کہ اور عبادات بھی حرام مال سے اگر کی جائیں گی قبول نہ ہوں گی۔ پس حرام کمائی کے ساتھ حج بھی قبول نہ ہوگا اس لئے اس کا بہت خیال کرنا چاہیے کہ زادو راحلہ اور روپیہ وغیرہ حرام مال سے نہ ہو حلال کمائی ہونی چاہیے۔

تقویٰ کا ہیضہ

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ آج کل تو اکثر آمدنیاں حرام ہی ہیں پھر کسی کا بھی حج مقبول نہ ہوگا۔ سو یہ بالکل غلط ہے وہی فقہاء جو رحمت عالم ہیں ان سے پوچھو دریافت کرو جو آمدنی ان کے فتوے سے جائز و حلال ہو اس کو حلال سمجھو اور فتویٰ کی رو سے بہت سی آمدنیاں اب بھی حلال ہیں۔ اس میں زیادہ غلو کرنے اور تقویٰ بھگارنے کی ضرورت نہیں۔

حق تعالیٰ فرماتے ہیں لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِکُمْ دین میں غلو مت کرو یعنی بات بات میں شبہات مت نکالو۔ بال کی کھال نہ کھینچو۔ ظاہر میں تو غلو اچھا معلوم ہوا کرتا ہے انسان یہ سمجھتا ہے کہ اس میں کیا حرج ہے یہ تو تقویٰ ہے کہ میں ذرا ذرا بات کی چھان بین کرتا ہوں۔

بعض لوگ عوام کے سامنے ایسی حکایات بیان کرتے ہیں کہ کسی بزرگ کے پاس کوئی طالب روزی حلال آئے انہوں نے کہا کہ چند روز پہلے تک تو حلال تھی مگر ایک بار میرے بیل دوسرے کے کھیت میں جا گھسے وہاں کی مٹی ان کے کھریوں کو لگ گئی پھر وہ میرے کھیت میں مل گئی پھر اس میں غلہ پیدا ہوا اس لئے حلال نہیں رہا۔ مگر اس غلو کے انجام ابتلاء فی المعصیت ہو جاتا ہے یعنی تھوڑے دنوں میں یہ تقویٰ بھی جاتا رہتا ہے اور فتویٰ بھی۔ کیونکہ جب ان توہمات کے ساتھ حلال روزی کوئی سمجھ میں نہیں آتی تو شیطان پٹی پڑھا دیتا ہے کہ بس دنیا میں حلال روزی تو میسر آ نہیں سکتی اور بدوں کھائے پئے گزارہ نہیں چل سکتا تو اب حلال و حرام کی فکر ہی فضول ہے جو آ جائے اور جس طرح آ جائے کھالینا

چاہیے ہمیشہ غلو کا یہی انجام ہوتا ہے کیونکہ تو ہمات کا سلسلہ کم نہیں ہوا کرتا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے پھر آخر کار گھبرا کر اس کو بھی چھوڑ دیتا ہے جس کا شریعت نے حکم کیا تھا۔

اسی واسطے فقہاء نے لکھا ہے کہ جو شخص گیہوں کا ایک دانہ لئے پھرے کہ یہ کس کا ہے اس کو سزا دینی چاہیے کیونکہ یہ تقویٰ کا ہیضہ ہے کہ آپ ایک دانہ کو پکارتے ہوئے پھرتے ہو۔ واقعی فقہاء نے شیطان کے فریبوں کو خوب ہی سمجھا ہے۔ ظاہر میں تو یہ حکم فقہاء کا گراں معلوم ہوتا ہے کہ جب ایک شخص دوسرے کے دانہ کو پڑا ہوا پائے تو اس کے پوچھنے میں کیا حرج ہے مگر فقہاء کی نظر انجام پر ہے کہ اس تقویٰ کی انتہا معصیت ہے۔

مال حرام سے حج

بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ حرام مال کما کر جاتے ہوئے دوسرے شخص کے حلال مال سے اس کو بدل لیتے ہیں گویا خدا سے بہانہ کرتے ہیں مگر اس سے کچھ نہیں ہوتا۔ بدلین کا حکم ایک ہی ہوتا ہے اس بدلنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ حلال مال بھی حرام ہو جاتا ہے۔

کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ فقہاء نے بھی تو ایسا حیلہ لکھا ہے جواب یہ ہے کہ اول تو وہ حیلہ اس طرح نہیں جس طرح تم کرتے ہو کہ حلال و حرام کا ادلہ بدلہ کرتے ہو وہ حیلہ دوسرا ہے۔ دوسرے فقہاء نے وہ حیلہ بھی اس لئے نہیں لکھا کہ اس کے سہارے سے حرام مال کمایا کریں اور اس کو اپنے تصرف میں لایا کریں۔ فقہاء نے وہ حیلہ صرف اس واسطے بیان کیا ہے کہ اگر کسی وقت کسی کے پاس ایسی رقم آ جاوے جو گانے والے نے تو حرام طریقہ سے کمائی ہو مگر اس کے پاس حلال طریقہ سے آئی ہو مثلاً کسی کو میراث میں رقم مل گئی اور مرنیوالا سود خور رشوت خور تھا۔ اب یہ پتہ نہیں کہ یہ ساری میراث سود اور رشوت ہی کی ہے یا بالکل حلال ہے یا دونوں قسم کا روپیہ ہے اور یہ بھی معلوم نہیں کہ رشوت کس کس سے لی تھی اس صورت میں آسانی کے لئے وہ صورت بیان کر دی ہے۔ باقی جس نے خود رشوت لی ہے اور وہ جانتا ہے کہ فلاں فلاں سے میں نے رشوت لی ہے۔ اس کو اس حیلہ پر عمل کرنا جائز نہیں۔ بلکہ اس پر واجب ہے کہ جس سے رشوت لی ہے اس کو رقم واپس کر دے اور جس سے سود لیا ہے اس کو سود واپس کر دے پھر اس کے بعد دیکھے کہ حلال آمدنی کتنی بچتی ہے اگر اس میں حج کر سکے تو حج کو جائے ورنہ اس پر حج فرض ہی نہ ہوگا۔

مگر آج کل تو لوگوں نے سستا نسخہ یاد کر لیا ہے کہ حرام مال خوب کماؤ بعد میں ادلا بدلا کر کے اس کو حلال کر لیں گے۔ یہ محض خدا تعالیٰ کے ساتھ بہانہ ہے جو کبھی جائز نہیں۔ پھر فقہاء نے جو صورت حیلہ کی بیان کی ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس حیلہ کے بعد گناہ سے بھی بچ جاوے گا۔ گناہ پھر بھی رہے گا کیونکہ اس حیلہ کی صورت یہ ہے کہ اگر کسی کے پاس حرام کی رقم ہو اور وہ کسی دوسرے سے قرض روپیہ لے کر اس سے حج کر کے بعد میں اس قرض کو اس حرام روپیہ سے ادا کر دے تو فقہاء لکھتے ہیں کہ اس

صوت میں حج صحیح ہوگا کیونکہ قرض گو انتہاءً معاوضہ ہے مگر ابتداءً تبرع ہے تو گویا اس نے ایسے مال سے حج کیا جو اس کو دوسرے کے پاس سے تبرعاً ملا ہے اور انتہاءً جو مبادلہ تھا سو وہ مبادلہ دیون میں ہے۔ عین میں نہیں یعنی جب اس نے ادا کیا ہے اس کا دین اس دوسرے کے ذمہ واجب ہو گیا پھر دونوں دین میں مقاصہ ہو گیا۔ اس لئے حرام روپیہ ادا کرنے سے اس روپیہ میں خبث نہ آئے گا جو پہلے قرض لیا گیا تھا۔

اس سے فقہاء کی فہم کا اندازہ ہوتا ہے بھلا خشک محدث ان دقائق کو کہاں سمجھ سکتا ہے لیکن فقہاء کا اس بیان سے مقصود یہ ہے کہ اس صورت میں حج صحیح ہو جائے گا۔ حج میں کوئی خرابی نہیں یہ مطلب نہیں کہ گناہ نہ ہوگا۔ اس صورت میں یہ شخص دوسری معصیت کا مرتکب ہوا وہ یہ کہ دوسرے شخص کو حرام مال استعمال کے لئے دیا۔

حرام مال کا نہ خود کھانا جائز ہے نہ دوسروں کو کھلانا جائز ہے۔ حتیٰ کہ کافر کو بھی حرام مال کھلانا جائز نہیں یہاں تک کہ ناپاک چیزوں کا کھانا جانوروں کو بھی جائز نہیں بعض لوگ ایسا کھانا جس میں کتا بلی منہ ڈال جائے بھنگی کو دیدیتے ہیں یہ ناجائز ہے بلکہ یہ چاہیے کہ اس سے کہہ دیں کہ اس چیز کو پھینک دو۔ اس کے بعد اگر وہ خود کھالے یا اپنے گھر لے جائے یہ اس کا فعل ہے تم خود اس کو استعمال کے لئے مت دو۔ غرض رشوت اور سود کا مال قرض میں دینا بھی جائز نہیں حدیث میں ہے **لعن الله اکل الربوا و موکله** (سنن ابی داؤد کتاب البیوع باب ۴) خدا لعنت کرے سود کھانے والے پر اور کھلانے والے پر مراد دوسرے کو دینا ہے چونکہ لینا دینا سبب ہو جاتا ہے کھانے پینے کا اس لئے اس کو **آکلہ و موکلہ** سے تعبیر فرمایا۔ مقصود یہ ہے کہ سود لینے والے اور سود دینے والے دونوں پر لعنت ہے۔ اس میں یہ صورت بھی شامل ہے کہ سود لیکر کسی دوسرے شخص کو وہ روپیہ اپنے قرض میں دیا جائے اس صورت میں اس نے اس کو سود کا روپیہ دیا۔ ایک گناہ تو یہ ہوا اس سے بڑھ کر ایک اور گناہ کا مرتکب ہوا وہ یہ کہ اکثر لوگ حرام کا روپیہ قرض میں دیکر اپنے آپ کو بری سمجھتے ہیں۔ ان کو یہ خیال ہی نہیں آتا کہ ہم نے کوئی گناہ بھی کیا ہے۔ تاکہ اس سے توبہ کریں اور اگر اس دوسرے شخص کو خبر نہیں کی کہ یہ روپیہ سود اور رشوت سے ہم نے حاصل کیا تھا جو تم کو قرض کے بدلہ میں دے رہے ہیں تو دھوکہ دینے کا تیسرا گناہ اور ہوا۔ خلاصہ یہ کہ حرام کمائی کرنے والے حج کو جاتے ہوئے جس طرح ادلا بدلا کرتے ہیں اس سے تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ وہ مال جو بدلہ میں لیا جاتا ہے حرام کا حرام ہی رہتا ہے اور جو حیلہ فقہاء نے بیان کیا ہے اس طریقہ سے اگرچہ حج صحیح ہو جاتا ہے مگر ایک گناہ کے بدلے کئی گناہ لازم آجاتے ہیں۔ اس لئے اس کی بہت ضرورت ہے کہ حج کے لئے خالص حلال سفر خرچ لیا کریں۔

حج میں فخر و شیخی

ایک کوتاہی حج میں یہ ہوتی ہے کہ اکثر لوگوں کو افتخار و اشتہار کی عادت ہوتی ہے جہاں بیٹھتے ہیں

اپنے حج کے تذکرے کرتے ہیں تاکہ لوگ ان کو حاجی سمجھیں لوگوں سے فخراً کہتے ہیں کہ میں نے سفر حج میں اتنا روپیہ خرچ کیا مکہ میں اتنا دیا۔ مدینہ میں اتنا خیرات کیا۔ یقول اھلکت مالاً لبداً حق تعالیٰ کفار کی مذمت میں فرماتے ہیں کہ کافر خرچ کر کے گاتا پھرا کرتا ہے کہ میں نے مال کے ڈھیر خرچ کر دیئے یہ وہ معاصی ہیں کہ خشک مولوی بھی یہاں تک نہیں پہنچتے۔ حج میں افتخار اور اشتہار اور تعظیم و تکریم کی خواہش نہ ہونی چاہیے اس میں تواضع و مسکنت ذلت و خواری ہونی چاہیے۔

سفر حج سفر آخرت ہے

یہ سفر سفر آخرت کے مشابہ ہے کہ اپنے گھر بار زمین جائیداد وغیرہ کو چھوڑ کر اقربا سے رخصت ہو کر جاتا ہے اور تھوڑا سا سامان ساتھ لیتا ہے جیسا کہ مردہ سب سامان چھوڑ کر صرف کفن ساتھ لے جاتا ہے بلکہ بعض حاجی بھی اس خیال سے کہ موت ہر اک کے ساتھ ہے نہ معلوم کس وقت موت آ جائے کفن بھی اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور عوام تو اس کو بہت ہی ضروری سمجھتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ کفن ساتھ لے کر بھی وہ کام نہیں کرتے جو کفن پہننے والے کو کرنے چاہئیں۔ جب کفن ساتھ لیا تھا تو چاہیے تھا کہ اپنے آپ کو اسی وقت سے مردہ تصور کرتے اور ساری شیخی اور تکبر کو یہیں چھوڑ جاتے اور پہلے سے زیادہ اعمال آخرت کے لئے کوشش کرتے مگر کچھ نہیں یہ کفن ساتھ لینے کی بھی ایک رسم ہو گئی ہے ورنہ بعض لوگ سفر حج میں پہلے سے گناہ کرنے لگتے ہیں نماز چھوڑ دیتے ہیں جماعت کا اہتمام تو اچھے اچھے بھی نہیں کرتے اور لڑائی جھگڑا کرتے ہیں اور حج کر کے اپنے کو سب سے افضل سمجھنے لگتے ہیں کیا سفر آخرت کی بھی یہی شان ہونی چاہیے۔

سفر حج اس اعتبار سے بھی قبر کے مشابہ ہے کہ جس طرح قبروں میں کبھی دو آدمی پاس پاس دفن ہوتے ہیں مگر ہر اک کا جدا حال ہوتا ہے کوئی راحت میں ہے کوئی عذاب میں اور ایک کو دوسرے کے حال کی خبر نہیں ہوتی۔ اس طرح حج میں ایک شگفتہ ہے ایک دیگر ہے اور ہر ایک کو اپنی اپنی فکر ہوتی ہے دوسرے کی فکر کسی کو نہیں ہوتی الا ماشاء اللہ اور جو شخص اس سفر میں دوسروں کی خدمت کرے وہ تو گویا مجاہد فی سبیل اللہ ہے۔

سفر نامہ حج کا لکھنا

بعض لوگ ایسے بیہودہ ہوتے ہیں کہ حج میں روزانہ کے واقعات قلمبند کرتے ہیں وہاں بھی ان کو مضمون نگاری سوجھتی ہے اگر اس خیال سے کوئی شخص حالات قلمبند کرے کہ دوسروں کو سفر حج آسان ہو جائے گا اس کا مضائقہ نہیں مگر بعض لوگوں کو محض اخبار نویسی اور مضمون نگاری کا شوق ہوتا ہے ہمارے ساتھ ایک ڈپٹی کلکٹر تھے وہ ہندوستان کے اخباروں میں لکھ لکھ کر وہاں کے حالات بھیجتے تھے۔ اور سفر کی تکلیف کو بہت مبالغہ سے لکھتے تھے تاکہ پھر کوئی حج کا نام ہی نہ لے۔

اسی طرح ایک اور صاحب تھے وہ بھی وہاں کی شکایت جمع کیا کرتے تھے۔ ایک دن وہ میرے پاس ایک محضر لکھ کر لائے جس میں وہاں کی تکالیف کو قلمبند کیا تھا کہ اس پر دستخط کر دو۔ میں نے کہا کہ حضرت تصدیق وہ کرے جس کو ان تکالیف کی اطلاع ہو مجھ کو تو کوئی تکلیف ہی پیش نہیں آئی۔ پھر کاہے کی تصدیق کروں، بس وہ خفا ہو گئے اور کہنے لگے کہ بس ہندوستانیوں میں اتفاق نہیں۔

اہل شوق کا حال

سو اگر پہلے ہی سے یہ سمجھ لیا جائے کہ۔ یہ سفر آخرت کا سفر ہے پھر کوئی بھی کلفت معلوم نہ ہو مگر آج کل تو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ جیسے گھر میں آرام کے ساتھ بسر کرتے ہیں ویسے ہی حج کے سفر میں رہیں۔ حالانکہ سفر میں گونہ مشقت اور تکلیف کا ہونا ضروری ہے دل میں اگر شوق اور محبت ہو تو پھر کوئی بھی تکلیف تکلیف نہیں رہتی اور جہاں بیت اللہ پر ایک نظر پڑی اسی وقت سب کلفت رفع ہو جاتی ہے اس وقت یاد بھی نہیں آتا کہ اس سے پہلے کیا کیا پیش آیا تھا۔ بس وہ حال ہوتا ہے جو جنت میں پہنچ کر جنتیوں کا ہوگا۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْٓ اَذْهَبَ عَنَّا الْحَزَنَ ؕ اِنَّ رَبَّنَا لَغَفُوْرٌ شَكُوْرُۙ الَّذِیْٓ اَحَلَّنَا دَارَ الْمُقَامَةِ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا نَصَبٌ وَّ لَا یَمَسُّنَا فِیْهَا لُغُوْبٌ جنتی جنت میں پہنچ کر کہیں گے کہ خدا تعالیٰ کا شکر ہے جس نے ہم سے رنج و غم کو دور کر دیا۔ بیشک ہمارا خدا بڑے بخشنے والا قدردان ہے جس نے ہم کو ٹھکانے کے گھر میں پہنچا دیا اپنے فضل سے جس میں نہ ہم کو کوئی مشقت معلوم ہوتی ہے نہ کچھ تھکن محسوس ہوتی ہے۔ یہی حال بیت اللہ کو دیکھ کر اہل شوق کا ہوتا ہے۔

حج میں خود بینی و خود رائی

بعض لوگ سفر حج میں پریشان ہو جاتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ وہ شوق سے خالی ہیں اور وہ اس کو سفر آخرت نہیں سمجھتے۔ نیز جو شخص اس کو سفر آخرت سمجھتا ہوگا اس میں دعویٰ اور افتخار بھی نہ ہوگا

فکر خود و رائے خود در مذہب رندے نیست　　　کفر ست دریں مذہب خود بینی و خود رائی

(اپنی رائے اور اپنی فکر محبت کے راستہ میں نہیں ہے مذہب عشق میں خود رائی اور خود بینی کفر ہے)

کلفت کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اپنے کو بہت کچھ سمجھتے ہیں۔ اسی لئے جب سفر میں کوئی بات اپنی شان کے خلاف پیش آتی ہے تو اس سے ناگواری پیدا ہوتی ہے پھر اسی سے دوسرے جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں اگر ہر شخص اپنے آپ کو مٹا دے اور عزت و آبرو کو بالائے طاق رکھ کر اپنے کو سب کا خادم سمجھے تو یہ باتیں پیش ہی نہ آئیں۔ مگر یہاں تو حالت یہ ہے کہ گھر سے چلتے ہیں یہی خیال کر کے کہ

ہماری یوں آؤ بھگت ہوگی ہم جب لوٹیں گے لوگ ہم کو حج کی مبارکباد دینے آئیں گے اور جو مبارکباد دینے نہ آئے اس کی شکایت کی جاتی ہے کہ ہم حج کر کے آئے تھے ہم کو مبارکباد بھی نہ دی انا للہ

حج نہ کرنے پر وعید

ارے بھائی! تم نے حج کیا تھا تو کیا کمال کیا۔ تمہارے ذمہ فرض تھا اگر ادا نہ کرتے تو جہنم میں جھونکے جاتے اور نہ معلوم خاتمہ کس حال پر ہوتا کیونکہ حدیث میں آیا ہے کہ جس شخص پر حج فرض ہوا اور وہ پھر بھی حج نہ کرے تو خدا کو پروا نہیں چاہے وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔ تو اگر تم حج نہ کرتے ان بلاؤں میں گرفتار ہوتے۔ پھر کسی پر کیا احسان کیا جو دوسروں سے مبارکباد ملنے کے منتظر ہو۔

یاد رکھو اس اشتہار اور افتخار سے سب کی کرائی محنت اکارت ہو جاتی ہے یہ وہ معاصی تھے جو زمانہ حج سے پہلے ہوتے ہیں اور زمانہ حج کے قبل سے مراد وہ وقت ہے جو احرام باندھنے سے پہلے ہو۔

محظورات احرام

باقی حج کے زمانہ میں جو گناہ ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ محظورات احرام کا ارتکاب کیا جائے یعنی جو باتیں حج میں ممنوع ہیں ان کو کیا جائے۔ مثلاً حج میں مردوں کو سر ڈھانکنا حرام ہے عورتوں کو چہرہ پر کپڑا ڈالنا ناجائز ہے۔ احرام الرجل فی راسه و احرام المرءة فی وجهها مگر اس سے یہ استنباط نہیں ہو سکتا کہ پردہ عورتوں کو نہ کرنا چاہیے بلکہ اس سے تو اور پردہ کے تاکد پر استدلال ہوتا ہے کہ عورت کو ساری عمر چہرہ کا ڈھانکنا ضروری ہے صرف حج میں اس کو منہ کھولنا چاہیے۔ اگر یہ حج کی خصوصیت نہ ہوتی تو احرام المرءة فی وجهها کے معنی کچھ نہیں ہونگے۔ اگر عورت کو ساری عمر چہرہ کا کھولنا جائز ہوتا تو اس کے کیا معنی کہ عورت کا احرام چہرہ میں ہے اسی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ عورت کے لئے چہرہ بہت قابل اہتمام ہے جیسا کہ مردوں کو سر ڈھانکنے کا اہتمام ہوتا ہے سو احرام میں ان دونوں کے خلاف حکم دیا گیا کہ مرد سر کھلا رکھیں اور عورتیں چہرہ کھلا رکھیں۔ مگر مطلب اس کا یہ ہے کہ کپڑا چہرہ سے لگے نہیں یہ نہیں کہ اجنبی مردوں کو چہرہ دکھلاتی پھریں پس عورتیں اپنے چہرہ پر اس طرح کپڑا لٹکائیں کہ چہرہ سے علیحدہ رہے چنانچہ اس کے لئے ایک پنکھا ایجاد ہوا ہے جس سے چہرہ پر کپڑا نہیں لگتا۔ اس کے علاوہ اور بھی محظورات احرام بہت ہیں جن کو فقہاء نے مناسک میں بیان کیا ہے اور قافلہ میں جو لوگ اہل علم ہیں ان سے وقت پر سب باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ ان سے پوچھتے رہنا چاہیے پس یہ گناہ حج کے ساتھ ہوتا ہے کہ احرام میں جو چیزیں ممنوع ہیں ان سے پرہیز نہ کیا جاوے۔

حج کے بعد ریاء

ایک معصیت حج کے بعد یہ ہوتی ہے کہ بعض لوگ ریا کرتے ہیں ریاء سے اکثر طاعات کے انوار زائل ہو جاتے ہیں ثواب جاتا رہتا ہے اس سے بہت احتیاط چاہیے۔ اور مستورات خصوصاً بہت ریاء کرتی ہیں کیونکہ ان کو ساری عمر میں ایک بار حج کے لئے گھر سے نکلنا ہوتا ہے اس کو وہ بہت ہی بڑا کارنامہ سمجھتی ہیں اور حج کے بعد اگر کوئی ان کو حجن نہ کہے اس پر خفا ہوتی ہیں اور وہاں سے آ کر سب کے سامنے گاتی ہیں کہ ہم نے سارے مقامات کی زیارت کی ہے اگر کسی غریب نے ایک جگہ کی زیارت نہیں کی ہے تو اس سے کہتی ہیں کہ تیرا حج ہی کیا ہوا تو جبل نور پر تو گئی ہی نہیں۔ حالانکہ اصل مقصود عرفات اور بیت اللہ ہے پھر بیت الرسول۔ مگر ان کی زیارت تو ہر شخص کرتا ہے اس لئے ان کو کوئی فضیلت میں بیان نہیں کرتا۔ ہاں جبل نور، غار ثور، اور امیر حمزہ کا مزار سب گناتی ہیں۔

اور بعض لوگ صراحۃً اپنے حاجی ہونے کا اگر ذکر نہیں کرتے تو کسی نہ کسی پیرایہ سے مخاطب کو جتلا دیتے ہیں کہ ہم حاجی ہیں۔ ایک بزرگ کسی کے یہاں مہمان ہوئے تو میزبان نے خادم سے کہا کہ اس صراحی کا پانی لانا جو ہم دوسرے حج میں ساتھ لائے تھے۔ مہمان نے کہا کہ حضرت آپ نے ایک بات میں دونوں حج کا ثواب کھو دیا۔ اس بات میں اس نے جتلا دیا کہ میں نے دو مرتبہ حج کیا ہے یہ ریاء نہیں تو اور کیا ہے؟

ریاء کے طریقے بہت دقیق ہیں اگر کوئی شخص اپنے نفس کی نگہداشت کرے تو اس کو نفس کے دقائق معلوم ہو سکتے ہیں لوگ ان کو معمولی بات سمجھتے ہیں اکثر لوگوں کو شوق ہوتا ہے کہ حج کے بعد ہر مجلس میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں حالانکہ مسلمان کا مذہب تو یہ ہونا چاہیے۔

ماقصۂ سکندر و دارا نہ خواندہ ایم   از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

(ہم نے سکندر اور دارا کا قصہ نہیں پڑھا ہے ہم سے حق تعالیٰ کی محبت اور اطاعت کے سوا اور کوئی بات نہ پوچھو)

نادار کو ترغیب حج جائز نہیں

ان قصوں کے لئے اسی کو فرصت ملتی ہے جس کا دل محبت الٰہی سے خالی ہوتا ہے اور جو تذکرہ نمائش و ریاء کے لئے ہو وہ تو روکنے کے قابل ہے۔ محققین تو بعض اوقات ایسے تذکرہ کی بھی اجازت نہیں دیتے جو ظاہراً اطاعت معلوم ہوتا ہے مثلاً وہاں کے فضائل و محاسن بیان کرنا جس سے وہاں جانے کی رغبت اور شوق ہو چنانچہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ہر شخص کے سامنے حج کی باتیں کرنا جائز نہیں کیونکہ تین قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جن پر حج فرض ہے۔ سو ایسے شخص کے سامنے تو ترغیبی مضامین بیان کرنا جائز بلکہ مستحب

ہے کہ دلالت علی الخیر ہے۔ دوسرے وہ جن پر نہ فرض اور نہ ممنوع ان کے روبرو بھی بیان کرنا جائز ہے تیسرے وہ جن پر حج فرض نہیں ہے اور ان کو جانا جائز بھی نہیں اس وجہ سے کہ نہ مالی استطاعت ہے اور نہ مشقت پر صبر و تحمل ہو سکے گا۔ ان کے سامنے تشویق اور ترغیب کے قصے اور مضامین بیان کرنا جائز نہیں کیونکہ اس سے ان کو حج کا شوق پیدا ہوگا اور سامان ہے نہیں نہ ظاہری نہ باطنی تو خواہ مخواہ دقت اور پریشانی میں مبتلا ہوں گے جس سے ناجائز امور کا ارتکاب کا بھی اندیشہ ہے اس لئے ایسے لوگوں کے سامنے حج کی ترغیب اور تشویق کے مضامین بیان کرنا جائز نہیں یہ وہ مسائل ہیں جن پر لوگوں نے امام غزالی کی تکفیر پر فتوے دیئے۔

ظاہر میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حج کی ترغیب سے لوگوں کو منع کرتے ہیں مگر حاشا وکلا ان لوگوں نے امام کے قول کا مطلب ہی نہیں سمجھا وہ حج کی ترغیب سے منع نہیں کرتے۔ بلکہ لوگوں کو ناجائز امور میں مبتلا کرنے سے منع کرتے ہیں کیونکہ نادار غیر صابر لوگوں کو ترغیب دینے کا یہی انجام ہوگا۔

تکالیف حج کا تذکرہ

ایک کوتاہی بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ حج سے آ کر وہاں کی تکالیف کا حال بیان کرتے ہیں۔ ایسی باتیں نہ کرنی چاہئیں چاہے وہ واقعی کلفتیں ہوں اور اگر واقعی کلفتوں میں اضافہ کر کے بیان کیا جائے تو یہ اس سے بھی بدتر ہے وہاں کی کلفتیں بیان کرنے کا یہ انجام ہوتا ہے کہ بہت لوگ حج سے رک جاتے ہیں اس کا سارا وبال ان لوگوں پر ہوتا ہے۔ جنہوں نے ان کو ڈرایا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ وہاں ایسی تکالیف نہیں ہیں جن کا یقینی اثر ہلاکت ہو بلکہ جیسی کلفتیں یہاں گاڑی اور بہلی کے سفر میں پیش آتی ہیں ویسی ہی وہاں اونٹوں کے سفر میں پیش آتی ہیں اگر آدمی احتیاط سے کام لے اور قافلہ سے علیحدہ نہ ہو تو ذرا بھی اندیشہ نہیں اور یوں کوئی خود ہی اپنی بے احتیاطی سے ہلاک ہونا چاہے تو اس کا یہاں بھی کوئی انتظام نہیں ہو سکتا۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ اونٹوں کا سفر ایسا پر لطف ہوتا ہے کہ اس کے سامنے یہاں کے سفر کچھ بھی نہیں پھر اگر کچھ کلفت پیش بھی آئے گی تو اس میں ثواب کس قدر ہے۔ جب یہاں دنیا کے واسطے سفر کی تکالیف برداشت کی جاتی ہیں تو خدا اور رسول کی رضا کے لئے اگر ذرا سی کلفت پیش بھی آ جائے تو کیا مضائقہ ہے۔

اور اگر کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اس سفر میں ہلاکت کا خطرہ زیادہ ہے تو یہ بالکل غلط اور مشاہدہ کے خلاف ہے کیونکہ ہزار ہا آدمی حج کو جاتے ہیں اور قریب قریب سب ہی سلامت واپس آتے ہیں اور یوں بیس پچیس ہزار میں اگر بیس پچیس مر بھی گئے تو اتنے تو یہاں بھی ہر سال مرتے ہیں مردم شماری دیکھ لی جائے کہ پچیس ہزار آدمیوں میں سے یہاں رہ کر کتنے مرتے ہیں اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ سفر حج میں جو لوگ

مرتے ہیں ان کی تعداد معمول سے زیادہ نہیں ہوتی۔ پھر خواہ مخواہ لوگوں کو وہاں کی تکالیف بیان کر کے ڈرانا اور مناع خیر بننا یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ (اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں) میں داخل ہے یا نہیں؟

البتہ اگر کوئی عاقل حکیم شخص وہاں کی تکالیف کا تذکرہ حکمت سے کرے اس کو اس کی اجازت ہے کیونکہ اس کے بیان سے لوگ حج سے نہیں رکیں گے اس کا بیان کرنا اس غرض سے ہوگا کہ ان تکالیف کا اس طرح انتظام کرنا چاہیے باقی غیر حکیم کے بیان سے لوگ رک جائیں گے۔ ہم نے دیکھا ہے ایسے بے وقوفوں کی وجہ سے بعض لوگ ایسے ڈرے ہوئے تھے کہ گویا ان کو یہ سمجھا دیا گیا تھا کہ تم یقیناً مر ہی جاؤ گے۔ افسوس

قبولیت حج کی علامات

یاد رکھئے! کہ حج کے مقبول ہونے کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ دوبارہ پھر وہاں جانے کا شوق دل میں پیدا ہو اور جو شخص وہاں سے آ کر پھر دوبارہ جانے سے توبہ کر لے اندیشہ ہے کہ اس کا حج مقبول نہ ہوا ہو۔ اس لئے جہاں تک ہو سکے اس کی کوشش کرے کہ دل میں پھر دوبارہ حج کا شوق پیدا ہو اس کی یہی تدبیر ہے کہ وہاں کے ثواب اور منافع اخروی پر نظر کرے اور یہ سمجھ لے کہ جنت میں جو درجات حج کی وجہ سے نصیب ہوں گے ان کے سامنے یہ تکالیف کیا ہیں ان جیسی ہزار بھی کلفتیں ہوں تو کچھ نہیں۔

اور حج میں علاوہ ثواب آخرت کے دنیا کا بھی تو نفع ہے چنانچہ مشاہدہ ہے کہ حج کے بعد ضرور رزق میں فراخی ہو جاتی ہے پھر وسعت اور فراخی رزق کے لئے لوگ کیسی کیسی مشقتیں برداشت کرتے ہیں اگر ذرا سی وہاں بھی تکلیف پیش آ گئی تو اس کی وجہ سے پریشان ہونا اور دوسروں کو پریشان کرنا اور حج کی دولت سے محروم کرنا یہ کون سی عقل کی بات ہے۔

نیز حج سے اخلاق کی تہذیب پر خاص اثر پڑتا ہے اور اگر کوئی حاجی اس کے خلاف پایا جاوے تو وہ ایک عارض کے سبب سے ہے وہ یہ کہ علماء محققین نے لکھا ہے کہ حجر اسود میں کسوٹی کی خاصیت ہے یعنی اس میں یہ خاصیت ہے کہ اس کے استلام کے بعد جیسا شخص ہوتا ہے وہ اپنی اصل خلقت میں ظاہر ہو جاتا ہے بعض لوگ حج سے پہلے ظاہر نہیں ہوتے کہ یہ اندر سے کیسے ہیں مگر حج کے بعد چھپا رہنا مشکل ہے

---

[1] احقر جامع وعظ کرتا ہے کہ اس سال افسوس ہے کہ ہندوستان میں خلافت کمیٹی کے ممبروں نے قربانی گاؤ کی طرح حج سے بھی بہت لوگوں کو روکا۔ گویا یہ لوگ حج کے بند کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ لوگ بالکل یَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کے مصداق ہیں حالانکہ حج ایک بہت بڑا شعار اسلامی ہے اس مبارک بقعہ میں ہر سال حاجیوں کا جانا فرض کفایہ ہے کسی سال میں اگر حج بالکل نہ ہو تو تمام عالم کے مسلمان گنہگار ہوں گے۔ اتنے بڑے شعار اسلامی سے روکنا اور اس کے بند کرنے میں سعی کرنا یہ کون سی حمایت اسلام ہے۔ جس شخص پر حج فرض ہو اور وہ بلا حج کئے مر جائے اس پر سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے تو جن لوگوں کو خلافت کمیٹی کے ممبروں نے حج سے روکا ہے اگر ان کا خاتمہ برا ہو تو سارا وبال ان روکنے والوں کی گردن پر ہوگا۔ اور ایک فریضہ اسلام اور شعار الٰہی سے روکنے کی وجہ سے خود ان لوگوں پر بھی سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے اس سے توبہ کریں۔ ۱۲ ظفر احمد

اصلی حالت ضرور کھل جاتی ہے پس جس کی حالت حج کے بعد پہلے سے اچھی ہو جائے سمجھنا چاہیے کہ اس کا حج قبول ہوا۔ اور جس کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو جائے اس کے حج قبول نہ ہونے کا اندیشہ ہے۔

شاید اس سے بعض لوگ یہ خیال کریں کہ پھر حج نہ کرنا چاہیے تاکہ قلعی نہ کھلے اس کا جواب یہ ہے کہ حج نہ کرنے میں اس سے زیادہ اندیشہ ہے جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ حدیث میں وارد ہے کہ جس شخص پر حج فرض ہوا اور وہ پھر بھی نہ کرے تو خدا کو پرواہ نہیں ہے خواہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر۔ پس اگر حج نہ کیا تب تو سوء خاتمہ کا اندیشہ زیادہ ہے اور حج کرنے میں تو صرف یہی اندیشہ ہے کہ قلعی کھل جائے گی وہ بھی اس وقت جبکہ اس کے آداب وشرائط کا لحاظ نہ کیا جائے۔ ورنہ اکثر یہی ہوتا ہے کہ شوق اور محبت کے ساتھ جو حج ادا کیا جاتا ہے اس سے دینداری میں ترقی ہی ہو جاتی ہے پس یہ اشکال فضول ہے۔

حج ضرور کرنا چاہیے۔ مگر اس کے ساتھ ہی اس کے آداب وشرائط کا پورا لحاظ کرنا چاہیے اور جو شخص حج میں احتیاط نہیں کرتا اس کی ایسی مثال ہے جیسے بیمار بدپرہیزی کرتا ہے اور جو احتیاط کے ساتھ حج کرتا ہے اس کی ایسی مثال جیسے کسی بیمار کو تنقیہ وازالہ کی ضرورت ہے اور وہ پوری تدبیر پر عمل کرتا ہے اور پورا پرہیز کرتا ہے اور اسی سے سب مواد رذیلہ کا تنقیہ ہو جاتا ہے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ حج کے بعد پھر علاج کی اور تدبیر کی ضرورت نہیں رہتی کیونکہ جس طرح مسہل کے بعد ہی تو آئندہ مواد خبیثہ کا پیدا نہ ہونے دینے کی اور جو تھوڑا بہت پیدا ہو جاوے اس کے تنقیہ کی ضرورت رہتی ہے۔

حج سے اصلاح نفس

اسی طرح یہاں سمجھئے کہ حج کے بعد بھی ہمیشہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ مگر حج میں احتیاط ہونا اسی وقت ممکن ہے جب حج سے پہلے نفس کی اصلاح کر لی جائے۔ ورنہ بالخصوص جھگڑے اور فساد کی تو ضروری نوبت آ جائے گی۔ نیز نماز وغیرہ میں بھی ممکن ہے کہ سفر کی وجہ سے سستی ہو جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ سفر کی تکالیف کی وجہ سے شوق اور محبت میں کمی ہو جائے اس لئے اس کی ضرورت ہے کہ حج سے پہلے اصلاح نفس کا اہتمام کیا جائے۔ مگر یہ سمجھ لو کہ نفس کی اصلاح خود اپنے آپ نہیں ہو سکتی اپنی عقل اور فہم اس کے لئے کافی نہیں ہو سکتی کسی مربی کامل سے اس کا طریقہ پوچھو

؎ کشتن ایں کار عقل و ہوش نیست شیر باطن سخرۂ خرگوش نیست

(نفس کو مغلوب کرنا عقل وہوش کا کام نہیں کوئی خرگوش کسی تیتر کا شکار کب کر سکتا ہے)

کسی کو اپنی عقل پر گھمنڈ نہ کرنا چاہیے اس میں ضرورت ہے عنایت حق وعنایات خاصاں حق کی

؎ بے عنایات حق و خاصان حق گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

(بے عنایت حق اور خاصان حق اگر فرشتہ بھی ہو جاؤ تو نامہ اعمال سیاہ ہی رہے گا)

طریق اصلاح میں اس کے بغیر کامیابی نہیں ہوسکتی اپنے آپ کو خاصان حق کے سپرد
جب جان دینے تک پر بندگان خدا راضی ہیں تو ان مجنونانہ حرکت سے ان کو کیا ننگ ہوگا۔ وہ تو فخر سمجھیں گے بہرحال یہ مثال اس کی تھی کہ عبادت کا شرف کبھی بانی کے شرف سے بھی ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ پانچ چیزیں فضائل مختصہ کے اسباب ہوتے ہیں۔ حقیقت، زمان، مکان، غائت، بانی یہ تو قاعدہ عامہ تھا۔ اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ مجھے قربانی کے اندر پانچوں وجہ سے فضیلت ثابت کرنا منظور ہے تو جاننا چاہیے کہ کوئی عبادت بجز قربانی کے ایسی کم ہوگی کہ اس میں پانچوں وجہ فضیلت کی موجود ہوں غالباً قربانی ہی ایک ایسی عبادت ہے جس میں یہ پانچوں وجہ فضیلت کی مجتمع ہیں۔

فضیلت باعتبار حقیقت

اول حقیقت کے اعتبار سے سنیے کہ اس کی دو حقیقتیں ہیں ایک حقیقت جنسیہ اور دوسری حقیقت نوعیہ۔ حقیقت جنسیہ میں جنس سے مراد جنس قریب ہے جنس بعید مراد نہیں ہے۔ تو حقیقت جنسیہ اس کی انفاق مال ہے اور حقیقت نوعیہ اراقۃ الدم ہے۔ قربانی کو دونوں اعتبار سے فضیلت ہے۔ انفاق مال کے حیثیت سے تو اس لئے کہ اول سمجھنا چاہیے کہ بڑی چیز اور اصل مدار فضیلت اور کمال کا حق تعالیٰ کی محبت ہے اور سب احکام اس کے لئے ہیں پس نفس کے انقلابات میں جو غور کیا جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عبادت بدنی اتنی دلیل محبت کی نہیں جس قدر کہ عبادت مالی ہے دنیا میں بھی اس کے نظائر موجود ہیں۔ ٹٹول کر دیکھئے کہ اگر کوئی بہت قیمتی شے اور پیاری شے آپ کے پاس ہو تو ہر محبوب کو دینا اس کا آپ پسند نہ کریں گے۔ بلکہ جس سے بے انتہا محبت ہوگی اس کو آپ دیں گے۔ مثلاً آپ کے پاس ایک گھوڑا ہے جس کے پانچ سو روپیہ قیمت ہے ایک دوست نے اس کو مانگا عذر کر دیا اور دوسرے نے مانگا فوراً بخوشی پیش کر دیا تو وجہ اس کی صرف یہ ہوئی کہ اس سے زائد محبت تھی۔ پس مال وہاں ہی خرچ کیا جاتا ہے جہاں محبت ہو بخلاف جانی خدمت کے کہ ہر کسی کی کر دی جاتی ہے مثلاً کوئی کہے کہ پانی پلا دو خواہ اس سے محبت ہو یا نہ ہو تو فوراً پلاؤ گے۔ غرض جانی خدمت اس قدر علامت محبت کی نہیں جس قدر مالی ہے اسی کو کسی شاعر نے کہا ہے

گر جاں طلبی مضائقہ نیست   در زر طلبی سخن دریں است

(اگر تو جان مانگتا ہے تو کوئی حرج نہیں ہے مصیبت تو یہ ہے کہ تو پیسہ مانگتا ہے)

ایک حکایت مشہور ہے کہ ایک بخیل کا کوئی دوست تھا اس نے اس سے انگوٹھی مانگی کہ تمہاری نشانی رہے گی۔ جس سے تم یاد آ جایا کرو گے تو بخیل نے کہا کہ جب تم انگلی خالی دیکھو گے تو یاد کر لیا کیجیو کہ کسی دوست سے انگوٹھی مانگی تھی اس نے نہیں دی۔ یہ بھی ایک صورت یاد کرنے کی ہے۔ جیسے شہرت کی صورت کبھی نیک نامی ہوتی ہے۔ کبھی بدنامی
کسی بددین مسخرہ کی حکایت ہے کہ اس نے اپنی شہرت کی صورت یہ تجویز کی تھی کہ کمبخت نے بیت اللہ شریف جا کر زمزم شریف میں موت دیا۔ اب جہاں جاتا ہے انگلیاں اٹھتی ہیں کہ یہ وہ شخص ہے جس نے

زمزم میں ہوتا ہے۔بدوں کامل محبت کے مال سے دریغ ہونے کی ایک اور حکایت یاد آئی۔

ایک بخیل روٹی شہد سے کھا رہا تھا ایک دوست آ گیا روٹی فوراً جا کر چھپادی۔اور شہد اس لئے چھوڑ دیا کہ خالی شہد کون کھاویگا۔اس کے بعد ان دوست کو بلایا پوچھا کہ شہد حاضر ہے اس نے بے دریغ کھانا شروع کر دیا جب بخیل نے دیکھا کہ یہ سب ہی کھا جائے گا تو کہا واللہ یا اخی انه یحرق القلب یعنی واللہ! اے میرے بھائی یہ شہد دل کو جلاتا ہے۔دوست نے کہا صدقت ولکن قلبک یعنی تم نے سچ کہا لیکن تیرے قلب کو جلاتا ہے۔ایک اور بخیل تھا وہ انجیر کھا رہا تھا ایک اعرابی آ گیا اس نے وہ انجیر کمبل کے نیچے چھپادیئے۔اور چاہا کہ اس کو کسی طرح ٹالوں یا کسی اور شغل میں لگاؤں پوچھا ھل تحفظ شیئا من القران یعنی تم کو کچھ قرآن یاد ہے اس نے کہا ہاں اور اعوذ بسم اللہ پڑھ کر شروع کیا وَالزَّيْتُونِ وَطُورِ سِينِينَ الخ بخیل نے کہا ہا ئیں این التین یعنی والتین کہاں گیا قال ھو تحت کساء ک یعنی وہ تیرے کمبل کے نیچے ہیں۔اسی طرح بہت حکایات مشہور ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کو مال کا خرچ کرنا بہت گراں ہے۔اسی طرح خدا تعالیٰ کے دوست کہلانے اختیار کرنا چاہیے اس لئے گھبرا گئے تو پھر یہ حکم نازل ہوا فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ کہ جتنا مرتبہ تقویٰ کا اس وقت ہو سکے اتنا اس وقت اختیار کر لو۔اس میں کوتاہی نہ کرو پھر بتدریج دوسرے مراتب میں بقدر استطاعت ترقی کرتے رہو۔

پس یہ آیت پہلے حکم کے لئے محققین کے نزدیک ناسخ نہیں۔بلکہ اس کا بیان ہے یعنی مطلوب تو وہی ہے کہ کامل تقویٰ اختیار کرو مگر اس کا طریقہ یہ ہے کہ اول اول جتنا ہو سکے اس کو پورا کرو اس میں کوتاہی نہ کرو۔پھر آہستہ آہستہ ترقی ہوتی جائے گی اور ایک دن ایسا بھی ہوگا کہ تم کامل متقی بن جاؤ گے۔اور یہ بتدریج اعمال تقویٰ کے اعتبار سے نہیں وہ تو ایک دم سے واجب العمل ہیں بلکہ ضعف وقوت مراتب کے اعتبار سے ہے۔اب اس اشکال کا جواب ہو گیا یعنی اس وقت سے ان ملکات رذیلہ کے ازالہ کی فکر شروع کردو۔بے فکری میں مت رہو۔اس وقت اگر آپ کے قبضہ میں یہ بات نہیں ہے کہ ملکات رذیلہ کو بالکل زائل کردیں تو یہ بات تو اختیار میں ہے کہ اس کے مقتضاء پر عمل نہ کرو۔جب بار بار نفس کے تقاضوں کے خلاف عمل کیا جائے گا تو اس کی عادت پڑ جائے گی اور ضبط کی عادت سے ملکات رذیلہ کی قوت مضمحل ہو جائے گی اور اضمحلال سے پھر ان میں اتنی کمزوری ہو جائے گی کہ گویا وہ ملکات ہیں ہی نہیں اس طرح سے آپ ان شاء اللہ کامل ہو جائیں گے اور اخلاق رذیلہ کی بجائے آپ میں ملکات فاضلہ پیدا ہوں گے۔

لہٰذا حج کے سفر میں فکر اور سعی ضرور شروع کردیجئے۔جب آپ نے اس نیت سے فکر شروع کردی تو آپ بھی انہی لوگوں میں شمار ہوں گے جو کامل متقی ہیں کیونکہ اہل کمال بھی اسی طرح اہل کمال بنے ہیں۔ایک دن میں کوئی کامل نہیں ہو گیا۔

حج مردانہ

دوسرے یہ کہ کمال کسی کے اختیار میں بھی نہیں ہے اور نہ انسان اس کا مکلف ہے انسان کا کام طلب اور فکر اور سعی ہے اگر طلب کے ساتھ ساری عمر بھی ناقص رہے تو وہ ان شاء اللہ کاملین ہی کے برابر ہوگا۔بلکہ

ممکن ہے کہ بعض باتوں میں کاملین سے بھی بڑھ جائے یعنی مشقت کے ثواب میں کیونکہ کاملین کو نفس کی مخالفت گراں نہیں ہوتی اور مبتدی کو زیادہ مشقت پیش آتی ہے تو مشقت کا ثواب اس کو زیادہ ہوتا ہے۔

دلیل اس کی یہ حدیث ہے والذی یتعتع فیه و هو علیه شاق له اجران حضورؐ فرماتے ہیں کہ جو شخص ماہر قرآن ہے وہ کراماً کاتبین کے ساتھ ہوگا اور جو شخص اٹک اٹک کر قرآن پڑھتا ہے اور وہ اس پر شاق ہوتا ہے اس کے لئے دوہرا ثواب ہے پس اس مشقت کے ثواب میں ناقص کامل سے بھی بڑھ جاتا ہے اگر چہ دوسرے فضائل میں کامل بڑھا ہوا ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم ادھمؒ کو کسی نے خواب میں دیکھا پوچھا کیا حال گزرا فرمایا کہ مغفرت ہوگئی۔ درجات ملے مگر ہمارا ایک پڑوسی تھا جو ہم سے کم عمل کرتا وہ ہم سے بڑھا ہوا رہا کیونکہ وہ صاحب عیال تھا۔ بال بچوں کی پرورش میں اس کو زیادہ اعمال کا موقعہ نہ ملتا تھا۔ مگر وہ ہمیشہ اسی دھن میں رہتا تھا کہ اگر مجھے فراغت نصیب ہو تو خدا کی یاد میں مشغول رہوں۔ وہ اپنی مشقت اور نیت کی وجہ سے ہم سے بڑھ گیا۔ بس اس طریق میں فکر اور دھن بڑی چیز ہے اسی سے سب کام بن جاتے ہیں۔

اندریں رہ می تراش و می خراش تادم آخر دمے فارغ مباش

(اس راہ میں تراش وخراش یعنی اصلاح کی فکر میں لگے رہو آخری سانس تک اصلاح سے فارغ نہ ہو)

میرے ایک دوست نے ایک منظوم خط لکھا جس میں اس کی شکایت تھی کہ میں کام شروع کرتا ہوں پھر چھوٹ جاتا ہے۔ پھر از سر نو جوڑتا ہوں پھر نظام ٹوٹ پھوٹ جاتا ہے۔ غرض ایک طویل نظم میں اپنی پریشانی لکھی تھی اور وہ نظم مثنوی کی بحر میں تھی۔ میرا جی چاہا کہ ان کو نظم ہی میں اور اسی وزن میں جواب دوں اس وقت یہ شعر ذہن میں آیا

دوست دارد دوست ایں آشفتگی کوشش بے ہودہ بہ از خفتگی

(حق تعالیٰ اصلاح کے لئے فکر اور عاجزی اور تمہاری پریشان حالی کو محبوب رکھتے ہیں اس لئے جس طرح بھی ہو سکے کوشش کئے جاؤ ناکام کوشش بھی بالکل سو رہنے سے بہتر ہے)

اور یہی حاصل ہے ان اشعار کا

اندریں رہ می تراش و می خراش تادم آخر دمے فارغ مباش

تادم آخر دمے آخر بود کہ عنایت باتو صاحب سر بود

(اس راہ میں تراش وخراش یعنی اصلاح کی فکر میں لگے رہو آخری سانس تک اصلاح سے فارغ نہ ہو۔ کوشش میں لگے رہو ایک دن ضرور ایسا وقت ضرور مرنے سے پہلے آئے گا کہ کامیاب ہو جاؤ گے حق تعالیٰ کی عنایت ہے) بس فکر اور دھن میں لگا رہنا چاہیے ان شاء اللہ پھر آپ کا حج مردانہ ہو جائے گا۔ جس کو مولانا فرماتے ہیں

؎ حج زیارت کردن خانہ بود　　　حج رب البیت مردانہ بود

(حج نام ہے خانہ کعبہ کی زیارت کا مگر صاحب خانہ کی زیارت عباد خاص کو ہوتی ہے)

حج رب البیت

اور یہ حج رب البیت ہر شخص پر فرض ہے گو حج البیت بھی اس شخص پر فرض نہ ہو کیونکہ حج رب البیت کے معنی یہ ہیں کہ خداتعالیٰ کی طرف چلنا اس کی طلب اور دھن میں لگنا سو اس کے لئے کعبہ اور مکہ بھی شرط نہیں اسی کو عارف مسعود بک فرماتے ہیں

؎ اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید　　　معشوق دریں جاست بیائید بیائید

(اے قوم جونفلی حج کے لئے کعبہ شریف گئے ہو تم کسی اللہ والے سے اپنے نفس کی اصلاح جو فرض عین ہے کرو تو یہاں سے واصل باللہ ہو جاؤ)

مگر قوم بحج رفتہ سے مراد سب حجاج نہیں ہیں۔ بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جن پر حج فرض نہیں اور ابھی تک انہوں نے نفس کی اصلاح بھی نہیں کی۔ اور حج کو جانے سے ان کو بعضی دینی مضرتیں پہنچنا بھی محتمل ہے ان کو خطاب فرماتے ہیں کہ تم پر حج تو فرض ہے نہیں اور نفس کی اصلاح فرض ہے تم حج کرنے کہاں چلے تم کو پہلے شیخ کی صحبت میں رہنا چاہیے۔ تمہارا مطلوب یہاں ہے اور جن پر حج فرض ہے ان کو یہ خطاب نہیں ہوسکتا کہ تم حج کرنے مت جاؤ۔ شیخ کے پاس رہو۔ کیونکہ جس پر حج فرض ہے اس کو خدا کا حکم ہے کہ پہلے حج سے فارغ ہو۔ اس کے لئے بدوں حج کے مطلوب حاصل نہیں ہوسکتا۔ وہ ترک حج کے گناہ کی وجہ سے کمال سے رہ جائے گا۔ کمال یہی ہے کہ جس وقت جو حکم ہو اس کو پورا کیا جائے تو جس پر حج فرض ہے اس کو حج ضرور کرنا چاہیے پھر کسی شیخ کی صحبت میں وہاں سے آ کر رہے۔ لیکن حج کے ساتھ جن احکام کا شریعت نے حکم کیا ہے ان کو بجالانا بھی ہر حاجی کے ذمہ فرض ہے۔ پس وہ اگر حج سے پہلے کامل نہیں بن سکتے تو کم از کم فکر اور سعی تو ابھی سے شروع کر دیں۔ اس طریقہ سے امید ہے کہ ان شاء اللہ اجر میں کاملین کی برابر ہو جاویں گے۔

لیجئے اب تو بہت سہل نسخہ معلوم ہو گیا اب بھی اگر کوئی اپنے حج کو کامل نہ کرے تو وہ جانے اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو فہم کی توفیق دے۔ اے اللہ سب حجاج کو حج مردانہ نصیب فرمائیے۔ اور سب کی کوشش مقبول ہو اور ان کے لئے اس حج کو آئندہ اصلاح اور کمال کا ذریعہ بنا دیجئے آمین۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد سید المرسلین و علیٰ الہ و اصحابہ اجمعین و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین

تحصیل المرام
فی صورۃ
حج بیت الحرام

تحصیل المرام فی صورت حج بیت الحرام سے موسوم یہ وعظ ۵ شوال المکرّم ۱۳۴۰ھ کو بعد نماز جمعہ کھڑے ہو کر اڑھائی گھنٹہ تک ارشاد فرمایا سامعین کی تعداد تقریباً ۵۰ تھی۔
حضرت مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی نور اللہ مرقدہ نے قلمبند فرمایا۔

حج کا حاصل یہ ہے کہ ایسے وسائط سے تعلق پیدا کیا گیا ہے جن سے تعلق مع اللہ کو قوت ہو بعبارت دیگر یوں کہیے کہ اور تمام عبادات تو مجاہدہ ہیں اور حج مشاہدہ ہے۔ اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

حج زیارت کردن خانہ بود — حج رب البیت مردانہ بود

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّاٰتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّداً عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ۔

امابعد! فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَالَّذِیۡنَ جَاھَدُوۡا فِیۡنَا لَنَھۡدِیَنَّھُمۡ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰہَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ

(اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ان کو ہم اپنا راستہ ضرور دکھاویں گے اور بے شک اللہ ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے)

تمہید: آج مجھ کو کسی قدر حج کے متعلق مضمون بیان کرنا ہے اور اس کے لئے بظاہر ضرورت اس کی تھی کہ کوئی آیت حج کے متعلق صریح اختیار کرتا مگر پھر غور کیا تو اس آیت کو بھی من وجہ حج سے مناسبت معلوم ہوئی۔ چونکہ اس آیت کا بیان[1] مسلسل کئی ہفتوں سے ہو رہا ہے اس لئے میں نے چاہا کہ حج کا بیان بھی اسی کے ضمن میں ہو جائے تاکہ جو مضمون اس آیت میں حج کے مناسب ہے اس کے بیان میں آیت کی تفسیر مکمل ہو جائے۔

نیز مجھ کو یہ بھی بتلانا ہے کہ حج کا مضمون بھی مضامین سابقہ سے مرتبط ہے نیز یہ بھی بتلانا ہے کہ عبادات رمضان اور افعال حج میں بھی باہم ارتباط ہے اس کا مقتضاء بھی یہی تھا کہ جس آیت کے تحت میں عبادات رمضان کا ذکر ہوا ہے اسی کے ضمن میں حج کا بیان ہو جاوے۔ اب تک یہ بتلایا گیا تھا کہ مجاہدہ کی چار قسمیں ہیں یعنی مجاہدہ حکمیہ کی جن میں سے ہر قسم کا بیان مستقل وعظ میں تفصیل کے ساتھ ہو چکا ہے۔ یہ سب مضامین تو اَلَّذِیۡنَ جَاھَدُوۡا فِیۡنَا (جو لوگ ہمارے رستہ میں کوشش کرتے ہیں) میں داخل تھے کیونکہ اسی جزو میں مجاہدہ کا ذکر ہے تو مجاہدہ کی جملہ اقسام اور اس کے متعلق جتنے مضامین

---

[1] تقلیل الطعام و تقلیل المنام و تقلیل الکلام و تقلیل الاختلاط مع الانام سب اسی سلسلہ میں بیان کئے گئے تھے۔

ذکر ہوئے ہیں وہ سب اسی ایک جملہ کی تفسیر تھے۔اس کے بعد لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا میں مجاہدہ پر ہدایت سبل کا وعدہ ہے چنانچہ ترجمہ آیت سے ظاہر ہو جائے گا۔

ترجمہ آیت کا یہ ہے کہ جو لوگ ہمارے راستہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کرتے ہیں۔

مقصود طریق

اور یہ ظاہر ہے کہ ہر طریق کا ایک منتہا ہوتا ہے جس پر سیر ختم ہو جاتی ہے جب کوئی سفر کرتا ہے تو ایک جگہ ایسی آتی ہے جہاں سفر منقطع ہو جاتا ہے اسی طرح طریق الٰہی کی بھی کہیں انتہا ہونی چاہیے جس پر مجاہدہ منتہی ہو یعنی کوئی مقصود ہونا چاہیے جس پر پہنچنے کے لئے ان راستوں کو طے کیا جاتا ہے۔

ہر چند کہ لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (ہم ان کو اپنے راستوں کی ہدایت کرتے ہیں)

میں بظاہر ہدایت طریق کا وعدہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ مجاہدہ کرنے والے کے لئے حق تعالیٰ اپنے راستوں کو کھول دیتے ہیں۔

اور مقصود تک پہنچانا ہدایت کے لئے لازم نہیں۔ کیونکہ ہدایت کبھی اراءت طریق کی صورت سے ہوتی ہے کہ راستہ بتلا دیا اور کہہ دیا کہ اس سڑک کو چلے جاؤ اور کبھی ایصال کی صورت سے ہوتی ہے کہ ایک شخص خود ساتھ ہو کر منزل تک پہنچا دے جب ہدایت کی دو صورتیں ہیں تو لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (ہم ان کو اپنے رستوں کی ہدایت کرتے ہیں) میں بظاہر دونوں احتمال ہونے کی وجہ سے مقصود تک پہنچانے کا وعدہ یقینی نہیں مگر محققین کے کلام میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مقصود تک پہنچانے کا بھی وعدہ ہے کیونکہ اس میں حق تعالیٰ نے ہدایت کو مفعول ثانی کی طرف بلاواسطہ متعدی فرمایا ہے اور حسب تصریح محققین اس صورت میں ہدایت کا مدلول وصول ہی ہوتا ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا اب دوسرا مقدمہ یہ رہا کہ مقصود کیا ہے تو جو لوگ آیات و احادیث پر نظر رکھنے والے ہیں ان کو اس میں کوئی شک نہ ہوگا کہ مقصود قرب حق جل وعلا ہے۔

حقیقت قرب حق

اسی کو کبھی رضا سے تعبیر کر دیا کرتے ہیں کیونکہ حق تعالیٰ سے بندہ کو وہ قرب نہیں ہو سکتا جو لفظ قرب سے متبادر ہے یعنی **اتصال بین الشیئین فی الظاهر بحیث یقل المسافة بینهما** دو چیزوں میں ایسا اتصال ہو جاتا ہے کہ ان کے درمیان میں مسافت کم رہ جاوے۔ یہ قرب خاصہ اجسام کا ہے جو دو جسموں کے ہی درمیان ہو سکتا ہے۔ اور حق تعالیٰ جسمیت سے منزہ ہیں۔ اس لئے قرب حق کے یہ معنی نہیں ہو سکتے۔ بلکہ قرب حق کے معنے وہی ہیں جس کو شریعت میں کبھی رضا کے لفظ سے

تعبیر کیا جاتا ہے کہ حق تعالیٰ بندہ سے راضی ہو جائیں اور اس کو اپنا مقبول بنا لیں۔ غرض شریعت میں مقصود کا پتہ کبھی قرب کے لفظ سے دیا گیا ہے اور کبھی رضا سے اس کو تعبیر کیا گیا ہے۔

اور صوفیہ کی اصطلاح میں اس کو مشاہدہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جس کے یہ معنی نہیں کہ حق تعالیٰ کو دیکھتے ہیں۔ شاید کسی نے یہی سمجھا ہو کیونکہ لغت میں مشاہدہ ادراک بالحواس ہی کو کہتے ہیں۔ مگر یہ معنی لغوی متعارف ہیں ورنہ اصل لغت مشاہدہ ادراک بالحواس کے ساتھ خاص نہیں بلکہ اصل میں عموم ہے۔ حضور کو بھی مشاہدہ کہتے ہیں مگر عام طور پر مشاہدہ کے معنی لوگوں کے ذہن میں ادراک بالحواس ہی ہیں اور حاسہ بھی عام نہیں بلکہ خاص یعنی بصر کیونکہ ادراک باللسان یا ادراک بالسمع واللمس وغیرہ کو محاورات عوام میں مشاہدہ نہیں کہا جاتا اور ادراک بالحواس الباطنہ کو تو اس سے بالکل ہی خارج سمجھتے ہیں۔ بس عام لوگ تو صرف آنکھ سے دیکھنے کو مشاہدہ کہتے ہیں۔

دیدار خداوندی

چنانچہ جب کبھی سنتے ہیں کہ سالکین کو مشاہدہ حق ہوتا ہے تو عام لوگ اس سے یہ سمجھتے ہیں کہ بزرگوں کو حق تعالیٰ کا دیدار ہوتا ہے اور وہ خدا کو دیکھتے ہیں حالانکہ دنیا میں خدا کو دیکھنا محال عادی وشرعی ہے۔ محال عقلی تو نہیں کیونکہ محال عقلی کا وجود کسی جگہ نہیں ہوتا۔ اور حق تعالیٰ کا دیدار آخرت میں ہوگا۔ جیسا کہ نصوص سے ثابت ہے اور دنیا میں بھی وجہ استحالہ رویت ادھر سے نہیں بلکہ ہماری طرف سے ہے، ہم اس کے متحمل نہیں ورنہ حق تعالیٰ میں خفا نہیں وہ تو یہاں بھی ظاہر ہیں۔

اس پر کسی کو شاید یہ شبہ ہو کہ حق تعالیٰ کی صفت باطن بھی تو ہے چنانچہ نص میں ہے **ھو الظاھر والباطن** پھر تمہارا یہ کہنا کیونکر صحیح ہے کہ حق تعالیٰ میں خفا نہیں۔ صفت باطن سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ میں بھی خفا ہے۔

اس کا جواب محققین نے یہ دیا ہے کہ حق تعالیٰ جو باطن ہیں اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان میں خفا نہیں بلکہ غایت ظہور سے بطون ہو گیا۔

رہا یہ کہ غایت ظہور سے بطون کیسے ہو گیا۔ اس سے تو ظہور ہونا چاہیے تھا تو بات یہ ہے کہ ہمارے ادراک کے لئے غیبت وخفا کی بھی ضرورت ہے اگر کسی چیز میں غیبت بالکل نہ ہو اس کا ادراک نہیں ہو سکتا کیونکہ ادراک التفات سے ہوتا ہے اور التفات غیبت کی وجہ سے ہوتا ہے جو چیز من کل وجہ حاضر ہو اس کی طرف التفات نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی روح حالانکہ بہت ظاہر ہے اور انسان سے جتنا قرب روح کو ہے کسی چیز کو بھی نہیں پھر بھی روح کا ادراک نہیں ہوتا کیونکہ وہ رگ رگ میں سرایت کی ہوئی ہے اس میں کوئی درجہ غیبت کا نہیں۔ اس لئے اس کی طرف التفات ہی نہیں ہوتا۔ اور

جب التفات نہیں تو ادراک کیسے ہو۔

اسی طرح بلاشبہ کیونکہ یہ تشبیہ بھی ناقص ہے حق تعالیٰ میں چونکہ کوئی درجہ غیبت و خفا کا نہیں اس لئے وہ بوجہ غایت ظہور کے باطن ہیں ہم کو دھوپ کا ادراک اس لئے ہے کہ وہ کبھی غائب بھی ہو جاتی ہے۔ اگر غائب نہ ہوتی تو آپ اس کو دیکھتے مگر ادراک نہ ہوتا دھوپ کا ادراک ظلمت ہی کی وجہ سے ہے اور ظلمت خفاء ضوہی کا نام ہے۔ نیز اگر غیبت نہ ہوتو پھر روشنی سے لذت بھی نہ آتی۔ دن میں جو لذت ہے وہ اسی لئے ہے کہ رات میں دھوپ غائب ہو جاتی ہے۔

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم　　　گر نیست غیبتے نہ دہد لذت حضور

(میں ہجر کی شکایت نہیں کرتا اگر ہجر نہ ہوتا تو قرب میں لذت نہ معلوم ہوتی)

غرض چونکہ حق تعالیٰ ہر وقت ظاہر ہیں اسی لئے خفا ہو گیا کیونکہ یہاں ہمارا ادراک ایسا ضعیف ہے جو غائب من وجہ کے ساتھ ہی متعلق ہو سکتا ہے۔ ظاہر من کل وجہ کے ساتھ متعلق نہیں ہو سکتا۔ ہاں آخرت میں یہ ادراک قوی ہو جائے گا تو ظاہر من کل وجہ کے ساتھ بھی متعلق ہو گا وہاں روح کا بھی انکشاف ہو گا اور حق تعالیٰ کا بھی دیدار ہو گا اور معلوم ہو جائے گا کہ حق تعالیٰ تو بے حجاب تھے حجاب ہماری طرف سے تھا ہماری آنکھوں میں اس وقت اس کے دیکھنے کی قوت نہیں جیسے خفاش میں آفتاب کے دیکھنے کی قوت نہیں کسی نے خوب کہا ہے

؎ شد ہفت پردہ برچشم ایں ہفت پردہ چشم　　　بے پردہ ور نہ ماہے چوں آفتاب دارم

یعنی آنکھ کے ساتھ پردے ہی دیدار سے مانع ہو گئے تو یہ آنکھ خود ہی مانع ہو رہی ہے۔ ادھر سے کوئی مانع نہیں۔ اگر آفتاب چمک رہا ہے اور تم آنکھوں پر ہاتھ دھر لو تو مانع تمہاری طرف سے ہو گا آفتاب کو مخفی نہ کہا جاوے گا۔ اور وہ جو حدیث میں آخرت میں حجاب کا ذکر آتا ہے۔

لایبقی علیٰ وجهه الا رداء الکبریاء (لم اجد الحدیث فی موسوعۃ) اس کے چہرہ پر سوائے کبریائی چادر کچھ باقی نہ رہے گا۔ وہ حجاب ادراک کنہ سے مانع ہے دیدار سے مانع نہیں آخرت میں ہماری آنکھوں کی قوت بڑھ جائے گی تو خدا تعالیٰ کو دیکھیں گے تو مگر کنہ کا ادراک نہ ہو گا اور رویت کیلئے ادراک کنہ لازم نہیں ہم یہاں بھی بہت چیزوں کو دیکھتے ہیں مگر کنہ کا ادراک نہیں ہوتا۔ بہر حال دنیا میں رویت الٰہی محال عادی ہے چنانچہ حدیث مسلم میں ہے:

انکم لن تروا ربکم حتیٰ تموتوا (مسند احمد ۳۲۴/۵)

(مرنے سے پہلے تم کو ہرگز تمہارے رب کا دیدار نہ ہو گا)

اور نص میں موسیٰ علیہ السلام کی درخواست دیدار کے جواب میں ارشاد ہے۔ لن ترانی (ہرگز مجھ کو نہیں دیکھ سکتے) یہ جواب قابل دید ہے۔ حق تعالیٰ نے لن ترانی (ہرگز مجھ کو نہیں دیکھ سکتے) فرمایا ہے۔ لن اریٰ

ہرگز نہ دیکھا جاؤں گا) نہیں فرمایا۔ بتلا دیا کہ میں تو اب بھی اس قابل ہوں کہ دیکھا جاؤں۔ میری طرف سے کوئی حجاب نہیں، مگر تم میں قوت دیدار نہیں تم مجھے اس وقت نہیں دیکھ سکتے۔ محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حق تعالیٰ کو نہیں دیکھا، کیونکہ دنیا میں رویت محال عادی ہے ہاں تجلی ہوئی تھی اور حق تعالیٰ نے حجابات اٹھا دیئے تھے مگر موسیٰ علیہ السلام دیکھنے سے پہلے ہی بیہوش ہو گئے۔ البتہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت اختلاف ہے کہ معراج میں آپ نے حق تعالیٰ کو دیکھا ہے یا نہیں۔ اس میں اکثر علماء اور صوفیہ اور حضرت عبداللہ بن عباس اور بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کا قول یہی ہے کہ آپؐ نے دیکھا ہے۔

مگر اسی کے ساتھ محققین کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ آیات سورۂ نجم کی تفسیر اس رویت سے صحیح نہیں ہے کیونکہ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ذُوْمِرَّةٍ ان کو ایک فرشتہ تعلیم کرتا ہے جو بڑا طاقتور ہے پیدائشی طاقتور ہے) سے یقیناً حضرت جبرائیل علیہ السلام مراد ہیں۔ ان صفات کا عنوان بیان اسی کو مقتضی ہے کیونکہ حق تعالیٰ پر شَدِيْدُ الْقُوٰى کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔ ایک مقدمہ تو یہ ہوا اب آگے چلئے۔

فَاسْتَوٰى وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى (پھر وہ فرشتہ اصلی صورت پر نمودار ہوا۔ ایسی حالت میں کہ بلند کنارہ پر تھا) اس میں بھی ضمائر کا مرجع جبرئیل علیہ السلام ہی ہیں۔ کیونکہ استویٰ بالافق بھی انہیں کی صفت ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى (پھر وہ فرشتہ نزدیک آیا پھر اور نزدیک آیا سو دو کمانوں کے برابر فاصلہ رہ گیا بلکہ اور بھی کم) میں سب ضمیریں جبرئیلؑ کی طرف راجع ہیں حق تعالیٰ کی طرف راجع نہیں ورنہ انتشار ضمائر لازم آئے گا یہ رویت جبرئیل تو دنیا میں ہوئی تھی آگے فرماتے ہیں۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى (اور انہوں نے اس فرشتے کو ایک اور دفعہ بھی دیکھا ہے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس، یہ دوبارہ رویت سدرۃ المنتہیٰ پر ہوئی اور گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام کو بہت دفعہ دیکھا ہے مگر یہاں اصلی صورت میں دیکھنے کا ذکر ہے وہ دو مرتبہ ہوئی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان آیات کی تفسیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے خود پوچھی تھی آپ نے فرمایا ھو جبرئیل یعنی یہ رؤیت جبرئیل کی تھی۔

باقی جو علماء معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے رویت کے قائل ہیں وہ دوسرے دلائل سے استدلال کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور بعض صحابہ کا قول ہے کہ آپ نے معراج میں حق تعالیٰ کو دیکھا ہے اور ان کی سند صحیح ہے۔ ابن عباس کا قول تو مسلم میں ہے اور سیوطی نے مستدرک حاکم سے اس باب میں حدیث مرفوع نقل کی ہے پس قرآن میں گو اس رویت کا ذکر نہیں مگر جب یہ حضرات صحابہ اس کا اثبات کرتے ہیں تو یقیناً انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اب ان علماء

نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قاعدہ سے (کہ دنیا میں رویت الٰہی محال عادی ہے) مستثنیٰ کیا ہے کیونکہ دلیل سے آپ کا دیکھنا ثابت ہو چکا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں استحالہ رویت کی علت رائی کی عدم قابلیت تھی ورنہ مرئی میں تو کوئی مانع ہے ہی نہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یہ قابلیت موجود ہو گئی تھی۔ اس لئے آپ اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں۔

مکان آخرت کی خصوصیت

مگر شیخ ابن عربی نے عجیب تحقیق لکھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اس قاعدہ میں استثنا کی ضرورت نہیں۔ بلکہ یہ اپنے عموم پر بحالہا باقی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت سے اس پر نقض وارد نہیں ہوتا کیونکہ ہم تو معراج میں رویت کے قائل ہیں اور معراج عرش تک ہوئی ہے اور سموات وعرش مکان آخرت ہیں وہ دنیا میں داخل نہیں بلکہ اس سے خارج ہیں تو ممکن ہے کہ اس مکان کی یہ خاصیت ہو کہ جو شخص وہاں پہنچ جاوے خواہ مرنے کے بعد یا مرنے سے پہلے اس میں قوت تحمل رویت پیدا ہو جاوے۔ جیسے عیسیٰ علیہ السلام اس وقت آسمان پر موجود ہیں اور وہاں وہ کھانے پینے اور بول براز سے منزہ ہیں صرف ذکر اللہ سے ان کی حیات ہے کیوں؟ اس لئے کہ وہ اس وقت دنیا میں نہیں ہیں بلکہ مکان آخرت میں ہیں اور اس مکان کی خاصیت مکان دنیا سے الگ ہے۔ اگر یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ غذا سے فضلات پیدا ہوں تو ممکن ہے وہاں کی یہ خاصیت ہو کہ فضلات پیدا نہ ہوں اگر یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ حرکت سے حرارت بدن تحلیل ہوتی ہے ممکن ہے وہاں کی یہ خاصیت نہ ہو۔ اسی طرح یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ اعراض میں وزن نہ ہو اور وہاں کی یہ خاصیت ہے کہ اعراض میں وزن ہو یہاں کی یہ خاصیت ہے کہ ایک دن موت ضرور آتی ہے وہاں کی یہ خاصیت ہے کہ جو وہاں پہنچ جائے اسے کبھی موت نہ آوے۔ جیسے کسی شاعر نے کشمیر کی تعریف میں کہا ہے

ہر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید ۔۔۔ گر مرغ کباب است کہ بابال و پر آید

(جو بھی سوختہ جان کشمیر میں آئے اگرچہ مرغ کباب ہی ہو تو بھی بال و پر کے ساتھ زندہ ہو جائے)

خیر یہ تو شاعرانہ مبالغہ ہے مگر اتنی بات تو مشاہد ہے کہ دنیا میں بھی ہر جگہ کی یکساں خاصیت نہیں بلکہ بعض جگہ کی کچھ خاصیت ہے بعض شہروں کی کچھ خاصیت ہے بعض ملکوں میں عمریں کم ہوتی ہیں اور بعض ملکوں میں لمبی لمبی عمریں ہوتی ہیں بعض مقامات کے آدمی کمزور ہوتے ہیں اور بعض مقامات کے بہت قوی اور توانا وتندرست ہوتے ہیں بعض ملکوں میں بیماریوں کی کثرت ہے آئے دن طاعون و ہیضہ پھیلا رہتا ہے اور بعض ملکوں میں کوئی ان بیماریوں کا نام بھی نہیں جانتا۔ جب ایسا اختلاف خواص دنیا کے مکانات میں بھی مشاہد ہے تو اس میں کیا اشکال ہے کہ مکان آخرت کی خاصیت دنیا سے بالکل الگ ہو ایک کو دوسرے پر

قیاس کرنے کی کیا وجہ ہے اس تحقیق سے سب معادیات سہل ہو جائیں گی۔اب نہ وزن اعمال میں اشکال ہے نہ رویت خداوندی میں کچھ شبہ ہو سکتا ہے۔معتزلہ کی عقل ماری گئی جو انہوں نے خواہ مخواہ ان امور کا انکار کیا جس کا منشاء بجز قیاس الغائب علی الشاہد کے کچھ نہیں۔اور اس قیاس کا فاسد ہونا ظاہر ہے۔

غرض شیخ (ابن عربی کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ ایک تو زمان آخرت ہے اور ایک مکان آخرت ہے۔زمان آخرت تو مرنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔اور مکان آخرت اسی وقت موجود ہے چنانچہ جنت و دوزخ کے بارے میں جملہ اھل سنت کا قول ہے کہ وہ اس وقت موجود ہیں تو کیا وہ دنیا میں ہیں۔اگر دنیا میں ہیں تب تو اس شخص کا قول صحیح ہو جائے گا جو کہتا ہے کہ ہم نے تو تمام دنیا کا جغرافیہ پڑھا جنت دوزخ کا اس میں کہیں پتہ ہی نہیں۔

اس کا جواب اہل حق کی طرف سے یہ دیا گیا ہے کہ تم نے دنیا کا جغرافیہ پڑھا اور ایک جغرافیہ آخرت کا ہے تم نے وہ نہیں پڑھا وہ تمہارے کورس میں داخل نہیں ہے اس لئے تم کو جنت و دوزخ کا پتہ نہیں چلا اگر آخرت کا جغرافیہ پڑھتے تب ان کو پتہ چلتا' پس اہل حق جنت و دوزخ کو دنیا میں موجود نہیں مانتے بلکہ ان کو مکان آخرت میں موجود مانتے ہیں۔معلوم ہوا کہ مکان آخرت اس وقت بھی موجود ہے اور جس طرح آخرت میں رویت ممکن ہے اسی طرح مکان آخرت میں بھی ممکن ہے گو دیکھنے والا ابھی زمان آخرت میں داخل نہ ہوا ہو۔پس قاعدہ مذکور منقض نہیں ہوا جس رویت کو آپ کے لئے ثابت کیا جاتا ہے وہ دنیا میں نہ تھی بلکہ مکان آخرت میں تھی۔

توہین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور دنیا میں آپ کے واسطے بھی رویت ممکن نہیں کیونکہ انبیاء علیہم السلام گو قوئی بشریہ میں سب سے اکمل ہیں مگر پھر بھی بشر ہیں اور دنیا میں خواص بشریہ کے ضعیف آثار ان میں بکثرت موجود ہوتے ہیں چنانچہ غصہ ان کو آتا ہے' بیماری ان کو ستاتی ہے' گرمی' سردی کا ان پر اثر ہوتا ہے۔بول و براز سے وہ مستغنی نہیں۔

اور ان خواص کا اثر یہ ہے کہ اس حالت میں حق تعالیٰ کے دیدار کا تحمل تو کہاں جبرئیل علیہ السلام کی رویت کا بھی تحمل نہیں ہوتا چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل علیہ السلام کو اصلی صورت میں دیکھ کر بے ہوش ہو گئے تھے۔مگر یہ آپ کے لئے نقص نہیں بلکہ کمال ہے' کیونکہ آپ کا کمال یہی ہے کہ آپ انسان ہیں اور انسان کامل ہیں۔اور بشریت کا خاصہ یہی ہے۔جس کا ظہور آپ کی ذات میں ہوا جبرئیل علیہ السلام کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئے۔جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا کی حد میں داخل کرتے ہیں وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کرتے ہیں کیونکہ خدا ہو کر آپ ناقص خدا ہوں گے اور بشر ہو کر کامل بشر ہیں اور ناقص ہونے سے کامل ہونا یقیناً اچھا ہے۔ایک شخص تیس سال کا جوان ہے مگر لنگڑا ہے اور ایک

بچہ دو سال کا ہے مگر تندرست صحیح الاعضاء ہے بتلایئے آپ دونوں میں کس کو اچھا کہیں گے۔ ایک شخص بہت بڑی جمہوری سلطنت کا بادشاہ ہے مگر اختیارات ناقص ہیں اور ایک شخص چند ضلعوں کا شخصی بادشاہ ہے مگر اختیارات کامل رکھتا ہے۔ ان دونوں میں آپ کسے افضل کہیں گے۔ یقیناً جس کے اختیارات کامل ہیں اسی کو افضل کہا جاوے گا معلوم ہو گیا کہ فضیلت کمال ہی میں ہے نقص میں کوئی فضیلت نہیں۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بشر ہونا ہی کمال ہے کیونکہ اس صورت میں آپ کامل بشر ہیں خدا ہونا کمال نہیں کیونکہ حق تعالیٰ کے سامنے آپ کامل خدا تو ہو نہیں سکتے ناقص ہی ہوں گے اور نقص عیب ہے۔

بشریت رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم)

مگر آج کل بعض لوگوں کی جہالت کا یہ حال ہے کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت لفظ بشر کو نہیں سن سکتے۔ چنانچہ کاٹھیاواڑ میں ایک دفعہ کسی مسافر امام نے نماز میں یہ آیت پڑھ دی قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ (آپ کہہ دیجئے کہ میں تم جیسا بشر ہوں) تو نماز کے بعد ایک جاہل نے کہا کہ نماز نہیں ہوئی اعادہ کرنا چاہیے کیونکہ امام نے ایسی آیت پڑھی ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بشر کہا گیا ہے میں کہتا ہوں کہ صرف بشر ہی نہیں کہا بلکہ بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ کہا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو تم جیسے ہی آدمی ہیں۔ بھلا یہ تو اس کے نزدیک بہت ہی بڑا مفسدہ صلوٰۃ ہوگا۔

اس جاہل سے کوئی پوچھے کہ تو نے اعتراض کس پر کیا؟ امام پر یا خدا تعالیٰ پر؟ امام پر تو اعتراض ہو نہیں سکتا کیونکہ اس کا تم کو بھی اقرار ہے کہ اس نے قرآن ہی کی آیت پڑھی تھی۔ بس خدا ہی پر اعتراض ہوا تو کچھ ٹھکانا ہے اس غلو کا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم میں حق تعالیٰ پر اعتراض کرنے لگے گویا حق تعالیٰ نے اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (میں تم جیسا آدمی ہوں) فرما کر نعوذ باللہ آپ کو کذب کی تعلیم دی ہے کہ تم واقع میں تو بشر نہیں ہو مگر لوگوں سے یوں ہی کہو کہ میں بشر ہوں۔

مگر اسے یہ خبر نہیں کہ یہ اعتراض حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی پہنچتا ہے کہ آپ نے اس مضمون کی تبلیغ کیوں کی۔ اور وہاں جن نمازوں میں آپ نے ایسی آیتوں کو پڑھا ہے کیا آپ کی بھی (معاذ اللہ) وہ نمازیں فاسد ہوئیں اور ان کا اعادہ آپ سے ثابت نہیں تو بس آپ کی وہ نمازیں یوں ہی رہیں۔ استغفر اللہ العظیم۔ واقعی یہ جہالت بری بلا ہے۔ خدا بچائے اس سے۔

ایک شخص نے مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس سوال بھیجا تھا کہ کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم بشر ہیں اور ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس بیوقوف کو بھی آپ کی بشریت میں تردد تھا۔ بعض لوگوں نے اس مضمون کی احادیث بھی گھڑی ہیں جن سے معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا

خدا ہونا ثابت کیا ہے چنانچہ ایک حدیث یہ گھڑی ہے انا عرب بلاعین (میں عرب بلاعین ہوں یعنی رب ہوں) اس کے الفاظ ہی بتلا رہے ہیں کہ کسی جاہل نے فرصت میں بیٹھ کر گھڑی ہے۔ بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس چیستاں کی کیا ضرورت تھی آپ نے صاف ہی کیوں نہ فرمادیا انـــا رب (میں رب ہوں) ہیر پھیر کے ساتھ انا عرب بلاعین کہنے کی کیا ضرورت؟

پھر اس سے مدعا کیونکر حاصل ہوا۔ کیونکہ عرب میں باء مشدد نہیں ہے مخفف ہے۔ تو عین نکال کر رب (بلاتشدید) باقی رہا اور یہ کوئی لغت نہیں رب (بالتشدید) تو ثابت نہ ہوا۔ دوسرے آپ عرب کہاں تھے۔ آپ تو عربی تھے۔ پھر انا عرب میں حمل کیونکر صحیح ہوگا۔ حدیث بھی گھڑی تو ایسی جس کے سر نہ پاؤں جس میں ایک ادنیٰ طالب علم بھی غلطیاں نکال سکتا ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے فصیح بلیغ تھے کہ آپؐ کے کلام میں کسی کی مجال نہیں کہ انگلی بھی دھر سکے۔

اسی لئے محدثین نے فرمایا ہے کہ رکاکت الفاظ بھی حدیث کے موضوع ہونے کی علامت ہے اور یہاں تو رکاکت الفاظ کے ساتھ مضمون بھی رکیک ہے کیونکہ اس سے رب ہونا نہیں نکلتا بلکہ رب نکلتا ہے اور رب پر تشدید ایک مہمل لفظ ہے ایک حدیث یہ گھڑی ہے انا حمید بلامیم یہ حدیث نہیں بلکہ احمد جام رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے جو ان سے حالت سکر میں صادر ہوا ہے اور قابل تاویل ہے اور اگر تاویل نہ کی جائے تو قابل رد ہے کیونکہ غلبہ حالت کے اقوال وافعال قابل اعتبار نہیں ہوتے ایک حدیث یہ گھڑی ہے۔

رایت ربی یطوف فی سکک المدینۃ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کی ہے انہوں نے آپ کو مدینہ کی گلیوں میں دیکھا تو فرمایا۔

رایت ربی یطوف فی سکک المدینۃ کہ میں نے خدا کو مدینہ کی گلیوں میں گھومتے ہوئے دیکھا۔ پس پھر تو ہر صوفی خدا ہو گیا۔ جیسے ایک جاہل صوفی کہتا ہے نعوذ باللہ

ع ''اللہ جسے کہتے ہیں واللہ میں ہی ہوں''

ان بیوقوفوں کو ان خرافات سے بدنام کر دیا مخالفین بھی ان باتوں پر ہنستے ہیں۔ ایک انگریز ایک مسلمان سے کہتا تھا کہ تم ہم پر خدا کے تین کہنے پر اعتراض کرتا ہے۔ تمہارا ٹوپی (یعنی صوفی ۱۲) تو ہر چیز کو خدا کہتا ہے یہ مسئلہ وحدۃ الوجود کا ناس مارا ہے۔ ان جاہلوں نے اس کی حقیقت تو سمجھے نہیں بس یہ سمجھے کہ ہر چیز کو خدا کہنے لگے۔ انہی لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بشریت سے نکالنے کی کوشش کی ہے حالانکہ واقعات اس پر یقینی شاہد ہیں کہ آپ بشر تھے چنانچہ اکل وشرب وبول وبراز سے آپ منزہ نہ تھے جنگ احد میں کفار کے ہاتھ سے آپ زخمی ہوئے یہود نے آپؐ پر سحر کیا اور اس کا اثر ہو گیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے

آپؑ نے درخواست کی کہ مجھے اپنی اصلی صورت دکھلاؤ جب وہ اصلی صورت میں ظاہر ہوئے تو آپ بیہوش ہو گئے سورۂ نجم میں اس واقعہ کا ذکر ہے۔ تفسیر بیان القرآن میں یہ موقع قابل دید ہے۔ یہ تو دنیا میں ہوا کہ آپ حضرت جبرئیل کی اصلی صورت دیکھ کر بیہوش ہو گئے مگر معراج میں بیہوش نہیں ہوئے کیونکہ اس مکان کی خاصیت سے آپ میں قوت تحمل پیدا ہو گئی تھی۔

غلو فی التعظیم

بہر حال جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم میں غلو کر کے آپ کو بشریت سے نکالنا چاہتے ہیں وہ آپ کی توہین کرتے ہیں اور ان واقعات کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں۔

اس غلو کا ایک اثر یہ ہے کہ شعراء تو بہت حد سے نکل گئے وہ آپ کی تعریف میں دوسرے انبیاء کی توہین کرتے ہیں۔ خصوصاً موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام تو ان کے تختہ مشق ہیں چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے

؎ برآسمان چہارم بیمار است　　　تبسم تو برائے علاج درکار ست

(عیسیٰ علیہ السلام چوتھے آسمان پر بیمار ہیں۔ علاج کے لئے آپ کا تبسم درکار ہے) کیا اس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبض دیکھی تھی آخر اسے ان کا بیمار ہونا کیسے معلوم ہوا اگر آسمان پر بھی وبا پھیلنے لگی تو خدا خیر کرے فرشتوں کی۔ واہیات ایک کہتا ہے

؎ موسیٰ زہوش رفت بیک جلوۂ صفات　　　تو عین ذات می نگری در تبسمی

(ایک تجلی صفاتی سے موسیٰ علیہ السلام بیہوش ہو گئے آپ تجلی ذاتی کو تبسم میں دیکھ رہے تھے) کتنا بڑا فیصلہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام پر تجلیٔ ذاتی نہ ہوئی تھی صفاتی ہوئی تھی پھر موسیٰ کے بیہوش نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ آپ پر دنیا میں تجلی ہوئی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیہوش نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے آخرت میں حق تعالیٰ کو دیکھا تھا۔ آخرت میں تو موسیٰ علیہ السلام بھی بیہوش نہ ہونگے اور دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی غالباً بے ہوش ہو جاتے کیونکہ حدیث سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ جبرئیل علیہ السلام کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ خدا کا دیدار دنیا میں ہوتا تو نہ معلوم کیا حال ہوتا۔ بھلا اگر کوئی مخالف اس شاعر پر اعتراض کرے کہ موسیٰ علیہ السلام تو حق تعالیٰ ہی کی تجلی سے بے ہوش ہوئے تھے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو جبرئیل علیہ السلام کو دیکھ کر بے ہوش ہو گئے جو ایک مخلوق ہیں تو اس کے پاس کیا جواب ہوگا؟

شیخ ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مقامات ذوقی ہیں۔ اور ناقص کا ذوق کامل کے مقام ذوق کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اس لئے ہم کو مقامات انبیاء میں کلام نہ کرنا چاہیے ہمارا ذوق نبی کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ غضب ہے کہ شیخ ابن عربی تو اتنے بڑے صاحب کشف ہو کر بھی مقامات انبیاء میں سکوت کی تعلیم دیتے ہیں اور آج ہر

بیضاوی وجلالین پڑھنے والا بلکہ ہر شاعر مقامات انبیاء کا فیصلہ کرتا ہے اور اپنی رائے سے وجوہ فضیلت بیان کرتا ہے۔امت میں چند لوگ بڑے صاحب کشف ہوئے۔ایک شیخ ابن عربی ان کا صاحب کشف ہونا سب کو مسلم ہے۔دوسرے عبدالکریم جیلی یہ بھی بہت بڑے صاحب کشف ہیں انہوں نے جنت، دوزخ کی پیمائش تک لکھ دی ہے کیونکہ جنت ودوزخ گو کتنی ہی بڑی ہوں مگر پھر محدود ومتناہی ہیں۔اور محدود کی پیمائش ہوسکتی ہے۔

نیز انہوں نے اپنے کشف سے ایک دریا معلوم کیا ہے جو اتنا بڑا ہے کہ اس کی ایک موج تمام عالم کو غرق کردے۔جس کی ایک موج کا یہ حال ہے خود وہ دریا کتنا بڑا ہوگا تمام زمین وآسمان اس کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتے مگر ملائکہ اس کو تھامے ہوئے ہیں اور اس کی موجوں کو روکتے رہتے ہیں تاکہ عالم سے نہ ٹکراویں۔مگر بایں ہمہ شیخ فرماتے ہیں کہ وہ دریا عرش سے کم ہے، عرش اس سے بھی بہت بڑا ہے۔ عرش سے بڑی کوئی چیز نہیں۔لیکن پھر بھی وہ اس قابل نہیں کہ حق تعالیٰ کی قرارگاہ ہوسکے کیونکہ قرارگاہ مستقر کو محیط ہونی چاہیے اور حق تعالیٰ کو کوئی چیز محیط ہو نہیں سکتی بلکہ وہی سب کو محیط ہیں۔

چنانچہ ارشاد ہے۔اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَىءٍ مُحِيطٌ (بیشک اللہ تعالیٰ ہر شئے کو احاطہ میں لئے ہوئے ہیں) کل شئ میں عرش بھی داخل ہے۔

رہا یہ کہ پھر **استواء علی العرش** کے کیا معنے ہیں سو یہ متشابہات میں سے ہے جس کے معنی ہم بیان نہیں کرسکتے سلف کا مذہب اس میں سکوت ہے۔البتہ متاخرین نے ضعفا کی مصلحت سے کچھ مناسب معنے بیان کردیئے ہیں غرض جب یہ لوگ باوجود اتنے بڑے صاحب کشف ہونے کے مقامات انبیاء میں گفتگو کی جرات نہیں کرتے تو ان شعراء یا طلبہ کی تو حقیقت کیا ہے۔

حقیقت مشاہدہ

میں یہ کہہ رہا تھا کہ مشاہدہ سے عام لوگ حق تعالیٰ کا دیکھنا سمجھتے ہیں یہ صحیح نہیں کیونکہ رویت الٰہی دنیا میں محال ہے بلکہ مشاہدہ کے معنی ہیں حضور لیکن حضور کی دوصورتیں ہیں ایک یہ کہ حق تعالیٰ اب تک غائب ہوں پھر آ گئے یہ معنی مراد نہیں کیونکہ حق تعالیٰ غیبت سے منزہ ہیں ایک صورت یہ ہے کہ تم اب تک غائب تھے پھر حاضر ہوگئے مشاہدہ سے یہی مراد ہے۔

اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے محاورات میں بولا جاتا ہے۔**جاء بعلبک** آ گیا بعلبک یا جاء تھانہ بھون۔آ گیا تھانہ بھون۔اب بعلبک اور تھانہ بھون آنے کی دوصورتیں ہیں ایک یہ کہ تم اپنی جگہ رہو۔اور یہ شہر حرکت کر کے تمہارے پاس آویں مگر ظاہر ہے کہ یہ مراد نہیں ہوتا اور نہ اس کا وقوع ہے دوسری صورت یہ ہے کہ وہ تو اپنے حال پر رہیں اور تم حرکت کر کے ان کے پاس پہنچو یہی مراد ہوتا ہے اور

وقوع بھی اسی طرح ہے یہی حال حضورِ حق کا ہے کہ حق تعالیٰ تو اپنے حال پر رہتے ہیں ہاں تم غیبت کے بعد مجاہدات واعمال کے ذریعہ سے ان تک پہنچتے ہو تم پہلے غائب تھے پھر حضور سے مشرف ہوتے ہو۔

اور تمہارے غائب ہونے کا بھی یہ مطلب نہیں کہ حق تعالیٰ کی نظروں سے غائب تھے کیونکہ حق تعالیٰ سے کوئی چیز غائب نہیں چنانچہ ارشاد ہے۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ہم اس کی طرف شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں) اس میں قربِ علمی ہی مراد ہے اور حق تعالیٰ کا علم ہر شئے کے ساتھ حضوری ہے بلکہ ان کا علم تو حضوری سے بھی زیادہ حضوری ہے پھر وہاں غیبت معلوم کا احتمال کیونکر ہو سکتا ہے۔ بلکہ تمہارے غائب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا علم پہلے حق تعالیٰ کے ساتھ متعلق نہ تھا اب معلوم ہو گیا۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک شخص تمہارے پاس موجود ہو مگر تم کو اس کی خبر نہ ہو کہ یہ میرے پاس ہے اور ایسا اتفاق بہت دفعہ پیش آتا ہے کہ مجمع میں ایک شخص ہمارے پاس بیٹھا ہوتا ہے مگر ہم کو اس کی طرف التفات نہیں ہوتا اس صورت میں وہ تو ہم سے غائب نہیں مگر یہ کہنا صحیح ہے کہ تم اس سے غائب ہو کیونکہ تمہارا علم اس سے متعلق نہیں۔ اس کے بعد جب تم کو اس کی طرف التفات ہوا اور تم نے اس کو پہچانا اب غیبت کے بعد حضور ہوا بہر حال غیبت سالک سے مراد عدم معرفت ہے اور حضور سے مراد معرفت ہے اسی کو قرب کہا جاتا ہے۔

اس تقریر سے ایک اشکال کا جواب بھی ہو گیا وہ یہ کہ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (ہم اس کی طرف شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں) سے بظاہر یہ لازم آتا ہے کہ جب حق تعالیٰ ہم سے قریب ہیں تو ہم بھی ان سے قریب ہوں کیونکہ قرب و بعد امور نسبیہ ہیں۔ اور امور نسبیہ کے لئے طرفین ضروری ہیں تو جب ایک شے دوسری شے سے قریب ہے تو یقیناً دوسری بھی اس سے قریب ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ زید تو عمرو کے قریب ہو اور عمرو اس سے قریب نہ ہو بلکہ اگر وہ اس سے قریب ہے تو یہ بھی اس سے قریب ہے اور اس بناء پر لازم آتا ہے کہ سارا جہان مقرب ہو جائے جواب اس اشکال کا یہ ہے کہ یہ بات قربِ حسی و قربِ مکانی میں ہوا کرتی ہے کہ ایک شئے کا دوسری سے قرب ہونا اس کے قرب کو بھی مستلزم ہے اور یہاں حق تعالیٰ کو بندہ سے اور بندہ کو حق تعالیٰ سے جو قرب ہوتا ہے وہ قربِ مکانی حسی نہیں بلکہ قربِ علمی ہے اور قربِ علمی میں یہ لازم[1] نہیں کہ اگر ایک شخص کو دوسرے سے قربِ علمی حاصل ہو تو دوسرے کو بھی اس سے قربِ علمی حاصل ہو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ایک کو دوسرے کا علم ہو

---

[1] فان قلت اذا كان القرب من الامور النسبية يلزم فى القرب العلمى ايضاً من قرب احد الشيئين بالآخر قربه به قلت الذى يلزم فى القرب العلمى من قرب احد هما بالآخر هو كون الآخر قريباً منه من حيث المعلومية دون العالمية فمراد الشيخ ان قرب شئ بالآخر من حيث العالمية لايستلزم قرب الآخر به من هذه الحيثية فيجوز ان يكون احد عالما بك و تكون انت جاهلا به و اما ان قرب شئى بالآخر من حيث العالمية لايستلزم قربه به من حيث المعلومية ايضاً فلم يرده الشيخ اصلا ۱۲ جامع

اور دوسرے کو اس کا علم نہ ہو۔ جیسا اوپر ایک مثال کے ضمن میں بتلایا گیا ہے۔ پس خدا تعالیٰ کو تو سب بندوں سے قرب علمی حاصل ہے مگر بندوں میں سب کو خدا تعالیٰ سے قرب علمی حاصل نہیں کیونکہ بہت سے اس سے غافل ہیں اس لئے حق تعالیٰ نے وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ (ہم اس سے زیادہ قریب ہیں) فرمایا ہے هو اقرب الينا (وہ ہماری طرف زیادہ قریب) نہیں فرمایا۔

اور یہ کوئی چیستاں نہیں ہے اس کی حقیقت یہی ہے کہ حق تعالیٰ کا علم تو ہمارے ساتھ ہر وقت متعلق ہے اس لئے وہ اپنے علم سے ہمارے بہت نزدیک ہیں اور ہمارا علم حق تعالیٰ کے ساتھ یا تو متعلق ہی نہیں ہے یا متعلق ہے تو ہر دم متعلق نہیں۔ اس لئے ہم اپنے علم سے حق تعالیٰ سے ہر دم قریب نہیں ہیں خوب سمجھ لو۔

اور ہاں ایک بات پر میں اور متنبہ کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ مشاہدہ مطلق علم باللہ کا نام نہیں کیونکہ فی الجملہ علم تو خدا تعالیٰ کا سب کو حاصل ہے تو پھر سب کو صاحب مشاہدہ کہنا چاہیے بلکہ مشاہدہ اس تعلق علم کا نام ہے جو حق تعالیٰ کی صفات کاملہ کے واسطہ سے ہو پھر یہ نہیں کہ ایک بار تعلق ہو گیا پھر نہ رہا بلکہ اس سے علم کا استحضار بھی مشاہدہ میں شرط ہے اسی کو معرفت کہا جاتا ہے (اور اس کے مقابل عدم معرفت سے بھی یہ مراد نہیں کہ حق تعالیٰ کا بالکل علم نہ ہو کیونکہ اس کا وقوع عالم میں نہیں اور کم از کم مسلمانوں میں تو ہے ہی نہیں بلکہ عدم معرفت سے مراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا علم بواسطہ صفات کاملہ کے استحضار کے ساتھ نہ ہو ۱۲ جامع)

یہاں سے یہ شبہ زائل ہو گیا کہ جب مشاہدہ قرب علمی کا نام ہے تو جن مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کا علم حاصل ہے اور ایسے سب ہی مسلمان ہیں ان کو صاحب مشاہدہ کیوں نہیں کہا جاتا جواب یہ ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کا ویسا علم حاصل نہیں جیسا ہونا چاہیے۔ اول تو بہت سوں کو اللہ تعالیٰ کی صفات کاملہ کا علم نہیں اگر ہے تو اجمالاً ہے تفصیلاً نہیں پس ان کے علم کی وہی شان ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ میں نے بادشاہ کو دیکھا تھا اس کے ایک سونڈ تھی اور آنکھیں نہیں تھیں ظاہر ہے کہ جاننے والا یہی کہے گا کہ تو نے بادشاہ کو نہیں دیکھا اور جن لوگوں کو حق تعالیٰ کے صفات کاملہ کا تفصیلی علم بھی ہے جیسے بہت سے علماء ظاہر کی یہ شان ہے تو ان کو اس علم کا استحضار نصیب نہیں اس لئے وہ بھی صاحب مشاہدہ نہیں ہیں۔ پس مشاہدہ کے یہ معنی ہوئے کہ توجہ کرنا حق تعالیٰ کی طرف مرتبہ صفات میں یعنی بواسطہ صفات کے مع استحضار توجہ کے دائماً

معائنہ حق

اور ایک درجہ حضور کا اس سے آگے ہے اس کو معائنہ کہا جاتا ہے وہ توجہ کرنا ہے ذات حق کی طرف بلا واسطہ صفات کے یہ مطلب نہیں کہ اس شخص کو صفات کا علم نہیں ہوتا۔ صفات کا علم تو ہوتا ہے اور پہلے وہ بھی صفات کے واسطہ سے متوجہ بحق ہوتا ہے لیکن اب اس کی توجہ کے لئے واسطہ صفات کی ضرورت نہیں

رہی بلکہ بلاواسطہ ذات کی طرف متوجہ ہوتا ہے گو یہ توجہ اجمالی ہی ہو مبہم ہی ہو من وجہ ہی ہو لیکن ملتفت الیہ بالذات اس وقت عین ذات ہوتی ہے صفات ملتفت الیہ نہیں ہوتیں اور درجہ مشاہدہ میں ملتفت الیہ بالذات صفات تھیں اور ذات ملتفت الیہ بواسطہ تھی گو مقصود اس وقت بھی توجہ الی الذات ہی ہوتی ہے مگر چونکہ اس شخص کو بلاواسطہ صفات کے ذات کی طرف توجہ نہیں ہوتی اس لئے التفات اولی صفات ہی کی طرف ہوتا ہے پس قصد کے لحاظ سے تو مشاہدہ میں بھی ذات مقصود بالذات ہے اور صفات مقصود بالعرض مگر التفات کے لحاظ سے صفات ملتفت الیہ بالذات ہیں اور ذات ملتفت الیہ بالعرض۔

توضیح کے لئے ایک مثال میں اس فرق کو سمجھئے مثلاً ایک شخص محبوب کے پاس حاضر ہے لیکن محبوب کے اور اس کے درمیان ایک پردہ پڑا ہوا ہے اس وقت مقصود تو اس کو بھی ذات محبوب کی طرف توجہ ہے لیکن حجاب کی وجہ سے یہ عین ذات کی طرف بلاواسطہ توجہ نہیں کرسکتا بلکہ محبوب کی صفات حسن و جمال کو ذہن میں حاضر کر کے لذت لیتا اور ان کو توجہ الی المحبوب کا واسطہ بناتا ہے اور ایک شخص محبوب کے پاس اس طرح حاضر ہے کہ درمیان میں کوئی حجاب نہیں اس کی توجہ اولاً ذات کی طرف ہوگی گو طبعاً صفات کی طرف بھی التفات ہوگا تو پہلے شخص کا ملتفت الیہ بالذات صفات تھیں اور ذات ملتفت الیہ بالعرض۔ وہ تو صاحب مشاہدہ ہے اور دوسرے شخص کا ملتفت الیہ بالذات عین ذات ہے اور صفات ملتفت الیہ بالعرض یہ صاحب معائنہ ہے باقی قرب دونوں کو حاصل ہے صاحب معائنہ کو بھی اور صاحب مشاہدہ کو بھی گو کیفیت قرب میں تفاوت ہو۔

اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ صاحب معائنہ کے لئے کوئی حجاب باقی نہیں رہتا۔ سب حجابات مرتفع ہو جاتے ہیں نہیں حجاب اس کے لئے بھی باقی ہے۔ لیکن یہ حجاب التفات اولی الی الذات سے مانع نہیں گو یہ التفات اجمالی ہی ہو مبہم ہی ہو مگر اولاً بالذات ذات ہی کی طرف ہے اور صاحب مشاہدہ کے درمیان جو حجابات ہیں وہ ذات کی طرف التفات اولی ہی سے مانع ہیں یہ فرق ہے دونوں میں۔ خوب سمجھ لو۔

اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ معائنہ میں صفات کی نفی نہیں ان کی طرف التفات کی نفی ہے میں یہ مضامین دقیقہ مجمع میں بیان نہ کرتا مگر چونکہ آج کل تصوف کی کتابیں اردو میں بھی ترجمہ ہوگئی ہیں جن کو عوام دیکھتے ہیں اور سمجھتے نہیں جس سے بہت لوگوں کا ایمان غارت ہوتا ہے اس لئے میں نے یہ مضامین بیان کر دیئے کہ اگر کسی کی نظروں سے کتابوں میں یہ مضامین گزرے ہوں اور حقیقت سمجھ میں نہ آئی ہو وہ اس بیان سے حقیقت کو سمجھ لے اور جس کی نظر سے یہ مضامین نہ گزرے ہوں اس کو ان کے سمجھنے کی ضرورت نہیں۔

مقصود مجاہدہ

غرض ہر قوم کی اصلاح جدا ہے صوفیہ اس مقصود کو جس پر سفر سلوک من وجہ منتہی ہوتا ہے مشاہدہ کہتے ہیں اور

مشاہدہ کے معنے ان کے نزدیک حضور ہیں اور حضور کی حقیقت وہ ہے جو میں نے ابھی بیان کی اور مشاہدہ سے رویت مراد نہیں کیونکہ وہ دنیا میں نہیں ہو سکتی۔ہاں آخرت میں ہوگی اسی واسطے بزرگوں نے وصیت کی ہے

؎ عنقا شکار کس نشود دام باز چیں　　　کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را

(جس طرح عنقا کو کوئی شکار نہیں کر سکتا جال پھیلانا بیکار اور کوشش کرنا لاحاصل ہے اسی طرح ذات محبت کی کنہ کا ادراک نہیں ہو سکتا اس کے لئے فکر وسوچ بے کار ہے) یعنی دیدار کی ہوس دنیا میں نہ کرو اتنا ہی بہت ہے کہ ادھر توجہ ہو جائے غیر سے توجہ ہٹالی جاوے اور حق تعالیٰ کو راضی کیا جائے۔ بس یہی مقصود ہے اور اسی مقصود کو علمی اصطلاح میں قرب و رضا سے تعبیر کیا جاتا ہے۔نشاط دنیا میں تمام مجاہدات کا منتہیٰ یہی ہے کہ حق تعالیٰ کا قرب حاصل ہو۔

اس آیت میں اسی مقصود کے حصول کا وعدہ ہے گو اس کی تعبیر سبل سے کی گئی ہے کیونکہ خود مقصود میں مدارج غیر متناہی ہیں اور ہر درجہ آئندہ درجہ کے لئے سبیل ہے اس لئے یہ آیت مجاہدہ کے بعد وعدہ حصول مقصود یعنی مشاہدہ پر دلالت کرتی ہے۔

نسبت باطنیہ

اور یہاں میں ایک بات پر تنبیہ کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ تقریر سابق سے تو یہ معلوم ہو گیا کہ مشاہدہ مقصود ہے اور مشاہدہ کے معنی حضور ہیں مگر حضور سے مراد یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طرف اتنی توجہ ہو کہ غیر کی طرف اتنی توجہ نہ ہو۔بعبارت دیگر یوں کہیئے کہ دوسروں کی طرف اتنی توجہ نہ رہے جتنی حق تعالیٰ کی طرف ہے۔یہی حاصل ہے نسبت باطنیہ کا باقی یہ کہ غیر کی طرف بالکل التفات نہ ہو۔سو ایسا بھی کبھی کبھی ہوتا ہے مگر محققین نے لکھا ہے کہ اس کا ہمیشہ ہونا ضروری نہیں چنانچہ عارف فرماتے ہیں

؎ در بزم دور یک دو قدح در کش و برو　　　یعنی طمع مدار وصال دوام را

مشاہدہ کا نام وصال بھی ہے۔تو نسبت باطنیہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ غیر کی طرف بالکل التفات نہ ہو بلکہ اتنا کافی ہے کہ غیر کی طرف التفات کم ہو اور حق تعالیٰ کی طرف توجہ زیادہ ہو کہ اکثر اوقات اس کی طرف توجہ رہے۔

حدیث شریف میں بھی اس کی تصریح ہے چنانچہ ایک مرتبہ حضرت حنظلہ صحابی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے راستہ میں ملے حضرت صدیق اکبر نے پوچھا کیا حال ہے فرمایا **نافق حنظلة** یعنی حنظلہ منافق ہو گیا۔پوچھا کیوں؟ **قال اذا کنا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کنا عندہ کانا تری الجنة والنار رؤیة عین و اذا فارقناہ نافسنا الاموال والاؤلا دقال ابوبکر و انا کذالک**

یعنی فرمایا جب ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہوتے ہیں تو ہماری یہ حالت ہوتی ہے گویا جنت و نار کو اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ پھر آپ سے جدا ہو کر اموال و اولاد میں لگ جاتے ہیں اور یہ حالت نہیں رہتی۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میرا بھی یہی حال ہے اگر یہ نفاق ہے تو ہم بھی منافق ہیں۔ چلو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے چل کر دریافت کریں۔

صحابہؓ کی خشیت وشدت حرص کی کچھ حد ہے کہ تغیر حالت کو بھی نفاق سمجھنے لگے وہ چاہتے تھے کہ جو حالت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوتی ہے وہی حالت ہمیشہ رہے اور اس کے تغیر سے ان کے ضعف ایمان کا اندیشہ تھا آج ہماری یہ حالت ہے کہ تغیر احوال سے تو کیا اندیشہ ہوتا تغیر اعمال سے بھی اندیشہ نہیں ہوتا کبھی جماعت فوت ہو جاتی ہے کبھی نماز قضا ہو جاتی ہے کبھی غیبت و نگاہ بد میں مبتلا ہیں اور اپنے کو صاحب نسبت اور صاحب کمال سمجھتے رہتے ہیں ذرا بھی اندیشہ نہیں ہوتا کہ یہ حالت کیسی ہے سو بات یہ ہے کہ عشق میں کمی ہے عشق کامل ہو تو بات بات میں اندیشہ اور خوف ہوتا ہے۔

؎ باسایہ ترا نمی پسندم عشق است و ہزار بدگمانی

(عشق میں ہزاروں بدگمانیاں ہوتی ہیں تو تجھ سایہ کے ساتھ بھی رہنا پسند نہیں کرتا)

میرے ایک دوست مولوی صادق الیقین صاحب وہ کہتے تھے کہ مجھے ڈر ہے کہ کہیں حق تعالیٰ مجھ سے اس پر مواخذہ نہ فرمائیں کہ تو اتنا بڑا متقی کیوں تھا۔ ان کو زیادہ تقویٰ پر بھی اندیشہ تھا۔ زاہد خشک اس کو نہ سمجھے گا۔ وہ تو یہ کہے گا کہ قلت تقویٰ تو اندیشہ کی چیز ہے کثرت تقویٰ میں کیا اندیشہ ہے۔ یہ تو جتنا زیادہ ہو اچھا ہے مگر فقہاء نے اس راز کو سمجھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ جو شخص ایک حبہ حنطہ کو لقطہ سمجھ کر اس کی تعریف و تشہیر کرے حاکم اس کو سزائے تعزیر دے۔ کیونکہ یہ تقویٰ کا ہیضہ اور غلو فی الدین ہے۔ کہ ایک گیہوں کے دانے کو پوچھتے پھرتے ہیں کہ یہ کس کا ہے۔ واقعی شریعت پل صراط ہے بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔ اگر تقویٰ کی کوئی حد نہ ہوتی تو تقویٰ آسان تھا مگر یہاں تو ہر چیز کی حد ہے جس سے آگے بڑھنے کی ممانعت ہے اس لئے مولوی صادق الیقین صاحب کو اندیشہ تھا کہ میں جو ورع و تقویٰ میں بہت سعی کرتا ہوں کہیں یہ غلو فی الدین کی حد تک نہ پہنچ گیا ہو۔

ان کا یہ اندیشہ بھی ویسا ہی تھا جیسا حضرت حنظلہ کو اپنے اوپر نفاق کا خوف ہوا تھا وہ نفاق کو عام سمجھ گئے حالانکہ نفاق نام ہے اظہار الایمان و ابطان کفر (کفر چھپانا) کا مگر چونکہ اس حالت کو فی الجملہ اس سے مشابہت تھی اس لئے خوف ہوا اور فی الجملہ مشابہت یہ تھی کہ جو حالت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوتی تھی وہ پیچھے نہ رہتی تھی اور نفاق میں بھی یہی ہوتا ہے کہ سامنے کچھ اور پیچھے کچھ تو جتنا حضور

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ہوتا تھا بعد میں اس میں کمی ہونے سے اندیشہ نفاق کا ہوا گو نفاق کامل نہ سہی ناقص ہی سہی کیونکہ جس طرح ایمان کے بہت سے مراتب ہیں اسی طرح نفاق کے بھی مراتب ہیں۔ نفاق دون نفاق (نفاق کم درجہ کا نفاق) و کفر دون کفر (کفر کم درجہ کا کفر ہے) مگر عاشق کے نزدیک نفاق ناقص کا احتمال بھی خطرناک اور اندیشہ ناک ہے۔ اب دونوں حضرات طبیب کامل سید الاطبیاء الروحانیین کے پاس پہنچے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

واللّٰہ کنتم بعدی کما تکونون عندی لصافحتکم الملائکۃ علی الفرش ولکن یا حنظلۃ ساعۃ و ساعۃ (اوکما قال)(الصحیح المسلم کتاب التوبہ ۱۲)

بخدا اگر تم میرے پیچھے بھی ویسے ہی رہو جیسے میرے سامنے ہوتے ہو تو تم سے فرشتے بستروں پر مصافحہ کیا کرتے لیکن اے حنظلہ ایک وقت اس طرح کا ہوتا ہے ایک وقت اس طرح کا یہاں علماء قشر کو یہ شبہ ہوا کہ حضرت حنظلہ کی موجودہ حالت کامل نہ تھی۔ گو نفاق بھی نہ تھی۔ کامل حالت وہی ہے کہ جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بھی ویسے ہی رہتی جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ فرشتے مصافحہ کرنے لگتے۔ مگر محققین نے فرمایا ہے کہ نہیں حالت موجودہ ہی کامل تھی کیونکہ ہر چیز کا کمال جدا ہے۔ انسان کا کمال یہی ہے کہ اس میں بشریت کامل ہو جیسے روٹی کا کمال یہ ہے کہ اس میں سیلان نہ ہو بلکہ رطوبت کم ہو جائے۔ سیلان پانی کا کمال ہے اسی طرح حق تعالیٰ نے انسان کو جس حکمت کے لئے پیدا کیا ہے اس حکمت کا ظہور جس انسان سے ہو وہ تو انسان کامل ہے وہی عالم ناسوت میں رکھا جائے گا اور جس میں ملکیت کا غلبہ ہو جاوے وہ عالم ملکوت میں پہنچا دیا جائے گا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا حاصل یہ تھا کہ بشریت کا مقتضاء یہی ہے جو تم کو پیش آیا ہے کہ کبھی حضور کامل ہے کبھی حضور ضروری کیونکہ غیبت محضہ تو کاملین کو ہوا ہی نہیں کرتی اور حضرت حنظلہ کے قول

نافسنا الاموال والاولاد

(مال اور اولاد میں لگ جاتے ہیں) سے غیبت محضہ کا ہو جانا مراد نہیں بلکہ اس درجہ کا حضور نہ رہنا مراد ہے۔ جیسا رسول اللہ صلی الہ علیہ وسلم کے سامنے ہوتا تھا سو حضور کے مراتب مختلف ہیں کبھی کاملین کو اعلیٰ درجہ کا ظہور ہوتا ہے کبھی اس سے کم (۱۲) اگر تمہاری ہمیشہ وہی حالت رہے جو میرے سامنے ہوتی ہے تو فرشتے تم سے مصافحہ کرتے یعنی تم میں ملکیت غالب ہو جاتی اور ملائکہ سے جا ملتے اور اس حالت میں تم انسان کامل نہ ہوتے۔ لہٰذا حالت موجودہ ہی کامل ہے۔

یہ تقریر ہے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب قدس سرہٗ کی واقعی آب زر سے لکھنے کے قابل ہے

کیونکہ اگر یہ حالت جو حضرت حنظلہ نے بیان فرمائی تھی ناقص حالت ہے تو اس سے حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا بھی ناقص ہونا لازم آتا ہے کیونکہ انہوں نے یہ حالت سن کر فرمایا کہ میرا بھی یہی حال ہے اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی نسبت نقص کا وہم بھی نہیں ہوسکتا اور اگر یہ نقص ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی تکمیل کا طریق ارشاد فرماتے۔ لیکن آپ نے تو اس حالت کی تقریر فرمائی اور قصہ ہی ختم کردیا۔ اور فرمایا کہ یوں ہی ہونا چاہیے معلوم ہوا کہ تغیر حالت نقص نہیں اور کمال کے لئے حضور کا ہمیشہ یکساں ہونا لازم نہیں پس نسبت باطنیہ کی یہ حقیقت نہیں کہ غیر کی طرف التفات بالکل نہ ہو بلکہ اس کی حقیقت یہ ہے کہ غیر کی طرف حق تعالیٰ سے زیادہ التفات نہ ہو اسی لئے عارف فرماتے ہیں

؎ در بزم دور یک دو قدح درکش و برد یعنی طمع مدار وصال دوام را

(بزم دور میں ایک دو پیالے پیو اور چلتے بنو یعنی ہمارے ہمیشہ وصال کی طمع نہ رکھو)

اگر ہر دم استغراق کامل ہی میں رہے تو مجذوب ہو جائے گا جو نہ اپنے کام کا ہے نہ دوسرے کے کام کا نہ نماز کا رہے گا نہ روزے کا نہ بیوی بچوں کا نہ کھانے کمانے کا۔

واسطہ بین الحق والعبد

غرض نسبت باطنیہ کے لئے ہر وقت استغراق لازم نہیں نسبت باطنیہ یہی ہے کہ حق تعالیٰ کی طرف دھن اور التفات لگ جائے گو کبھی استغراق ہو کبھی نہ ہو یہ دوسرا مقدمہ ہوا تعیین مقصود میں کہ وہ قرب حق ہے۔

اب تیسرا مقدمہ سمجھئے۔ وہ یہ کہ حق تعالیٰ یہاں دنیا میں ہم سے غائب ہیں یعنی حواس سے ان کا ادراک نہیں ہوسکتا۔ چوتھا مقدمہ یہ کہ غائب کی طرف طبعاً توجہ قوی و مستمر نہیں ہوسکتی توجہ کامل و مستمر حاضر محسوس ہی کی طرف ہوسکتی ہے غائب کی طرف تھوڑی دیر توجہ ہوتی ہے پھر غائب ہو جاتی ہے تو اس توجہ کی قوت کے لئے کوئی واسطہ ہونا چاہیے اور واسطہ بھی ایسا ہو جو انسان کے مناسب ہو۔

یوں تو مراقبات اور اشغال بہت ہیں مگر ان میں بھی کسی محسوس کی طرف توجہ نہیں ہوتی غائب ہی کی طرف توجہ ہوتی ہے اور انسان کی خاصیت یہ ہے کہ غائب سے دفعۃً اس کا تعلق قوی نہیں ہوتا اب اس تعلق کے قوی کرنے کی دو صورتیں ہیں۔ یا تو حق تعالیٰ خود سامنے ہوں یہ تو دنیا میں دشوار ہے دوسری صورت یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے ساتھ خاص تعلق رکھنے والی کوئی چیز اس کے سامنے ہو جس سے حق تعالیٰ کا خاص تعلق ہو کیونکہ تعلق عام توجہ خاص کیلئے کافی نہیں عاشق محبوب کے شہر میں جاتا ہے تو گو شہر سے بھی محبوب کو تعلق ہے مگر اتنا نہیں جتنا خاص اپنے گھر سے ہے۔ اسی لئے شہر میں جا کر عاشق کی وہ حالت نہیں ہوتی جو خاص گھر کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ غرض دلائل سے اس کی ضرورت ثابت ہوگئی کہ کوئی چیز

ایسی ہونی چاہیے جس کے ذریعے سے حق تعالیٰ کی یادداشت بڑھ جائے اور اس کی طرف توجہ جم جائے۔ شریعت نے اس کا بہت اہتمام کیا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ

یا انس افعل بصرک حیث تسجد (کنزالعمال ۹/۲۰۰۰)

یعنی نماز میں نظر ادھر ادھر نہ لے جاؤ بلکہ سجدہ کی جگہ پر نظر رکھو کہ سجدہ کی جگہ پر رحمت کا نزول ہوتا ہے جیسا ابھی آتا ہے اگر صاحب قرب کا مشاہدہ نہیں ہے تو کم از کم مقام قرار ہی کا مشاہدہ کرتے رہو۔ اس سے توجہ الی اللہ میں اعانت ہوگی۔

اسی طرح نماز میں فعل عبث سے ممانعت ہے سکون کا امر ہے۔

قال صلی اللہ علیہ وسلم اذا قام احدکم الی الصلوٰۃ ولا یمسح الحصافان الرحمۃ تواجھہ (سنن ترمذی ۳۷۹)

یعنی کنکریوں کو نماز میں نہ چھوؤ کیونکہ حق تعالیٰ کی رحمت سامنے ہوتی ہے۔ اسی طرح نماز میں ادھر ادھر دیکھنے کی ممانعت فرمائی اور علت اس کی یہ ارشاد فرمائی ہے:

لایزال اللّٰہ عزوجل مقبلاً علی العبد وھو فی صلاتہ مالم یلتفت فاذا التفت انصرف عنہ (شرح السنۃ للبغوی ۳/۲۵۳)

جب بندہ (خدا سے اعراض کر کے) ادھر ادھر متوجہ ہوتا ہے وہ بھی بندہ سے اعراض کرتے ہیں ان روایات میں مقام سجدہ اور جہت قبلہ کی طرف متوجہ رہنے کی کتنی تاکید ہے اب خدا تعالیٰ تو نظر نہیں آتے مگر وہی موقع جو مقام عبادت ہے اس کو خدا تعالیٰ سے خاص تعلق ہے ادھر متوجہ ہونا گویا خدا تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے کیونکہ حق تعالیٰ کی طرف توجہ بواسطہ ہی ہوسکتی ہے غائب کی طرف توجہ بلا واسطہ دائم نہیں رہ سکتی ذرا توجہ کی اور اچٹ گئی اس لئے وسائط کی ضرورت ہے اور ان وسائط کو جس طرح بقاء توجہ میں دخل ہے حدوث توجہ میں بھی دخل ہے کیونکہ ان کو حق تعالیٰ سے تعلق ہے تو ان کی طرف متوجہ ہونے سے حق تعالیٰ کی طرف توجہ پیدا بھی ہوگی اور متوجہ رہنے سے توجہ الی اللہ دائم بھی رہے گی اور چونکہ اس واسطہ کی تجویز اور طریق استعمال اور اس کے حدود واصول اور حکمت توسط سب مشروط ہیں اور ورود نص کے ساتھ اس لئے ان وسائط پر دوسرے وسائط مبتدعہ ومخترعہ کو قیاس کرنا جائز نہیں جیسا رسالہ الوسط بین الخلق والحق میں اس کی خوب تحقیق کی گئی ہے منجملہ ان ہی وسائط کے ایک واسطہ بیت اللہ ہے۔ حق تعالیٰ نے انسان کی اس خاصیت کی رعایت کے لئے کہ اس کی توجہ غائب کی طرف بلا واسطہ دائم نہیں رہ سکتی دنیا میں ایک مقام کو اپنی ذات کی طرف منسوب فرمایا اور اس کو اپنا گھر

کہا اور اس میں وہ انوار و برکات رکھے جن کی وجہ سے خدا تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت صحیح ہوگئی ورنہ خدا تعالیٰ مکان سے منزہ ہے۔

پھر بندوں کو اس کے حج کا حکم دیا اب وہاں جا کر عشاق کی وہی حالت ہوتی ہے جو عاشق مجازی کی محبوب کے گھر کو دیکھ کر ہوتی ہے کیونکہ اس بیت کو بھی حق تعالیٰ سے ایک خاص تعلق ہے لیکن یہ وسائط نفع وضرر کے اعتبار سے کسی درجہ میں مقصود نہیں ہیں۔

موحد و مشرک میں فرق

اور یہی فرق ہے موحد و مشرک میں مشرک ان وسائط کو نفعاً وضراً مقصود سمجھتا ہے اور موحد غیر مقصود سمجھتا ہے گو مشرکین بھی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم بتوں کو محض یکسوئی کے لئے سامنے رکھتے ہیں مگر ان کا برتاؤ اس کا کذب ہے۔ وہ بتوں کے لئے نذر و نیاز کرتے ہیں۔ ان کے آگے ہاتھ جوڑتے ہیں اور ان سے ہی مرادیں مانگتے ہیں اور ان کو متصرف و موثر سمجھتے ہیں۔ یہاں ان سب باتوں کی ممانعت ہے اول تو یہاں ایسی چیزوں کو واسطہ بنایا ہی نہیں گیا جن میں کسی جاہل کی رسم و عادت سے موثر و دخیل ہونے کا شبہ ہو سکے۔ چنانچہ بیت اللہ ایک مکان کی شکل میں ہے مختصر سی کوٹھڑی ہے کسی آدمی یا جن کی شکل میں نہیں اور کوٹھڑی کو کسی نے کبھی فاعل یا موثر نہیں سمجھا۔

اور اگر کسی کو شبہ بھی ہوتا تو فوراً صاف صاف اس کا ازالہ بھی کر دیا گیا چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کی تقبیل کے موقع پر فرمایا

انی لاعلم انک حجر لا تضر ولا تنفع ولو لا انی رایت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقبلک ما قبلتک یعنی میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو نہ نفع دے سکے نہ ضرر دے سکے مگر میں صرف اس لئے تجھ کو چومتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو میں نے تیری تقبیل کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ورنہ تجھ کو ہرگز نہ چومتا۔ اور قرآن میں جہاں استقبال بیت کا امر ہے وہاں صاف ارشاد ہے **فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ**

اپنے منہ کو مسجد حرام کی طرف پھیر دیجئے) یہ نہیں فرمایا فَوَلِّ وَجْهَكَ لِلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (اپنے چہرہ کو مسجد حرام کے لئے پھیر لیجئے) اس آیت میں لفظ شطر بڑھا کر بتلا دیا گیا کہ کعبہ محض سمت عبادت ہے خود مقصود و مسجود نہیں ہے پس مسلمان بڑے زور سے دعوے کرتے ہیں کہ ہم کعبہ کو سجدہ نہیں کرتے اس کی عبادت نہیں کرتے نہ وہ معبود ہے نہ مقصود ہے نہ مسجود ہے نہ مطلوب محض سمت عبادت اور جہت صلوٰۃ ہے۔

بھلا مشرکین تو ذرا اپنے بتوں کے سامنے ایسا کہہ دیں جیسا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حجر اسود کے

سامنے کہا تھا کہ تو نہ نفع دے سکتا ہے نہ ضرر دے سکتا ہے نہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں نہ ہم تجھے سجدہ کرتے ہیں مشرکین کبھی ایسا نہیں کہہ سکتے معلوم ہوا کہ وہ اپنے بتوں کو محض سمت عبادت نہیں سمجھتے بلکہ موثر و متصرف و معبود و مسجود سمجھتے ہیں۔ پھر مسلمانوں کا یہ محض دعویٰ ہی نہیں بلکہ اس پر دلائل قائم ہیں وہ یہ کہ مسلمان کعبہ کے اوپر بھی بعض دفعہ چڑھتے ہیں اس پر پیر رکھتے ہیں۔ ذرا کوئی مشرک تو اپنے بت پر پیر رکھ کر دکھلا دے۔ مسلمانوں نے بعض دفعہ کعبہ کو مرمت وغیرہ کے لئے اپنے ہاتھ سے توڑا ہے اور گرایا ہے۔ مشرک تو ذرا اپنے بت کو اپنے ہاتھ سے توڑ کر دکھلا دے۔ پھر اگر خدانخواستہ کعبہ کو ہمارے سامنے سے ہٹا دیا جائے تو ہم جب بھی نماز ادھر ہی پڑھیں گے۔ اور مشرک کے سامنے سے بت کو ہٹا لو تو وہ اپنی عبادت ترک کر دے گا اس سے صاف معلوم ہوا کہ مشرکین کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ ہم بتوں کو سمت سمجھ کر سامنے رکھتے ہیں۔ اور مسلمانوں کا دعویٰ صحیح ہے کیونکہ وہ کعبہ کے بغیر بھی نماز پڑھ سکتے ہیں۔

بہرحال یہ وسائط محض اس لئے مشروع ہوئے ہیں کہ انسان کی خاصیت یہ ہے کہ وہ غائب کی طرف بلاواسطہ ہمیشہ متوجہ نہیں رہ سکتا باقی یہ وسائط مقصود نہیں ہیں اور خیر یہ وسائط تو کیا مقصود ہوتے ان سے بڑھ کر جو وسائط ہیں یعنی وسائط فی السلوک وہ بھی مقصود نہیں ہیں۔ ہر واسطہ میں مسلمان کا مقصود صرف ایک ہی ذات ہے۔

اقسام واسطہ اور ان کی حیثیت

اور یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وسائط کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وسائط فی العلوم جو تعلیم طریق ہیں واسطہ ہیں دوسرے وسائط فی العمل جو توجہ فی اداء العبادۃ میں واسطہ یعنی معین ہیں اور توحید کی کس قدر حفاظت کی گئی ہے کہ وسائط طریق کو سمت عبادت نہیں بنایا گیا گو فضیلت ان کی کعبہ سے زیادہ ہے چنانچہ علماء امت کا اتفاق ہے کہ جس بقعہ ارض سے سیدنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر مماس ہے وہ عرش سے بھی افضل ہے تو کعبہ سے تو بدرجہ اولیٰ۔ اور ظاہر ہے کہ یہ فضیلت اس جگہ میں محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اتصال سے آئی ہے تو خود آپ کی ذات مقدس تو یقیناً عرش سے افضل ہو گی اور عرش کعبہ سے افضل ہے تو آپ کعبہ سے بھی افضل و اعظم ہیں۔

نیز ترمذی کی حدیث میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے ایک دن کعبہ کو دیکھا اور اس کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں تیری عظمت اور حرمت کو جانتا ہوں مگر مومن کی حرمت[1] اللہ تعالیٰ کے

---

[1] اس حدیث نے تو مخالفین کے اعتراضات کا استیصال ہی کر دیا بھلا جب مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر مسلمان کی حرمت کعبہ سے زیادہ ہے تو پھر استقبال کعبہ سے یہ شبہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ مسلمان کعبہ کو مقصود و مسجود و معبود سمجھتے ہیں کوئی عابد بھی اپنے کو معبود سے افضل سمجھا کرتا ہے ہرگز نہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو کعبہ سے افضل سمجھتے ہیں پھر وہ ان کا معبود و مسجود کیونکر ہو سکتا ہے بس سوا اس کے کچھ نہیں کہ کعبہ محض سمت عبادت ہے۔ (۱۲ جامع)

نزدیک تیری حرمت سے بھی زیادہ ہے اسی لئے نماز سے فارغ ہو کر جب امام بیٹھتا ہے تو مسلمانوں کی طرف منہ کر کے کعبہ سے انحراف کر لیتا ہے۔ جب ہر مسلمان کی حرمت کعبہ سے زیادہ ہے تو حضرات مشائخ طریق اور انبیاء اولیاء ہیں۔ یقیناً ان کی حرمت کعبہ سے بدرجہ اولیٰ زیادہ ہوگی۔ مگر بایں ہمہ ان کو سمت عبادت نہیں بنایا گیا۔ کیونکہ کعبہ تو ایک کوٹھڑی ہے اس کی سمت عبادت ہونے سے کسی کو اس کے مقصود و مسجود ہونے کا وہم نہیں ہو سکتا کوئی بہت ہی احمق ہوگا جسے ایسا وہم ہو۔

بخلاف وسائط تعلیم کے کہ ان کو سمت عبادت بنانے میں اندیشہ قوی تھا کہ جہلا ان کو مقصود و مسجود سمجھ جائیں اس لئے کہ وسائط تعلیم میں سب سے افضل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ کی حالت یہ تھی کہ ہزاروں معجزات و خوارق عادات آپ کے ہاتھ سے ظاہر ہوئے۔ آپ کی ذات بابرکات میں سینکڑوں کمالات ایسے موجود تھے جو کسی انسان میں نہ تھے اس حالت میں اگر آپ کی ذات کو سمت عبادت بنا دیا جاتا تو یقیناً بہت سے جاہل آپ کو خدا بنا لیتے باوجود سمت عبادت نہ بنانے کے تو جہلا کی یہ حالت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بشریت سے نکالنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کی ذات کو سمت عبادت بھی بنا دیا جاتا تو نہ معلوم لوگ کیا غضب ڈھاتے۔ اسی طرح اہل اللہ میں اپنے زمانہ کے لوگوں سے زیادہ کمالات معنویہ ہوتے ہیں اور بعض صاحب کرامات حسیہ بھی ہوتے ہیں ان کو سمت عبادت بنانے میں یہی اندیشہ تھا اس لئے وسائط تعلیم کو سمت عبادت نہیں بنایا گیا گو فضیلت میں وہ کعبہ سے بدرجہا زائد ہوں مگر ان کے احکام اور ہیں اور وسائط فی العمل کے احکام اور ہیں وسائط تعلیم کی طرف سجدہ کرنا یا ان کی طرف جھکنا حرام ہے اور وسائط فی العمل کے ساتھ یہ برتاؤ ہے کہ عبادت میں ان کی طرف منہ کیا جاتا ہے۔

ضرورت بیت اللہ الکریم

ایسے ہی وسائط میں سے ایک واسطہ بیت اللہ ہے کہ اس کے خاص تعلقات حق تعالیٰ کے ساتھ ظاہر کئے گئے اور اس اظہار کی تقریر کے لئے اس کے کونہ میں ایک پتھر جنت کا نصب کیا گیا ہے جس کا لقب یمین اللہ رکھا گیا کیونکہ اگر آپ محبوب حقیقی کو دیکھتے تو اس کے ساتھ کیا معاملہ کرتے۔ ایک معاملہ تو یہ ہوتا کہ اس کو محبوب و مطلوب اور معبود و مسجود سمجھتے اس کو تو مستثنیٰ کر دیا گیا۔ اس کے سوا جو معاملہ بھی آپ محبوب کے ساتھ کرتے۔ ان سب معاملوں کی بیت اللہ کے ساتھ اجازت ہے اگر آپ محبوب کے گھر پہنچتے تو جب تک صاحب خانہ سے نہ ملتے اس وقت تک گھر کے گرد گھومتے پھرتے دیواروں کو چومتے (جیسا کہ مجنوں کہتا ہے)

؎ امر علیٰ الدیار دیار لیلیٰ	اقبل ذالجدار و ذالجدار
وما حب الدیار شغفن قلبی	ولٰکن حب من سکن الدیارا

(میں لیلیٰ کے گھر پر گزرتا ہوں کبھی اس دیوار کو چومتا ہوں کبھی اس دیوار کو میرے قلب کو گھر کی محبت نے نہیں بلکہ اس گھر کے رہنے والے کی محبت نے پھاڑا ہے۔)

اسی طرح یہاں بھی بیت اللہ کا طواف کیا جاتا ہے اور کعبہ کے بعض ارکان کی تقبیل کی جاتی ہے۔

اور ایک معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے مصافحہ کرتے تو یمین اللہ سے مصافحہ کیجئے عاشق محبوب کے مکان پر پہنچ کر جب تک محبوب سے ملاقات نہ ہو اس کے گھر کی طرف ٹکٹکی باندھے کھڑا رہتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی نماز میں استقبال بیت کیا جاتا ہے۔

اور یہ معاملات جس طرح ناشی ہوتے ہیں محبت سے اسی طرح یہ منشا بھی ہو جاتے ہیں۔ محبت کے کسی لباس کو روزانہ بتکلف آنکھوں سے ملا کرو۔ دیکھو چند روز میں محبت کا ولولہ پیدا ہو جائے گا۔ کسی کے گھر پر روزانہ ایک دو گھنٹے بیٹھ کر چلے آیا کرو۔ چند روز میں اس گھر سے اور اس کے مالک سے محبت ہو جائے گی۔ یہ نری باتیں نہیں ہیں تجربہ کر کے دیکھ لو۔ اسی طرح طواف بیت اللہ بعض تو محبت کے بعد کرتے ہیں اور بعضوں کو طواف کے بعد محبت حق پیدا ہو جاتی ہے غرض اس کی ضرورت عقلی تھی کہ کوئی چیز ایسی بنائی جاوے جس کے ساتھ اظہار محبت کا معاملہ کیا جاوے تاکہ انسان کو اس واسطہ سے حق تعالیٰ کے ساتھ محبت پیدا ہو اور جس کو پہلے سے محبت ہو اس کی محبت قوی و دائم ہو کیونکہ میں بار بار کہہ چکا ہوں کہ غائب کے ساتھ توجہ اور محبت بلاواسطہ قائم نہیں رہتی۔ چنانچہ وہ چیز بیت اللہ ہے جس کے ساتھ محبت کا برتاؤ ظاہر کیا جاتا ہے اور چونکہ اس کو حق تعالیٰ کی طرف نسبت واضافت ہے اور اس میں انوار و برکات بھی ہیں اس لئے بیت اللہ کے ساتھ اس برتاؤ سے خدا کے ساتھ تعلق و محبت پیدا ہوتا اور قوی و مستحکم ہو جاتا ہے۔

حقیقت حج

اور بیت اللہ کے ساتھ اس برتاؤ کا نام حج ہے اور حج کی حقیقت مشاہدہ ہے۔ چنانچہ ابھی معلوم ہو جائے گا تو اب مجاہدہ کے بعد جو کہ عبادات رمضان میں مرعی ہیں مشاہدہ کا وقت ہے۔

شاید اس لئے رمضان کے متصل شوال ہی سے اشہر حج شروع ہو جاتے ہیں کیونکہ مجاہدہ کے بعد ہی ہدایت سبیل کا وعدہ ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا اور جو لوگ ہمارے راستہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے راستے ضرور دکھا دیں گے) اور میں بدلیل کہہ چکا ہوں کہ ہدایت سبیل اس آیت میں ایصال کو مستلزم ہے اور وصول الی المقصود ہی کو مشاہدہ کہا جاتا ہے پس ثابت ہوا کہ مشاہدہ کا وعدہ مجاہدہ سے متصل ہے۔ اسی لئے اشہر حج رمضان سے متصل ہی شروع ہو جاتے ہیں۔ گو حج ذی الحجہ میں ہوگا اور یہ محض

شاعری نہیں بلکہ بعض افعال حج بھی شوال ہی سے شروع ہو جاتے ہیں یعنی احرام کہ قبل شوال مکروہ ہے اور احرام تیاری ہے مشاہدہ کی۔ اور مشاہدہ کی تیاری بھی اسی کے حکم میں ہے تو اب رمضان کے بعد بلا رہے ہیں کہ آؤ مشاہدہ کرو اور ہم سے ملو اور وہ ملنا یہ ہے کہ جب تک تم ہمارے دیکھنے کے قابل ہو اس وقت تک ہمارے گھر کیساتھ وہی برتاؤ کرو جو ہمارے ساتھ کرتے۔ بجز مقصودیت و مسجودیت کے کہ اس کی اجازت نہیں یہ صرف ذی واسطہ کا حق ہے واسطہ کو مقصود و مسجود سمجھنا شرک و کفر ہے۔ باقی اور سب برتاؤ کی اجازت ہے۔

افعال حج کی حکمتیں

اسی لئے میں نے کہا تھا کہ حج کی حقیقت مشاہدہ ہے چنانچہ محبوب سے ملنے کے لئے عاشقانہ انداز سے تیاری کرتے ہیں احرام باندھتے ہی سر ننگے ہو جاتے ہیں۔ سلے ہوئے کپڑے چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ عاشق کو یہ تکلفات کہاں سوجھتے ہیں کہ اچکن ہو کرتہ ہو۔ پاجامہ وہ تو ویسے ہی کپڑوں کو لپیٹ لیا کرتا ہے اس لئے احرام میں بھی چادر و لنگی پہنی جاتی ہے اور سر کھلا رہتا ہے مگر پیر نہیں ننگے ہوتے کیونکہ کانٹا وغیرہ لگنے کا اندیشہ ہے جس سے تکلیف کا خوف ہے تو وہ عاشق نواز بھی ہیں کہ اپنے عشاق کی تکلیف گوارا نہیں کرتے۔

دوسرے یہ بھی بتلا دیا کہ تمہارا عشق چاہے کتنا ہی زیادہ ہو ناتمام ہی رہے گا۔ کامل کبھی نہ ہوگا۔ اس لئے نقصان ظاہر کرنے کو جوتہ نکالنے کا حکم نہیں کیا

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است — بآب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبا را

(جمال محبوب ہمارے عشق و عرفان ناتمام سے مستغنی ہے جس طرح زیبا صورت کو رنگ و روپ خط و خال کی احتیاج نہیں ہے)

اسی لئے کھانے کی اجازت ہے ہاں وحشی کے شکار کی ممانعت ہے اور مچھلی کے شکار کی اجازت ہے نہانے کی اجازت ہے اور خوشبو لگانے خط بنوانے ناخن کترنے کی ممانعت ہے حالانکہ عاشق کو تو نہ مچھلی کے شکار کی فرصت ہوتی ہے نہ وحشی کے نہ نہانے کی فکر ہوتی ہے نہ حجامت کی۔ تو چاہیے تھا کہ ان سب افعال کی ممانعت ہو جاتی مگر ایسا نہیں کیا بلکہ بعض کی اجازت دی اور بعض سے روک دیا تاکہ معلوم ہو کہ ہمارا عشق ناتمام ہی رہے گا۔

غرض نفس حج کا مشروع ہونا تو عقلی مسئلہ ہے خود عقل اس کا تقاضا کر رہی ہے آگے افعال عاشقانہ ہیں ان کا عقلی ہونا ضروری نہیں۔

اور اگر اس بناء کا لحاظ کیا جاوے جس کی وجہ سے عقل مشروعیت حج کا تقاضا کر رہی ہے تو یہ افعال بھی عقلی اور سراسر مطابق عقل ہیں۔ کیونکہ مشروعیت حج کا منشی تو یہی ہے کہ کسی چیز کے ساتھ جس کو

خدا تعالیٰ سے تعلق ہے ایسے افعال کئے جائیں جن سے تعلق بالغائب مستحکم و دائم ہو اور حق تعالیٰ کے ساتھ محبت پیدا ہو۔ اور یہ بناء تمام افعال حج میں موجود ہے کیونکہ وہ سب عاشقانہ افعال ہیں تو اب وہ بھی عقلی ہو گئے چنانچہ احرام و طواف کا عاشقانہ فعل ہونا تو معلوم ہو چکا۔

اب آگے چلو تو عاشق کبھی جنگلوں جنگلوں مارا مارا پھرا کرتا ہے اسی طرح حجاج کبھی منیٰ میں جاتے ہیں کبھی مزدلفہ میں کبھی صفا پر چڑھتے ہیں کبھی مروہ پر کبھی آہستہ چلتے ہیں کبھی دوڑ کر پھر کبھی عاشق کو اپنے گھر سے نکال بھی دیا کرتے ہیں یا تو عتاب کی وجہ سے یا کسی حکمت کی وجہ سے۔ محبوب اگر حکیم ہو تو تجدید نشاط کیلئے کبھی عاشق کو اپنے سے الگ کر دیتا ہے کیونکہ ہر وقت ایک جگہ میں رہنے سے شوق کم ہو جاتا ہے اور ولولہ عشق فرو ہو جاتا ہے۔ اہل مکہ میں جو حکماء ہیں وہ تجدید نشاط کے لئے مکہ والوں کو باہر جانے کی ترغیب دیا کرتے ہیں تا کہ سفر میں کعبہ سے غیبت ہو تو پھر شوق تازہ ہو اور ولولہ پیدا ہو اسی طرح حجاج کو ایک دن حد حرم سے باہر جانے کا حکم ہوتا ہے یہ وقوف عرفہ ہے۔ رمی جمار کی یہ حکمت ہے کہ عاشق رقیب کے ڈھیلے پتھر مارا کرتا ہے۔ حجاج بھی شیطان کے جلانے کو خاص موقع پر پتھر مارتے ہیں گو شیطان رقیب نہیں کیونکہ حق تعالیٰ سے اس کو محبت نہیں مگر عشاق کے لئے مانع تو ہے۔ دشمن تو ہے۔ پھر جس طرح کہ عاشق محبوب کے سامنے نذر پیش کرتا ہے اسی طرح حجاج خدا کے نام پر قربانی کرتے ہیں جو ان کی جان کا فدیہ ہے۔ عشق کا مقتضا تو یہ تھا کہ اپنی جان کو نذر میں پیش کرتے مگر حق تعالیٰ عاشق نواز ہیں اس لئے جان کے عوض میں ان کے محبوب جانوروں کی جان کو قبول فرما لیتے ہیں اس کے بعد پھر دوبارہ مشاہدہ بیت کے لئے بلاتے اور طواف زیارت میں اظہار محبت کی اجازت دیتے ہیں۔ غرض اول سے آخیر تک سب افعال عاشقانہ ہیں۔

افعال حج کے اثرات

پھر جب حق تعالیٰ نے ان افعال کو مشروع کیا ہے تو ان میں اثر بھی رکھا ہے اس کا مشاہدہ اس سے ہوتا ہے کہ بیت اللہ کے برابر کسی چیز کا دل پر اثر نہیں ہوتا۔ بیت اللہ کو دیکھ کر گھڑوں پانی آنکھوں سے اٹدتا ہے جس کو حج نصیب ہو وہ جا کر دیکھ لے آخر کوئی تو بات ہے حجاج جب لبیک کہتے ہیں تو پتھر بھی موم ہو جاتا ہے۔ دل پر ایک چوٹ لگتی ہے جب ننگے سر لنگی چادرہ پہنے ہوئے فقیر بادشاہ ایک صورت میں نظر آتے ہیں تو کفار کے دل پر بھی اثر ہوتا ہے کہ کس چیز نے سب کو برابر کر دیا۔ بس سب کا یہ حال ہوتا ہے کہ

؎ بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی　　کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

(جامی تو بندہ عشق ہے نسب کو چھوڑ کر اس راستہ میں فلاں بن فلاں کوئی چیز نہیں ہے) عشق نے سب کو برابر کر دیا۔ نہ بادشاہ بادشاہ معلوم ہوتا ہے نہ غلام غلام سب ایک صورت میں ننگے سر ہوتے ہیں۔ سب کے

بال بڑھے ہوئے ناخن لمبے لمبے ہیں اور گو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر سے جو جگہ مس کئے ہوئے ہے وہ عرش سے بھی افضل ہے تو بیت اللہ سے بدرجہ اولیٰ پایں ہمہ روضہ اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم (قبۂ خضرا) کو دیکھ کر جو حالت ہوتی ہے وہ اس قسم کے نہیں جو بیت اللہ کو دیکھ کر ہوتی ہے وہاں رونا محبت جمال سے ہوتا ہے اور یہاں محبت جلال سے۔ اور کیوں نہ ہو مشاہدہ بیت میں مشاہدہ رب البیت کا اثر کچھ تو ہونا چاہیے۔ پس حج کا حاصل یہ ہے کہ ایسے وسائط سے تعلق پیدا کیا گیا ہے جن سے تعلق مع اللہ کو قوت ہو بعبارت دیگر یوں کہئے کہ اور تمام عبادات تو مجاہدہ ہیں اور حج مشاہدہ ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں۔

حج زیارت کردن خانہ بود حج رب البیت مردانہ بود

(حج خانہ کعبہ کی زیارت کرنا ہوتا ہے حج رب البیت مردانہ ہوتی ہے)

جو لوگ طریق مجاہدہ کو صحیح طور پر طے کر چکے ہیں وہ واقعی صرف حج بیت نہیں کرتے بلکہ حج رب البیت کرتے ہیں ان کو ظاہری آنکھوں سے گو دیدار نصیب نہ ہو مگر حج میں قلب سے ان کو مشاہدہ حق ضرور حاصل ہو جاتا ہے۔

حج کا لفظ بھی اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ لغت میں حج کے معنی قدوم غلبہ کے بھی ہیں اور قدوم وصال کا ہم معنی ہے اور غلبہ کامیابی کا مرادف ہے۔ بس لفظ حج میں وصال و کامیابی پر دلالت ہے اور اس کو اصطلاح میں مشاہدہ کہا جاتا ہے۔ ۱۲ جامع) حج کی حقیقت مشاہدہ ہونا خود اس کے نام سے ہی ظاہر ہے۔ اور عجیب بات ہے کہ جس طرح لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (ہم ضرور ان کو اپنے راستے دکھادیں گے) میں سبیل کا لفظ وارد ہوا ہے۔ اسی طرح حج کے بارے میں مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا (جو شخص استطاعت رکھے اس کی طرف راستہ کی) فرمایا گیا ہے دونوں جگہ لفظ سبیل ہے مادہ ایک ہی ہے معلوم ہوا کہ جس مشاہدہ کا وعدہ لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (ہم ضرور ان کو اپنے راستے دکھادیں گے۔) میں فرمایا ہے اس کا ظہور حج میں ہوتا ہے اشارہ کے لئے اتنا کافی ہے باقی مدلول نص تو میں اس کو کہتا نہیں خلاصہ یہ کہ اعمال رمضان مجاہدہ ہیں اور اعمال حج مشاہدہ ہیں اور مشاہدہ بعد مجاہدہ کے ہوا کرتا ہے اس لئے حج رمضان کے متصل مشروع ہوا۔ میں اسی اتصال زمانی کی وجہ سے اکثر رمضان کے بعد حج کا معمولاً بیان کیا کرتا ہوں۔

حج و رمضان میں باہمی مناسبت

مگر اب کے یہ مضمون ذہن میں آیا کہ ان دونوں میں اتصال زمانی کے ساتھ ساتھ اتصال معنوی بھی ہے وجہ یہ کہ اعمال رمضان سے جو محبت اور توجہ الی اللہ پیدا ہوتی ہے حج سے اس کا دوام واستحکام کیا جاتا ہے۔ اجمالاً یہ مضمون میں نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے سنا ہے وہ فرماتے تھے کہ ان وسائط سے محبت کو باقی رکھا گیا ہے۔ اس اجمال کی برکت سے یہ تفصیل میرے قلب پر وارد

ہوئی کہ غائب کے ساتھ تعلق بلاواسطہ دائم نہیں رہ سکتا توجہ بلاواسطہ تھوڑی دیر ہوتی ہے پھر غائب ہو جاتی ہے اس لئے ایسے وسائط کو اختیار کیا گیا جن کے واسطہ سے یہ محبت اور توجہ دائم ہو جاوے۔

تذکرۂ حج کا اثر

اس پر شاید کسی کو یہ اشکال ہو کہ پھر چاہیے تھا کہ حج ہر سال فرض ہوتا یا ہر شخص پر فرض ہوتا کیونکہ جب حج کو دوام محبت و استحکام توجہ الی اللہ کے لئے مشروع کیا گیا ہے تو لازم آتا ہے کہ جن لوگوں نے حج نہیں کیا بس ان کی محبت فنا ہو جائے گی دائم نہ رہے۔

جواب یہ ہے کہ جس طرح ان وسائط میں یہ دخل ہے کہ ان کو دیکھ کر محبت قوی ہوتی ہے اسی طرح ان وسائط کے تذکرہ میں بھی یہ اثر ہے اور ان عشاق کو دیکھنے میں بھی یہ اثر ہے جو ان کی زیارت کو جاتے ہیں چنانچہ ایک بڑے عارف فرماتے ہیں

؎ نہ تنہا عشق از دیدار خیزد   بسا کیں دولت از گفتار خیزد

(عشق محض دیکھنے ہی سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ اکثر یہ دولت محبوب کے تذکرہ اور گفتگو سے حاصل ہوتی ہے) صاحبو! مشاہدہ کر لو کہ جب کوئی حج کو جاتا ہے تو اس کو دیکھ کر مسلمانوں کا کیا حال ہوتا ہے دل پر ہر سال ایک نشتر سا لگتا ہے کہ ہائے ہم بھی جاتے اگر بیت اللہ کا وجود ہی نہ ہوتا تو یہ اثر کیوں کر ہوتا۔ پس بیت اللہ کی زیارت سے تو حجاج کی محبت قوی ہوتی ہے اور حجاج کو جاتے ہوئے دیکھ کر دوسروں کے دل پر جو نشتر لگتا ہے اس حسرت و شوق سے ان کی محبت قوی ہوتی ہے۔ پس بیت اللہ کی وہ شان ہے

؎ بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد   برنگ اصحاب صورت را ببوار باب معنی را

(اس کے عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو اپنے حسن صوری سے اور حقیقت پرستوں کے دل و جان کو اپنے حسن معنوی سے تر و تازہ رکھتی ہے) صاحبو! حج کے تذکرہ میں بھی ایک تاثیر ہے جس سے دل اُمڈتا ہے۔ یہ تو ان کا حال ہے جن کو حج نصیب نہیں ہوا اور جن کو ایک دفعہ نصیب ہو چکا ہے ان کا حال کچھ نہ پوچھو کہ ہر سال موسم حج میں ان کے دل پر کیا گزرتی ہے

؎ غائباں راچوں نوالہ مے دہند   حاضراں از غائباں لاشک بہ اند

(غائبوں کو جب لقمہ دیتے ہیں تو حاضر غائبوں سے بیشک بہتر ہیں) واللہ اکثر لوگ کلیجہ مشوش کرہ ہو جاتے ہیں اور ہر دن یہ خیال ہوتا ہے کہ ہائے آج حاجی مکہ میں پہنچے ہوں گے کل کو منیٰ جائیں گے آج عرفات میں ہوں گے اب عرفات سے لوٹ رہے ہوں گے۔ یہی ایک عبادت ایسی ہے کہ ایک بار کر کے دوبارہ اس کو جی چاہتا ہے جو لوگ حج کر چکے ہیں ان کے دل سے پوچھو کہ وہ بار بار حج کرنے کی کیسی تمنا کرتے ہیں۔

حج وشہادت میں باہمی مناسبت

پس حج کی مثال شہادت جیسی ہے شہید بھی جنت میں یہ تمنا کرے گا کہ میں دوبارہ دنیا میں جاؤں اور خدا کے راستہ میں بار بار شہید ہوں بھلا اور تو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسے کامل بھی بار بار شہادت کی تمنا فرماتے تھے۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے۔

وددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احییٰ ثم اقتل ثم احییٰ ثم اقتل الحدیث

(تاریخ بغداد للخطیب البغدادی ۱۴۱/۷)

(میں چاہتا ہوں کہ اللہ کے راستہ میں شہید ہوں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔ پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں ۱۲) آخر آپ کے دل پر کچھ تو گزرتی ہوگی جو یوں بار بار قتل کی تمنا فرماتے ہیں۔ یہی حال حج کا ہے کہ اس سے بھی دل کبھی سیر نہیں ہوتا۔ بیت اللہ میں کچھ خاصیت ہے کہ وہ دل کو کشش کرتا ہے۔ ملاحدہ یورپ بھی اس کشش کا انکار نہ کر سکے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل بھی کعبہ کی طرف کھنچتے ہوں گے چنانچہ ایک انگریز محقق نے لکھا ہے کہ جس طرح مقناطیس میں حدید کی خاصیت ہے اسی طرح حجر اسود میں جذب قلوب کی خاصیت ہے یہ لوگ برکت وغیرہ کے تو معتقد نہیں اسباب طبعیہ کے معتقد ہیں اس لئے اس بیچارہ نے اپنے مذاق کے موافق حجر اسود کی کشش کو بھی اسباب طبعیہ میں داخل کر دیا۔ خیر کچھ ہی ہو اس کا اقرار تو ان کو بھی ہے کہ حجر اسود قلوب کو کشش کرتا ہے خواہ سبب کچھ ہی ہو۔ اب یہ اشکال جاتا رہا کہ جو لوگ حج کو نہیں گئے کیا ان کی محبت زائل ہو جائے گی جواب کا حاصل یہ ہوا کہ بیت اللہ کا نام سن کر ہی ان کے دل میں زیارت کا ولولہ اٹھتا ہے چنانچہ مشاہدہ ہے کہ تمنا حج سے کوئی مسلمان غالباً خالی نہ ہوگا۔ تو یہ ولولہ بھی ان کی محبت باقی رکھنے کے لئے کافی ہے۔

پھر حجاج کو دیکھ کر یہ ولولہ اور تیز ہو جاتا ہے جس سے محبت کو ترقی ہوتی ہے اور جو لوگ ایک دفعہ حج کر چکے ہیں ان کی محبت باقی رکھنے کے لئے ایک ہی حج کافی ہے۔ دوبارہ فرضیت حج کی ضرورت نہیں کیونکہ بیت اللہ کی کشش کی وجہ سے ہمیشہ ان کے دل مشتاق زیارت رہتے ہیں اور ہر سال ان کے دل پر نشتر لگتا ہے یہی نشتر ان کی محبت بڑھانے کے لئے کافی ہو جاتا ہے اور اگر دنیا میں بیت اللہ کا وجود نہ ہوتا اور کوئی اس کی زیارت کو نہ جاتا تو نہ حاضرین کی محبت بڑھتی نہ غائبین کی۔ اب اس کے وجود سے جانے والوں اور نہ جانے والوں سب کی محبت قوی ہو رہی ہے (بشرطیکہ دل میں کچھ ایمان کا اثر ہو اور جن کے دلوں پر محبت دنیا نے اتنا غلبہ کر لیا ہے کہ دین کا ان کو کچھ بھی خیال نہیں ان کا یہاں ذکر نہیں۔ گو کشش کعبہ سے ان کے قلوب بھی ضرور متاثر ہیں۔ مگر وہ اثر ایسا ہی ہے جیسے ملاحدۂ یورپ کے قلب پر اس کا اثر ہے اور یہ ضعیف اثر محبت بڑھانے کے لئے کافی نہیں جامع ۱۲)

عاشق نوازی

بہرحال اس مجاہدہ کے بعد جو کہ اعمال رمضان میں ہو چکا ہے اب حق تعالیٰ آپ کو مشاہدہ کے لئے بلا رہے ہیں اور عشق کا مقتضا تو یہ تھا کہ مشاہدۂ محبوب کے لئے سب پر حاضر ہونا فرض کر دیا جاتا مگر حق تعالیٰ بڑے عاشق نواز ہیں۔ وہ اپنے عشاق کی راحت و آسائش کا بھی بہت لحاظ فرماتے ہیں اس لئے حج سب پر فرض نہیں کیا بلکہ ارشاد ہے۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا اور اللہ کے لئے لوگوں پر حج بیت اللہ واجب ہے اس پر جو بیت اللہ تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو اور طاقت سے یہ مراد نہیں کہ جوان ہو ہٹا کٹا ہو۔ محض جوان ہونے پر فرضیت حج کا مدار نہیں کیونکہ بعض جوان پیدل نہیں چل سکتے۔ بلکہ استطاعت سبیل سے مراد زاد و راحلہ ہے یعنی جو سوار ہو کر آرام سے آ سکے اور آرام سے لوٹ سکے وہ آئے اور جو سواری پر نہ آ سکے اس کے ذمہ حج فرض نہیں۔

پھر اس کے ساتھ یہ بھی رعایت ہے کہ زاد و راحلہ کا خرچ حوائج اصلیہ ضروریہ سے زائد ہو اور مدت سفر تک یعنی جانے سے لوٹنے تک اپنے اہل و عیال کا خرچ بھی اس سے الگ دے سکے تب حج فرض ہوتا ہے۔

پھر اس کے ساتھ یہ بھی رعایت ہے کہ راستہ میں امن ہو کوئی اس کو تنگ نہ کر سکے۔ خطرہ کا یقین یا احتمال غالب نہ ہو باقی اوہام کا اعتبار نہیں۔ جیسا بعض لوگ ذرا ذرا سی بات سن کر حج ملتوی کر دیتے ہیں سو خوب یاد رکھو کہ حج تو ہم خطرہ سے ساقط نہیں ہوتا ایسا کونسا سفر ہے جس میں خطرہ کا وہم بھی نہ ہو۔ یوں تو سہارنپور سے مظفر نگر تک بھی خطرہ ہے کہ شاید ریل لڑ جائے اور کبھی کبھی ایسے واقعات ہو بھی جاتے ہیں۔ مگر شاذ و نادر جن کا کوئی اعتبار نہیں کرتا تو ایسے اوہام کا حج میں بھی اعتبار نہیں بحمد اللہ آج کل حج میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔

ہاں سفر مدینہ[1] میں کچھ خطرات بعض دفعہ بڑھ جاتے ہیں۔ سو وہ سفر مستحب ہے مستحب کی وجہ سے فرض کو ترک نہیں کیا جا سکتا۔ غرض فرضیت حج میں امن طریق بھی شرط ہے۔ یہ اتنی رعائتیں اس لئے ہیں کہ ہمارا عشق ناتمام ہے اگر راستہ میں خرچ کے کم ہو جانے سے کوئی تکلیف پیش آئی یا کسی نے تنگ کر دیا تو رہا سہا عشق بھی جاتا رہے گا۔ جیسے ایک شخص کی حکایت ہے کہ وہ روز ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر دعا کیا کرتا تھا کہ اے اللہ مجھے کھینچ۔ ایک مسخرے نے سن لیا اس نے یہ حرکت کی کہ ایک دن سویرے سے درخت پر رسی لے کر جا بیٹھا۔

جب اس نے دعا کی کہ اے اللہ مجھے کھینچ تو اس نے آہستہ نرم آواز سے کہا کہ اے میرے بندے یہ رسی اپنے گلے میں ڈال لے میں کھینچ لوں گا۔ اور رسی میں پھانسی بنا کر لٹکا دی۔ یہ بڑا خوش ہوا کہ دعا قبول ہو

---

[1] الحمد للہ یہ خطرہ بھی عرصہ دراز سے بالکل ختم ہو گیا ضرور مدینہ منورہ حاضری دیں۔ والسلام اللھم وفقنا لما تحب و ترضی ۱۲

گئی بس آج میں اللہ میاں کے پاس پہنچ جاؤں گا۔ (مسخرہ نے تدبیر تو خدا تعالیٰ کے پاس پہنچانے ہی کی تھی گلا گھٹ کر مر جاتا تو خدا تعالیٰ کے پاس ہی پہنچتا ۱۲) اس نے خوشی خوشی رسی گلے میں ڈال لی۔ اس نے کھینچنا شروع کیا جب یہ زمین سے ایک دو بالشت بلند ہوا تو رسی گلے میں پھنسی اور گلا گھٹنے لگا تو تڑپ گیا اور کہنے لگا اے اللہ مجھے مت کھینچ میں نہیں کھنچتا۔ بس ذرا سی تکلیف میں سارا عشق ختم ہو گیا۔ یہی حال ہمارا ہے کہ محبت کے سارے دعوے اسی وقت تک ہیں جب تک آرام سے گزر رہی ہے اور جہاں تکلیف پہنچتی ہے بس عشق و محبت سب جاتا رہا دوسرے ان رعایتوں میں یہ بھی نکتہ ہے کہ عاشق کامل و عاشق ناقص کا کمال و نقصان چھپا رہے اگر زاد و راحلہ کی قید نہ ہوتی تو ہمت والے جاتے اور کم ہمت نہ جاتے اس وقت یہ لوگ رسوا ہو جاتے کہ ان میں خدا تعالیٰ کی محبت نہیں ہے فرض کو ترک کر رہے ہیں۔ اب رسوا نہیں ہوتے وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے پاس زاد و راحلہ نہیں اس لئے نہیں گئے۔ ہمارے ذمہ حج فرض ہی نہیں۔

میں نے ان احکام کی (یعنی شرط فرضیت حج کی) حکمت اس لئے بیان کر دی کہ یہاں ایک اشکال ہوتا ہے وہ یہ کہ جب حج تحریک عشق و تقویت محبت کے لئے مشروع ہوا ہے تو اس کے احکام سب عاشقانہ ہونے چاہئیں۔ اور عشق و محبت میں زاد و راحلہ اور امن طریق وغیرہ کی پرواہ نہیں ہوا کرتی۔ عاشق کبھی یہ نہیں دیکھتا کہ میرے پاس محبوب تک پہنچنے کے لئے خرچ بھی ہے یا نہیں۔ سواری بھی ہے یا نہیں راستہ مامون بھی ہے یا نہیں۔ اس کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ ایک بار مجنوں لیلیٰ کے پاس جا رہا تھا اونٹنی پر سوار تھا اس اونٹنی کے ایک بچہ تھا جس کو وہ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی تھی۔ مجنوں اس کو آگے چلانا چاہتا وہ بچہ کی محبت میں پیچھے دیکھتی تھی۔ اس طرح راستہ بہت کم طے ہوتا تھا بھلا عاشق کو تاخیر کب گوارا ہے مجنوں سے نہ رہا گیا کہنے لگا ؎

هوی ناقتی خلفی وقدمی الهوىٰ فانی وایاها لمختلفان

(میری اونٹنی کا محبوب پیچھے ہے اور میرا محبوب آگے ہے میں اور وہ مطلوب میں مختلف ہیں) یہ کہہ کر دھڑام سے اونٹنی کے اوپر سے گر پڑا اتنا بھی انتظار نہ کیا کہ اسے ٹھہرا کر بٹھلا کر اترتا۔ جب گرا تو پیر میں چوٹ بھی لگی اب پیدل بھی نہ چل سکا تو گھسٹنا شروع کیا اور گھٹنوں کے بل چلنے لگا۔ عشق کا تو یہ تقاضا ہے پھر شریعت نے سفر حج کے لئے جو کہ عاشقانہ سفر ہے زاد و راحلہ و امن طریق وغیرہ کی قیود کیوں لگائیں؟

جواب میری تقریر سے ظاہر ہے کہ قیود میں ہمارے عشق ناتمام کی رعایت ہے۔ کہیں تکالیف سے رہا سہا عشق بھی زائل نہ ہو جائے ہاں جو لوگ مجنوں کی طرح عاشق کامل ہوں ان کے لئے کچھ قید نہیں ان کو پیدل حج کرنا بھی جائز ہے اور کھانے پینے کا خرچ بھی ساتھ لینے کی ضرورت نہیں کیونکہ ایسا شخص متوکل بھی ہوگا اور کسی سے سوال نہ کرے گا۔

پیدل سفر حج

بعض خشک مولوی ان لوگوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ پیدل سفر کرنا اور نفس کو مشقت میں ڈالنا جائز نہیں مگر ان لوگوں نے قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھی

وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۝

ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ لوگوں میں حج کا اعلان کردو تو وہ آپ کے پاس پیدل چل کر آئیں گے اور دبلی اونٹنیوں پر بھی سوار ہو کر آئیں گے۔

اس میں بتلا دیا گیا کہ بعضے عشاق پیدل بھی حج کو جائیں گے اگر پیدل سفر کرنا مطلقاً ممنوع ہوتا تو قرآن میں رجالاً کا بلانکیر ذکر نہ ہوتا اور ذکر بھی کیسا کہ پیدل آنے والوں کو سواروں سے پہلے ذکر فرمایا۔

اور بات یہ ہے کہ نفس کو مشقت میں ڈالنا بیشک ممنوع ہے لیکن اگر کسی کو اس میں مشقت ہی نہ ہو بلکہ لذت آوے تو پیادہ چلنا اس کے لئے القاء نفس فی التہلکہ (نفس کو ہلاکت میں ڈالنا) کہاں رہا۔ خوب سمجھ لو۔ غرض حج کی حقیقت مشاہدہ ہے اور اس بناء پر لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (ہم ان کو ضرور اپنے راستے دکھادیں گے) میں حج کی طرف اشارہ ہوسکتا ہے اس لئے میں نے اس آیت کے تحت میں حج کا بھی بیان کردیا۔

اور یہ حقیقت بزرگوں کے کلام سے سمجھ میں آئی ہے میں اس کو مدلول نص قرار نہیں دیتا اگر کوئی اس کا انکار کردے تو گناہ نہ ہوگا۔ ہاں ایک طرح گناہ بھی ہوگا کہ جن کے قلوب پر یہ واردات ہوئے ہیں ان پر انکار کرنے لگے وارد کے انکار کا تو آپ کو حق ہے مگر صاحب وارد پر انکار کا کسی کو حق نہیں۔

بحمد اللہ بقدر ضرورت اس آیت کا بیان اپنے علم کے موافق مکمل ہوگیا۔ باقی عجائب قرآن کا احاطہ کون کرسکتا ہے۔ اس کی تو شان ہے **لاتنقضی عجائبه** (نہیں ختم ہوتے قرآن کے عجائبات) اس سے پہلے چار بیان ہوچکے ہیں ان کا حاصل مجاہدہ ہے۔ اور اس بیان کا مجاہدہ مشاہدہ ہے مجاہدہ کے بعد مشاہدہ ہی ہوا کرتا ہے اس لئے اس کو چاروں سے خاص مناسبت ہے۔ اگر کوئی لغزش ہوتی ہو تو حق تعالیٰ معاف فرمادیں اصل مقصود یہ ہے کہ محبت بڑھانے کی کوشش کرنا چاہیے جس کا بڑا ذریعہ حج بھی ہے جس کا زمانہ شروع ہوگیا ہے اس کا اہتمام کرنا چاہیے۔ جن پر حج فرض ہو وہ جلدی کریں بس اب میں ختم کرتا ہوں۔ دعا کیجئے حق تعالیٰ ہم کو اپنی محبت کاملہ عطا فرمائے اور اعمال صالحہ کی توفیق ہو۔ وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقه سیدنا محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین۔

التہذیب۶

(اسرار حج)

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون میں ۶ شوال المکرم ۱۳۳۲ھ کو جمعہ کے روز بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد ۲۰۰ تھی۔
محترم جناب مولوی عبدالحلیم صاحبؒ نے قلمبند فرمایا۔

حج سے محبت کا بڑھنا ایک ایسا امر ہے کہ ہر مسلمان اس کو سمجھتا ہے چنانچہ ہر شخص اپنے قلب میں بیت اللہ شریف کی طرف ایک کشش اور انجذاب محسوس کرتا ہے اور جو وہاں گئے ہیں ان سے پوچھ لو کہ کیا حالت ہوتی ہے کہ خانہ کعبہ کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہو جاتا ہے۔ اور بالاضطرار آنسوؤں کا مینہ برسنے لگتا ہے۔ اور یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ خانہ کعبہ پر ضرور کوئی جلوہ گر ہے۔ ورنہ ایک تعمیر میں رلانے کا اثر کیا معنی؟

چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں
کوئی معشوق ہے پردۂ زنگاری میں
(از حضرت حکیم الامتؒ)

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ نَحۡمَدُهٗ وَنَسۡتَعِيۡنُهٗ وَنَسۡتَغۡفِرُهٗ وَنُؤۡمِنُ بِهٖ وَنَتَوَكَّلُ عَلَيۡهِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰهِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَيِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ يَّهۡدِهِ اللّٰهُ فَلَا مُضِلَّ لَهٗ وَمَنۡ يُّضۡلِلۡهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنۡ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحۡدَهٗ لَا شَرِيۡكَ لَهٗ وَنَشۡهَدُ اَنَّ سَيِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُهٗ وَرَسُوۡلُهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصۡحَابِهٖ وَبَارَكَ وَسَلَّم.

امابعد! فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم. بسم اللہ الرحمن الرحیم

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الۡبَيۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَيۡهِ سَبِيۡلًا . وَمَنۡ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ (ال عمران آیت ۹۷)

اور اللہ کے واسطے لوگوں کے ذمہ اس مکان کا حج کرنا ہے (یعنی) اس شخص کے ذمہ جو طاقت رکھے وہاں تک کے سبیل کی اور جو شخص منکر ہو تو اللہ تعالیٰ تمام جہاں والوں سے غنی ہیں۔

تمہید: چند سال سے میرا معمول ہے اور ترتیب کا بھی یہی مقتضا ہے کہ بعد گزر جانے رمضان المبارک کے حج کے متعلق بیان کیا کرتا ہوں اور نیز اشہر حج شوال سے شروع بھی ہوتے ہیں اس لئے کہ اشہر حج شوال ذوالقعدہ ذوالحجہ ہیں۔

ہر چند کہ شوال اور ذوالقعدہ پورے پورے اور ذی الحجہ کا ایک معتدبہ حصہ یہ اتنی مدت ہے کہ فی نفسہ ضروری نہیں تھا کہ شروع شوال ہی میں اس کو بیان کیا جائے اس مدت کے اندر اندر جب چاہے بیان کردیا جاتا۔ لیکن چونکہ ہم لوگ مکہ معظمہ اور عرفات سے مسافت بعیدہ پر ہیں تو اگر بیان کو موخر کیا جائے گا تو جن لوگوں کا بیان سن کر جانے کا خیال ہوگا وہ نہیں جاسکتے اس لئے معمول یہی ہے کہ شروع شوال میں بیان کردیا کرتا ہوں۔

اس مرتبہ بعض روایات سے معلوم ہوا تھا کہ راستہ کے خطرناک ہونے کی وجہ سے پہنچنے میں شبہ ہے اور بعض روایتوں سے امن معلوم ہوا لیکن اکثر روایات سے شبہ قوی ہوتا چلا گیا اس لئے ارادہ تھا کہ اس بیان کو ملتوی کردوں لیکن غور کرنے کے بعد مصلحت یہی معلوم ہوئی کہ بیان کیا جائے اس لئے کہ یہ کیا

ضرور ہے کہ ہم کو شبہ ہو تو سب کو ہی ہو اور اگر ہو بھی تو تحقیق کر لیں گے اور اگر نہ بھی تحقیق کریں یا تحقیق کے بعد بھی شبہ رہے تو کم از کم احکام سے تو فی نفسہا اطلاع ہو جائے گی۔ جو شخص شرائط کے اعتبار سے ضروری سمجھے گا وہ ارادہ کریگا ورنہ فی نفسہ حج ایک رکن اسلام ہے اس کے آثار و خواص کا علم ہی ہو جائے گا۔ اور نیز اس عبادت کی عظمت ذہن میں آ جائے گی۔ یہ بھی بڑا فائدہ ہوا۔ ان وجوہ سے یہی مناسب معلوم ہوا کہ اس کا ذکر ترک نہ کروں۔ اس لئے میں نے یہ آیت پڑھی ہے۔

میں اس وقت حج کی فرضیت اور فرعی مسائل بیان نہ کروں گا اس لئے کہ فرض ہونے کو تو سب جانتے ہیں اور مسائل اس کے اردو کے رسائل میں موجود ہیں اور نیز اس وقت ان کا بیان کرنا بھی زیادہ مفید نہیں اس لئے کہ حج کے مسائل یاد ہی نہیں رہتے۔ میں اس کے متعلق بھی ایسے ہی مضامین بیان کرنا چاہتا ہوں۔ جیسے روزہ اور تراویح وغیرہ کے متعلق بیان کئے ہیں یعنی لطائف اور اسرار اور روح اور جوہر اس عبادت کا بیان کروں گا۔ اس سے اعتقاد فرضیت بھی بوجہ احسن موکد ہوگا اور نیز اس کی عظمت اور وقعت بھی پیدا ہوگی۔ اس لئے زیادہ مہتم بالشان اسی کا ذکر کرتا ہے اور وہ مضمون مخترع نہ ہوگا بلکہ صیام و قیام کے مضامین کی طرح ان شاءاللہ تعالیٰ نصوص سے تائید ہوتی چلے جائے گی۔

نوعیت مضمون

میں نے جو آیت تلاوت کی ہے وہ اس ضمن کے استنباط کے لئے کافی وافی ہے لیکن کچھ مقدمات صحیحہ اس میں منضم کرنے کی ضرورت ہوگی۔ اب میں اس مضمون کی نوعیت کی تعیین کرتا ہوں اور ہر چند کہ اس تعیین کی ضرورت نہ تھی اس لئے کہ جو مضامین صیام و قیام کے متعلق بیان کئے گئے ہیں ان کا یاد کر لینا کافی ہے۔

چنانچہ میں نے روزہ تراویح اور اس کی تقریب سے اعتکاف کے متعلق یہ بیان کیا تھا اور یہ بھی بیان کیا تھا کہ ان مجاہدات کی تکمیل اعتکاف سے ہوتی ہے یعنی اعتکاف کو بھی مجاہدہ میں داخل کیا گیا تھا۔ یہ حاصل تھا ان مضامین کا یہی نوعیت حج کے متعلق بھی ہے۔

جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے بندوں پر بڑی رحمت فرمائی ہے۔ کہ ان کو تطہیر قلب و تزکیہ نفس کے ایسے طریقے تعلیم فرمائے ہیں کہ فلسفی اور کسی مرتاض اور کسی اشراقی کو وہاں تک رسائی ہونا کیا معنی اس کی ہوا تک بھی نہیں پہنچی۔ یہ بجز وحی کے کسی واسطہ سے معلوم نہیں ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ان مجاہدات کی تفصیل میں غور کرنے سے یہ امر بین طور سے واضح ہے یہاں تک بیان تھا اس مضمون کی نوعیت کے متعلق۔

مقصود بیان

اب آگے مقصود شروع کیا جاتا ہے ہر چند کہ خصوصیت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ حج کا ذکر اس وقت کیا جائے تو قربانی کا ذکر عیدالاضحیٰ میں ہو لیکن جو مضمون میں بیان کرنا چاہتا ہوں اس کا تعلق جیسا حج سے

ہے ایسا ہی قربانی سے بھی ہے اور نیز قربانی حج کامل کے بعض اقسام کا جزو بھی ہے۔

اور کامل کی قید میں نے اس لئے لگائی ہے کہ قربانی نفس حج کا جزو نہیں ہے نفس حج تو وقوف عرفات اور طواف زیارت سے ادا ہو جاتا ہے ہاں کمال اس کا قربانی سے ہے۔

پس جبکہ قربانی بھی اس کا جزو ہے گو کسی[1] درجہ ہو۔ جیسا ابھی مذکور ہوا کہ حج کا جزو ہے اور اس میں قران و تمتع کا۔ تو یہ نامناسب ہے کہ حج کے متعلق تو بیان ہو اور اس کے ایک بڑے جزو کا بیان ترک کر دیا جائے اس سے حج کا بیان بھی ناتمام رہے گا۔ اس لئے کہ حج تام ایک افعال کے مجموعہ کا ہے جس میں بعض احوال میں قربانی بھی داخل ہے۔ اور نیز ایام عیدالاضحیٰ میں قربانی کے احکام بیان کرنے کی ضرورت ہوگی اور اس وقت احکام نہ بیان کئے جائیں گے۔ بلکہ قربانی کی روح اور حقیقت اور اس کا بیان ہوگا۔ اس لئے ایام ذی الحجہ کا انتظار نہیں کیا گیا اور اسی طرح حج کا بیان بھی احکام تفصیلہ کے بیان سے نہ ہوگا۔ جیسا پہلے بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس لئے کہ وہ احکام یاد نہیں رہتے اور نیز خود بیان کرنے والوں کو یاد نہیں جیسے ایک طوطے کو کسی نے الم تر کیف تک سورتیں یاد کرا دی تھیں۔ جب اس سے کوئی پڑھوا تا تھا تو وہ فر فر پڑھ دیا کرتا تھا اور جب کہتے کہ آگے پڑھو تو وہ کہتا تھا کہ آگے تو میاں کو بھی یاد نہیں۔

عجیب دربار

اسی طرح احکام حج کے تو مجھے بھی یاد نہیں بیان تو کیا کروں گا۔ اور اگر کسی کو یاد بھی ہوں تب بھی وہاں جا کر نئے استاد کی ضرورت ہوتی ہے وہاں سب پڑھا لکھا بھول جاتا ہے۔

ع جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا

مولانا رحمہ اللہ صاحب راوی ہیں کہ بہت بڑے عالم مکہ معظمہ حج کے لئے آئے جب مطوف معلم طواف کرانے کے لئے ان کے پاس آیا تو انہوں نے فرمایا کہ ہم کو معلم کی ضرورت نہیں ہم خود واقف ہیں۔ معلم الگ ہو گئے۔ جب حرم شریف میں پہنچے تو

باب السلام سے داخل ہوتے ہیں اور باب السلام دو ہیں ایک احاطہ میں اور ایک بالکل اندر باہر کے باب السلام میں تو انہوں نے غلطی نہیں کی لیکن جب اندر پہنچے تو اندر کے باب السلام سے داخل نہ ہوئے۔ ایک بچہ نے اسی وقت بتلا دیا یا شیخ ادخل من هنا اے شیخ ادھر سے داخل ہو جائیے جب آگے طواف کے لئے پہنچے تو حکم یہ ہے کہ حجر اسود کو بوسہ دیکر داہنی طرف جس طرف خانہ کعبہ کا دروازہ ہے چلنا چاہیے وہ بائیں طرف کو چلے اسی وقت لڑکے نے بتلا دیا اور کہا اخطات یا شیخ امشا من هنا یعنی اے شیخ آپ

[1] حدیث شریف میں بھی وارد ہے الحج الحج الحج اس سے بھی قربانی کا مہتم بالشان ہونا معلوم ہوتا ہے ۱۲ جامع

نے خطا کی اس طرف سے چلئے۔ جب بار باران سے غلطی ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے میرا تکبر توڑا ہے۔ واقعی یہاں بغیر معلم کے کام نہیں چلتا۔ اس وقت انہوں نے معلم کو بلایا وہ عجیب دربار ہے وہاں اچھے اچھے عقلاء بھی بے عقل ہو جاتے ہیں۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ وہاں جا کر ایک حیرت[1] اور کیفیت طاری ہوتی ہے کہ جس سے عقل ایک طرف رہ جاتی ہے اس لئے میں احکام بیان نہ کروں گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حج اور قربانی دو مضمون ہوں گے پہلے مواعظ میں نماز اور روزہ کے متعلق بیان تھا۔ دو عبادتوں کا آج ہوگا۔ ارکان اسلام کے کل پانچ ہی ہیں۔ تلفظ شہادتین جس کا بیان محتاج بیان نہیں۔ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' جس میں سے بجز زکوٰۃ کے سب کا بیان ہو جائے گا لیکن طبعاً زکوٰۃ کا بیان بھی آ جائے گا۔

اقسام مجاہدہ

قبل اس کے کہ حج کے متعلق کچھ بیان کیا جائے مواعظ سابقہ کے حاصل کو سمجھنا چاہیے۔ اور وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے محض اپنی رحمت سے تطہیر قلب و تزکیہ نفس کے واسطے کچھ مجاہدات اپنے بندوں کو تعلیم فرمائے ہیں۔ اور ان مجاہدوں کی مختلف قسمیں ہیں۔ مثلاً ایک مجاہدہ روزہ ہے ایک نماز ہے ایک زکوٰۃ منجملہ ان مجاہدات کے حج اور قربانی بھی ہے مواعظ سابقہ میں روزہ نماز کے متعلق بیان ہو چکا ہے پس اگر ایام حج بھی اس وقت نہ ہوتے تب بھی چونکہ بعض مجاہدات کا بیان ہو چکا ہے تو مجاہدہ ہونے کے اعتبار سے حج کا بیان بھی ضروری تھا یہ حسن اقتران ہے کہ ایام بھی اس عبادت کے یہی ہیں۔

ان اقسام مختلفہ میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کل دو رنگ یا دو نوع کے مجاہدے ہیں ایک وہ مجاہدہ ہے جس میں عقلیت کی شان غالب ہو اور ایک وہ ہے جس میں ادراک بالعقل غالب نہ ہو بلکہ اس میں طبیعت اور تعبدیت غالب ہو۔ اور راز اس تنویع میں یہ ہے کہ مجاہدہ کا حاصل منازعات نفس کا مغلوب کرنا ہے یعنی جو قلوب طاعت میں کشاکشی کریں۔ ان کو مغلوب کر دینا اور دبا دینا مقصود ہے اور وہ منازعات مختلف قسم کے ہیں۔ کوئی مجاہدہ کسی منازعت کے مغلوب کرنے کے لئے ہے اور کوئی کسی منازعت کے دبانے کے لئے۔ چنانچہ نماز سے جاہ کو دبانا مقصود ہے اور قوت بہیمیہ کا انکسار روزہ سے مطلوب ہے۔ غرض مجاہدہ کی حقیقت منازعات کو مغلوب کرنا ہے۔

مانع حق عقل

اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ منازعت کرنے والی کیا کیا چیز ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ منازعت کرنے والی آدمی کے اندر دو شئے ہیں۔ عقل اور طبیعت۔ یہی دو چیزیں انسان کو حق سے روکتی

---

[1] یہ حیرت کم و بیش ہر مسلمان کو طاری ہوتی ہے اور اگر کسی کو نہ ہو تو وہ سمجھ لے کہ اس کا سبب قساوت قلب اور غفلت ہے جیسے قرآن اور نماز سے بعضے متاثر نہیں ہوتے۔ لیکن اس سے محزون نہ ہو بلکہ علاج میں مشغول ہو۱۲ جامع۔

ہیں۔ چنانچہ حکماء کو جس شے نے اتباع حق سے روکا اور انبیاء کا اتباع نہیں کرنے دیا وہ عقل ہی ہے اس لئے کہ طبیعت کے اقتضاءات کا تو انہوں نے بخوبی علاج کر لیا تھا چنانچہ اخلاق ان کے مہذب تھے۔ نفس کا تزکیہ بالکلیہ کر لیا تھا۔ بڑے بڑے مجاہدات سے وہ شائستہ ہو گئے تھے۔ اس لئے طبعی منازع تو ان میں بالکل نہ تھے صرف عقل ان کی اتباع سے مزاحم ہوتی تھی چنانچہ ایک آیت میں حق تعالیٰ نے اس کی طرف اشارہ بھی فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ یعنی اپنے علم پر اترا گئے اپنے علوم کے سامنے انبیاء کے علوم کو پست سمجھتے تھے۔ جیسے مدعیان عقل قرآن شریف پر اعتراض کیا کرتے تھے کہ قرآن میں تو معمولی مضمون ہیں۔ کہیں مچھر کا ذکر ہے کہیں مکھی کا۔ اللہ میاں کا کلام اور ایسی حقیر چیزوں کا ذکر اللہ تعالیٰ جیسے عظیم الشان ہیں۔ ایسی ہی چیزوں کا ذکر ہونا چاہیے۔ اور احمق یہ نہ سمجھے کہ مچھر اور مکھی کا ذکر قرآن مجید میں بطور تمثیل کے ہے اور تمثیل کے اندر یہ ضروری ہے کہ ممثل لہٗ جس درجہ کا ہو مثال بھی اسی درجہ کی ہوتی ہے۔ چنانچہ بتوں کی کمزوری دکھانے کے لئے ان کو مکھی سے تشبیہ دی ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ اور اللہ تعالیٰ کے سوا دوسرے کو اللہ ماننے کو مکڑی کے جالے کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور اگر مشبہ اور مشبہ بہ میں تناسب کی رعایت نہ ہو تو جو تشبیہ سے غرض ہے وہ فوت ہو جائے گی۔ پس پابندان خیال محققین کے کلام کو ہمیشہ بوجہ اپنی کم فہمی کے پست اور معمولی بتاتے چلے آئے ہیں اسی طرح انبیاء علیہم السلام کو اور ان کی کلام کو معمولی بات کہتے چلے آئے ہیں۔

علوم انبیاء علیہم السلام

اور راز اس میں یہ ہے کہ انبیاء اور محققین کو اصل میں نفع رسانی مقصود رہی ہے اور نافع مضمون کی شان ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ اس سے عوام سے لے کر خواص تک نفع حاصل کریں اور ایسے مضامین عجیب و غریب نہیں ہوتے۔ بلکہ سننے سے معمولی معلوم ہوتے ہیں لیکن اگر ان پر عمل کیا جائے تو اس وقت ان کا نفع معلوم ہوتا ہے اور جس قدر ان میں غور کیا جاتا ہے اسی قدر زیادہ باریکیاں اس میں نکلتی ہیں اور حقائق دقائق اور مضامین غامضہ سے چونکہ کوئی نفع نہیں اس لئے انبیاء اور ان کے جانشین ایسے مضامین بیان نہیں فرماتے نہ اس وجہ سے کہ ان کو معلوم نہیں بلکہ اس وجہ سے کہ وہ فہم عوام سے باہر ہیں اور نیز کوئی نفع بھی نہیں۔

اس کو ایک مثال کے ضمن میں سمجھنا چاہیے کہ حکیم محمود خاں کی دو مقام میں دو شانیں ہیں ایک تو جس وقت وہ طالب علموں کو پڑھاویں اور ایک جس وقت نسخہ لکھیں تو اگر کوئی شخص مطب میں ان کو دیکھ کر کہے کہ میں نے تو سنا تھا کہ حکیم محمود خان صاحب طب کے بڑے عالم ہیں یہ تو کچھ بھی نہیں۔ سونف، کاسنی تو کوئی بتا دے تو وہ شخص احمق ہے اس کو یہ عقل نہیں کہ جو لوگ ان کے پاس اس وقت جمع ہیں یہ مریض ہیں

ان کے لئے یہی مناسب ہے۔ اگر اس کو طب کی تحقیقات سننے کا شوق ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ اس وقت کا انتظار کرے جب کہ وہ طالب علموں کی نفیسی اور قانون کا سبق پڑھاتے ہیں۔

اسی طرح انبیاء کے دو موقع ہیں ایک تو جبکہ عوام سے خطاب کرتے ہیں ایک وہ جبکہ خواص ان کے مخاطب ہوتے ہیں خواص کو جو خطابات ہوتے ہیں ان کے بیان کرنے کی حاجت نہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب **الم حمعسق کھیٰعص** اب ان حروف کے معانی بجز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی نہیں سمجھا۔ کسی شخص نے کسی بزرگ سے معراج کے متعلق پوچھا تھا کہ وہاں کیا کیا باتیں ہوئیں اس کا کیا خوب جواب دیا۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد زباغباں　　بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

میاں عاشق و معشوق رمزیست　　کراماً کاتبین راہم خبر نیست

(کس کے پاس اتنا دماغ ہے کہ باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا پھول نے کیا سنا اور ہوا نے کیا کہا)

(یہ عاشق و معشوق کے اشارات ہیں جنکی اعمال لکھنے والوں کو خبر تک نہیں مراد یہ کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان کیا باتیں ہوئیں ان کی کسی کو خبر نہیں)

خود ملائکہ حامل وحی کو بھی خبر ہونا ثابت نہیں کہ ان لفظوں کے کیا معنی ہیں۔ ایک مرتبہ کانپور میں میں یہی تقریر کر رہا تھا ایک کورٹ انسپکٹر بھی موجود تھے۔ ان کو اس سے بڑا حظ ہوا اور کہنے لگے کہ یہ بالکل صحیح ہے۔ اور انہوں نے حکایت بیان کی کہ میں اناؤ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کے پاس بیٹھا تھا۔ ان کے پاس ایک کتاب رکھی تھی میں اٹھا کر دیکھنے لگا کہنے لگے کہ تمہارے کام کی نہیں تم نہیں سمجھو گے۔ یہ خاص اصطلاحیں خفیہ پولیس کی ہیں جن کو وہ باہم سمجھتے ہیں لیکن تشریع عام سب کو بتلائی گئی ہے یہ ایسے خطابات ہیں کہ سوائے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دوسرا نہیں سمجھتا۔

اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے بعض خواص اولیاء اللہ کا فہم بھی ان کے کسی حصہ تک پہنچا ہو۔ چنانچہ شیخ اکبر نے اوائل سورۂ روم سے نفخ صور تک کے حالات مع قید وسن و مع قید ناموں کے سمجھ کر لکھ دیئے ہیں۔ لیکن زبان ایسی اختیار کی ہے کہ ہر کوئی ان اصطلاحوں کو نہیں سمجھ سکتا اور کسی شخص نے اس کی شرح بھی لکھی ہے۔ مگر ان بھلے مانس نے بھی ایسے طور سے لکھا ہے کہ ہر کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اور اس پر بھی بہت قسمیں دی ہیں کہ اگر کوئی سمجھ جائے تو کسی سے ظاہر نہ کرے۔

غرض انبیاء اور اولیاء کے سینوں میں وہ علوم غامضہ ہیں کہ بڑے بڑے عقلاء وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ ان احمقوں نے اس پر نظر تو نہیں کی نظر اس پر کی کہ عوام سے جو ان کے خطابات ہیں وہ معمولی ہیں حالانکہ یہ خطابات بھی ان کے غایت علو درجہ پر دال ہیں۔

اس کی ایسی مثال ہے جیسے دو شخص ہیں ایک تو شرح ملا تک پڑھا ہوا ہے تو وہ اگر میزان الصرف پڑھا دے تو اس قدر عجیب نہیں اور ایک دوسرا شخص جو علم کے اندر ایک بحر ذخار ہے وہ اگر میزان پڑھاوے اور آسان کر کے پڑھاوے تو اس کا کمال ہے اس لئے کہ میزان کے ہر صفحہ پر جو اس کی نظر پڑے گی تو ہر ہر جملہ پر اس کو علم کا بے انتہا خزانہ نظر آئے گا۔ اور بڑے بڑے مضامین اس کے سامنے آئیں گے اور وہ ان کو اپنے درجہ سے تنزل کر کے نہایت سہل عنوان سے بیان کرے گا۔ اسی طرح انبیاء علیہم السلام مضامین عالیہ کو نہایت سہل عنوان سے بیان فرماتے ہیں۔ شاعر کا بڑا کمال یہ ہے کہ شعر سہل ٹھیٹھ زبان میں کہے اور پھر مضمون اچھا ہو۔

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ حق تعالیٰ کی قدرت جیسی بڑے حسین کو پیدا کرنے سے ظاہر ہوتی ہے اس سے بڑھ کر بدصورت کے پیدا کرنے سے معلوم ہوتی ہے۔ کامل خوشنویس اگر بگاڑ کر ایسا لکھ دے کہ بدخط معلوم ہو یہ اس کا کمال سمجھا جائے گا۔ پس صنائع اور بدائع سے جیسے حضرت حق کمال ظاہر ہوتا ہے ناقص کو دیکھ کر اس سے زیادہ استدلال ہوتا ہے بڑا فصیح و بلیغ اگر دیہات کی زبان میں گفتگو کرے تو یہ اس کا غایت کمال ہے۔ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ گنواروں کے ساتھ گاؤں کی زبان میں گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ تو بہت ہی بھلا معلوم ہوتا تھا۔ بڑے آدمی بچوں کے ساتھ بچوں کی سی بولی بولا کرتے اور اگر مخاطب کے رتبہ کے موافق نہ بولیں تو ایسے خطاب سے کچھ فائدہ نہیں۔

جیسے لکھنؤ میں ایک مولوی صاحب تعلقہ دار تھے۔ گاؤں کے کاشتکاران کے پاس آئے تو آپ ان سے پوچھتے ہیں کہ امسال آپ کے کشت زار گندم پر تقاطر امطار ہوا یا نہیں۔ تو وہ چودھری آپس میں ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ بھائیو! ٹھہر کر آئیو ابھی تو میاں قرآن پڑھ رہے ہیں تو آپ فرماتے ہیں کہ میں نے تو بہت مبتذل لغت بولے ہیں۔ پس اگر حضرات انبیاء علیہم السلام اپنے مقام رفیع پر رہ کر گفتگو کریں تو ایک حرف بھی کسی کی سمجھ میں نہ آوے اور حضرات انبیاء علیہم السلام کا مقام تو بہت عالی ہے۔ اولیاء امت میں ایسے ہوئے ہیں کہ انہوں نے جب اپنے مقام پر رہ کر کلام کیا ہے تو ان کے ہمعصروں کو سمجھ میں نہیں آیا۔ حضرت مولانا محمد قاسمؒ صاحب پر حال غالب تھا۔ اور حضرت مولانا گنگوہیؒ اپنے حال پر غالب تھے۔ اسی واسطے حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کو ان کا حال اپنے رتبہ کے موافق کلام کراتا تھا۔ ایک مرتبہ رامپور میں آئے اور تقریر فرمائی جو لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئی کسی عامی نے کہا کہ ہم تو سمجھے نہیں ایک بزرگ نے جواب دیا کہ افسوس! ایک شہباز عرش کا کہ جس کا پرواز عرش پر ہے۔ اس سے درخواست کی جاتی ہے کہ زمین پر اتر کر چلے۔ مولانا حال رفیع رکھتے تھے اور ایک امتی تھے اس سے سمجھ لیجئے کہ اگر انبیاء اپنے مقام رفیع سے کلام فرماتے تو کون سمجھتا۔

کلام خداوندی

اور اس سے آگے اور نظر کو وسعت دیجئے کہ اگر خدا تعالیٰ ہماری طاقت فہم سے بالاتر کلام فرماتے تو کیا ہوتا۔ وہ کلام کیا ہوتا ایک تجلی خاص ہوتی کہ اس کے ظہور ہوتے ہی ایک متنفس بھی باقی نہ رہتا۔

؎ چوں سلطان عزت علم درکشد　　جہاں سر بجیب عدم درکشد

(جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے تو سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں)

یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اپنے کلام کو الفاظ حادثہ کا لباس پہنا کر متجلی فرمایا ہے۔ اگر کلام قدیم اپنی قدم کی حالت سے متجلی ہوتا تو نہ میں ہوتا نہ تم ہوتے۔ پس یہ رحمت ہے کہ یہ کلام الفاظ حادثہ کی صورت میں نازل ہوا ہے۔ لیکن الفاظ ہی تک نہ رہنا چاہیے کسی نے خوب لکھا ہے۔

البحر بحر علی ما کان فی قدم　　ان الحوادث امواج و انهار
لایحجبنک اشکال تشاهدها　　عمن یشکل فیها فهی استار

(سمندر تو سمندر ہی ہے جیسا کہ شروع سے ہے موجیں اور نہریں ختم ہو جایا کرتی ہیں تیرے لئے وہ شکلیں جن کا تو مشاہدہ کرتا ہے حجاب نہ بن جائیں اس حقیقی شکل سے جس تک پہنچنا مشکل ہے کہ یہ ظاہری شکل بمنزل پردہ ہے)

یعنی الفاظ ہی کی طرف نظر نہ رکھنا چاہیے الفاظ بمنزلہ قشر ظاہر کے ہے اور صفت کلام جو قدیم ہے جس کی یہ صورت ہے وہ بمنزلہ مغز اور لب کے ہے اور ان الفاظ کے مدلولات بمنزلہ قشر باطن کے ہیں۔ گویا یہ مدلولات صفت قدیم اور ان الفاظ حادثہ کے درمیان ایک برزخ ہے کہ جس کے اندر قوم اور حدوث دونوں شان ہے مختلف درجات میں یعنی اس مدلول کا ایک درجہ تو وہ ہے جس کو کلام نفسی کا مدلول کہا جا سکے وہ مثل دال کے قدیم ہے اور دوسرا درجہ جس کو کلام لفظی کا مدلول کہا جا سکے وہ مثل اپنے دال کے حادث ہے ان میں معانی کا مشاہدہ کرنا چاہیے اور گو یہ وہ مرتبہ ہے جس کو عرفی نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر منطبق کیا ہے جناب وہ کہتا ہے

؎ تقدیر بیک ناقہ نشانید دو محمل　　سلمائے حدوث تو دلیلائے قدم را

(تقدیر کی ایک اونٹنی پر دو کجاوے لدے ہوئے ہیں ہلاکت سے تیرا محفوظ ہونا تیرے ہمیشہ سے ہونے کی دلیل ہے)

پس یہ مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے تو ثابت کرنا خلاف واقع کے ہے اور صحیح نہیں ہے ہاں البتہ مدلول کلام الٰہی کی یہی شان ہے مولانا شہیدؒ نے عرفی کے اس شعر پر رد فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ یہ تو ظاہر ہے کہ حضورؐ کا جسد عنصری حادث ہے اس کے قدم کا تو کوئی قائل ہو ہی نہیں سکتا۔ ہاں نور کے

اندر کلام ہو سکتا ہے سو وہ بھی حدیث اول خلق اللہ نوری (کشف الخفا للعجلونی ۱/۳۰۱) سے حارث ہے اس لئے کہ خلق ایک فعل ہے اور خلق کا تعلق نور سے ہوا ہے۔ تو خلق خود حادث ہے اور نور اس کا اثر ہے وہ ضرور اس سے متاخر ہوگا۔ اور بدرجہ اولیٰ حادث ہوگا۔

حقیقت محمدیہ

اس مقام پر ایک اور بات بھی سمجھنے کے لائق ہے وہ یہ ہے کہ بعضوں کو صوفیہ کی ایک اصلاح سے دھوکہ ہو گیا ہے کہ حضورؐ کے اندر شان قدم کی ہے وہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ حقیقت محمدیہ قدیم ہے اس سے دھوکا ہوتا ہے کہ حضورؐ کے اندر شان قدم کی ہے حالانکہ یہ ان کی ایک اصطلاح ہے حقیقت محمدیہ سے مراد وہ علم الٰہی کا ایک مرتبہ لیتے ہیں اور اس کو حضورؐ کی طرف اس لئے نسبت کرتے ہیں کہ یہ شان الٰہی حضورؐ کی مربی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس شان الٰہی کے مظہر ہیں۔ حقیقت تو اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ایک امر باطن ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چونکہ اس شان سے فیضیاب ہوتے ہیں اس لئے اس کو آپ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

منشا دھوکہ کا یہ ہوا کہ حقیقت کے معنی وہ لے لئے جو منطقیوں نے لئے ہیں حالانکہ ان کی مراد یہ معنی نہیں معقول کی جدا اصطلاح ہے اور تصوف کی علیحدہ اس التباس کی وجہ سے یہ سمجھ گئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قدیم ہیں۔ یادرکھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بجمیع اجزائہ شریفہ حادث ہیں۔ پس عرفی کا یہ شعر قرآن شریف کے بارہ میں تو بہت مناسب ہے۔

تجلی کلامی

الحاصل اگر کلام الٰہی کو یہ لباس حدوث کا نہ پہنایا جاتا تو یہ حالت ہوتی۔ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَیْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْیَةِ اللّٰهِ یعنی اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل کرتے تو اے مخاطب تو اس کو اللہ کے خوف سے دب جانے والا اور پھٹ جانے والا دیکھتا۔ کوہ طور پر ایک ہی تجلی تو ہوئی تھی جس نے اس کو ریزہ ریزہ کر دیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اول رویت کی درخواست کی تھی جس کے جواب میں ارشاد ہوا۔ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ فَسَوْفَ تَرٰىنِیْ یعنی تم مجھ کو نہیں دیکھ سکتے اس پہاڑ کی طرف دیکھو اگر یہ اپنی جگہ پر جما رہا تو تم مجھ کو دیکھ لو گے۔ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا یعنی رب موسیٰ نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اس کو ریزہ ریزہ کر دیا اور بیہوش ہو کر گر گئے۔ پس یہی حال تجلی کلامی کا بھی ہوتا کہ کسی کو اس کی تاب نہ ہوتی۔ حدیث شریف میں ہے لو کشف سبحات وجهه لاحترق ما انتهی الیه بصره (لم

اجدالحدیث فی موسوعۃ) (اگر وہ اپنے چہرے کے حجابات اٹھا دیتے جہاں تک اس کی نظر پہنچے سب جل جاتے) پس غایت رحمت ہے کہ اپنے کلام کو ایسی صورت سے اس عالم میں اتارا کہ ہمارے قلوب اس کے متحمل ہو گئے تو لازم تو یہ تھا کہ اس کا احسان مانیں نہ کہ الٹا اعتراض کریں۔ غرض انبیاء اور اولیاء اللہ کا کلام تنزل کے بعد بھی نہایت رفیع الشان ہوتا ہے وہ کلام سہل ممتنع ہوتا ہے۔ اس کے اندر ایسی رعایت اور پہلو ہوتے ہیں کہ نہایت مفید اور نہایت مفید ہونے کے ساتھ نہایت عالی کہ ارسطو اور افلاطون اور مشائین اور اشراقیین بھی وہاں تک نہیں پہنچ سکتے۔ پس اس پر اعتراض کرنا نری حماقت ہے اور عقل پرستی نہیں بلکہ وہم پرستی ہے خلاصہ یہ ہے کہ ان عقلاء کی عقل نے راہ ماری ہے اور فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَھُمْ (جو کچھ ان کے پاس ہے اس پر خوش ہیں) کے پورے مصداق ہیں۔

مانع حق طبیعت

دوسری شے حق سے روکنے والی طبیعت ہے طبیعت کا مقتضی یہ ہے کہ تمام شہوات اور لذات سے تمتع حاصل ہو اور سب پر غالب ہو کر رہوں۔ سب میرے ماتحت ہوں بعضوں کو تو اس تسخیر کا یہاں تک خبط ہوتا ہے کہ آدمیوں کو چھوڑ کر چاہتے ہیں کہ جنات بھی ہمارے تابع ہو جائیں میرے پاس بہت خطوط آتے ہیں کہ کوئی عمل تسخیر کا بتلا دو مجھے بھی ایک مرتبہ زمانہ طالب علمی میں تسخیر جن کا خبط ہوا تھا۔ میں نے حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے عرض کیا تھا۔ کہ حضرت کوئی عمل تسخیر جن کا بتلا دیجئے۔ حضرت نے فرمایا کہ ہاں ایسے عمل ہیں مگر یہ تو بتلاؤ کہ کیا حق تعالیٰ نے تم کو اسی واسطے پیدا کیا ہے کہ تم خدا بنو تم کو حق تعالیٰ نے بندہ بننے کے لئے پیدا کیا ہے۔ بندہ بنو۔

ز خاک آفریدت خداوند پاک ‏ ‏ ‏ ‏ پس اے بندہ افتادگی کن چو خاک

(اللہ تعالیٰ نے مجھے خاک سے پیدا کیا ہے پس اے بندے اپنی بڑائی پر خاک ڈال)

مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھ پر یہ چند حرفوں کی تہمت لگ گئی ہے ورنہ اپنے کو ایسا مٹاتا کہ کوئی نام بھی نہ جانتا۔ ایک مرتبہ حضرت مولانا تھانہ بھون تشریف لائے تھے وعظ بھی فرمایا تھا مجھ کو یاد ہے کہ حضرت چارپائی پر پائنتی کی طرف بیٹھے ہوئے تھے اور انگرکھ کے بند اور گھنڈی کھلی ہوئی تھی۔ اللہ اکبر اس قدر مٹایا کہ کوئی پہچان ہی نہ سکتا تھا۔ سنا تھا کہ مولانا محمد مظہر صاحبؒ کے پاس نائی خط بنانے آیا۔ حضرت اس وقت چارپائی کی پائنتی کی طرف بیٹھے ہوئے تھے۔ نائی کو حکم ہوا کہ سرہانے بیٹھ جا۔ اس نے کہا حضور میری کیا مجال ہے تیزی سے کہا ارے بیٹھ بھی۔ ان حضرات نے اپنے آپ کو کیسا مٹایا تھا مگر اس مٹانے کے ساتھ مولانا محمد یعقوب صاحبؒ کی اور شان بھی تھی وہ

یہ جانتے تھے کہ چھوٹوں کے سامنے تواضع کرنے سے ان کو تکلیف ہوتی ہے اس لئے وہ زیادہ تواضع نہ فرماتے تھے۔ شاگردوں کو ان کا نام لے کر پکارتے تھے۔ مجھے فرمایا کرتے تھے اشرف علی خدا جانتا ہے کہ مولانا کے اس طرح پکارنے سے اس قدر جی خوش ہوتا تھا کہ اوروں کے مولانا صاحب کہنے میں وہ لطف نہیں آتا۔ اور مولانا محمد قاسم صاحبؒ کا مذاق جدا تھا۔ وہ شاگردوں کو بھی مولوی صاحب اور شاہ صاحب کہہ کر پکارتے تھے۔ بات یہ ہے ؎ ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

(ہر پھول کا رنگ اور اس کی خوشبو جدا ہے)

؎ بگوش گل چہ سخن گفتہ کہ خنداں است ‏ ‏ ‏ بعندلیب چہ فرمودۂ کہ نالاں است

(پھول کے کان میں کیا بات کہہ دی کہ مسکرا رہا ہے بلبل سے کیا فرمادیا کہ فریاد کر رہی ہے)

مختلف شانیں ہیں کسی پر تواضع غالب ہے کسی پر شفقت و رحمت کا غلبہ ہے۔ کسی کے اندر جلال کسی میں جمال کی شان ہے۔ بعض لوگ جو بزرگوں پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ فلاں نرم ہیں اور فلاں تیز ہیں یہ نری جہالت ہے۔ تم کو ان کے حال کی کیا خبر ہے تم ہر ایک کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہو۔ تمہارے لئے یہی بہتر ہے کہ تم اپنی حالت پر رہو۔ بزرگوں کا فیصلہ کرنے والے تم کون ہوتے ہو۔ گیدڑ اگر شیروں کا فیصلہ کرے تو اس کی کم بختی آتی ہے۔ تم اپنی خیر مناؤ۔ ایسا نہ ہو کہ ان کے درمیان میں تم نہ دے جاؤ

؎ آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ ‏ ‏ ‏ بر نہ تابد کوہ را ایک برگ کاہ

(آرزو کی خواہش کرو لیکن اپنے اندازہ کے موافق خواہش کرو کیونکہ ایک گھاس کا پتہ پہاڑ کو اٹھا نہیں سکتا)

حاصل مجاہدہ

غرض مانع عن الحق دوشئ ہیں عقل اور طبیعت۔ عقل خواص کی راہزن ہے۔ اور طبیعت سب کی۔ پس مجاہدہ کا حاصل یہ ہوا کہ عقل اور طبیعت دونوں کو مغلوب کیا جائے۔ پس دو قسم کے عمل کی ضرورت ہے۔ ایک تو وہ عمل کہ جس پر عقلیت غالب ہو مثلاً نماز ہے کہ اس سے مقصود جاہ کو مغلوب کرنا اور جناب باری کے سامنے نیاز مندی کا اظہار ہے تو عقل بھی نیاز مندی اور نماز میں مناسبت سمجھتی ہے اس لئے کہ اس میں دست بستہ ہاتھ باندھ کر کھڑے ہوتے ہیں اور اشرف اجزاء یعنی سر کو ارذل العناصر یعنی زمین پر رکھا جاتا ہے۔ غرض اس کے ہر ہر جزو سے اس کی غایت سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح روزہ کو سمجھئے کہ وہ قوت بہیمیہ کے انکسار کیلئے ہے اور مناسبت دونوں میں سمجھ میں آتی ہے۔ پس ان دونوں عبادتوں میں عقلیت کی شان غالب ہے ان کے ادا کرنے سے عقل کی رعایت ہے اور دوسری قسم عمل کی وہ ہونا چاہیے کہ جس میں عقلیت کی شان مغلوب ہو۔ عقل براہ راست اس کو نہ سمجھے۔ بلکہ اس میں طبیعت کا غلبہ ہو اور اس کے ادا کرنے میں

طبیعت کی رعایت ہو۔ جب عقل اور طبیعت دونوں کی رعایت کر کے دونوں کو کام میں لگا دیا جائے تو دونوں کو حق تعالیٰ سے تعلق ہو کر ان میں شان انقیاد کی آ جاوے گی اور دونوں اعتدال پر آ جاویں گے اور یہی دونوں چیزیں حق تعالیٰ سے روکنے والی تھیں۔ تو اس وقت بندہ پر حق واضح ہو جاوے گا اور مجاہدہ بھی کامل ہو جائیگا۔

رعایت طبیعت

اس سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ جیسے ہم کو پہلی قسم کی ضرورت ہے اسی طرح دوسری قسم کی بھی ضرورت ہے اس لئے ہم کو اس میں سے بھی حصہ دیا گیا ہے۔ اور صرف عقل کو رام کر لینا کافی نہ تھا۔ اس لئے کہ طبیعت اس کی مزاحم ہوتی رہے اور عقل اور طبع میں جب تنازع ہوتا ہے تو غلبہ ہمیشہ طبع کو رہتا ہے۔ اور وجہ اس کی یہ ہے کہ طبع پر وہم کا اثر غالب رہتا ہے۔ دیکھو اگر بڑی اونچی دیوار ہو اور ایک گز اس کا عرض ہو اور ادھر ادھر کوئی آڑ اس پر نہ ہو اور وہاں پر کسی آدمی کو چھوڑ دیا جاوے تو سوائے نٹ کے کوئی اس پر کو نہ گزر سکے گا بلکہ گزرنا تو علیحدہ وہاں بیٹھ نہ سکے گا۔ حالانکہ عقل کہتی ہے کہ چلنے کے لئے تو صرف ہاتھ بھر بلکہ اس سے کم جگہ کافی ہے اور عقل برابر زبان حال سے کہہ رہی ہے کہ گرو گے نہیں۔ مگر وہم کہتا ہے کہ ضرور گرو گے اور اسی کا غلبہ رہتا ہے۔

بعض فلاسفہ کہتے ہیں کہ بہت اونچی دیوار پر جو انسان ڈرتا ہے اور بسا اوقات گر بھی جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شے کا مرکز کی طرف میلان ہے مرکز یعنی زمین اس کو کشش کرتی ہے اس لئے ڈرتا ہے یہ بالکل بے ہودہ بات ہے اس لئے کہ اگر کسی اندھے کو وہاں چھوڑ دو اور یقین دلا دو کہ حافظ جی اس کے دونوں طرف دیواروں کی آڑ ہے گرو گے نہیں تو ہرگز اس کو خوف نہ ہوگا۔ اور جب اس کو بھی علم ہو جاوے گا تو وہ بھی خائف ہوگا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہم کے غلبہ سے خوف معلوم ہوتا ہے۔

دیکھو ننھے بچے ایسی ایسی جگہ پہنچ جاتے ہیں کہ بڑے وہاں نہیں جا سکتے۔ اس لئے کہ ان کو ہوش نہیں اور وہم پرستی سے ان کا دماغ خالی ہے ان کو زمین کیوں نہیں کشش کرتی۔ یہ سب ڈھکو سلے ہیں۔ اسی طرح پتھر جو اوپر سے نیچے کو آتا ہے تو حکماء قدیم تو یہ کہتے ہیں کہ پتھر کے اندر نیچے جانے کا میلان ہے اور اس وقت کے فلاسفہ کہتے ہیں کہ زمین اس کو اپنی طرف کشش کرتی ہے۔ یہ سب گپ ہے۔ ہاں پہلی بات کچھ جی کو لگتی ہے قرآن شریف سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ارشاد ہے۔ إِنَّ اللَّهَ يُمْسِكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ أَنْ تَزُولَا ۚ وَلَئِنْ زَالَتَا إِنْ أَمْسَكَهُمَا مِنْ أَحَدٍ مِنْ بَعْدِهِ ۚ (یقینی بات ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین کو تھامے ہوئے ہے کہ وہ موجودہ حالت کو چھوڑ نہ دیں اور اگر (بالفرض) وہ موجودہ حالت کو چھوڑ بھی دیں تو پھر خدا تعالیٰ کے سوا ان کو کوئی تھام بھی نہیں سکتا) اور ارشاد ہے وَيُمْسِكُ السَّمَاءَ أَنْ تَقَعَ عَلَى الْأَرْضِ (اور وہی آسمانوں کو زمین پر گرنے سے تھامے ہوئے ہے مگر

اس کا حکم ہو جائے تو (خیر) ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان زمین پر گرنا چاہتا ہے مگر حق تعالیٰ اسے روکے ہوئے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر شے مرکز کی طالب ہے۔

الحاصل طبع پر وہم کا غلبہ رہتا ہے پس اگر مجاہدہ کے اندر صرف عقل کی تعدیل کی جاتی اور طبع کو مہمل چھوڑ دیا جاتا تو سخت مصیبت ہو جاتی۔ مثلاً نماز کا وقت آیا تو عقل کہتی ہے کہ نماز پڑھنا چاہیے اور طبع پر سستی غالب ہوئی اور پہلے گزر چکا ہے کہ عقل اور طبع کی مزاحمت کے وقت طبع کو غلبہ رہتا ہے۔ پس اس صورت میں بھی طبع کو غلبہ رہتا۔ پس اس کا ضروری اور لازمی اثر تھا کہ نماز ترک ہوتی۔ حق تعالیٰ کا یہ فضل ہوا کہ طبع کو بھی رنگین بنا دیا۔ اور اس کو خاص خاص مجاہدوں سے مہذب بنا دیا۔ اب خود اس کا اقتضاء ہے کہ وہ اٹھا کر کھڑا کر دیتی ہے اسی واسطے منتہا مجاہدہ کا یہ ہے کہ امور شرعیہ امور طبعیہ بن جاویں اسی کی نسبت کسی نے کہا ہے

ع صنمارہ قلندر سزد از بمن نمائی کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(مجھے قلندری کی ایسی راہ دکھادے جو میرے مناسب ہو اس لئے کہ میں پارسائی کی قیدوں کو دور دراز پاتا ہوں)

رہ قلندر سے یہی مراد ہے کہ طبع پر رنگ چڑھ جاوے کہ بدوں اس کے چین نہ آوے۔ بفضلہ تعالیٰ اس رنگ کا حصہ کم وبیش دینداروں میں موجود ہے۔

اختلاف طبیعت

دیکھو اگر کسی نمازی کو نماز کے وقت دو آدمی پکڑ کر رسے باندھ دیں تو وہ رسے توڑ کر بھاگے گا تو اس میں کیا راز ہے یہی ہے کہ اس کی طبیعت بدل گئی ہے وہ کشاں کشاں اس کو اپنے مقتضیٰ کی طرف لے جاتی ہے۔ اس کو ملکہ راسخہ اور طبعیہ ثانیہ کہتے ہیں۔

کسی بزرگ نے حکایت لکھی ہے کہ ایک آقا اور غلام چلے جا رہے تھے غلام نمازی تھا نماز کا وقت آ گیا وہ مسجد میں نماز پڑھنے گیا اور آقا صاحب مسجد سے باہر رہے۔ جب بہت دیر ہو گئی تو آقا نے پکارا کہ آؤ۔ غلام نے کہا کہ آنے نہیں دیتا۔ فرق کیا تھا کہ نماز اس غلام کی طبیعت ثانیہ ہو گئی تھی۔ اور مولیٰ کی طبیعت مہذب نہ تھی۔

اس کی وہ حالت تھی جیسے کسی قصائی کا بیل چھٹ کر مسجد میں گھس گیا۔ لوگوں نے ملامت کی تو کہنے لگا کہ میاں جانور بے عقل تھا چلا آیا کبھی ہم کو بھی دیکھا ہے۔ اللہ اکبر طبیعت کا کیسا اختلاف ہے اور یہی طبیعت کبھی ایسا پلٹا کھاتی ہے کہ تکبیر اولیٰ بھی اگر قضا ہو جائے تو گویا غم کا پہاڑ آ گرتا ہے

ع بردل سالک ہزاراں غم بود گرز باغ دل خلالے کم بود

اس لئے بہت زیادہ ضروری طبیعت کا مسخر کرنا ہے۔

طبیعت اور عقل کی مثال

طبیعت اور عقل کی مثال ریل کی سی ہے کہ انجن میں جو کلیں ہیں ان کے ذریعے سے پہیے کو گھما کر بھی چلا سکتے ہیں لیکن سخت تکلیف ہوگی اور کچھ دور جا کر یقیناً رک جائے گی اور زیادہ مسافت قطع نہ کر سکے گی۔ یہ مثال تو عقل کی ہے کہ عقل کے ذریعہ سے گو بدن سے کام لے سکتے ہیں لیکن بہت کم اور بڑی مشقت سے اور اگر اس میں آگ اور پانی بھی ہوا اور اس کے بعد کلوں کو گھمایا جاوے تو پھر اس بے تکلف ہزاروں میل قطع ہو سکتے ہیں۔ یہ مثال طبیعت کی ہے کہ اگر طبیعت رنگین ہو جائے تو اس سے بڑے بڑے کام بے تکلف لے سکتے ہیں۔ پس ایسے مجاہدوں کی بھی ضرورت واقع ہوئی کہ جن سے طبع مسخر ہو۔

حج سے تسخیر طبیعت

ان میں سے ایک بہت بڑی شے حج بھی ہے اور اس میں یہ رنگ ہونا اس آیت سے سمجھ میں آیا ہے چنانچہ ارشاد ہے کہ واسطے اللہ کے لوگوں پر خانہ کعبہ کا حج ہے جو اس تک راہ کی مقدور رکھتے ہیں۔
اس آیت میں جو لفظ حج البیت واقع ہوا ہے تو اس اضافت سے اس کا پتہ چلتا ہے۔ اللہ اکبر قرآن شریف کا ایک ایک حرف ایک علم کا دریا ہے دیکھو اس اضافت سے کتنا بڑا علم مستنبط ہوتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عقل اور طبیعت کے آثار میں تفاوت ہے۔ عقل کا مقتضیٰ یہ ہے کہ نفس عبادت کا اہتمام ہو اور قیود اور ہیئات کا اہتمام بالکل نہ ہو اس لئے کہ عقل تجرد کو چاہتی ہے اور تعینات اور تشخصات سے اس کو تنفر ہے اور طبیعت چونکہ محسوسات سے مالوف ہے اس لئے اس کو قیود اور ہیئات و تعینات سے انس ہے اور جس شخص میں تجرد ہو اس کو الفت و انس نہیں ہے۔ مثلاً نماز ہے اس کی روح خشوع اور خضوع ہے تو عقل محض اس معنیٰ سے آشنا ہے اور جو قیود اس کے علاوہ ہیں وہ دو قسم ہیں ایک تو وہ ہیں جو نماز کے مقام اور محقق ہیں جیسے رکوع اور سجدہ عقل کو ان سے بھی گریز نہیں۔ اس لئے کہ یہ سب خشوع اور خضوع کی صورتیں ہیں اور اسی طہارت کی قید سے بھی اس کو انکار نہیں اور دوسری قسم قیود کی وہ ہیں جو زائد اور خارج ہیں جیسے مکان خاص یا زمان خاص عقل اس قسم کی قیود کو تجویز نہیں کرتی ایسے قیود طبیعت کا حظ ہیں۔ اسی واسطے میں نے کہا تھا کہ نماز کے اندر عقلیت کی شان کا غلبہ ہے اور طبیعت مغلوب ہے پس عقل ایسی عبادت کی مجوز ہے جو زمان اور مکان کی قید سے مبرا ہو جیسے ذکر اللہ کہ کسی وقت کے ساتھ مقید نہیں چنانچہ ارشاد ہے۔ **یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً** اور حدیث میں **کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یذکر اللہ فی کل حین** لیکن طبیعت کی رعایت کر کے بعض عبادتوں میں قیدیں لگائی گئی ہیں اس لئے کہ طبیعت کا تعلق جزئیات محسوسہ سے ہے اور اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ ہر قسم کی قید

ہو پس جو عبادت عقل کی تسخیر کے لئے ہیں ان میں قیدیں نہ ہونی چاہئیں۔ اور جو طبیعت کی تسخیر کے لئے ہیں ان میں قیود ہونا ضروری ہے اس لئے ہر قسم کی عبادتیں حق تعالیٰ نے مقرر فرمائی ہیں۔

اس کے بعد سمجھنا چاہیے کہ قیود کی تین قسمیں ہیں۔ اول قید زمان، دوسرے قید مکان، تیسرے علاوہ ان دونوں کے کوئی قید مناسب ہو۔ ان تینوں قسموں کے درمیان جو غور کر کے دیکھا جاتا ہے تو زمان کی قید عقل سے اتنی بعید نہیں ہے جس قدر کہ مکان کی قید بعید ہے۔ اس لئے کہ زمان بھی ہر چند کہ قید ہے لیکن وہ ایسی قید ہے کہ اطلاق کے مناسب ہے اس لئے کہ زمان خود ایک ایسی شئے ہے کہ اس کے اندر ایک قسم کا اطلاق ہے خواہ فلاسفہ کے قول کے موافق فلک الافلاک کی حرکت کو کہا جائے یا متکلمین کے قول کے موافق ایک امتداد موہوم سے تعبیر کیا جائے۔ ہر صورت میں زمانہ ایک ایسی شے ہے کہ اس میں اطلاق کی مشابہت ہے پس اس قید سے بھی عقل کو زیادہ انکار نہیں ہے۔ باقی رہی قید مکان کی یا وہ قید جو محسوس ہونے میں مکان کی طرح ہو اس سے عقل کو بالکلیہ انکار ہے وہ خالص طبع کے موافق ہے۔ پس حج چونکہ بیت کی طرف مضاف ہے اور بیت نام ایک مکان خاص کا ہے اس لئے یہ عبادت طبع کی تسخیر کے لئے ہوئی اور عقل اس کو بالکل تجویز نہیں کرتی ہے۔

مجاہدہ حج

چنانچہ حج کو اول سے آخر تک دیکھ لیجئے کہ اس کے سب افعال ایسے ہی ہیں دیکھئے سب سے پہلے حج میں کیا ہوتا ہے سب سے اول یہ ہوتا ہے کہ اپنے گھر آرام سے اپنے اہل وعیال اور عزیزوں میں بیٹھے ہوئے ہیں دل میں آیا کہ حج کریں سفر کی تیاری ہوئی عقل یہاں سے ہی مانع ہوتی ہے کہ کیا ضرورت ہے۔ خصوصاً جبکہ عقل نے یہ اشعار بھی سن لئے ہیں

؎ اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید   معشوق دریں جاست بیائید بیائید

(اے حج کو جانے والی قوم کہاں جارہے ہو؟ آؤ محبوب اس جگہ ہے)

حالانکہ یہ شعر خاص ان لوگوں کے واسطے ہے جو حج کر کے خدا سے اور زیادہ دور ہو جاتے ہیں یعنی پاس کچھ نہیں ہے اور شوق ہوا حج کا چلدیئے اور راستہ میں نمازیں قضا کر رہے ہیں اور لوگوں سے بھیک مانگ رہے ہیں ایسے لوگوں کو خطاب ہے کہ محبوب تو یہاں ہی ہے یعنی اس کی مرضی نہیں ہے کہ تم وہاں جاؤ اور مرضیات کے خلاف کرو غرض عقل اول ہی سے سدراہ ہوتی ہے اور کہتی ہے کہ حضرت حق تو مقید مکان کے ساتھ نہیں تم وہاں جا کر کیا کرو گے۔ غرض عقل کو سخت گنجلک ... ہوتی ہے۔

یہاں سے یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ آج کل جو بعض عقل پرست حج پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ عقل کے خلاف ہے اس امر کو ہم تسلیم کرتے ہیں اور اسی کو ہم ثابت کرتے ہیں کہ واقعی عقل کے

خلاف ہے مگر یہ ضرور نہیں کہ عقل جس بات کو تجویز نہ کرے وہ ضروری نہیں ہے یہ عبادت طبع کی تسخیر کے لئے ہے اور اس کا تسخیر کرنا ضروری ہے کمامر۔

اب آگے چلئے آگے یہ ہوتا ہے کہ اچھے خاصے آدمیوں کی صورت سے نکل کر یہ وحشت ہوئی کہ سب کپڑے اتار دیئے صرف ایک لنگی باندھ لی اور ایک چادر بدن پر اوڑھ لی اور سر ننگا کر لیا۔ یہاں بھی عقل کو وحشت ہوئی کہ ہائیں یہ کیا ہوا یہ کون سی عقل کی بات ہے کہ ننگے سر رہو اور اچھے خاصے کپڑے اتار کر مردوں کا سا کفن بدن سے لپیٹ لیا۔

اس کے بعد دو رکعت پڑھ کر چلانا شروع کیا۔ لبیک اللھم لبیک اب عقل پھر روکتی ہے کہ یہاں چلاتے کیوں ہو یہ تم کو کیا سودا ہوا۔ لیکن وہ ایک نہیں سنتا۔ اس کے بعد آگے چلے جب خانہ کعبہ پہنچے اور اس کو دیکھا تو آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو جاری ہو گئے۔ عقل کہتی ہے کہ باؤلے کیوں ہو گئے روتے کیوں ہو؟ آگے بڑھے تو کیا سوجھی کہ دیوانوں کی طرح ایک مکان کے چاروں طرف پھر رہے ہیں اور پھر یہ حرکت کہ آپ دوڑتے ہیں اور شانے ہلاتے جاتے ہیں۔ عقل کہتی ہے کہ بس جی بالکل ہی دیوانگی آ گئی اور وہ جواب دیتا ہے

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم — مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نہ شد — مرعس رادید و درخانہ نشد

(ہم اگر مفلس اور دیوانہ ہیں تو ہم اس ساقی اور پیمانہ سے مست ہیں)

(وہ دیوانہ دراصل دیوانہ نہیں ہے جو اتنی کششیں دیکھنے کے بعد گھر نہیں آتا)

غرض عقل وہاں لنگڑی لنجی کھڑی تکتی ہے اور کچھ نہیں کر سکتی۔ اس بھلی مانس سے کوئی پوچھے کہ تو یہاں آئی کیوں۔ اس کو مناسب تھا کہ یہ یہاں نہ آتی۔ لیکن طبیعت سے پوچھو وہ باغ باغ ہے اور عقل کو ملامت کرتی ہے کہ تو یہاں کیوں آئی یہاں تیری دعوت نہیں ہے یہاں تو ہماری دعوت ہے تو یہاں محض طفیلی ہے ایک طرف چپکی کھڑی رہ اگر ذرا دم مارا تو کان پکڑ کر نکال دی جائے گی۔ خیر عقل بے چاری چپ ہو گئی اس نے اور صبر کیا خیر۔

وہاں سے پھر پھرا کر صفا مروہ کی طرف گئے وہاں کیا حرکت کی کہ اچھے خاصے متانت کے ساتھ چلتے چلتے میلین اخضرین کے درمیان ایک دم سے بھاگے۔ عقل کو سخت وحشت ہوئی پھر ایک دفعہ نہیں سات مرتبہ یہی کیا۔ اس کے بعد خیر عقل نے مغلوب ہو کر تسلیم کر لیا کہ یہ اللہ میاں کا گھر ہے یہاں ایسے ہی افعال مناسب ہیں اس کے بعد آٹھویں تاریخ جب آئی تو عرفات کو چلے عقل یہاں بھی روکتی ہے کہ میاں یہ کیا وحشت ہے۔ اللہ میاں کے گھر کو چھوڑ کر جنگل کیوں چڑھ گئے پھر وہاں کوئی شئے نہیں محض ایک میدان ہے اور وہاں جا کر کچھ کرنا بھی نہیں پڑتا۔ ایک نماز تھی جو عقل کا حظ تھا وہ بھی اپنے وقت پر نہیں ہے۔ یعنی عصر کی

نماز اس روز ظہر کے وقت پڑھی جاتی ہے۔ خیر عقل نے جوں توں کر کے تمام دن گزارا۔ اب مغرب کا وقت آیا عقل کہتی ہے کہ نماز پڑھو لیکن نماز نہیں پڑھتے اس لئے کہ اس روز مغرب کی نماز مزدلفہ میں جا کر عشاء کے وقت میں پڑھی جاتی ہے مغرب کا وقت گزر رہا ہے اور عقل سخت پیچ وتاب میں ہے کہ یہ کیا اسرار ہے کہ نماز بھی اڑ گئی۔ عقل اس پارلیمنٹ سے بالکل علیحدہ ہے اس کے بعد منیٰ میں پہنچے وہاں تین پتھر ہیں ان کو کنکریاں مارو یہاں بھی عقل منع کرتی رہی کہ یہ کیا دیوانگی ہے پھر جانور ذبح کرو۔ ذبح خود عقل کے خلاف نہ کہ اس شان کے ساتھ۔ اس کے بعد سر منڈواؤ اچھے خاصے تھے سب کے سر کدو سے نکل آئے۔ اور عورتوں کے لئے بجائے سر منڈانے کے تھوڑے سے بالوں کو کترانا ہے اس لئے کہ عورتوں کے سر کے بال مردوں کی داڑھیوں کے قائم مقام ہیں جیسے مردوں کی زینت داڑھی سے ہے عورتوں کی زینت سر کے بالوں سے ہے۔ اس لئے حج اور غیر حج کسی وقت انکا بالکل کتر ڈالنا یا مونڈنا جائز نہیں۔

اسی واسطے میں کہا کرتا ہوں کہ جو لوگ داڑھی منڈاتے ہیں ان کو چاہیے کہ عورتوں کے سر کے بال منڈایا کریں۔ اس لئے اگر داڑھی کے منڈانے سے ان کے زعم میں زینت ہوتی ہے تو عورتوں کے سر کے بال منڈانے سے بھی ہونی چاہیے۔

غرض حج کے جس قدر افعال ہیں اول سے آخر تک سب عقل کے خلاف ہیں۔ اس لئے کہ اس مجاہدہ میں عقل کی رعایت نہیں ہے طبیعت کے مذاق کے موافق ہے اس لئے کہ طبیعت قیود مکانیہ کو مقتضی ہے یہ تو اجمالی بیان تھا۔ حج میں رعایت طبیعت کا۔

خاصیت محبت

اور تفصیلی بیان یہ ہے کہ تتبع سے یہ معلوم ہوا ہے کہ اصل میں طبع جس شے سے مغلوب ہوتی ہے وہ صرف ایک شے ہے جس کا نام محبت ہے محبت ہی وہ شے ہے جس سے طبیعت مغلوب ہو جاتی ہے اور اس کے سامنے بیکار ہو جاتی ہے طبیعت کی کیفیت یہ تھی کہ وہ وہم کی مسخر تھی لیکن محبت کے سامنے سب اوہام جاتے رہتے ہیں۔ دیکھو اگر کوئی کسی مردار عورت پر عاشق ہو جاتا تو ذلت اور خواری جو کہ طبیعت کے خلاف تھی سب گوارہ کرتا ہے اور اگر کبھی ان چیزوں کی مزاحمت ہوتی ہے تو کہتا ہے

؎ من آنست کہ یاراں ہمہ گار — بگذارند وخم گیسوے یارے گیرند

(میں تو وہ ہوں کہ جس نے دوستوں کے سب اعتراضات سے صرف نظر کر لیا ہے اور اپنے محبوب کی زلفوں کا اسیر ہو گیا ہوں) طبیعت کہتی ہے کہ رسوا ہو جائے گا۔ محبت کہتی ہے

؎ نساز و عشق را کنج سلامت — خوشا رسوائی کوئے ملامت

(عشق کے لائق گوشہ عافیت نہیں ہے اس کے لئے تو محبوب کی گلیوں کی رسوائی خوشی کا باعث ہے)

طبیعت چاہتی ہے کہ میری برائی اور ننگ و ناموس محفوظ رہے لیکن محبت کا مقتضی یہ ہے

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما　　　　وے طبیعت جملہ علتہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما　　　　اے تو افلاطون و جالینوس ما

(اے عشق کہ میں اپنی دیوانگی پر خوش ہوں کہ تو میری تمام بیماریوں کے لئے بطور طبیعت کے ہے تو میری بزرگی اور عفت لئے بمنزل دوا کے ہے اور تو میرے لئے افلاطون اور جالینوس کی طرح مصلح ہے)

اور واقعی طبیعت کو دبانے کے لئے بھی ایسی ہی سخت شے کی ضرورت تھی۔ عقل کو تو اس نے دبالیا تھا۔ لیکن محبت جیسا زبردست پہلوان نہ ہوتا تو واقعی طبیعت عقل پر غالب آ کر بہت فساد اٹھاتی۔ غرض محبت طبیعت سے مغلوب ہوتی ہے محبت کا بقا اور ظہور ہوتا ہے اسباب سے اور اسباب اس کے یہ ہیں کہ محبوب کے ساتھ کچھ تلبس ہو مثلاً محبوب کو دیکھ لیا یا اس کی آواز کان میں آ گئی یا اگر خوش قسمتی سے ہاتھ ملالیا تو محب ذبح ہی ہوجائے گا۔ اور اگر کبھی معانقہ نصیب ہو گیا تو یوں سمجھو سب کچھ مل گیا اور اگر ان اسباب میں سے کوئی شے بھی نہ ہو تو محبت ضعیف تو یقیناً جاتی رہے گی اور محبت قوی بھی یا تو ضعیف ہو کر قریب الزوال ہوجائے گی اور یا محب کو فنا کر ڈالے گی۔

طریق اظہار محبت

پس جب محبت کا یہ خاصہ معلوم ہو گیا تو سمجھنا چاہیے کہ یہاں محبوب ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور وہ بالکل نظروں سے غائب ہیں نہ ان کو دیکھ سکتے ہیں نہ کوئی آواز ان کی سنائی دیتی ہے اور ہاتھ ملانا اور معانقہ کرنا تو کیسے ہوسکتا ہے پس اگر اس محبت کی بقاء کا کوئی سبب ظاہری دنیا میں نہ بنایا جاتا تو محبین یا تو ہجر میں فنا ہو جاتے یا محبت ان کی رخصت ہو جاتی اس لئے حق تعالیٰ نے اپنی رحمت بے نہایت سے دنیا میں ایک گھر بنایا اور اس کو اپنی طرف منسوب فرما کر اس کا نام بیت اللہ رکھا اور اس پر ایک خاص تجلی اپنی صفات کی رکھی اور اس میں ایک پتھر حجر اسود رکھا گیا جس کا نام یمین اللہ رکھا گیا اور اس کی زیارت مستطیعین پر فرض کر دی کہ اپنی جان اور مال لے کر دار محبوب تک جاؤ اس لئے کہ محبوب حقیقی کو اس عالم میں دیکھ نہیں سکتے اس کے تخت یعنی تجلی گاہ سے ہی اپنی محبت کا اظہار کرو اور اپنے جوش محبت کو نکالو۔ اس کے گرد پھرو اس سے معانقہ کرو۔ اس سے مصافحہ کرو۔ یعنی حجر اسود کو تقبیل یا مس کرو اور عشاق کی سی صورت بناؤ اور جیسے عشاق کی چال اور افعال میں وقار اور متانت نہیں رہتا ایسے ہی تم بیت اللہ شریف کے گرد شانے ہلاتے ہوئے دوڑو اور اگر کوئی ان افعال سے مانع ہو اور ملامت کرے تو اس کو پتھروں سے مارو یعنی رمی جمار کرو۔

اور چھوٹی چھوٹی کنکریاں اس لئے تجویز کی گئی ہیں کہ بڑے بڑے پتھر اگر ہوتے تو ان سے کسی

آنے جانے والے کے چوٹ لگ جاتی اور مارنا مقصود ہے شیطان کو اور اس کو درحقیقت مارنے والی شے اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور یہ کنکریاں اس کی ظاہری علامت ہے۔

اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ حج کے افعال سب عقل کے خلاف ہی ہونا چاہیے چنانچہ صورت بھی مجنونوں کی سی ہو جاتی ہے۔ سر ننگا' بال بڑھے ہوئے جوئیں چلتی ہوئی۔ نہ سر کا ہوش' نہ بدن کی خبر اور مناسب تو یہ تھا کہ وہاں اس حالت سے جا کر اپنی جان دے ڈالتے۔ لیکن یہ محبوب کی طرف سے رحمت ہے کہ انہوں نے بجائے تمہاری جان کے ایسی شئے کی جان کو قبول کر لیا کہ جوان کی جنس قریب میں شریک ہے یعنی بکرا یا گائے یا اونٹ کی قربانی کا حکم دیا۔

فلاسفر قربانی پر اعتراض کرتے ہیں کہ مال کے ضائع کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ اس لئے کہ اس کا گوشت بھی نہیں کھایا جاتا۔ لیکن یہاں تو عقل کو بالائے طاق رکھدیا ہے اس کو تو یہ کہا جاتا ہے تو ایک طرف کھڑی رہ تیرا یہاں کام نہیں ہے یہاں تو طبیعت کو بلایا گیا ہے پس فلاسفہ کو بکنے دو یہ کیا جانیں کہ اس میں کیا لطف ہے۔ غرض یہ موقع جان دینے کا تھا۔ لیکن یہ رحمت ہے کہ بجائے تمہاری جان کے محبوب نے جانوروں کی جان قبول فرمائی۔

اور دیکھئے کہ محبوب کے مکان کی عظمت عاشق کے دل میں بے حد ہوتی ہے یہاں اس کی عظمت کو اس طرح ظاہر کیا گیا ہے کہ وہاں کے جانور کا شکار نہ کرو اور وہاں کی گھاس نہ کاٹو۔ فلسفیانہ نظر سے تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا لیکن عاشق سے پوچھو کہ اس کو محبوب کی در و دیوار کو دیکھ کر کیا حالت ہوتی ہے

۔ ومن ویدنی حب الدیار لا هلها   وللناس فیما یعشقون مذاهب

اور ایک اور شاعر کہتا ہے

تمتع من شمیم عرار نجد   فما بعد العشیة من عرار

(جامع)

وہ عاشق ہی کیا ہوا جس نے محبوب کے مکان کی قدر نہ کی اور وہاں کے گل تو علیحدہ وہاں کے خار کو بھی نظر محبوبیت سے نہ دیکھا اور وہاں کے جانوروں کا شکار تو بہت بڑی خیانت ہے اس تقریر سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ حج کے تمام افعال میں محبت کا ظہور ہے۔ اس واسطے اس کے تمام افعال عقلی سطح کے خلاف نظر آتے ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ سبب ظاہری ہے۔ محبوب حقیقی کی محبت کے بڑھنے کا اور جب محبت بڑھے گی تو یہ شخص محبّ ہوگا اور رفتہ رفتہ محبوب بن جاتا ہے۔

حج سے ازدیاد محبت

گو حق تعالیٰ کی محبت اور عبد کی محبت میں اتنا فرق ہے۔ کہ عبد کی محبت کا تو آثار سے شور و غل ہو جاتا ہے۔ اور حق تعالیٰ کی محبت مثل حق تعالیٰ کے پوشیدہ ہوتی ہے

؎ عشق معشوقاں نہاں ست دستیر　　عشق عاشق باد و صد طبل و نفیر
لیک عاشق عاشقاں تن رہ کند　　عشق معشوقاں خوش و فربہ کند
عشق من پیدا و معشوقم نہاں　　یار بیروں فتنہ اودر جہاں

(معشوق کا عشق پوشیدہ اور پیچ سے باہر ہے اور عاشق کا عشق سو نقاروں اور شور کے ساتھ ہوا کے درستی پر ہے عاشق کا عشق تن کو گھلاتا ہے اور معشوق کا عشق خوشی اور فربہی کا باعث ہے میرا عشق تو ظاہر ہے اور میرا معشوق پوشیدہ۔ دوست تو باہر ہے اور اس کا فتنہ پورے عالم میں ہے)۔

اور حج سے محبت کا بڑھنا ایک ایسا امر ہے کہ ہر مسلمان اس کو سمجھتا ہے چنانچہ ہر شخص اپنے قلب میں بیت اللہ شریف کی طرف ایک کشش اور انجذاب محسوس کرتا ہے اور جو وہاں گئے ہیں ان سے پوچھ لو کہ کیا حالت ہوتی ہے کہ خانہ کعبہ کو دیکھتے ہی دل بے قابو ہو جاتا ہے اور بالاضطرار آنسوؤں کا مینہ برسنے لگتا ہے اور یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ خانہ کعبہ پر ضرور کوئی جلوہ گر ہے ورنہ ایک تعمیر میں رولانے کا اثر کیا معنی

؎ چرخ کو کب یہ سلیقہ ہے ستمگاری میں　　کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں

یہ ضروری بات ہے کہ حق تعالیٰ مقید بالمکان نہیں ہے لیکن مکان کے ساتھ ایک بے کیف اتصال اور تعلق ضرور ہے لیکن وہ اتصال ایسا نہیں کہ جس کی ہم کیفیت یا کمیت بتلا سکیں مولانا اسی مضمون کے متعلق فرماتے ہیں

؎ اتصال بے تکیف بے قیاس　　ہست رب الناس را باجاناں ناس

(اللہ کے لوگوں کے ساتھ ہونے کی کیفیت کو نہ بیان کیا جا سکتا ہے نہ کسی پر قیاس۔ اتنی بات ہے کہ لوگوں کا رب ان کی جانوں کے ساتھ ہے) اور مولانا کعبہ کی نسبت فرماتے ہیں

؎ کعبہ راہر دم تجلی میفزود　　ایں زاخلاصات ابراہیم بود

(کعبہ پر ہر دم تجلیات بڑھتی جا رہی ہیں یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اخلاص کی وجہ سے ہے)

اور یہ تجلیات اگر نہ ہوتیں تو اس میں کیا تھا۔ مثل دیگر امکنہ کے وہ بھی ایک مکان تھا پس حجاج دراصل حج البیت نہیں کرتے بلکہ حج رب البیت کرتے ہیں مولانا فرماتے ہیں

؎ حج زیارت کردن خانہ بود　　حج رب البیت مردانہ بود

(حج خانہ کعبہ کی زیارت کرنے کا نام ہے حج مردانہ دراصل رب البیت کی زیارت کا نام ہے)

یہ حج کے اسرار ہیں جو بزرگوں کے کلام سے اول کتاب اور سنت کے اشارات سے میں نے بیان کئے ہیں۔

خاصیت حج

خلاصہ یہ ہے کہ اس سے حفاظت مقصود ہے مذاق محبت کا اور ثمرہ بھی اس کا وہی ہے جو عشق و محبت کا ثمرہ

ہونا چاہیے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ حج مبرور سے تمام گناہ بخشے جاتے ہیں عشق کا خاصہ یہی ہے کہ اس سے ماسوا محبوب کے سب فنا ہو جاتے ہیں۔ عشق کی مثال آگ جیسی ہے کھیت میں اگر جھاڑ جھنکار ہوں تو ایک کو اگر اکھاڑا جاوے تو بہت مدت صرف ہوگی اور اگر آگ لگا دو تو ایک دم سے سب جل بھن کر خاک سیاہ ہو جائیں گے۔ یہی حال آتش عشق کا ہے کہ ماسوا کو سوخت کر دیتی ہے۔

اور یہ وہ آگ ہے کہ پل صراط پر جب مومن کا گزر ہوگا تو نار دوزخ کہے گی جز یا مومن فان نورک اطفأ ناری یعنی اے مومن جلدی گزر جا تیرے نور نے میری آگ کو بجھا دیا۔ بزرگان دین نے فرمایا ہے کہ اس نور سے مراد آتش عشق ہے حاجی صاحب کا شعر ہے

؎ اگر ظاہر کروں سوز جگر کو　　　کروں شرمندہ دوزخ کی شرر کو

مولانا فرماتے ہیں

؎ عشق آں شعلہ است کوچوں بر فروخت　　　ہرچہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

(عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ بھڑک اٹھتا ہے معشوق کے علاوہ ہر چیز کو جلا دیتا ہے)

اور گناہ بھی ماسوا میں داخل ہیں وہ بھی سوختہ ہو جاتے ہیں اس لئے ارشاد فرمایا کہ حج کرنے والا ایسا ہو جاتا ہے جیسے آج ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا یہ حاصل ہے حج کا اب آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ حج کا خاصہ کیا ہے چنانچہ حج کرنے والوں کو دیکھا جاتا ہے کہ بعد حج کے ان پر محبت کا رنگ غالب ہو جاتا ہے اگر کوئی عارض مانع نہ ہو گیا۔

اب ایک شبہ رہ گیا وہ یہ ہے کہ جس کو حج کی استطاعت نہ ہو تو وہ ناقص رہے گا۔ اس لئے کہ طبیعت اس کی مسخر نہ ہوگی۔ اس کا جواب ایک تو یہ ہے کہ میں نے اول بیان کیا ہے کہ نماز روزہ میں بھی بقدرت ہیں اس لئے طبع ان سے مسخر ہو جائے گی لیکن فرق اس قدر ہے کہ حج سے تسخیر[1] کامل ہوتی ہے اور نماز روزہ سے اس قدر نہیں ہوتی۔ گو رفتہ رفتہ بتدریج کمال حاصل ہو جائے لیکن حج سے دفعتاً ہو جاتی ہے ایسی مثال ہے جیسے کسی لکڑی کو آہستہ آہستہ کاٹو تو مدت کے بعد وہ کٹ جائے گی۔ اور ایک صورت یہ بھی ہے کہ دفعتاً کٹ جائے پس نماز روزہ سے بتدریج طبع پر اثر ہوگا اور حج سے فوراً رنگ بدل جائے گا۔

اور دوسرا جواب یہ ہے کہ گو حج نہ کرے لیکن نیت بلکہ شوق ہو تو ہر مومن کو ثواب حج کا ہوتا ہے اور حدیث شریف میں آیا ہے۔ نیة المومن خیر من عملہ (المعجم الکبیر للطبرانی) (مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے) پس وہ بھی مثل حج کرنے والے ہی کے ہوگا اور اس کے شوق اور دوسری عبادات کے شوق میں بھی فرق ہے اس کا شوق سب سے بڑھ کر ہے چنانچہ دیکھ لو کہ ساری دنیا کے مسلمان حج کے شوق میں مٹے ہوئے ہیں اگر ذرا تذکرہ آ جاتا ہے تو ہر مسلمان تمنا ظاہر کرتا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو نصیب فرمائے یہ تو ان کا حال ہے

---

[1] لیکن یہ کمال استعداد اور قوت اور موانع کے ارتفاع کے اعتبار سے ہوگا۔ (۱۲ جامع)

جن کو نصیب نہیں ہوا اور جو مشرف ہو چکے ہیں ان کا ایک مرتبہ بلکہ دس مرتبہ سے بھی جی نہیں بھرتا۔ جتنی مرتبہ بھی جاؤ گے جی نہ بھرے گا پھر دل چاہے گا کہ جائیں۔ پس ایسا شوق بھی نائب ہو جاتا ہے اصل کا۔

ایک شبہ اور ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ نماز میں بھی تو قید مکان کی ہے کہ مسجد میں پڑھتے ہیں پس چاہیے کہ اس سے اسی وجہ کی تسخیر طبع کی ہو جواب یہ ہے کہ مسجد کی قید نماز میں فضیلت کی ہے نفس صلوٰۃ بغیر اس قید کے بھی ہو جاتی ہے بخلاف حج کے کہ وہ اس مکان کے بدوں متحقق نہیں ہوتا اور قید بھی ایسی عجیب و غریب ہے کہ وہ قید بھی خود مقید ہے۔

حقیقت بیت اللہ

تفصیل اس مجمل کی یہ ہے کہ بیت اللہ شریف نام اس خاص بیت کا اسی وقت تک ہے جب کہ وہ اس مکان خاص اور اس جو خاص کے ساتھ مقید ہے چنانچہ اگر اس کے پتھر اٹھا کر دوسری جگہ رکھ دیں تو وہ بیت اللہ نہیں ہے لوگ سمجھتے ہوں گے کہ وہ ایک کوٹھا ہے جب اس کو منہدم کر دیا جائے تو بس حج گیا یہ نہیں ہے بلکہ اس زمین کا نام بھی نہیں ہے چنانچہ اگر تحت الثریٰ تک وہاں کی مٹی اٹھا کر دوسری جگہ پھینک دی جائے تب بھی بیت اللہ موجود ہے۔ پس در حقیقت بیت اللہ اس بعد مجرد کا نام ہے جو تحت الثریٰ سے عنان سماء تک ہے نہ کوٹھا بیت اللہ اور نہ زمین چنانچہ اگر کوئی بیت اللہ کے قریب کسی ایسے مکان کے اوپر نماز پڑھے جو بیت اللہ سے بلند ہے تو نماز ہو جاتی ہے۔ یہاں سے یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ شعائر اسلام کی بنیاد کس قدر قوی ہے کہ ان کا مدار کسی ضعیف اور بے اصل شے پر نہیں اور یہاں سے اس اعتراض کا جواب بھی ہو گیا کہ جو بعض غیر قوموں نے کہا ہے کہ مسلمان بھی بت پرستی کرتے ہیں یعنی کعبہ کی طرف سجدہ کرتے ہیں۔

تقریر جواب کی یہ ہے کہ اول تو ہم خانہ کعبہ کو مسجود نہیں سمجھتے اور دوسرے یہ کہ خانہ کعبہ ان پتھروں کا نام نہیں جیسا کہ ابھی واضح ہو گیا۔ بت پرستی میں تو اگر اس بت کو اٹھا کر پھینک دیا جائے تو اس طرف کوئی سجدہ نہ کریگا۔

تشبیہ بالحجاج

اور اسی تقریر سے قربانی کی حقیقت بھی معلوم ہو گئی کہ وہ ہماری جان کے قائم مقام ہے باقی اور مقامات پر جو سب مسلمان قربانی کرتے ہیں تو اس کا راز یہ ہے کہ حج کے برکات تو انہیں کو حاصل ہوتے ہیں جو حج سے مشرف ہوتے ہیں اور جو وہاں جانے کی استطاعت نہیں رکھتے وہ اس کے برکات سے محروم تھے اس لئے حق تعالیٰ نے حج کا ایک جز ان پر واجب کر دیا کہ تشبیہ بالحجاج سے ان کو بھی ان برکات کا ایک حصہ نصیب ہو جائے اور نیز اول بیان کیا گیا ہے کہ قربانی بھی منجملہ ان مجاہدات کے ہے جو طبیعت کی تسخیر کے لئے ہیں۔ اور طبیعت کی تسخیر کی ہر ایک کو ضرورت ہے اس لئے سب کو یعنی غیر حجاج کو بھی قربانی کا حکم ہوا اور یہ سنت ابراہیمی ہے۔

قربانی کا راز

اور اصل تو اس کی یہ تھی کہ بیٹے کی قربانی کریں لیکن چونکہ ہم ضعیف تھے اور بیٹا اپنی جان سے زیادہ محبوب ہوتا ہے اس لئے بجائے اسکے یہ حکم ہوتا کہ اپنی جان قربان کرو اس لئے کہ اپنی جان دینا بھی لوازم عشق سے ہے۔

چنانچہ بعض بزرگوں کو یہ دولت نصیب بھی ہوئی کہ خانہ کعبہ پہنچ کر انہوں نے اپنی جان دیدی ہے۔ حضرت نجم الدین کبریؒ یا کسی اور بزرگ کا قصہ ہے کہ ایک شخص آپ کی مجلس میں اس مصرع کا تکرار کرنے لگا

؎ جاں بدہ جاں بدہ جاں بدہ۔ (جان دے دو، جان دے دو، جان دے دو) حضرت کو جوش ہوا اور فرمایا کہ میاں محبوب جان مانگ رہے ہیں اور کوئی اتنا نہیں ہے کہ جان دیدے اور یہ کہہ کر فرمایا جان دادم جان دادم وجان دادم (میں اپنی جان پیش کرتا ہوں، میں اپنی جان پیش کرتا ہوں، میں اپنی جان پیش کرتا ہوں) اور وصال ہوگیا۔ پس اصل تو عشق کا مقتضی جان دینا ہے۔

اور اگر وہ جان مانگتے تو حق تھا چنانچہ ارشاد بھی ہے۔ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ الخ (اور اگر ہم ان پر فرض کر دیتے کہ اپنے آپ کو قتل کرو (یعنی خود کشی کرو) اور وہ تو سلطان السلاطین ہیں دنیا کے جب ایسے خطرناک موقعوں پر لے جاتے ہیں کہ جہاں جان کا خطرہ ہے اور انکار نہیں کرتے تو وہ بطریق اولی اس کے مستحق ہیں خاص کر جب کہ جان بھی ہماری نہ ہو ان کی ہی دی ہوئی ہو اگر وہ جان لے لے تو کیا حرج ہے۔ مولانا تو اہل اللہ کے لئے فرماتے ہیں

؎ آنکہ جاں بخشد اگر بکشند رواست — نائب است او دست او دست خدا است

ہمچو اسمٰعیل بہ پیشش سر بنہ — شاد و خنداں پیش تیغش جاں بدہ

(جو جان عطا کریں اگر وہ قتل کریں تو جائز ہے) (حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح ان کے سامنے اپنا سر جھکا دے۔ ہنستے کھیلتے ان کی تلوار کے سامنے جان دے دے)

یعنی اسماعیل علیہ السلام کی طرح تفویض محض کر دو کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی یعنی بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کرتا ہوں تم سوچ کر اپنی رائے بتلاؤ۔ قَالَ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ۔ یعنی اسماعیل علیہ السلام نے فرمایا اے ابا آپ کو جو حکم ہوا ہے آپ کیجئے ان شاء اللہ تعالیٰ آپ مجھ کو صابرین سے پائیں گے۔ اللہ اکبر کیسے باپ بیٹے تھے کہ دونوں راضی ہو گئے چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے ان کو پچھاڑ کر ان کے گلے پر چھری چلا دی لیکن حق تعالیٰ نے بجائے ان کے ایک مینڈھے کو رکھ دیا اور وہ ذبح ہو گیا۔ چنانچہ ارشاد ہے وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ وہ مینڈھا جان کا فدیہ ہو گیا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ قربانی جان کا عوض ہے۔

بیان زکوٰۃ

غرض اس تمام تر تقریر سے قربانی کا راز بھی معلوم ہو گیا اور بحمد اللہ یہاں تک اسلام کے تمام ارکان کا اسرار کا بقدر ضرورت بیان ہو گیا۔ صرف ایک رکن باقی رہ گیا ہے زکوٰۃ لیکن اس کے اسرار بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ اس میں عقلیت کی شان اغلب ہے اس لئے کہ مالی اعانت مساکین کی کیسی شے ہے کہ اس کے استحسان میں کسی عاقل کو کلام نہیں ہے اور نیز اس میں کسی مکان یا زمان خاص کی بھی قید نہیں یعنی کوئی زمانہ ایسا نہیں ہے کہ اس وقت اگر ادا نہ کریں تو یہ عبادت قضا ہو جائے۔ باقی چالیسویں حصہ کی تعیین یہ سہولت کے لئے ہے اس لئے کہ چالیس روپیہ میں سے ایک روپیہ دیدینے سے کوئی حرج نہیں ہے۔ نصاب مقرر فرمانا بہ معنی سہولت کے لئے ہے مصارف جو مقرر فرمائے ہیں کہ نہ بیٹا ہو نہ پوتا نہ باپ نہ دادا ہو یہ اس لئے ہے تاکہ نفس پر گراں ہو اس لئے کہ ان لوگوں کو دینے سے نفس کو کچھ گرانی نہ ہوگی۔ حاصل یہ ہے کہ اول تو اس میں بہ نسبت اور مجاہدات کے قیدیں ہی کم ہیں اور جو قیدیں ہیں وہ سب ایسی ہیں کہ اجمالاً ہر شخص ان کا راز سمجھ سکتا ہے گو تفصیلاً اس میں بھی بعض قیود تعبدی ہیں اور ایسا ہوتا بھی چاہیے تاکہ اس میں بھی مثل نماز کے عقلیت غالب اور دوسری حیثیت مغلوب ہو مگر چونکہ زیادہ حصہ اس میں معقول ہے اس لئے اس کو مستقل بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

جذب وسلوک

خلاصہ یہ ہے کہ نماز اور روزہ میں تو عقلیت غالب ہے اور تعبدیت مغلوب اور زکوٰۃ میں عقلیت اغلب ہے اور تعبدیت بہت کم بمنزلہ اس کے کہ گویا نہیں ہے اور حج میں طبیعت اور تعبدیت اغلب ہے اور عقلیت نہایت کم اور ہر قسم کے مجاہدہ کا جدا اثر ہے جس میں عقلیت غالب اور یا اغلب ہے وہ عقل کی تعدیل کے لئے ہیں اور جس میں طبیعت کا غلبہ ہے وہ طبیعت کی تسخیر کے لئے ہیں اور جن میں عقلیت غالب ہے ان کا اثر سلوک ہے اور جن میں طبیعت غالب ہے ان کا اثر جذب ہے اور یہی دو طریق ہیں قبول کے۔ چنانچہ ان دونوں طریقوں کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ اجتباء سے طریق جذب اور ہدایت سے طریق سلوک کی طرف اشارہ ہے۔ اور ہم کو اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کے مجاہدے عطا فرمائے ہیں کہ ان کے حقوق ادا کرنے سے جذب اور ہدایت سے طریق سلوک کی طرف اشارہ ہے۔ اور ہم کو اللہ تعالیٰ نے دونوں قسم کے مجاہدے عطا فرمائے ہیں۔ کہ ان کے حقوق ادا کرنے سے جذب اور سلوک حاصل ہو جاتا ہے۔ پس نہ خلوات طویلہ کی ضرورت ہے اور نہ ترک لذات کی حاجت ہے اور نہ تعلقات قطع کر کے

گوشہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے ان ہی مجاہدات سے سب کچھ ہو جاتا ہے ہاں بصیرت وخلوص کی بے شک ضرورت ہے۔ پس خلاصہ اول رمضان سے اب تک کے مواعظ کا یہ ہوا کہ سلوک اور جذب کی تعلیم ہے اب اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ توفیق عطا فرماویں۔ (آمین ثم آمین)

بعضے مقولات منقولات از شبلیؒ مشتمل بر بعضے رموز حج بتائید بعضے مضامین وعظ ہذا

حضرت ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بعض متعلقین سے دریافت کیا کہ تو نے حج کی نیت منعقد کی تھی اس نے کہا ہاں۔ انہوں نے پوچھا جتنے علاقہ اس کے مخالف تیری پیدائش کے وقت سے تھے تو نے سب کو قطع کر دیا تھا۔ اس نے کہا نہیں۔ شبلی نے کہا تو بس حج کی تو نے نیت ہی منعقد نہیں کی (کیونکہ نیت حج کی روح یہی قطع تعلقات ماسوی اللہ ہے جب یہ نہ ہوا تو ظاہر ہے نیت مثل جسد بلا روح کے ہے جو غیر معتد بہ ہے)

پھر شبلیؒ نے اس سے پوچھا تو نے (احرام کے وقت پہلے سلے ہوئے) اپنے کپڑے اتارے تھے اس نے کہا ہاں شبلیؒ نے پوچھا کیا (کپڑے اتارنے کے وقت) تو ہر چیز سے مجرد ہو گیا تھا اس نے کہا نہیں۔ شبلیؒ نے کہا تو بس تو نے کپڑے ہی نہیں اتارے (کیونکہ ان کپڑوں کے اتارنے کی روح یہی تجرد عما سوی اللہ ہے) بدوں اس کے کپڑے اتارنا جسد بلا روح ہے۔

پھر شبلیؒ نے پوچھا تو نے (احرام کے وقت) وضو یا غسل کیا تھا۔ اس نے کہا ہاں شبلیؒ نے پوچھا تیرے وضو یا غسل کے وقت تجھ سے تمام (باطنی) علتیں دور ہو گئی تھیں اس نے کہا نہیں۔ شبلیؒ نے کہا کہ بس تو نے وضو و غسل ہی نہیں کیا (کیونکہ اس طہارت ظاہری کی روح یہی طہارت باطنی ہے۔ جب یہ نہیں تو وہ کالعدم ہے) پھر شبلیؒ نے اس سے پوچھا کہ تو نے (احرام کے وقت) لبیک کہی تھی۔ اس نے کہا ہاں شبلیؒ نے پوچھا تو نے لبیک کا جواب ویسے ہی لبیک سے پایا تھا۔ اس نے کہا نہیں۔ شبلیؒ نے کہا تو بس تو نے لبیک ہی نہیں کہی۔ کیونکہ اس کے لبیک یعنی حاضری کی روح محبوب کی طرف سے قرب وحضور کی دولت کا میسر ہونا ہے۔ جس کا اثر قلب پر ظاہر ہوتا ہے۔ بدوں اس کے لبیک کہنا خالی لفظ ہے)

اور اپنے بعض متعلقین سے جو حج کر کے آیا تھا حضرت شبلیؒ نے پوچھا (غالباً یہ کوئی اور شخص ہو گا اور ممکن ہے کہ پہلا ہی ہو مگر تفریق اجزاء قصہ کے سبب ناقل نے لفظوں میں ایسا عنوان اختیار کیا ہو جو دونوں شخصوں کے متغائر ہونے کا موہم ہو غرض اس سے پوچھا) کہ تو مسجد (حرام) میں داخل ہوا تھا اس نے کہا ہاں۔ انہوں نے پوچھا کہ تو نے کسی مقام قرب میں داخل ہونا بھی معلوم کیا اس نے کہا نہیں انہوں نے کہا تو بس تو مسجد ہی میں داخل نہیں ہوا۔ (کیونکہ دخول مسجد کی روح دخول مقام قرب

ہے جس کا اثر قلب پر ہوتا ہے اور جسد بلا روح کالعدم ہے) پھر شبلیؒ نے اس سے پوچھا تو نے کعبہ کو دیکھا اس نے کہاں ہاں! انہوں نے کہا کہ تو نے اس کو بھی دیکھا جس کے لئے خود کعبہ کا قصد کیا تھا (یعنی حضرت حق اور یہ رویت بالقلب ہوتی ہے) اس نے کہا نہیں شبلیؒ نے کہا تو بس تو نے کعبہ ہی کو نہیں دیکھا۔ (کیونکہ روح رویت کعبہ کی یہی تھی یہ نہیں تو وہ محض جسد ہے)

پھر شبلیؒ نے اس سے پوچھا کہ تو (طواف میں) تین بار دوڑ کر اور چار بار آہستہ چلا تھا اس نے کہا ہاں انہوں نے پوچھا کیا تو دنیا سے اس طرح بھاگ گیا کہ تجھ کو معلوم ہو گیا ہو کہ اس سے جدا ہو گیا اور وہ تجھ سے منقطع ہو گئی (کہ یہ بھاگنا روح ہے اس طواف میں دوڑنے کی) اور کیا تو نے اپنے چار بار آہستہ چلنے میں اس (بلائے دنیا) سے امن پایا۔ جس سے تو بھاگا تھا پھر اس پر تو نے مزید شکر کیا ہو (کہ اس امن کا معلوم ہونا روح ہے اس آہستہ چلنے کی کیونکہ امن میں آہستہ چلتے ہیں اور خوف و بلا میں دوڑ کر پس یہ دونوں رفتاریں اشارہ ہے اس خوف اور امن کی طرف) اس نے کہا کہ نہیں۔ شبلی نے کہا تو بس تو طواف میں دوڑ کر ہی نہیں چلا (یعنی یہ چلنا محض صورت بے معنی ہوا۔ اور اسی طرح آہستہ چلنا بھی)

پھر اس سے پوچھا تو نے حجر اسود سے مصافحہ کیا تھا اور اس کو بوسہ دیا تھا اس نے کہا ہاں انہوں نے ایک چیخ ماری اور کہا کمبختی مارے واللہ یہ کہا گیا ہے (یعنی اکابر نے کہا ہے) کہ جو شخص حجر اسود سے مصافحہ کرتا ہے وہ خدا تعالیٰ سے مصافحہ کرتا ہے اور جو خدا تعالیٰ سے مصافحہ کرتا ہے وہ مقام امن میں آ جاتا ہے (یعنی دوزخ سے محفوظ ہو جاتا ہے) کیا تجھ پر کچھ اثر امن کا ظاہر ہوا (مثلاً معاصی سے نفرت ہو گئی ہو کہ جو سبب ہے دوزخ میں جانے کا کہ یہ ظہور ہے اثر امن کا) اس نے کہا نہیں۔ شبلیؒ نے کہا تو بس تو نے (حجر اسود سے) مصافحہ ہی نہیں کیا۔ (کیونکہ جب اس میں روح نہیں تو جسد محض صورت بے معنی ہوا۔)

اور ایک شخص سے جس نے حج کیا تھا خواہ وہ پہلا ہی شخص ہو یا کوئی اور ہو جیسے یہی دو احتمال اوپر بھی آ چکے ہیں) حضرت شبلیؒ نے کہا کیا خدا تعالیٰ کے روبرو مقام ابراہیم کے پیچھے کھڑا ہوا تھا اور دو رکعت (طواف) کی پڑھی تھی۔ اس شخص نے کہا ہاں! شبلیؒ نے پوچھا کہ تیرا جو مرتبہ خدا تعالیٰ کے نزدیک ہے تو اس پر بھی قائم ہوا پھر تو نے اپنا مقصود بھی ادا کیا (جس کی طرف اشارہ ہے مقام ابراہیم پر کھڑے ہو کر نماز ادا کرنا یعنی خدا تعالیٰ کے نزدیک ایک مرتبہ قرب کا حاصل ہو اور مقام قرب کے مناسب جو مناجات و مکالمت ہے وہ میسر ہو) اس نے کہا نہیں انہوں نے کہا بس تو نے نماز ہی نہیں پڑھی (کیونکہ جب اس نماز کی روح ہی نہیں تو قالب بے جان ہے۔ اور ایک شخص سے (کہ وہی شخص مذکور تھا یا دوسرا) حضرت شبلیؒ نے کہا کہ تو کوہ صفا کی طرف گیا تھا۔ اس نے کہا ہاں شبلیؒ نے پوچھا کہ تجھ سے تمام علتیں دور ہو گئی

تھیں یہاں تک کہ تو (سب سے) صاف ہو گیا تھا۔ (جیسا مادۂ صفا میں بھی اس طرف اشارہ ہے و نیز صفا سے ابتداء ہوتی ہے حرکت سعی کی اور حرکت مسلمان کی تہذیب نفس کے لئے ہونا احق ہے اس لئے بھی اس حرکت کی روح زوال علل ہے اس شخص نے کہا نہیں شبلیؒ نے کہا تو بس تو نہ صفا پر چڑھا اور نہ اترا۔

پھر شبلیؒ نے کہا کیا تو (صفا و مروہ کی سعی میں میلین اخضرین کے درمیان دوڑا بھی تھا۔ اس نے کہاں ہاں شبلی نے کہا تو کیا اپنے سامان (ہوس[1]) سے بھاگ کر اپنی ہستی (کی حقیقت پہچاننے) تک پہنچا (کہ روح اس دوڑنے کی یہی ہے اور مسلمان کے لئے یہی دوڑ نالائق ہے کہ پندار کو حذف کر کے اپنی ہستی فانی پر نظر کر کے حق عبدیت ادا کرے) اس شخص نے کہا نہیں شبلیؒ نے فرمایا بس تو دوڑا ہی نہیں۔

پھر شبلیؒ نے پوچھا تو نے مروہ پر پہنچ کر (اپنے نفس میں) سکون (وطمانیت علی المرضیات الالٰہیہ) کو پایا کہ اس کو تو نے حاصل کیا ہو اور اس کا تجھ پر نزول ہوا (کہ مروہ پر اخیر پھیرے میں حرکت سعی ختم ہوتی ہے گویا یہ اشارہ ہے اس سکون نفس کی طرف جو بعد حرکت مجاہدہ کے میسر ہوتا ہے) اس شخص نے کہا کہ نہیں۔ شبلیؒ نے کہا بس تو مروہ ہی پر نہیں پہنچا۔

اور شبلیؒ نے ایک حج کرنے والے شخص سے (کہ وہی شخص سابق تھا یا اس کے علاوہ دوسرا) پوچھا تو منیٰ کی طرف گیا تھا۔ اس نے کہا ہاں۔ شبلیؒ نے پوچھا کیا تو نے (وہاں پہنچ کر) غیر حالت معصیت کی تمنا کی تھی۔ اس نے کہا نہیں۔ شبلیؒ نے فرمایا تو بس تو منیٰ ہی میں نہیں گیا۔ (کیونکہ منیٰ کے مادہ میں مینہ بمعنیٰ آرزو سے مناسبت ہے تو اس میں اس آرزو کی طرف اشارہ ہے)

پھر حضرت شبلیؒ نے اس سے پوچھا کہ تو مسجد خیف میں (جو کہ منیٰ میں ہے) داخل ہوا تھا۔ اس شخص نے کہا ہاں۔ شبلیؒ نے کہا تو نے اپنے اس آنے جانے میں خدا تعالیٰ سے خوف کیا تھا اور تو نے (اپنے دل میں) خوف کا ایسا درجہ پایا تھا جو اسی مقام میں تجھ کو حاصل ہوتا ہو۔ اس شخص نے کہا نہیں۔ حضرت شبلیؒ نے فرمایا تو بس تو مسجد خیف میں داخل نہیں ہوا (کیونکہ لفظ خیف کو مناسبت ہے لفظ خیفہ سے جس میں کسرہ ماقبل اور خود ساکن ہونے سے واؤ کو یا سے بدل لیا گیا ہے اور اس کی اصل خوف ہے پس وہاں جانا مذکر ہونا چاہیے۔

خوف حق کا جب یہ نہ ہوا تو وہاں جانا نہ جانا برابر ہوا۔ اور حضرت شبلیؒ نے دخول خیف و منیٰ و صحو دو صفا میں الفاظ کو مذکر احوال کا قرار دیا کہ عبرت کے لئے ایسے ارشارات و مناسبات بھی کافی ہیں۔ اسی طرح آگے لفظ عرفات میں اسی مناسبت کا اعتبار فرمایا۔

---

[1] منقول عنہ میں یہ عبارت تھی خضرات من زادک ووصلت الی جودک۔ اسی پر ترجمہ کیا گیا اور جی کو یہ لگتا ہے کہ یہ عبارت اس طرح ہو۔ من مرادک الی معبودک واللہ اعلم

اور شبلیؒ نے ایک شخص سے جس نے حج کیا تھا (یہاں بھی وہ دونوں احتمال ہیں اور اغلب مغائرت ہے) فرمایا تو عرفات گیا تھا اس شخص نے کہا ہاں۔ حضرت شبلیؒ نے فرمایا کیا تو نے اس حالت کی معرفت حاصل کی جس کے لئے تو (ماضی میں) پیدا کیا گیا ہے اور (اسی طرح) اس حالت کی جس پر تو (فی الحال) وارد ہوتا رہتا ہے اور (اسی طرح) اس حالت کی جس کی طرف تو (مستقبل میں) رجوع کرے گا۔ اور کیا معرفت بخشنے والے نے تجھ کو ان احوال کی معرفت کرائی۔ اور کیا تو نے اس مکان کو دیکھا۔ جس کی طرف یہ سب اشارات (مذکورہ) ہیں؟ مکان سے مراد مقام معرفت اور اشارات سے مراد عرفات کا احوال مذکورہ کی معرفت کی طرف مشیر ہونا) کیونکہ یہی مقام ہے جس نے انفاس عمر کو احوال مذکورہ میں سے) ہر حال میں غم سے رہائی دی ہے (یعنی حالات ماضیہ و حالیہ و استقبالیہ مذکورہ کو اسباب معصیت سے بعید رکھنا یہ شعر معرفت ہی کا ہے۔) اس شخص نے کہا نہیں حضرت شبلیؒ نے فرمایا تو بس تو نے وقوف عرفات ہی نہیں کیا۔ (کیونکہ عرفات سے ان ہی معارف کی طرف اشارہ ہے جس کی مناسبت کا ابھی اوپر دخول مسجد خیف میں ذکر ہوا ہے)

اور حضرت شبلیؒ نے ایک شخص سے جس نے حج کیا تھا (خواہ وہ عین اول ہو یا غیر اول) فرمایا تو مزدلفہ کی طرف واپس آیا تھا۔ اس شخص نے کہا ہاں انہوں نے پوچھا تو نے مشعر حرام (جو کہ مزدلفہ میں ہے) دیکھا تھا۔ اس نے کہا ہاں انہوں نے کہا تو نے وہاں اللہ تعالیٰ کا ایسا ذکر کیا تھا جس نے ماسوائے کو بھلا دیا ہو اور تو اس میں مشغول ہو گیا ہو (جس کا حکم اس آیت میں ہے فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَٰتٍ فَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ عِندَ ٱلْمَشْعَرِ ٱلْحَرَامِ الآیۃ۔ (پھر جب تم لوگ عرفات سے واپس آنے لگو تو مشعر الحرام کے پاس (مزدلفہ میں شب قیام کر کے) خدا تعالیٰ کو یاد کرو) اور ظاہر ہے کہ ذکر میں درجہ مطلوبہ وہ ہے۔ جس میں ماسوے سے انقطاع ہو کما قال اللہ تعالیٰ وَٱذْكُرِ ٱسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا الآیۃ (اور اپنے رب کا نام یاد کرتے رہو اور سب سے قطع کر کے اس کی طرف متوجہ رہو) اس نے کہا نہیں۔ انہوں نے فرمایا بس تو نے وقوف مزدلفہ نہیں کیا۔ (کیونکہ وہاں جو حکم تھا وہ نہ بجا لایا۔ اور حضرت شبلیؒ نے ایک شخص سے اپنے متعلقین میں سے جس نے حج کیا تھا فرمایا تو منیٰ میں داخل ہوا تھا۔ (اور یہی سوال پہلے ایک شخص سے آ چکا تھا اور ظاہر ہے کہ ایک شخص سے دوبار سوال بیکار ہے یہ قرینہ قویہ تحریجہ ہے کہ یہاں مخاطب اور ہے اور یہی ظن غالب سب جگہ ہے اس شخص نے کہا ہاں انہوں نے پوچھا تو نے وہاں (جانور) ذبح کیا تھا اس نے کہا ہاں پوچھا اپنے نفس کو بھی ذبح کیا تھا جس کی طرف اشارہ ہے ذبح حیوان میں) اس نے کہا نہیں انہوں نے کہا کہ تو بس تو نے ذبح ہی نہیں کیا۔

پھر حضرت شبلیؒ نے فرمایا تو نے رمی جمار کیا تھا اس شخص نے کہا ہاں انہوں نے پوچھا کیا تو نے اپنے جہل کو اپنی ترقی علم سے پھینک دیا تھا جس کا تجھ پر ظہور ہوا ہو (کہ رمی بمعنی پھینکنا اس کی طرف اشارہ ہے) اس شخص نے کہا نہیں انہوں نے کہا تو بس تو نے رمی ہی نہیں کی۔

پھر انہوں نے پوچھا کیا تو نے سر منڈایا تھا اس شخص نے کہا ہاں انہوں نے کہا کیا تو نے اپنی ہوسیں اپنے سے زائل کر دی تھیں (کہ سر منڈانا اشارہ اس ازالہ کی طرف ہے) اس شخص نے کہا نہیں انہوں نے فرمایا تو بس تو نے حلق ہی نہیں کیا۔

اور حضرت شبلیؒ نے اپنے متعلقین میں سے ایک شخص سے جس نے حج کیا تھا۔ پوچھا کیا تو نے طواف زیارت کیا تو اس نے کہا ہاں انہوں نے پوچھا کیا تجھ کو کوئی بات خیرات میں سے مکشوف ہوئی؟ یا تو نے اپنے اوپر کچھ زیادات کرامات زیارت کے سبب دیکھی؟ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کی زیارت کرنے والے ہوتے ہیں۔ اور جس کی زیارت کے واسطے کوئی جاوے اس پر حق ہوتا ہے کہ اپنی زیارت کے لئے آنے والوں کی خاطر داری کرے (سو تجھ کو کوئی اکرام بھی محسوس ہوا) اس نے کہا نہیں۔ انہوں نے کہا تو بس تو نے طواف زیارت ہی نہیں کیا۔

پھر انہوں نے اس سے پوچھا کیا تو حلال ہوا تھا۔ (یعنی احرام کھول دیا تھا جس سے سب ممنوعات احرام کے حلال ہو جاتے ہیں) اس نے کہا ہاں! انہوں نے پوچھا کیا تو نے اکل حلال کا عزم کیا تھا اس نے کہا نہیں۔ انہوں نے فرمایا تو بس حلال ہی نہیں ہوا۔

اور حضرت شبلیؒ نے اپنے متعلقین میں سے ایک شخص سے جس نے حج کیا تھا۔ پوچھا تو نے طواف وداع کیا تھا۔ اس نے کہا ہاں انہوں نے پوچھا کیا تو اپنے نفس اور روح سے بالکلیہ نکل گیا تھا۔ (کہ طواف وداع اس وداع نفس و روح کی طرف اشارہ ہے) اس شخص نے کہا نہیں انہوں نے فرمایا تو بس تو نے طواف وداع ہی نہیں کیا تجھ پر دوبارہ جانا لازم ہے اور (دوبارہ حج میں) غور کرنا کہ کس طرح حج کیا جایا کرتا ہے۔

بعد ان تمام مضامین کے جو میں نے تمام مناسک میں تجھ سے ذکر کئے ہیں کیونکہ میں تجھ کو سب بتلا چکا اور جب تو (اب کی بار) حج کرے تو اس امر کی کوشش کر کہ وہ حج ایسا ہو جیسا میں نے تجھ سے بیان کیا۔ (اس سے ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ تمام سوالات کا مخاطب ایک ہی شخص ہے سو اگر مخاطب متعدد ہوں جیسے اس کا اظہر ہونا پہلے آ چکا ہے تو اس کی توجیہ یہ ہوگی کہ انہوں نے اس مخاطب اخیر کے روبرو ان سب سائلوں کے مخاطبات کو بھی نقل کرایا ہوگا۔

من رسائل الارکان البحر العلوم رحمة الله تعالیٰ

تمت بالخیر

روح العج والثج

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ نے یہ وعظ جامع مسجد تھانہ بھون
میں ۸ شوال المکرم ۱۳۳۳ھ کو جمعہ کے روز بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔
سامعین کی تعداد دو سو تھی۔
محترم جناب مولوی عبدالحلیم صاحبؒ نے قلمبند فرمایا۔

فنائے اتم حج کی روح ہے اور فنائے تام قربانی کی۔ نفس فنا میں
دونوں شریک ہیں مگر چونکہ قربانی میں عقل کے خلاف کم ہے۔ فقط
اتعاب نفس ہے اسی لئے فنا تو وہ بھی ہے مگر حج کے برابر نہیں ہے
اور دونوں میں تام اور اتم کا تفاوت ہے یہ ان دونوں کی روح
ہوئی۔ (از حضرت حکیم الامت)

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ.

امابعد! فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم. بسم اللہ الرحمٰن الرحیم.

وَاِذۡ بَوَّاۡنَا لِاِبۡرٰھِیۡمَ مَکَانَ الۡبَیۡتِ اَنۡ لَّا تُشۡرِکۡ بِیۡ شَیۡئًا وَّطَھِّرۡ بَیۡتِیَ لِلطَّآئِفِیۡنَ وَالۡقَآئِمِیۡنَ وَالرُّکَّعِ السُّجُوۡدِ وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ یَاۡتُوۡکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاۡتِیۡنَ مِنۡ کُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ لِّیَشۡھَدُوۡا مَنَافِعَ لَھُمۡ وَیَذۡکُرُوا اسۡمَ اللّٰہِ فِیۡۤ اَیَّامٍ مَّعۡلُوۡمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَھُمۡ مِّنۡۢ بَھِیۡمَۃِ الۡاَنۡعَامِ. فَکُلُوۡا مِنۡھَا وَاَطۡعِمُوا الۡبَآئِسَ الۡفَقِیۡرَ ثُمَّ لۡیَقۡضُوۡا تَفَثَھُمۡ وَلۡیُوۡفُوۡا نُذُوۡرَھُمۡ وَلۡیَطَّوَّفُوۡا بِالۡبَیۡتِ الۡعَتِیۡقِ (الحج آیت ۲۶ تا ۲۸)

ترجمہ: (یعنی جبکہ ہم نے ابراہیمؑ کو خانہ کعبہ کی جگہ بتلادی اور حکم دیا کہ میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرنا اور میرے اس گھر کو طواف کرنے والوں کے اور قیام اور رکوع وسجدہ کرنے والوں کے لئے پاک رکھنا اور لوگوں میں حج کا اعلان کردو وہ تمہارے پاس حج کو چلے آ دیں گے پیادہ بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی جو کہ دور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی تا کہ اپنے دینی اور دنیوی فوائد کے لئے آ موجود ہوں اور ایام مقررہ میں ان مخصوص چوپایوں پر ذبح کے وقت اللہ تعالیٰ کا نام لیں جو ان کو اللہ تعالیٰ نے عطا کئے ہیں سو ان قربانی کے جانوروں میں سے تم کو بھی اجازت ہے کہ کھایا کرو اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلایا کرو پھر لوگوں کو چاہیے کہ اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنے واجبات کو پورا کریں اور خانہ کعبہ کا طواف کریں ۱۲)

تمہید: ان آیات میں حق جل شانہ نے حج اور قربانی کے متعلق مقصوداً اور بعض اقسام انفاق مالی

(خرچ کرنا) کے متعلق تبعاً مضمون ذکر فرمایا ہے اوران میں اول حکایت ہے ابراہیم علیٰ نبینا وعلیہ السلام کے خطاب کی۔ پھراس سے انتقال کر کے خطاب ہے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حاصل ہے ان آیات کا
وجہ ان آیات کے اختیار کرنے کی یہ ہے کہ میرا معمول ہے کہ جب جیسا موقعہ اور جیسی ضرورت دیکھتا ہوں اس کے متعلق کچھ بیان کر دیتا ہوں اور یہ کام تو مصنف کا ہے کہ جو ضرورتیں واقع یا متوقع ہوں سب کے لحاظ سے وہ مضامین کو جمع کر دیں لیکن کسی خطاب کرنے والے کا جس کو واعظ کہتے ہیں منصب صرف اسی قدر ہے کہ وہ جس وقت جو حکم مناسب ہو اس کے متعلق بیان کرے اس لئے میرا معمول ہے کہ بعد رمضان وعید کے حج کے متعلق مضامین کلیہ ذکر کیا کرتا ہوں۔

اشہر حج

اس وجہ سے کہ بعد رمضان شوال کا مہینہ ہے اور یہ اشہر حج میں ہے۔ جس کو ایک آیت میں حق جل وعلیٰ نے خود ذکر فرمایا ہے۔ اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ (حج کا زمانہ چند مہینہ ہیں جو معلوم ہیں) اور اس کی تفسیر شوال وذیقعدہ وذی الحجہ سے کی گئی ہے تو گویا شوال سے مہینہ حج کا شروع ہوتا ہے نہ اس معنی کر کہ اس ماہ میں حج کر سکتے ہیں بلکہ اس معنی کر کہ بعد شوال کے بلا کراہت حج شروع ہو سکتا ہے۔ شروع سے مراد احرام ہے ہر چند کہ شوال سے پہلے بھی احرام صحیح ہے مگر اس میں کراہت ہے اور اگر شوال سے شروع کیا جائے تو بلا کراہت صحیح ہے اور احرام چونکہ شرائط حج میں سے ایسا ہے جیسے تکبیر شرائط صلوٰۃ میں سے یعنی ایسی شرط جو مشابہ ارکان کے ہے اس معنی کر شوال وذیقعدہ کو بھی اشہر حج میں سے قرار دیا گیا اور ذی الحجہ کا تو اشہر حج میں سے ہونا ظاہر ہی ہے اس واسطے کہ بڑے بڑے ارکان حج کے اسی میں واقع ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے میری عادت اس کے متعلق شوال کے شروع میں بیان کرنے کی ہے۔ اب کے بھی اس کے ذکر کرنے کا پہلے سے ارادہ تھا اور اس کے ساتھ یہ بھی ارادہ تھا کہ ایام قربانی میں قربانی کے متعلق کچھ مضامین ذکر کئے جائیں گے۔ اور جس طرح اب کے رمضان میں روزہ، تراویح، اعتکاف، شب قدر اور عید کے متعلق خاص طرز پر مضامین بیان کئے گئے کہ اس کے قبل کبھی اس طرز پر بیان نہیں ہوئے تھے۔ خیال یہ تھا کہ شوال میں حج کے متعلق اور ذی الحجہ میں قربانی کے متعلق اسی طرز خاص پر کچھ مضمون بیان کیا جائے تا کہ یہ سب مضامین ایک طرز پر ایک مجموعہ میں شائع ہو جائیں۔
اسی واسطے میں نے اپنے ان دوست کو جنہوں نے اب کے رمضان کے مواعظ ضبط کئے ہیں اس وعظ کے لکھنے کے لئے بھی ٹھہرا لیا ہے اور ذی الحجہ میں بھی آنے کو کہہ دیا تھا تا کہ وہ وعظ جو قربانی کے متعلق ہوگا وہ بھی ضبط ہو جائے لیکن اس وقت میرا یہ خیال ہے کہ اس زمانہ تک کیوں انتظار کیا جائے

اس زمانہ میں اگر موقع ہوا قربانی کے احکام فرعیہ بیان کر دیئے جائیں گے۔ باقی بیان مضامین مقصودہ ابھی بیان کر دیئے جاویں۔ پس اس پہلے خیال میں اتنی ترمیم ہوگئی اس لئے قصد ہے کہ دونوں کے متعلق اسی وقت بیان کردوں۔ اسی واسطے ایسی آیت اختیار کی کہ جس میں دونوں مذکور ہوں۔ گو قربانی کی زیادہ خصوصیات ان ایام کے ساتھ نہیں جیسا کہ حج کی ہیں اسی طرح ان آیات میں بھی مقصود بالذات حج کا ذکر ہے اور قربانی و حج دونوں شریک ہیں۔ اس واسطے مناسب معلوم ہوا کہ دونوں کو ساتھ ساتھ بیان کیا جائے۔ پھر اس کے بعد مجھ کو یہ خیال ہوا کہ رمضان کے مواعظ میں روزہ تراویح اعتکاف شب قدر پھر اخیر میں عید کے متعلق مضامین مذکور ہوئے تھے۔ مگر یہ سب عبادات بدنیہ کے متعلق تھے۔

اقسام عبادت

اور عبادت کی تین قسمیں ہیں بدنیہ محضہ مالیہ محضہ مرکب بدنیہ اور مالیہ سے اور اس وقت حج وقربانی کے متعلق بیان کروں گا کہ یہ دونوں مرکب ہیں بدنیہ و مالیہ سے۔ اب ایک قسم رہ گئی وہ کون سی جو مالیہ محضہ ہے۔ مثل زکوٰۃ کے اور اس کے بیان کی اب تک نوبت نہیں آئی۔ اس لئے مناسب ہوا کہ یہ کیوں رہ جاوے۔ اس کو بھی بمناسبت حیثیت مالیت حج وقربانی کے بیان کر دیا جائے۔ جس کے اندر صدقہ فطر زکوٰۃ خمس عشر (پانچوا ں حصہ دسواں حصہ) وغیرہ سب داخل ہو جائیں اور اسی طرز خاص پر اس کا بھی ذکر کیا جائے۔ اس لئے آج اس کو بھی شامل کیا جائے گا۔ اس بناء پر آج کے بیان میں تین قسم کے مضمون مذکور ہوں گے ایک عبادت مالیہ محض اور ایک مرکب بدنی و مالی سے پھر اس کی دو قسمیں ہوں گی۔ ایک حج دوسری قربانی کل تین ہو گئے اور عبادات بدنیہ محضہ کے متعلق رمضان میں مذکور ہو چکے ہیں۔ اس طرح سے سب اقسام بیان ہو جاویں گے۔

حج وقربانی میں مناسبت

حاصل یہ کہ اس وقت حج وقربانی و انفاق مالی کے متعلق بیان ہوگا۔ اسی واسطے سوچ کر میں نے ایسی آیت اختیار کی ہے کہ اس میں تیسری قسم بھی تبعاً ذکر ہے۔ غرض تین قسم کی عبادت کے متعلق مضمون مذکور ہوگا۔ حج قربانی انفاق مالی چنانچہ عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

بہرحال ایک تو وجہ یہ ہوئی حج وقربانی کے جمع کرنے کی۔ دوسری مناسبت دونوں کے جمع کی یہ ہے کہ جیسا کہ بعض اعتبارات سے یعنی احرام کے اعتبار سے حج کی ابتداء شوال سے اور معظم ارکان کے وقوع کا اعتبار سے انتہا ذی الحجہ میں ہے۔ اسی طرح قربانی کے بھی بعض اعتبارات ذی الحج سے پہلے ہو سکتے ہیں چنانچہ تسمین ضحایا مامور بہ ہے جو عادۃً ذی الحجہ کے قبل سے خرید کرنے میں ممکن ہے یعنی قربانی کے جانور

پہلے سے خرید کر موٹا تازہ کرنا۔ تو گویا پہلے سے سامان اس کا مطلوب ومندوب ہے پس قربانی میں بھی تسمین (یعنی قربانی کا جانور موٹا کرنا) پہلے سے ہوگی جیسا کہ حج میں احرام پہلے سے ہوتا ہے اور بعض حجاج کے اعتبار سے سفر بھی پہلے سے ہوتا ہے۔ خصوصاً ہمارے بلاد میں کہ عموماً شوال میں اور بعضے اخیر درجہ میں ذیقعدہ میں سفر کرتے ہیں اور یہ اتفاق عجیب اور لطیف ہے کہ سفر کے اعتبار سے بھی حج شوال ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے شوال میں اس کا بیان اکثر کیا کرتا ہوں تا کہ جو حج کو جانے والے ہوں تیاری کر لیں۔

اختیار اسباب کی فرصت

اور گو امسال محض اس بناء پر بیان کرنا پہلے سے مناسب نہیں معلوم ہوتا تھا کیونکہ میرے ذہن میں یہ بات جمی ہوئی تھی کہ راستہ حج کا بند ہے اگر بند نہیں تو مخدوش ضرور ہے تو ایسی حالت میں پھر ترغیب کی کیا غایت۔ مگر معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ جانے والے جا رہے ہیں نہ راستہ بند ہے نہ خدشہ ہے۔ یہ ضرور ہے کہ پہلے سے کچھ تفاوت ہے مگر خدشہ غالب نہیں اور ایسے ضعیف خدشہ کا کیا اعتبار ایسا خدشہ تو گھر سے بازار تک جانے میں بھی ہے کہ شاید کوئی دیوار راستہ میں اوپر گر پڑے۔ غرض خدشہ نہیں بلکہ اطمینان ہے۔ اگر قلب میں قوت اور ہمت ہے دیکھئے حکام نے بھی اجازت دے دی ہے اگر خدشہ قوی ہوتا تو حکام اجازت نہ دیتے باقی خیر خواہی واحتیاط کی وجہ سے یہ بھی ظاہر کر دیا کہ ہم ذمہ دار نہیں آگے قلوب مختلف ہیں بعضوں کو یہ خیال ہوا کہ جب حکام ذمہ دار نہیں تو خدا جانے کیا پیش آئے گا لیکن ہمت ہو تو کچھ بھی نہیں کیونکہ جب ذمہ دار تھے ادھر سے ذمہ داری نہ ہوتی تو کوئی کیا کر سکتا ہے۔ یعنی حکام ذمہ دار ہوئے لیکن خدا ذمہ دار نہیں ہوا اور سمندر میں طوفان آیا اور جہاز غرق ہو گیا تو بتاؤ حکام کی ذمہ داری کیا کر سکتی ہے تو ذمہ دار حکام کا اتنا ہی فرض تھا کہ اصلی واقعہ بیان کر دیں ہمیں ان کا ممنون ہونا چاہیے کہ انہوں نے ضعیف اندیشہ کو بھی ہم سے چھپایا نہیں اب تم اپنے قلوب میں ہمت واطمینان پیدا کرو اور قواعد شرعیہ سے معلوم کر لو کہ اس وقت جانا کیسا ہے۔ قاعدہ شرعی یہ ہے کہ جب سلامت غالب ہو اور خطرہ مغلوب ہو تو حج فرض ہے چنانچہ آج کل بھی سلامت غالب ہے اور لوگ برابر جا رہے ہیں۔

اب رہی اس کی تفصیل کہ کہاں ٹکٹ ملے گا کب جہاز چھوٹے گا۔ سو میں نے اس کی کاوش نہیں کی۔ آپ تحقیق کر لیجئے اگر بمبئی میں کسی سے ملاقات ہو تو اس سے دریافت کر لیجئے۔ اور اس سے اعلیٰ درجہ تحقیق کا یہ ہے کہ خود بمبئی جا کر معلوم کر لیجئے تا کہ شک وشبہ بھی نہ رہے اور وہ ایسی جگہ بھی نہیں جہاں جانا دشوار ہو کیونکہ یہاں تو آپ کو باسی خبر مل سکتی ہے اور وہاں بالکل تازہ خبریں ملیں گی۔ اور اگر وہاں نہ جا سکیں اور نہ کسی سے جان پہچان ہو تو پھر ایک نیک شخص کا پتہ میں بتلائے دیتا ہوں حاجی احمد جان صاحب سوداگر شاہی بازار سہارنپور یہی پتہ یہاں سے

پوچھ لیں اور میں یہ پتہ اس لئے بتائے دیتا ہوں کہ اگر کسی کو شوق و ہمت ہو تو وہ متردد اور پریشان نہ ہو اور ان باتوں کو ان سے معلوم کر کے چل کھڑا ہو۔ لو اب میں نے یہ تدبیر ایسی بتلادی کہ گویا تمام واقعات بتلادیئے۔

یہ تو میں کہتا نہیں کہ ایسا توکل کرو کہ سمندر کی سیدھ باندھ کر چل کھڑے ہو بلکہ اسباب سے کام لو۔ مگر اس میں غلو نہ کرو۔ ورنہ اس طرح تو دنیا کا بھی کوئی کام نہیں چل سکتا۔ کھانا بھی نہیں کھا سکتے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کسی نے زہر ملا دیا ہو۔ تو اس قسم کے احتمالات خود ہی مردود ہیں ہاں جو احتمال ناشی عن الدلیل (دلیل سے پیدا ہو) وہ معتبر ہے لیکن دلیل جلیل ہو ذلیل نہ ہو کوئی معتد بہ دلیل ہو تو اس پر عمل کرنے میں مضائقہ نہیں۔

بہر حال چونکہ یہ عالم اسباب ہے اس لئے اعتدال کے اسباب کے اختیار کرنے کا یہی حکم ہے چنانچہ حج کے اندر بھی ارشاد ہے **وتزودوا** یعنی زادراہ بھی لو کہ ضعفاء کے لئے واجب بھی ہے۔ اس واسطے کہ روپیہ ہوگا تو طمانیت رہے گی ورنہ قلب میں پریشانی ہوگی پھر کیا نشاط ہوگا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تدابیر سے کام لینا مامور بہ ہے۔ اسی واسطے میں بتلاتا ہوں کہ اول بمبئی جاؤ اور اگر بمبئی نہ جا سکو وہاں کسی سے خطوط کے ذریعہ سے دریافت کرلو۔ اور اگر کسی سے جان پہچان نہ ہو تو پھر سہارنپور میں حاجی احمد جان صاحب سے دریافت کرلو مگر مہربانی کر کے ٹکٹ جواب کے لئے رکھ دینا گو اگر ٹکٹ نہ بھی ہوگا تب وہ جواب دیں گے مگر یہ واہیات بات ہے کہ اپنی غرض کے لئے خواہ مخواہ ایسی تکلیف دینا جو خود اٹھا سکتے ہو۔ بہر حال یہ تدبیر میں نے بتلادی ہے اور اس سے واقعات جزئیہ سفر کے معلوم ہو سکتے ہیں۔ اب وہ مانع تو رفع ہو گیا کہ جب حج ممکن ہی نہیں تو اس کے متعلق کچھ بیان کرنا اور ترغیب دینا کیا ضرور؟ جب ثابت ہو گیا کہ ممکن ہے تو مناسب ہوا کہ اس کے متعلق کچھ بیان کیا جائے تاکہ ہمت و رغبت ہو اور جن کے ذمہ حج فرض ہے وہ چل کھڑے ہوں۔ بہر حال ہمارا ابتدائے سفر شوال سے ہوتا ہے۔

ایک وجہ تشارک (شریک ہونے) کی یہ بھی ہے کہ قربانی بھی ایام حج میں ہوتی ہے تو اس اعتبار سے بھی قربانی و حج ساتھ ساتھ ہیں جیسا کہ قرآن و رمضان کہ دونوں میں ایک خاص مناسبت ہے گو بعض قربانی ان ایام میں واجب ہے اور بعض مستحب خصوص حجاج کے واسطے ان ایام حج میں اور حرم میں اس کی اور زیادہ فضیلت ہے۔ غرض چونکہ دونوں میں مناسبتیں متعددہ تھیں اس وجہ سے مناسب معلوم ہوا کہ ساتھ ساتھ دونوں کو بیان کیا جائے۔

مال و بدن سے مرکب عبادت

اور میں نے جو حج اور قربانی کو مرکب مالی و بدنی سے کہا ہے سو فقہاء نے حج کو تو تصریحاً مرکب ٹھہرایا ہے یعنی حج کے اندر بذل نفس بھی ہے یعنی سفر کرنا اور ارکان بھی بدن ہی سے ادا ہوتے ہیں تو بدنی ہونا تو ظاہر ہے رہا مالی ہونا سو مالی اس معنی تو ہے نہیں کہ (بدون بذل مال (خرچ) کے حج ہی نہ

ہو سکے کیونکہ ہم ایسا شخص فرض کرتے ہیں جو مکی ہے اور مفلس ہے اس نے قران و تمتع ہی اس لئے نہیں
کیا کہ وہ حنفی ہے یا ہم اسے شافعی فرض کرتے ہیں کہ اس نے قرآن و تمتع بھی کرلیا لیکن اس نے
بجائے دم قران و تمتع کے تین روزے رکھ لئے یا یہ صورت ہی قران و تمتع کی نہ فرض کرو کیونکہ بدل کو
مبدل منہ ہی کا حکم ملتا ہے تو حکما گویا اس نے بدل مال کرلیا پس فرض کرو کہ اس نے افراد ہی کیا اور
تمام ارکان پیادہ ہی ادا کئے تو دیکھئے ٹکا بھی نہیں خرچ ہوا اور نہ واجب ہوا اور حج ادا ہو گیا تو حج اس معنی
کر تو مالی نہ ہوا کہ بدون مال کے اس کا تحقق ہی نہ ہو البتہ اس معنی کر مالی ہے کہ غالباً تلبس مال کا ہوتا ہے
چنانچہ حجاج میں اکثر باہر کے ہوتے ہیں اور ان میں بھی بکثرت سفر کر کے سوار ہو کر زادراہ لے کر حج کو
آتے ہیں۔ تو گویا اکثر تلبس اس کا عادۃً و غالباً ضرور مال کے ساتھ ہوتا ہے گو باہر کے آنے والوں میں
بہت سے باہمت مفلس لوگ پیادہ بھی آتے ہیں مگر بہ نسبت اہل تمول کے ایسے لوگ کم ہوتے ہیں۔
چنانچہ اس آیت میں بھی ان تہی دستوں کا مذکور ہے: وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ یَاۡتُوۡکَ رِجَالًا (الآیۃ)
کہ اے ابراہیمؑ آپ لوگوں کو حج کے لئے ندا کر دیجئے لوگ آپ کے پاس حج کے لئے پیادہ بھی
آئیں گے اور اونٹ پر بھی سوار ہو کر آئیں گے۔ گویا پیادہ حج کرنیکا حکم تو نہیں مگر یہ خبر بلانکیر ہے اس
سے مرضی عندالحق (اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ) ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ پیادہ میں دو
احتمال ہیں ایک یہ کہ اس کے پاس زادراہ ہے۔ دوسرے یہ کہ زادراہ نہیں احتمال ثانی تو باطل ہے کیونکہ
شریعت اسے پسند نہیں کرتی کہ زادراہ ہو اور پھر پیادہ سفر کرے کہ یہ بخل ہے کیونکہ ایسے کنجوس کی مدح
کیا ہوگی جو خود بھی نفع نہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی نفع سے باز رکھے کیونکہ سواری میں کچھ خرچ ہوتا تو
دوسروں کو بھی کچھ نفع ہو جاتا تو اس سے اشارۃً یہ بھی نکل آیا کہ بلا زدراہ بھی حج کرنا جائز ہے۔ جیسا کہ بلا
راحلہ (سواری) جائز ہے جس پر عَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ (دبلی اونٹنیوں پر) دال ہے۔

پیدل حج

اب بعض لوگوں کا ان پر طعن کرنا جنہوں نے جانبازی کی اور غلبہ شوق میں پیدل ہی چل کھڑے ہوئے کہ یہ ایسے
بیہودہ لوگ ہیں جو خود بھی پریشان ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی پریشانی میں ڈالتے ہیں یہ طعن ناشی ہے جہل سے۔
صاحبو! معلوم ہوتا ہے تم نے عشاق کو دیکھا ہی نہیں‘ خود جیسے کم ہمت ہو دوسروں کو بھی ایسا ہی سمجھتے
ہو۔ دو چار لنگاڑے فقیر تم نے دیکھے ہوں گے۔ بس اس سے حکم کلی لگا دیا کسی عطار ہی پر الٹ پلٹ
کے نظر پڑتی رہی اس سے حکیم محمود خاں کے وجود کے منکر ہو گئے‘ یاد رکھو ہر زمانہ میں اللہ کے بندے
ایسے ایسے رہے ہیں جو آپ کی نظر میں مسکین پریشان ہیں۔ مگر حقیقت میں وہ وہ لوگ ہیں جن کی

نسبت کسی بزرگ کا الہام ہے کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔

اولیائی تحت قبائی لا یعرفھم سوائی کہ میرے دوست میرے دامن قبا کے نیچے چھپے ہوئے ہیں۔ جنہیں میرے سوا کوئی نہیں پہچانتا۔ تو آپ کو کیا خبر ہے

؎ اے ترا خارے بپا نشکستہ کے دانی کہ چیست حال شیرانیکہ شمشیر بلا برسر خورند

(تمہارے پاؤں میں کانٹا بھی نہیں لگا ہے تم ان لوگوں کی حالت کو کیا سمجھ سکتے ہو جن کے سروں پر بلا و مصیبت کی تلوار چل رہی ہے)

خاکساران جہاں

تم پر جب وہ کیفیت ہی نہیں تو تم کو کیا معلوم ایسے ایسے لوگ ہیں کہ جن کی ذات کو پہچانتے ہو مگر صفات کو نہیں جانتے جیسے حق تعالیٰ اپنی نسبت فرماتے ہیں:

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ کہ ہم تو تم سے باعتبار علم کے نہایت قریب ہیں اور تم ہم سے باعتبار معرفت کے نہایت دور۔ اسی طرح اللہ کے بندے ایسے ایسے ہیں کہ ذات کے اعتبار سے تم سے بہت نزدیک ہیں مگر صفات کے اعتبار سے تم ان سے بہت ہی بعید ہو۔

ایک شخص بیان کرتے تھے کہ سفر حج میں ایک شخص نہایت آزادوضع سے تھے۔ اس معنی کر آزاد نہیں کہ شریعت کی وضع سے بھی آزاد تھے بلکہ اس معنی کر آزادوضع تھے کہ مخدومیت مولویت مشیخت کی شان ان میں نہ تھی۔

؎ زیربار اندر درختاں کہ ثمرہا دارند اے خوشا سرو کہ از بندغم آزاد آمد

(یعنی پھل دار درخت زیر بار ہیں سرو بہت اچھا کہ بند غم سے آزاد ہے)

تمام سفر میں ان کی یہ حالت تھی کہ رقص کرتے تھے عشقیہ اشعار پڑھتے تھے ان کو لوگ نقال مسخرہ سمجھتے تھے واقعی بظاہر ان کی وضع بھی ایسی ہی تھی آپ کے پاس ایک ڈفلی بھی تھی جو ایک طرف سے کھلی ہوئی تھی یونہی اپنے ہاتھ سے کسی چیز کے گھیرے پر جھلی منڈھ کر چھوٹے سے دف کی شکل بنالی تھی کبھی کبھی اسے بھی بجایا کرتے تھے غرض لوگ انہیں ان باتوں سے بالکل مسخرہ سمجھتے تھے

؎ خاکساران جہاں رابحقارت منگر توچہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

(خاکسار لوگوں کو حقارت کی نظر سے مت دیکھو ممکن ہے کہ ان میں کوئی اہل دل صاحب حال ہو)

اخیر تک بھی انہوں نے اس وضع کو نہ چھوڑا۔ اسی حالت میں تھے کہ حرم میں یعنی مسجد حرام میں پہنچ گئے اور اس کو حرم میں میں نے بالمعنی العرفی کہہ دیا ورنہ یوں تو تمام مکہ حرم ہے عرف میں البتہ خاص مسجد مسجد بیت اللہ کو حرم کہتے ہیں۔ میں نے بھی اسی اصطلاح کے اعتبار سے حرم کہہ دیا۔ خیر جب خانہ کعبہ کے سامنے

پہنچے اس کے سیاہ غلاف اور اس کی ایک محبوبانہ شان کو دیکھ کر اور بھی جوش بڑھ گیا مطوف نے کہا کہ یہی بیت اللہ ہے اب طواف کرو۔ یہ کہنا تھا کہ ان پر ایک حالت طاری ہوئی اور بے ساختہ یہ شعر زبان پر جاری ہو گیا

چوری بکوے دلبر بسپار جان مضطر ۔ کہ مبادا بار دیگر نرسی بدیں تمنا

کہ اب تو محبوب کے در پر پہنچ گئے ہو اب اپنی جان فدا کر دو شاید پھر اس تمنا کے حصول کا موقع نہ ملے یہ کہہ کر فوراً گر پڑے اور دم نکل گیا۔ تب معلوم ہوا کہ یہ کوئی صاحب حال تھا مسخرہ نہیں تھا۔ تو یہ ایک واقعہ ظاہر ہو گیا ورنہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ کیسے کیسے رتبے کے شخص ہوتے ہیں۔

میں نے ایک شخص کو دیکھا کہ عمرہ کے لئے دوڑے دوڑے جاتے تھے خدا جانے کس چیز نے انہیں پریشان کر رکھا تھا اور کیا چیز تھی جو آہستہ بھی نہیں چلنے دیتی تھی۔ انجن میں جتنی آگ زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی تیز چل سکتا ہے۔ ان میں عشق کی آگ تھی جس کو عراقی رحمۃ اللہ کہتے ہیں

صنمارہ قلندر سز دار بمن نمائی ۔ کہ دراز و دور دیدم رہ و رسم پارسائی

(طریق زہد خشک بہت دور دراز کا راستہ ہے مجھے تو طریق عشق میں چلایئے)

اگر یہ محبت نہیں تو ہمارا حج وہی حج ہے نماز وہی نماز ہے جس کو عراقی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں۔

بز میں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا برآمد ۔ کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریائی

(جب زمین پر میں نے سجدہ کیا تو زمین سے یہ ندا آئی کہ تو نے سجدہ ریا کا کر کے مجھ کو بھی خراب کیا)

یہ تو ہماری نماز ہے اور حج کیسا ہے

بطواف کعبہ رفتم بحرم رہم ندادند ۔ کہ بروں در چہ کر دی کہ دروں خانہ آئی

(خانہ کعبہ کے طواف کے لئے گیا تو حرم کا رستہ مجھ کو نہ دیا اور کہا تو نے حرم کے باہر کیا کیا ہے جو خانہ کعبہ میں داخل ہونا چاہتا ہے)

یہ ہمارا حج ہے اور وہ ہماری نماز۔ اگر محبت نہیں تو کیا ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ محبت کے لئے جوش ضروری نہیں کہ جس میں جوش نہ پاؤ اس کو محبت سے خالی سمجھو۔ محبت بھی دو قسم کی ہوتی ہے کسی میں ضبط ہوتا ہے اور کسی میں نہیں ہوتا جسے خبط کہنا مناسب ہے مگر اس خبط ہی کی نسبت مولانا فرماتے ہیں

ما اگر قلاش وگر دیوانہ ایم ۔ ست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

(یعنی اگر ہم قلاش و دیوانہ ہیں تو کیا پرواہ کی بات ہے یہی دولت کیا کم ہے کہ ہم محبوب حقیقی اور ان کی محبت کے متوالے ہیں) اور یوں فرماتے ہیں

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد ۔ مرعسس رادید و در خانہ نشد

(جو دیوانہ نہیں ہوا وہی دیوانہ ہے۔ جس طرح جو شخص کوتوال کو دیکھتا ہے گھر میں چلا جاتا ہے۔ اس طرح جب محبوب حقیقی کا عشق غالب ہوتا ہے عقل رفو چکر ہو جاتی ہے) اور یوں بھی فرمایا ہے

؎ آزمودم عقل دور اندیش را ‏ ‏ ‏ ‏ بعد ازاں دیوانہ سازم خویش را

(عقل دور اندیش کو آزمالیا جب اس سے کام نہ چلا تو اپنے کو دیوانہ بنالیا)

باز سودائی شدم من اے طبیب ‏ ‏ ‏ ‏ باز دیوانہ شدم من اے حبیب

(پھر اے طبیب ہم سودائی ہوئے اے حبیب پھر ہم دیوانہ بنے)

یہ وہ دیوانگی ہے۔ جس پر ہزاروں دانشمندیاں قربان ہیں۔

رتبہ شہید عشق کا گر جان جایئے ‏ ‏ ‏ ‏ قربان ہونے والے کے قربان جایئے

(امیر مینائی مرحوم ۱۲ جامع)

تو میں نے انہیں دوڑتے ہوئے عمرہ کرتے ہوئے دیکھا مگر یہ پتہ نہ لگا کہ کون تھے کہاں کے تھے اور کیا نام تھا اور تھے نہایت حسین اور صرف حسن طبعی ہی نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ وہ حسن وہ رونق وہ آب وتاب الٰہی بھی تھی۔ وہ وہی تھے جو حدیث میں ہے

رب اشعث راس مدفوع بالابواب لو اقسم علی اللہ لا برہ او کمال قال (کنزالعمال ص۵۹۸)

کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جن کے بال پریشان ہیں اگر کسی کے دروازہ پر جائیں تو دھکے دے دیئے جائیں کسی کی سفارش کریں تو کبھی قبول نہ کرے۔ غرض بالکل لوگوں سے علیحدہ ہیں اور کوئی ان کی وقعت بھی نہیں کرتا مگر اللہ کے نزدیک ان کی اتنی قدر اور اس قدر وقعت ہے کہ اگر وہ اللہ کے بھروسہ پر قسم کھالیں تو خدا انہیں ضرور سچا کر دے اور جب خدا کے یہاں ان کی بات مانی جاتی ہے تو مخلوق کیونکر نہ مانے گی اسی کا حاصل عارف شیرازیؒ بیان فرماتے ہیں۔

گدائے میکدہ ام لیک وقت مستی بیں ‏ ‏ ‏ ‏ کہ ناز برفلک و حکم برستارہ کنم

(گدائے میکدہ ہوں مستی کی حالت دیکھو کہ فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتا ہوں)

فلک و ستارہ پر حکم کیا بعید ہے جب خدا ان کا معروضہ سن لیتا ہے جب خدا ان کا کہنا کر دیتا ہے تو اور مخلوق ان کا کہنا کیوں نہ کریں۔ اطاعت و فرمانبرداری کیوں نہ کریں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے وقت میں زلزلہ آیا۔ آپ نے فرمایا اسکنی یا ارض، اے زمین ٹھہر جا۔ زلزلہ موقوف ہو گیا۔

ایک مرتبہ دریائے نیل خشک ہو گیا پہلے بھی خشک ہو جاتا تھا۔ جب خشک ہوتا تھا ہزاروں روپے خرچ کر کے کسی کی نہایت حسین جمیل لڑکی لباس و زیور سے آراستہ کی جاتی تھی اور وہ دریا میں ڈال دی

جاتی تھی بس پانی ابلنے لگتا تھا۔ وہ لڑکی ہلاک ہو جاتی تھی ۔ یہ تصرف شیطانی تھا۔ خیر جب دریا خشک ہو گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت اور اس مقام پر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کی ولایت کا زمانہ تھا۔ لوگوں نے عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے عرض کیا اور یہی قدیمی تدبیر بھی بتلائی۔ انہوں نے کہا کہ میں ایسا کبھی نہ کروں گا۔ ہاں امیر المؤمنین سیدنا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھے دیتا ہوں چنانچہ لکھا۔ آپؓ نے اس کے جواب میں ایک رقعہ دریائے نیل کے نام لکھ کر روانہ کیا کہ:

"اے دریائے نیل اگر تو خدا کے حکم سے جاری ہوتا ہے تو جاری رہ اور اگر تو خود جاری ہوتا ہے تو ہم کو تیری حاجت نہیں"۔

جس وقت رقعہ پہنچا ہے تو جاہل لوگ ہنستے تھے کہ عقل گئی۔ ہے نیل کو رقعہ لکھ رہے ہیں۔ خیر وہ رقعہ دریا میں ڈالا گیا رقعہ کا دریا میں پڑنا تھا کہ بس ابلنا شروع ہو گیا۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ جب سے پھر کبھی نیل خشک نہیں ہوا تو

ناز برفلک و حکم برستارہ کنم

(یعنی فلک پر ناز اور ستارہ پر حکم کرتے ہیں) میں استبعاد (دوری چاہنا) ہی کیا ہے۔

غرض کپڑے میلے بال بکھرے صورت پریشان اللہ کے بندے ایسے ایسے عشاق ہیں ان پر اعتراض کرنا اپنے کو غضب الٰہی کا مستحق بنانا ہے۔ تو حق تعالیٰ نے

یاتوک رجالاً و علیٰ کل ضامر (آئیں گے وہ تمہارے پاس پیادہ بھی اور دبلی اونٹنیوں پر بھی) میں دونوں باتیں یعنی زاد سے بھی خالی ہونا اور راحلہ (سواری) سے بھی خالی ہونا منطوقاً و مفہوماً ذکر فرمایا ہے۔ تو ایسا بھی حج ہو سکتا ہے کہ ایک پیسہ بھی نہ خرچ ہو تو حج اس معنی کر عبادت مالی نہیں کہ **لا یتحقق الا بالمال** (اس کا تحقق مال ہی سے ہوتا ہے) مگر اس معنی کر مالی ہے کہ حج کرنے والے دو قسم کے لوگ ہیں ایک مکہ والے دوسرے باہر والے۔ باہر والے مکہ والوں سے بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ پھر باہر کے آنے والوں میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں زیادہ وہ ہیں جو سوار ہو کر آتے ہیں اور کم وہ ہیں جو پیادہ آتے ہیں۔ پھر سوار ہو کر آنے والوں میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ جن کی نظر سواری سے مصلحت ظاہری پر ہوتی ہے۔ دوسرے وہ جو مصلحت باطنی کا لحاظ رکھتے ہیں۔ مصلحت ظاہری تو یہی ہے کہ پریشانی نہ ہو۔ مصلحت باطنی وہ ہے جو حضرت حاجی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہم تو عاشق احسانی ہیں۔ صفات بحت (خالص) کے ساتھ ہمیں محبت کہاں۔ افسوس انسان کے ساتھ تو ہمیں یوں ہی عشق ہو جاتا ہے اور خدا کے ساتھ ہمیں محض اس کے انعام و احسان کی وجہ سے محبت ہو۔ اللہ کے بندے ایسے بھی ہیں جو صفات بحت کے عاشق ہیں۔ مگر بہت کم ہیں زیادہ احسان ہی کی وجہ سے محبت رکھتے ہیں کہ منعم کے ساتھ طبعی محبت ہوتی ہے۔ تو اگر حج میں بدون زاد راہ کے گیا اور

وہاں ہوئی کلفت تو وہ نام کی محبت بھی زائل ہو جائے گی۔اس واسطے فرمادیا کہ تزودوا کہ زادراہ لے کر چلو' تو زیادہ وہ لوگ ہیں جو زادراہ لے جاتے ہیں اور یہ مطلوب بھی ہے۔اس معنی کر حج مرکب ہے بدنی اور مالی سے کہ غالب احوال میں مال بھی خرچ ہوتا ہے گو بدون مال کے بھی ہو جاتا ہے جیسا کہ میں پہلے اس کی ایک صورت فرض کر چکا ہوں۔مگر غلبہ کی وجہ سے مرکب کہہ دیا۔

کیا قربانی مرکب عبادت ہے؟

پس فقہاء نے حج کے مرکب ہونے کی تو تصریح فرمادی۔البتہ قربانی کا مرکب ہونا کسی قول میں نظر سے نہیں گزرا۔لیکن غور کرنے سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ بھی مرکب ہے گو اس میں مالیت کی شان غالب ہو مگر جس طرح باوجود غالبیت بدنیت کے من وجہ تلبس بمال کے سبب حج کو مرکب کہہ دیا اسی طرح یہاں باوجود غالبیت کے من وجہ تلبس بالبدن کے سبب اس کو بھی مرکب کہنا صحیح ہو سکتا ہے۔اور اس کا مالی ہونا تو ظاہر ہے مگر بدنی ہونے میں دو حیثیتیں ہیں ایک خفی دوسرے جلی۔جلی تو یہ کہ قربانی محض انفاق مال (مال کے خرچ کرنے) سے ادا نہیں ہوتی کہ تین روپے یا کم دبیش اللہ واسطے کسی فقیر کو دے دیئے البتہ اگر اتنی تاخیر کر دے کہ ایام قربانی نکل جائیں تو اس وقت تصدق (صدقہ کرنا) ہی متعین ہے لیکن اول تو اس صورت میں قربانی کے برابر فضیلت نہ ہوگی دوسرے گفتگو اس میں ہے کہ وظیفہ اصلی کیا ہے سو وظیفہ اصلی قربانی کا تو یہی ہے کہ جانور ذبح کرو اور جانور کے ذبح کرنے میں ظاہر ہے کہ اتعاب (تکلیف میں ڈالنا) بدن ہے۔اگر کوئی شخص کہے کہ زکوٰۃ بھی مرکب ہے کیونکہ ہاتھ سے دینا پڑتا ہے اور اس میں بھی کسی قدر تعب ہے ہی۔جواب اس کا یہ ہے کہ اگر طبیعت سلیمہ ہے تو سمجھ میں آ جاوے گا کہ مال کے خرچ کرنے میں معتد بہ (اعتبار کے قابل) اتعاب بدنی نہیں اور قربانی میں بین اتعاب ہے۔اسی واسطے ہر شخص سے نہیں ہو سکتی اور دینا تو بچہ بھی کر سکتا ہے۔

دوسری حیثیت کے لئے جو کہ خفی ہے ایک مقدمہ کی ضرورت ہے مقدمہ یہ ہے کہ آیا اتعاب بدن من حیث ہو مقصود ہے یا اس وجہ سے کہ نفس پر محنت ہو ہر شخص قواعد شرعیہ سے جانتا ہے کہ بدن کو ایذا نفس کی وجہ سے ہوتی ہے اگر نفس نہ ہو تو ایذا بھی نہ ہو۔باقی یہ شبہ کہ اہل سنت کے نزدیک بعد مفارقت نفس بھی بدن میں حیات باقی رہتی ہے چنانچہ اسی وجہ سے حدیث میں مردہ کی ہڈی توڑنے کی ممانعت آئی ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہڈی کا توڑنا مردہ کو محسوس ہوتا ہے اور اس سے اذیت ہوتی ہے تو بدون تعلق نفس کے بھی بدن کو اذیت ہوئی۔سو اس کا الزامی جواب تو یہ ہے کہ اگر اس کا کوئی قائل ہو تو ہم کہیں گے کہ مفارقت نہیں پائی گئی تعلق نفس باقی ہے اگرچہ تھوڑا ہی سہی اور تحقیقی یہ ہے کہ

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں احساس ہے بلکہ احترام میں مردہ زندہ کے مثل ہے۔ زندہ میں دو حیثیتیں ہیں۔ ایک تو ہڈی توڑنے سے اس کو ایذا رسانی دوسرے ترک احترام تو مردہ کی ہڈی توڑنا اس وجہ سے ناجائز ہے کہ ترک احترام ہے نہ اس وجہ سے کہ اس کو اذیت ہوتی ہے۔

اور فقہاء نے اسے ایسا سمجھا ہے کہ صوفیا نے بھی نہیں سمجھا۔ اور حق یہ ہے کہ صوفیہ نفس کے معالجات اور ان کے نکات خوب بیان کرتے ہیں اور فقہاء اعمال کے اسرار خوب سمجھاتے ہیں۔ فقہاء نے صاف لکھا ہے کہ زیارت اموات کے وقت قبر سے اتنی دور رہنا چاہیے جس قدر دور حیات میں رہتے تھے۔ بعض لوگ ادب کی وجہ سے بہت دور رہتے ہیں۔ سو اتنا دور بھی نہ رہنا چاہیے پس فقہاء کے معیار سے کام لینا چاہیے کہ حیات و موت دونوں میں یکساں معاملہ کیا جائے اور یہ دور رہنا فقط احترام کے سبب سے ہے۔ گو وہ اب مرا ہوا ہے مگر واقع میں

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

(یعنی جس کو عشق حقیقی سے روحانی حیات حاصل ہوگئی وہ اگر مر بھی جائے تو واقع میں بوجہ اس کے کہ لذت قرب اس کو کامل درجہ کی حاصل ہو جاتی ہے اس لئے اس کو زندہ کہنا چاہیے)

پس اسی طرح مردہ کی ہڈی توڑنا منع ہے کہ توڑنے سے کچھ تکلیف نہیں ہوتی ہاں احترام کے خلاف ہے۔ میں نے مولانا محمد یعقوب صاحبؒ سے اسی قسم کا مسئلہ پوچھا کہ لاش جلانے سے مردہ کو کچھ تکلیف ہوتی ہے۔ مولانا فقیہ بھی تھے اور صوفی بھی تھے۔ فرمایا کہ مردہ کو اس سے ایسی تکلیف ہوتی ہے جیسی تمہیں تمہاری رزائی جلانے میں اور اگر کوئی پرانے گلے سڑے کپڑے کو چیرے پھاڑے تو کچھ بھی تکلیف نہیں ہوتی۔ ایسا ہی یہاں بھی ہے کہ جب بدن پرانا ہو جاتا ہے گل سڑ جاتا ہے تو پھر اس کے خاک میں ملنے اور کیڑوں کے کھانے سے کچھ تکلیف نہیں ہوتی۔

بس اب یہ مسئلہ بالکل صاف اور اچھی طرح حل ہو گیا تو یہ وجہ تھی مردہ کی ہڈی توڑنے اور اس کے بدن جلانے کی ممانعت کی۔

اور یہاں سے اسلام کی خوبی ظاہر ہوتی ہے کہ دفن کا حکم دیا اور جلانے کی ممانعت کر دی کہ دفن میں اکرام اور احراق (جلانے) میں ترک احترام ہے اور اس کے علاوہ دفن میں ارجاع الی الاصل (اصل کی طرف لوٹنا) بھی ہے۔ اور احراق میں اصل سے عدول ہے۔ بعض مدعین فلسفہ جلانے کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اور دفن کی خرابیاں کہ اس سے مٹی خراب ہو جاتی ہے اور اس سے جو بخارات اٹھتے ہیں وہ گندے زہریلے اور متعفن ہوتے ہیں اس طرح کے نکتوں سے ثابت کرتے ہیں کہ جلانا اچھا ہے مگر ہم تو اس کے خلاف مشاہدہ کر رہے ہیں کہ کسی مدفون کی قبر پر ہمیں بدبو نہیں آتی مگر مرگھٹ پر تو اس

قدر متعفن اور گندی ہوا ہو جاتی ہے کہ ناک نہیں دی جاتی ایسے مہمل نکتے تو ہر چیز میں بیان ہو سکتے ہیں مگر سلامت فطرت حق و باطل کا فیصلہ خود کر لیتی ہے بلکہ عقل تو دفن کو پسند کرتی ہے کہ اس میں بدن کو اس کی اصل میں پہنچا دیا باقی خاک کا اصل ہونا سو اس کی دلیل یہ ہے کہ ہر عنصر کا اپنے خمیر کی طرف طبعی میلان ہے اگر کوئی انسان کوٹھے پر سے اچھلے اگر وہ اوپر چلا جاتا تو ہوا یا نار غالب ہوتی اور اب تو خاک غالب ہے یا آب اور آب کا غالب نہ ہونا بھی ظاہر ہے ورنہ آب میں پہنچ کر عمق کی طرف نہ جاتا۔ پس خاک کا غلبہ متعین ہو گیا اور یہ قاعدہ عقلی ہے کہ:

کل شئی یرجع الی اصلہ (یعنی ہر چیز اپنی اصل کی طرف عود کرتی ہے) تو خاک میں دفن کرنا بالکل عقل کے موافق اور اس کے ماسوا سب فطرت سلیمہ اور عقل کے بالکل خلاف ہے۔

باقی احراق کی رسم کیسے نکلی سو ایک بزرگ فرماتے تھے کہ ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں پرانی تاریخ میں اوتار اور دیوتاؤں کی معاشرت کا ذکر ہے اور وہ جن تھے سو غالباً ان کے شرائع اور تھے اور انسان کے اور تو ان کے عنصر غالب یعنی نار کا مقتضائے عقلی یہ تھا کہ بعد موت ان کے ابدان کو اسی میں ملا دیا جائے۔ چونکہ ان میں آگ غالب تھی اس لئے آگ میں ملا دیئے جاتے تھے۔ یہ قصے ان کی کتابوں میں مذکور ہوں گے جہالت اور نادانی سے خدا بچائے۔ یہ اسے بزرگوں کی سنت سمجھ کر خود بھی یہی کرنے لگے

ع چوں ندیدند حقیقت رہ افسانہ زدند (یعنی جب حقیقت کا پتہ نہ چلا قصے کہانیوں پر عمل کرنا شروع کر دیا) گو یہ بات تاریخ سے ثابت نہیں مگر قرائن اسی کے مؤید ہیں۔ یہ جملہ معترضہ میں نے اس پر بیان کیا تھا کہ ہڈی توڑنے اور بدن کے جلانے میں تکلیف ہوتی ہے یا نہیں اور اس سے وہ شبہ رفع ہو گیا کہ بعد مفارقت نفس کے بدن کو تکلیف ہوتی ہے اور ثابت ہو گیا کہ بعد مفارقت کے تکلیف نہیں ہوتی۔

رہا یہ کہ مردہ کو قبر میں بٹھلاتے ہیں اور اس سے پھر وہی شبہ عود کر آیا کہ بعد مفارقت روح کے بھی تالم (دکھ پانا) و تنعم (عیش پانا) قبر میں بدن کو ہوتا ہے تو بات یہ ہے کہ وہ روح ہے جس کے ساتھ یہ معاملہ کیا جاتا ہے۔

رہا یہ کہ روح مجرد جلوس کے ساتھ کیسے متصف ہو سکتی ہے سو اول تو ابھی تک یہ امر طے نہیں ہوا کہ روح مجرد ہے یا مادی ہے۔ بعض اہل کشف کا قول ہے کہ مجرد ہے اور بعض متکلمین اس طرف گئے ہیں کہ مادی ہے اور دلیل یہ بیان کی ہے کہ تجرد خواص واجب سے ہے۔ لیکن یہ دعویٰ خود بے دلیل ہے بلکہ خواص واجب سے قدم اور وجوب ہے سو حکماء مجردات کے قائل ہوئے ہیں وہ مجردات میں قدم بھی مانتے ہیں یہ بیشک باطل ہے باقی اگر روح کو مجرد کہا جاوے اور حادث بالذات و بالزمان بھی مانا جاوے تو کون سی دلیل عقلی کے خلاف ہے۔ غرض بعض متکلمین تو سوائے واجب کے کسی چیز کے مردہ ہونے کے قائل نہیں۔ اور صوفیہ کرام کئی

چیزوں کے تجرد کے قائل ہوئے ان کو لطائف کہتے ہیں۔ جیسے روح، قلب، سر، خفی، اخفی اور کہتے ہیں کہ انسان جس طرح عناصر سے مرکب ہے اسی طرح ان اجزائے مجردہ سے بھی ہے۔ اور اس پر دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے خلوات و مراقبات میں ان مجردات کا مشاہدہ کیا ہے۔ سو جب تک قرآن وحدیث کے خلاف نہ ہو ہم کیونکر اس کا انکار کر سکتے ہیں۔ تو اگر روح مجرد ہے تو اس پر البتہ یٹھنا صادق نہیں آتا مگر صوفیہ اس کے قائل ہوئے ہیں کہ دوسرا بدن جو مشابہ اسی بدن عنصر کے ہوتا ہے عالم برزخ میں دیا جاتا ہے تو جس طرح یہ حی تھا وہ بھی حی ہے سب عذاب وثواب اس پر ہوتا ہے اور اس بدن کی طرح اسے بھی حس ہوتی ہے بلکہ اس سے زیادہ حس ہوتی ہے کیونکہ اس کا مادہ لطیف ہوتا ہے تو تجلسانہ (یعنی منکر نکیر مردہ کو بٹھاتے ہیں) اسی کے لئے ہے اور اگر روح مادی ہے تو تجلسانہ میں کوئی اشکال نہیں بہرحال تجلسانہ اس بدن عنصری کے لئے نہیں پس شبہ تاذی (تکلیف پانا بدن عنصری کا بعد مفارقت روح کے ساقط ہو گیا۔

تو حاصل یہ کہ یہ امر ثابت رہا کہ جب بدن کو تعب ہو گا ملابست (ملنے) نفس کی وجہ سے ہو گا کیونکہ نفس جب مفارق (جدا) ہو جاتا ہے تو کچھ تکلیف نہیں ہوتی۔ تو ثابت ہو گیا کہ بدن کو تکلیف نفس کو تکلیف ہونے سے ہوتی ہے پس اتعاب (تکلیف میں ڈالنا) بدن کی اصل اور حقیقت اتعاب نفس ہوا پس اگر ہم قربانی میں اتعاب نفس ثابت کر دیں تو تب تو اس میں عبادت بدنیہ کے معنی ثابت ہو جاویں گے سو قربانی میں اتعاب نفس موجود ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ رقت فطریہ مشارک فی الجنس (فطری رقت جنس میں شریک) پر بھی ہوتی ہے بلکہ بعض اوقات اس قدر ہوتی ہے کہ مشارک فی النوع پر بھی اتنی نہیں ہوتی کیونکہ مشارک فی النوع (یعنی نوع میں شریک ہونے والے) سے کہ انسان ہے بسا اوقات اتنی کلفتیں پہنچ جاتی ہیں کہ رقت کیسی بالعکس اس کے گلے پر چھری پھیرنے سے اور مسرت ہوتی ہے مگر چونکہ مشارک فی الجنس سے اس قسم کی اذیتیں نہیں پہنچ سکتیں۔ جس سے انتقام کی آگ اس قدر بھڑک اٹھے کہ بغیر اس کے خون کے چھینٹوں کے نہ بجھے۔ اور اگر اس سے کوئی اذیت پہنچتی بھی ہے تو ہر شخص اسے ایک درجہ میں معذور بھی سمجھتا ہے اس لئے مشارک فی الجنس پر رقت زیادہ ہوتی ہے اور اگر زیادہ نہ سہی تو برابر تو ہوتی ہے برابر بھی نہ سہی کم ہی سہی مگر وہ کم بھی فی نفسہ بہت ہے کسی کتے بلی کو سسکتے دیکھا نہیں جاتا بہت ہی رحم آتا ہے۔

تو اب سمجھ لیجئے کہ جس وقت جانور کے گلے پر بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کے چھری پھیرتے ہیں تو کیا دل نہیں دکھتا۔ بہت دل دکھتا ہے حتیٰ کہ بعض اسی وجہ سے اپنے ہاتھ سے ذبح بھی نہیں کر سکتے۔

سنگدلی کا شبہ

اب دوسری قوموں کا یہ شبہ کہ یہ لوگ بڑے سنگدل ہوتے ہیں کہ انہیں جانور کے گلے پر چھری

پھیرتے ذرا بھی رحم نہیں آتا محض ناواقفی یا تعنت سے ناشی ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہ شبہ یہ اعتراض فقط گائے کی قربانی کے متعلق ہے۔ چوہے' بکری' مرغی' کبوتر کے متعلق نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کچھ دال میں کالا ہے یعنی اس شبہ کا سبب ترحم نہیں ہے بلکہ محض حمیت مذہبی ہے اور اگر کوئی ذہین آدمی مذہب سے قطع نظر کر کے سب جانوروں کے متعلق یہی الزام دے تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسے کیا خبر کہ مسلمان نرم دل ہوتے ہیں یا سخت دل۔ پس ان کا اعتراض اگرچہ حمیت مذہب سے نہیں لیکن ناواقفی سے ضرور ہے' پس اس کا یہ فیصلہ بہت ہی ظاہر ہے۔

مگر باوجود اس کے ظاہر ہونے کے ہمارے علماء مناظرین نہ معلوم جواب میں کہاں کہاں پہنچتے ہیں لیکن ان پر بھی اعتراض نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہاں تحقیق مقصود نہیں ہوتی محض الزام واسکات (خاموش کرنا) مقصود ہوتا ہے۔ باقی جہاں تحقیق منظور ہوتی ہے وہاں حق تعالیٰ کی جانب سے اصل حقیقت کا القاء ہوتا ہے۔ سوالحمد للہ حق تعالیٰ نے اس وقت مجھے جواب میں یہ بات سمجھا دی کہ انہیں کیا خبر کہ مسلمانوں میں رحم نہیں۔ اب آپ سب مسلمان ٹٹول لیجئے کہ ذبح کے وقت قلب کی کیا کیفیت ہوتی ہے کڑھتا ہے یا نہیں۔ بعض موجود بزرگوں کا قصہ سنا ہے کہ ذبح کے وقت آنکھ سے آنسو جاری ہوگئے آخر یہ کیا بات ہے ترحم اور کسے کہتے ہیں۔

قوۃ عدل

لیکن اس کے ساتھ بڑا کمال مسلمانوں کا قوت عدل ہے کہ ایک ہی طرف نہیں چلے گئے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا

(اور ہم نے تم کو ایسی ایک جماعت بنادی ہے جو ہر پہلو سے نہایت اعتدال پر ہے تاکہ تم مخالف لوگوں کے مقابلہ میں گواہ ہو اور تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گواہ ہوں)

وسط کی تفسیر عدل ہے کہ اعتدال ہے قوت علمیہ وعملیہ دونوں میں کہ جزبرہ و بلاہت کے وسط میں حکمت جبن وتہور کے وسط میں شجاعت اسی طرح قوت شہویہ خمود وفجور میں توسط عفت ہے اور ان تینوں کے مجموعہ یعنی حکمت' شجاعت' عفت کا نام عدل ہے۔ تو یہ امت عادلہ ہے۔ حق تعالیٰ نے احکام بھی ایسے رکھے ہیں کہ اگر ان کے اندر صفت عدل کم ہو تو ان احکام کے برتنے سے درست ہو جائے نہ افراط ہو کہ چھری ڈال دو اور نہ تفریط کہ رحم ہی نہ ہو غرض دونوں میں اعتدال رکھو تو ہمارا بڑا کمال یہ ہے کہ رحم بھی ہے اور چھری بھی پھیرتے ہیں مگر یہ سمجھ کر

؎ آنکہ جاں بخشد اگر بکشد رواست

(جو جان دینے والے ہیں یعنی خدا تعالیٰ اگر وہ مار ڈالیں تو جائز ہے) اگر کوئی کہے کہ انہوں نے نہیں مارا تو اس کا جواب دوسرے مصرعہ میں دیتے ہیں

؎ نائب است اودست اودست خداست

(یعنی وہ خدا کا نائب ہے اس کا فعل مثل خدا کے فعل کے ہے)

یہ تو مسلم ہے کہ جان جس کی دی ہو وہ لے سکتا ہے ہم اسی کے نائب ہیں اس نے ہمیں حکم دیا اس لئے ہم نے چھری پھیر دی باقی ہم نے جان نہیں نکالی۔ ہم نے تو فقط راستہ کھول دیا جان تو انہوں نے نکالی اب کیا شبہ رہا۔ اہل اسلام پر کہ بڑے سنگ دل ہوتے ہیں۔ آپ بڑے رحمدل ہوتے ہیں کہ خود چوہے نہیں مارتے مسلمانوں کے محلہ میں چھوڑ آتے ہیں کہ یہ ماریں۔ جب تم ہمیں موش کشی میں اپنا نائب بناتے ہو تو اللہ تعالیٰ نے اگر گاؤ کشی میں ہمیں اپنا نائب بنادیا تو کیا قباحت ہوگئی۔ اللہ کی نیابت میں یہ نفع بھی ہے کہ مارو اور کھاؤ اور تمہاری نیابت میں تو فقط مار کر پھینک دینا ہی ہے اور کچھ بھی نہیں۔ سبحان اللہ یہ رحم لی ہے۔ کہ ہم سے نہیں مارے جاتے تم مار دو۔ نیابت اور کسے کہتے ہیں یہ تو زبان سے کہنے سے بھی بڑھ کر ہے، اگر زبان سے کہتے تو ایک مسلمان بھی نہ کر سکتا کیونکہ یہ کس کو غرض تھی کہ وہ اپنا کاروبار چھوڑ کر تمہارے گھروں اور دکانوں پر چوہے مارنے جاتا۔ مگر ان کے گھر لا کر چھوڑ دیئے کہ اچھی طرح ان کو مار سکیں۔

یہ رحم تو ویسا ہی ہو گیا کہ کسی کی ایک بے حیا بہو تھی اس سے کسی نے پوچھا کہ تمہارا شوہر کہاں گیا ہے حیا کی وجہ سے منہ سے تو کہہ نہ سکی مگر بتلانا بھی ضرور تھا۔ تو آپ نے کیا کیا کہ لہنگا اٹھا کر اس کے سامنے موتا اور اس پر سے پھاند گئی۔ مطلب یہ کہ ندی پار گیا ہے۔

تو حضرت بعضا ترحم بھی ایسا ہی ہوتا ہے کسی نے زنا کیا حمل رہ گیا۔ رسوائی ہوئی لوگوں نے کہا کہ کمبخت تو نے عزل کیوں نہ کرلیا۔ (عزل انزال سے پہلے علیحدہ ہونے کو کہتے ہیں) تو آپ کہتے ہیں کہ سنا تھا کہ عزل مکروہ ہے کمبخت منحوس اور زنا کو کون سا فرض سنا تھا۔

بعضوں کا تقویٰ بھی ایسا ہی ہوتا ہے تو یہ ترحم ویسا ہی ہے جیسی اس بہو کی شرم تھی کہ منہ سے بولنے میں تو حیا تھی اور لہنگا کھول کر سامنے بیٹھ جانے میں حیا نہ تھی۔ اور پھر مسلمانوں پر اعتراض۔ حضرت میں بقسم کہتا ہوں کہ ترحم مسلمانوں کے برابر کسی قوم کے اندر نہیں ہے۔ مگر امتحان کے وقت معلوم ہوتا ہے۔ کسی کا قطعہ ہے جس کے بعض اشعار یہ ہیں

؎ دے کر قسم کہے کہ تو میرا لہو پیئے | گر پی نہ جائے جلدی سے پیالہ شراب
اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو | گر کچھ بھی خوف کیجئے روز حساب کا

اور امتحان بغیر تو یہ آپ کا غلام قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

دنیائے واقعات نے کھلم کھلا ثابت کر دیا ہے کہ ترحم کے موقعوں پر ترحم کرنا یہ خاصہ مسلمانوں ہی کا ہے۔ مسلمانوں کے برابر کوئی قوم رحمدل نہیں۔

میرے پاس ایک برہمن کا خط آیا تھا کہ مسلمانوں پر تو یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جیو مارتے ہیں مثلاً گاؤ کشی وغیرہ کرتے ہیں مگر وہ جیو گا نہیں مارتے (جیو گا آدمی کے نفس کو کہتے ہیں مگر یہ معترض قوم جیو گا مارتی ہے یعنی آدمیوں پر ظلم کرتی ہے مجھے اس شخص کا قول نقل کرنے سے فقط یہ مقصود ہے ۔ الحق ماشهدت به الاعداء (حق وہ ہے جس کی دشمن بھی شہادت دے دیں یعنی

ع جادو وہ ہے جو سر پر چڑھ کے بولے

اب تو کئی شہادتیں ہو گئیں کہ مسلمان بڑے رحمدل ہوتے ہیں۔ بہرحال ان کی رحمدلی ثابت ہو گئی۔ تو اب ذبح میں کتنا بڑا اتعاب نفس ہوا جو حقیقت ہے اتعاب بدن کی تو اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ قربانی میں بدنیہ بھی ہے مگر مغلوب اور مالیت غالب جیسا کہ حج میں مالیہ بھی ہے مگر مغلوب اور بدنیہ غالب یہ بیان ہو گیا قربانی کے عبادت بدنیہ ہونے کی دونوں وجہوں کا۔

بدل قربانی

اوران کے علاوہ ایک تیسری وجہ اس سے بھی لطیف ہے وہ یہ کہ یہ دیکھنا چاہیے کہ قربانی بدل کا ہے کی ہے۔ اعتبار اس اصل کا ہوگا جیسے میں نے ابھی بیان کیا تھا کہ اصل قربانی ہے اور بعد ایام نحر (قربانی کے دنوں) کے اس کا بدل یعنی قیمت دینا اس کا قائم مقام ہے پھر بدل پر بھی وہی آثار مرتب ہو جاتے ہیں جو اصل پر ہو جاتے ہیں یہ سو واقع میں قربانی بھی اصل نہیں یہ بھی کسی چیز کا بدل ہے اور اس کی بھی کوئی اور ہی اصل ہے۔ سو وہ اصل وہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہؓ کے جواب میں ارشاد فرمائی۔

قالو اماهذه الاضاحی یا رسول الله ؟ قال سنة ابیکم ابراهیم (کنز العمال ۱۱۴۹۰)
صحابہؓ نے استفسار کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قربانی کیا چیز ہے؟ آپؐ نے فرمایا تمہارے باپ ابراہیمؑ کی سنت ہے۔

فرزند کی قربانی

اب اس کی تحقیق سمجھو کہ ابراہیم کا طریقہ کیا تھا انہوں نے کون سا فعل کیا تھا سو اگر انہوں نے ایک دنبہ ذبح کیا تھا مگر یہ دیکھو کہ وہ کس کا قائم مقام تھا۔ سو وہ بیٹے کا قائم مقام تھا۔ اس کا قصہ اول یہ ہوا تھا خواب میں دیکھا تھا۔

إِنِّيْ أَرٰى فِي الْمَنَامِ أَنِّيْ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى (میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ تم کو ذبح کر رہا ہوں، سو تم بھی سوچ لو کہ تمہاری کیا رائے ہے) کہ ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا تھا کہ بیٹے کو ذبح کرو جس کو انہوں نے اپنے بیٹے اسماعیل سے ذکر کیا۔

اس کی نسبت بعض لوگ یہ سمجھے کہ رائے دریافت کرنے کے لئے ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام سے پوچھا تھا کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ تو انہوں نے کہا **یاابت افعل ماتومر** کہ اے باپ آپ وہی کیجئے جس کا آپ کو حکم ہوا ہے۔ اور یہ سمجھ کر ان کو یہ شبہ ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام کو نعوذ باللہ تردد تھا۔

کارِ پاکاں را قیاس از خود مگیر　　　گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

(یعنی بزرگوں کے افعال کو اپنے اوپر قیاس مت کرو گرچہ ظاہر میں دونوں فعل یکساں ہیں جس طرح لکھنے میں شیر و شیر یکساں ہیں)

حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو تردد نہ تھا کہ انبیاء میں اس کا احتمال ہی نہیں بعض اہل ظاہر اس کے قائل ہوئے ہیں کہ گو تردد نہ تھا مگر اس وقت بیٹے میں باپ سے زیادہ استقلال تھا جیسا کہ ان کے سوال **ماذا تری** (تمہاری کیا رائے ہے) میں اور ان کے جواب **افعل ماتومر** (وہی کیجئے جس کا آپ کو حکم ہوا) میں موازنہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے پھر اس تفاوت کا ایک نکتہ بیان کیا جو عوام کو پسند بھی آئے گا۔ مگر ابراہیم علیہ السلام کی اس میں تصریح تنقیص ہے۔

وہ نکتہ یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم پہلے ابراہیم علیہ السلام کے بدن میں تھا اس کی وہ برکت تھی کہ ابراہیم علیہ السلام میں کس قدر استقلال تھا کہ آگ میں ڈالے گئے اور مضطرب نہ ہوئے۔ جب اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تو وہ نور ان میں منتقل ہو گیا اس واسطے وہ اسی درجہ میں مستقل المزاج ہو گئے تھے۔ مگر اس توجیہ سے میرا تو رونگٹا کھڑا ہوتا ہے کیا توجیہ کی ہے کہ اتنے بڑے پیغمبر کی جناب میں گستاخی کی بھی پرواہ نہ کی۔ بس ایسی توجیہ رہنے دیجئے

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است　　　بآب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روئے زیبا را

(یعنی جمال محبوب ہمارے عشق وعرفان ناتمام سے مستغنی ہے۔ جس طرح زیبا صورت کو رنگ وروپ خط وخال کی احتیاج نہیں۔)

ناتمام اس معنی کر کہ اس میں تنقیص ہے ابراہیم علیہ السلام کی نور محمدی کے جدا ہو جانے کے بعد غیر مستقل ہو جانا محض جزاف (تخمینی) اور رجم بالغیب ہے۔ غور کرو تو اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی گستاخی ہے کیونکہ آپ کا وہ نور ایسا نہیں جس کا اثر زائل ہو جاوے۔ آگ تنور کے اندر جلائی جاتی ہے تو ایک گھنٹہ تک تنور اس کے اثر سے گرم رہتا ہے تو کیا وہ نور اتنا بھی نہ ہو گا کہ اسکے منتقل ہونے کے بعد

ابداً آباد تک اس کا اثر رہے۔ یہ تفاوت ہی نہیں جو ان جزافات کے ماننے کی ضرورت پڑے۔

اصل یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اسماعیل علیہ السلام کے صرف پدر مشفق اور مربی شفیق ہی نہ تھے بلکہ وہ شیخ بھی تھے۔ سو شیخ ہونے کی حیثیت سے ان کو ان کے استقلال کا امتحان مقصود تھا۔ اس واسطے فرمایا فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی (تم بھی سوچ لو کہ تمہاری کیا رائے ہے) مگر وہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے کہ فرماتے ہیں:

یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ (اے باپ آپ وہی کیجئے جس کا آپ کو حکم ہوا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ آپ مجھ کو سہار کرنے والوں میں سے دیکھیں گے) اور کیا ٹھکانا ان کے عرفان کا اتنا بڑا توکل کہ اپنی قوت پر نظر نہیں یہاں بھی کہتے ہیں ان شاء اللہ کہ اگر خدا کو منظور ہوا پس یہی تو کمال ہے۔ ایسے ہی بیٹے کی نسبت کہتے ہیں۔

شاباش آں صدف گر چناں پرورد گہر   آباد از و کرم و ابنا عزیز تر

(یعنی اس صدف کو آفرین جس نے ایسے موتی کو پرورش کیا۔ ابا اس سے مکرم اور لڑکا عزیز ہے) تو یہ تھی اس کی اصل چنانچہ اسماعیل علیہ السلام راضی ہو گئے۔ ابراہیم علیہ السلام نے چھری ہاتھ میں لے کر ذبح کے لئے لٹایا۔ اسماعیل علیہ السلام کا یہ استقلال کمال میں ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ نہیں۔ بڑا کمال تو ابراہیم علیہ السلام کا ہے کیونکہ خودکشی کرتے تو بہتوں کو دیکھا ہوگا یا کم از کم سنا ہوگا مگر فرزند کشی کون کر سکتا ہے۔ بھلا باپ سے ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے بیٹے کے گلے پر چھری پھیر دے۔ **والنادر کالمعدوم** (نادر معدوم کی مثال ہے) اب بتلایئے استقلال کس کا بڑھا ہوا ہے۔ ایک محتمل عبارت فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی (تم بھی سوچ لو کہ تمہاری کیا رائے ہے) سے یہ سمجھ لینا کہ ابراہیم علیہ السلام میں استقلال کم تھا کتنی بڑی غلطی ہے اگر نور محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے جدا ہو جانے سے وہ غیر مستقل ہو گئے تھے تو اچھا پھر وہ چھری چلانے کے وقت مستقل کیونکر ہو گئے؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نور کے برکات تو اس قدر غیر محدود ہیں کہ وہ مفارقت بدن ابراہیمی کے بعد ویسا ہی نور بخش دیا تھا جیسا کہ مفارقت ناسوت کے بعد بھی ناسوت کے لئے نور بخش ہو رہا ہے۔

جن انوار کا مشاہدہ آپ کر رہے ہیں اس پر ایک لطیفہ یاد آیا جس میں اس منوریت ناسوت سے ایک دوسرے مذہب کے شخص نے ایک لطیف استدلال کیا تھا۔ وہ قصہ یہ تھا کہ ایک مرتبہ اکبر بادشاہ کی مجلس میں رات کو دفعۃً ساری شمعیں گل ہو گئیں اور مجلس میں بالکل اندھیرا ہو گیا گو یہ بادشاہ دہری سا تھا مگر اپنے کو مسلمان کہتا تھا۔ اس اندھیرے کو دیکھ کر قبر کا اندھیرا یاد آ گیا۔ طبیعت بہت پریشان ہوئی۔ حکم دیا کہ بیربل کو بلاؤ۔ بیربل حاضر ہوا اس سے اپنی پریشانی بیان کی اس نے تسلی کے لئے ایک عجیب نکتہ بیان کیا

الفضل ما شهدت به الاعداء

(فضیلت وہی ہے جس کی دشمن بھی شہادت دے دیں)

کہتا ہے کہ حضور اس کا ہرگز غم نہ کریں۔ مسلمان کی قبر میں اندھیرا ہوتا ہی نہیں کیونکہ آپ امتی ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جب تک آپ اس عالم میں رہے یہاں روشنی رہی تمام عالم منور رہا جس کا اثر اب تک باقی ہے۔ جب سے عالم قبر میں تشریف لے گئے وہاں بھی آپ کا نور پھیل گیا جس سے مسلمانوں کی سب قبریں منور ہیں۔

تو مسلمانوں کے لئے نہ یہاں اندھیرا ہے نہ وہاں۔ اکبر بہت خوش ہوا فوراً حکم ہوا کہ بیربل کو انعام دیا جائے۔ بہرحال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بڑا قوی نور ہے اور ہم اس کے ثابت کرنے کے لئے اس نکتہ کے محتاج نہ تھے مگر لطیفے کے طور پر ذکر کر دیا۔ بہرحال یہ ثابت ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے تو اپنی طرف سے بیٹے کو ذبح کیا تھا پھر خواہ ذبح کوئی چیز ہو گئی۔

روح حج وقربانی

تو اصل قربانی کی بیٹے کو ذبح کرنا ہے کہ جو اپنے ذبح سے بھی اشد ہے۔ اور یہ قاعدہ عقلیہ ہے کہ اشد اخف کو متضمن ہوتا ہے تو روح قربانی کی اپنا فدا کرنا اور اپنی قربانی کرنا ٹھہرا۔ جس کی نسبت دوسری جگہ ارشاد ہے کہ اگر ہم یہ فرض کر دیتے کہ:

اَنِ اقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْهُمْ

خودکشی کیا کرو یا شہر بدر ہو جایا کرو تو بہت کم لوگ کرتے اس سے معلوم ہوا کہ خودکشی ایسی چیز ہے کہ اس میں مشروعیت کی صلاحیت تھی چنانچہ ابراہیم علیہ السلام کے وقت مشروع ہوئی اور انہوں نے اس کو کیا مگر حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ فوراً ہی ایک عنایت کا ظہور ہوا۔ چنانچہ فرماتے ہیں وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ (ہم نے ایک بڑا ذبیحہ اس کے عوض میں دیا)

ذبح عظیم کی تفسیر میں مفسرین نے لکھا ہے کہ فوراً ایک دنبہ وہاں پر رکھ دیا گیا اور ابراہیم علیہ السلام نے اسے ذبح کر دیا۔ تو ابراہیم علیہ السلام کے دین میں قربانی مشروع ہوئی تھی۔ انہیں کے موافقت میں اس دین میں بھی مشروع ہوئی۔ تو اصل قربانی کی اپنے نفس کو فدا کر دینا ہے اور اعتبار اصل کا ہوا کرتا ہے۔ اب تو اس اصل کے اعتبار سے قربانی نری عبادت بدنیہ ہوئی اب مالیت کا پہلو مغلوب ہو گیا اور بدنیہ کا پہلو غالب ہو گیا۔ بہرحال یہ بھی مرکب ہوئی تو حج وقربانی کے درمیان میں ایک مابہ الاشتراک (وہ چیز جس کی وجہ سے اشتراک ہے) یہ بھی نکل آیا اور اس وجہ سے تشارک کے بیان کے ضمن میں اتفاقاً قربانی کی روح بھی مذکور ہو گئی جس کو بعد میں ذکر کرنے کا ارادہ تھا اور چونکہ ابھی متعدد وجوہ

سے دونوں میں اشتراک ثابت ہو چکا ہے اسی مناسبت سے سمجھ لینا چاہیے کہ یہی فدا وفنا روح حج کی بھی ہے۔ تو گویا یہ دونوں عمل ایک جان دو قالب ہوئے تو روح دونوں کی کیا ہوئی اپنے کو فدا کرنا حق تعالیٰ کی راہ میں اہل ظاہر اس کو فدا کہتے ہیں۔ اور اہل معرفت اپنی اصطلاح میں فنا سے تعبیر کرتے ہیں۔

اور انہوں نے اس پر ایک ثمرہ بھی مرتب کیا ہے جس کو وہ بقا کہتے ہیں اور یہی بقاء انفاق مالی کی روح ہے جو انفاق سے روح حج وروح قربانی کے ساتھ ذکر میں آ گئی۔

حج وقربانی میں فنائیت

اب یہ بات رہی کہ فنا کی حقیقت کیا ہے اور حج وقربانی میں فنا کیسے ہے سو صوفیہ کے نزدیک فنا کی حقیقت یہ ہے کہ اپنے ارادات اپنی خواہشیں اور ہوائے نفسانی بالکل ترک کردے اس واسطے کہ حیات کے آثار میں سے یہی چیزیں تو ہیں حی اور غیر حی میں صرف یہی فرق ہے کہ حی احساس متحرک بالا رادہ (ارادہ سے حرکت کرنے والا) ہے سو جب اپنا ارادہ دوسرے کے تابع کر دیا تو گو لغۃً وہ صاحب ارادہ ہے مگر اس معنی کر یہ غیر متحرک بالا رادہ ہے کہ اس کو حرکت جب ہوگی جب دوسرے کا ارادہ دیکھ لے گا تو اب وہ متحرک بالا رادہ نہیں رہا۔ مثلاً ہمارا ارادہ دوڑ کا ہوا۔ سوچا کہ حق تعالیٰ کا ارادہ تشریعیہ ہمارے دوڑنے کے متعلق ہے یا نہیں۔ حق تعالیٰ کا ارادہ دو قسم کا ہے ایک تشریعیہ دوسرے تکوینیہ۔ تکوینیہ تو وہ ہے کہ اس سے کسی وقت اور کوئی شے خالی نہیں۔ خیر وشر سب اسی کی ایجاد سے ہوتا ہے۔ سو اس مرتبہ میں تو کوئی بھی صاحب ارادہ نہیں مگر اس سے یہاں اس لئے بحث نہیں کہ اس کا تابع ہونا امر اضطراری ہے اختیاری ومطلوب وکمال نہیں۔ اور ایک ارادہ تشریعیہ ہے کہ عبد سے اس کے موافق بھی فعل ہو سکتا ہے اور خلاف بھی۔

اور یہاں سے ایک شبہ بھی حل ہو گیا کہ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ (اللہ تعالیٰ کو تمہارے ساتھ آسانی کرنا منظور ہے تمہارے ساتھ دشواری منظور نہیں)

شبہ یہ ہے کہ بہت سی دشواریاں بھی پیش آتی ہیں اگر یہ عسر بالا رادہ (دشواری) حق ہے تو نص مذکور کے خلاف ہے کہ مثلاً وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَايْءٍ اِنِّيْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّا اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ (یعنی آپ کسی کام کی نسبت یوں نہ کہا کیجئے کہ میں اس کو کل کروں گا مگر خدا کے چاہنے کو ملا دیا کیجئے)

جواب یہ ہے کہ اس آیت میں یـــریـد سے مراد ارادۂ تشریعیہ ہے یعنی حق تعالیٰ نہیں چاہتے کہ مشکل مشکل احکام مشروع کریں بلکہ آسان آسان احکام مشروع کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ کہیں کوئی حکم شریعت کا مشکل بتلا تو دو۔ کہیں نہیں۔ بہر حال یہ مراد ہے ارادہ سے۔ سو مادہ مذکور سے اس پر نقص لازم نہیں آیا اور اس ارادہ تشریعیہ کا اتباع کمال اور مطلوب ہے۔ مثلاً ہم نے جس وقت اٹھنے کا

ارادہ کیا تو ہم نے شریعت سے پوچھا۔ اور معلوم ہوا کہ ارادہ تشریعیہ اس کے متعلق ہے تب اٹھیں گے۔ اسی طرح کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا چاہا تو شریعت سے پوچھا ھل یجوز ام لا (کیا جائز ہے یا نہیں) جواب ملا لا یجوز (نہیں جائز (فوراً آنکھ نیچی کر لی۔ تو جب اپنا ارادہ کیا تھا مگر اس پر عمل بغیر اجازت کے نہیں ہوا تو وہ متحرک بالارادہ کیا ہوا تو ثابت ہو گیا کہ متحرک بالارادہ نہیں ہے۔

رہا حس سو غلبہ اطاعت شریعت سے جس میں ارادہ کا فنا مذکور ہوا۔ ہے جس میں بھی ایک انقلاب ہوتا ہے جس سے حس سابق کا کالباطل وکالزائل (مثل باطل کے اور مثل زائل کے) ہو جاتی ہے۔

اور صورت اس کی یہ ہے کہ ہر چند کہ اصل میں اعمال تابع علوم کے ہوتے ہیں لیکن بعد رسوخ ملکہ کے علوم تابع اعمال کے ہو جاتے ہیں۔ یعنی اعمال کے تمرن (عادی ہونے) سے ادراکات میں بھی ایک انقلاب عظیم واقع ہو جاتا ہے۔ مثلاً پہلے نماز پڑھنا مشکل معلوم ہوتا تھا آج آسان معلوم ہوتا ہے تو یہ تفاوت ادراک میں ہوا اور حس کے اندر تفاوت ہونے کا یہ مطلب ہے یہ نہیں کہ سوئی چبھے اور معلوم نہ ہو۔ پس ارادہ اور حس دونوں اس طرح سے فنا ہو گئے اس واسطے حساس متحرک بالارادہ نہ رہا۔ پس یہ شخص گو حساجی ہے مگر حکماً میت ہے جس طرح عوض مفلوج (جو فالج میں مبتلا ہو) کو حکماً مردہ کہتے ہیں گو حقیقت میں وہ مردہ نہیں اس کے ساتھ تعلق حیات کا ہے۔ ورنہ یہ عضو سڑ گل کیوں نہیں جاتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس میں حیات ہے مگر کان لم یکن (گویا کہ ہے نہیں) محاورہ میں بھی بولتے ہیں کہ کھال مر گئی۔ تو صوفیہ کا مطلب یہ نہیں کہ حیات کا تعلق بالکل نہیں رہا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس شخص پر بہت سے آثار میت کے مرتب ہوتے ہیں۔

پھر آگے اس کے مراتب ہیں فنائے علمی، فنائے حسی، سو ان سے اس وقت بحث نہیں۔ پس یہ حقیقت فنا کی ہے سو یہ بات حج و قربانی میں مختلف وجوہ سے پائی جاتی ہے۔ قربانی میں تو ظاہر ہے افناء (فنا کرنا) حس تو یہ اس طرح کہ یہ اصل میں افناء بدن تھا جس کے لوازم میں سے افناء حس بھی ہے حق تعالیٰ نے افناء بدن کے عوض بدنہ (مینڈھے کو ذبح کرنا) کو شروع کر دیا اور افناء ارادہ (ارادہ کا فنا کرنا) اس طرح کہ باوجود یہ کہ نفس کے اندر مادہ ترحم کا تھا مگر اس کو حکم تشریعی سے مغلوب کر کے ذبح کرتا ہے اور اس طرف کے اس ارادہ تشریعیہ کو اتنا غالب کیا کہ ارادہ متعلقہ بالایجاب کو تو کیا ارادہ متعلقہ بالاستحباب کو بھی پورا کرتا ہے تو گویا افناء ہوا اپنے ارادہ کا اور احساس کا۔

اور حج میں یہ معنی بظاہر خفی ہیں مگر بغور جلی (ظاہر) بلکہ اجلی (زیادہ ظاہر) ہیں۔ اس میں تو اول سے آخر تک افناء ہی افناء ہے اور شروع سے آخر تک مردہ ہی مردہ ہے کہ سر نہیں اٹھا سکتا۔ اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ تمام جذبات فنا کر دیئے کہ خوشبو مت لگاؤ۔ سلے ہوئے کپڑے مت پہنو۔ بیوی سے دل مت بہلاؤ۔

شکار مت کرو۔ نہاؤ مت۔ میل کچیل مت صاف کرو۔ خوشبودار کھانا مت کھاؤ۔ ایک بات ہو تو کہا جائے۔

اور اس میں فنا کے معنی ایک مقدمہ سے بہت سہولت سے سمجھ میں آ جائیں گے ارادہ موقوف ہے تصور غایت پر۔ اور غایت کا تصور عقل سے ہوتا ہے تو اول ادراک بالعقل (عقل سے جاننا) ہوتا ہے اس کے بعد پھر قوت ارادیہ حرکت دیتی ہے اعصاب کو۔

جب یہ مقدمہ سمجھ میں آ گیا تو اب سمجھئے کہ اگر کسی جگہ ایسی حرکت کا ارادہ ہو جو عقل کے موافق نہیں تو اس کو یوں کہیں گے کہ یہ کسی دوسرے ارادہ کے تابع ہے۔ بشرطیکہ جنون نہ ہو۔ کیونکہ اگر اپنا ارادہ ہوتا تو وہ تابع ہوتا اپنی عقل کے ادراک کے اور یہاں اپنی عقل نے اس کی موافقت نہیں کی۔ پس ضرور وہ فعل دوسرے کے ارادہ سے ہوا۔ تو یہاں وہ معنی فنا کے زیادہ تام ہیں وہاں تو ایک ہی بات تھی کہ خلاف ترحم تھا۔ لیکن پھر بھی عقل فتویٰ دیتی ہے کہ کھانے کھلانے کی ضرورت سے ذبح جائز ہے تو وہاں استحسان عقلی بھی ہے۔ چنانچہ جن لوگوں نے ذبح کو عقلاً مستحسن ثابت کرنا چاہا ہے انہوں نے اس طرح استدلال بھی کیا ہے کہ اگر ذبح نہ کریں تو جانور چندروز کے بعد بوڑھا ہو جائے گا اور پھر بالکل معذور ہو کر مرے گا۔ اس سے انسان کو بھی تکلیف ہوگی کہ وہ تھا تو مخدوم مگر اب جانور کے بڑھاپے اور معذوری میں اس کی خدمت کرنی پڑے گی اور یہ بالکل قلب موضوع ہے۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ وہ وقت آنے سے پہلے ہی اس کو کام میں لے آؤ۔ تاکہ انسان خادمیت سے اور جانور بڑھاپے اور معذوری کی تکلیف سے محفوظ رہے تو انہوں نے اس طرح استحسان عقلی ثابت کیا۔[1] جزاھم اللہ تعالیٰ (اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے) مگر حج میں عجیب پیچ ہے کہ کوئی اس پر آج تک قادر نہیں ہوا۔ کہ اس کو عقل کیموافق ثابت کر سکے۔ پس یہاں پورا پورا افنا ہے کہ باوجود مزاحمت عقل کے پھر اس کا ارادہ کیا اور اپنے کو بالکل دوسرے کے ارادے کے تابع کر دیا۔

؎ رشتہ در گردنم افگندہ دوست — می برد ہرجا کہ خاطر خواہ اوست

محبوب حقیقی نے یہ حرکات پیدا کر دیئے ہیں جس طرف چاہتے ہیں متحرک کر دیتے ہیں)

عاشقانہ افعال

سنئے حج میں افعال کیا ہیں کہ سارے عقل کیخلاف ہیں۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ اچھے خاصے اپنے کاروبار میں لگے ہوئے اپنے اہل وعیال میں آرام سے بیٹھے ہوئے ایک کوٹھڑی اور جنگل کا قصد کر کے جاؤ اگر وہاں اللہ میاں ہوتے تو ایک بات بھی تھی۔ مگر وہ تو مکان سے منزہ ہیں تو پھر کیوں ایسا کرتے ہو۔ سو آج تک عقل چکر میں ہے۔

میرے بھائی سے ایک آریہ نے کہا کہ ہمارے مذہب میں یہ خوبی ہے کہ اس کی ہر تعلیم عقل کے موافق ہے اور تمہارے یہاں یہ بات نہیں۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارا مذہب صحیح ہے۔ بھائی نے کہا یہی دلیل ہے اس کی کہ ہمارا مذہب سماوی ہے اور تمہارا ارضی۔ دیکھو بہت سی باتیں اپنے خانگی

انتظام کے متعلق ایسی ہوتی ہیں کہ ہم تم تو سمجھتے ہیں مگر ہمارے نوکر نہیں سمجھتے۔ اس واسطے کہ ہماری عقل ان کی عقل سے بالاتر ہے۔ اسی طرح خدائی احکام کی یہی علامت ہے کہ کہیں ہماری سمجھ میں آویں اور کہیں نہ سمجھ میں آویں۔ اور جب تمہاری سب مذہبی تعلیمات عقل کیموافق ہیں تو معلوم ہوا تمہیں جیسوں نے اس کو اپنی عقل وذہانت سے گھڑ لیا ہے آسمانی نہیں ہے واقعی خوب لطیفہ ہے۔

غرض حج میں سب سے اول تو عقل کو دور کر دیا گیا ہے۔ پہلے ہماری سواری اس پر تھی مگر یہ رہبری کہاں تک کر سکتی تھی۔ آخر ایک حد پر پہنچ کر اس سواری کو چھوڑ دیا۔ عقل کی مثال بالکل گھوڑے کی سی ہے کہ ایک پہاڑ ہے۔ بالکل سیدھا چلا گیا ہے نہ ڈھلوان ہے کہ سواری پر جا سکیں نہ کہیں پاؤں رکھنے کی جگہ ہے تو گھوڑے پر وہیں تک جا سکتے ہیں جہاں تک میدان ہے آگے جہاں سے پہاڑ شروع ہوتا ہے وہاں گھوڑا نہیں جا سکتا اب کاہے کی ضرورت ہے۔ یا تو غبارہ کام دے سکتا ہے یا کمند کام دے سکتی ہے۔ پس آپ کی عقل مرکب ہے جہاں پہاڑ آیا رک گئی۔ تو احکام حج مشابہ پہاڑ کے ہیں عقل بے چاری ان میں کہاں عبور کر سکتی ہے۔ چنانچہ عقل چکر میں ہے کہ اس کوٹھڑی تک اس طرح جانے کی کیا ضرورت ہے اس کے بعد عرفات ایک میدان ہے وہاں جانے سے کیا فائدہ۔ پھر سات کنکریاں لے کر نشانوں پر مارنا یہ بھی خلاف عقل ہے۔ شیطان وہاں بیٹھا نہیں جسے مارتے ہو۔

ایک بزرگ سہارنپور کے رہنے والے کہتے تھے کہ ہم نے ایک شخص کو دیکھا کہ جمرہ پر دھوڑی کا ایک بڑا سا جوتا مار رہا تھا۔ اور شیطان کو خطاب کر کے یہ کہتا جاتا تھا ارے کمبخت اے خبیث تو نے فلانے دن فلاں حرکت کرائی تھی۔ جب اسے ایک بات یاد آئی ادھر ایک جوتا دیا۔ حالانکہ یہ حرکت بھی شیطان ہی کی تھی کسی نے کہا ارے یہ کیا جہالت ہے تو کہنے لگا معلوم ہوتا ہے کہ تم اس کے طرف دار ہو۔ ادھر میری طرف آؤ تو تمہیں بھی بتا دوں۔ پھر بھلا کہنے کی کسی کو کیا غرض تھی۔ بعض بعض سپاہیوں کو میں نے سنا ہے کہ گولی مارتے ہیں۔ اب وہاں شیطان کہاں ہے یہ دوسری بات ہے کہ اسے اس سے تکلیف ہوتی ہے تو جب ان کاموں کے ارادوں سے چلے تو اول تو یہ چلنا ہی خلاف عقل تھا مگر اس شخص نے عقل کو گردن پکڑ کے گھر پر باندھ دیا اور چل کھڑا ہوا۔ اب عقلاء نے ملامت شروع کی کہاں جاتے ہو بیچ میں اتنا بڑا سمندر حائل ہے۔

ایک شخص بنارس کے رہنے والے حج کے ارادے سے بمبئی آئے سمندر کو دیکھا تو کہنے لگے ارے بھائی اس میں سے سفر ہوگا اس میں سے جانا تو بہت دشوار ہے بس لوٹ گئے۔ واقعی ہے بھی بحر ناپیدا کنار۔ تاجروں کا کیا ہے اگر یہ ہمت کریں تو کیا کمال وہاں تو نقد ملتا ہے۔ کمال حجاج کا ہے کہ ادھار ہے مگر پھر بھی ہمت کرتے ہیں۔ ہر طرح کی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ اتنا بڑا سمندر پھر بڑے بڑے پہاڑ، لق ودق میدان عبور کر کے وہاں پہنچنا پڑتا ہے۔

زبان کا مسئلہ

پھر وہاں کی زبان اجنبی نہ یہ کسی کی سمجھیں نہ کوئی ان کے سمجھے۔ ہمارے ایک عزیز تھے ان سے بدوی نے روٹی مانگی۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ جب آگے پہاڑ آیا تو اس نے وزن برابر کرنے کے لئے ان سے کہا گدام گدام (قدام قدام) یعنی آگے بڑھ کے بیٹھو۔ یہ سمجھے کہ روٹی نہ دینے سے ناخوش ہو گیا ہے۔ اس لئے مجھے گالیاں دے رہا ہے۔ اور گڈام گڈام کہہ رہا ہے یہ سمجھ کر اس سے لڑنے لگے جب اس نے اشارے سے کہا تو سمجھ گئے پھر آگے بڑھ کے بیٹھے۔

اور لیجئے ایک حاجی کو پیشاب لگا انہوں نے کہا موتوں تو بدوی سمجھا مجھے کوستا ہے۔ کہ موتو یعنی مر جاؤ اس نے کہا لاموت یعنی میں نہیں مروں گا۔ یہ سمجھے کہ کہتا ہے مت موتو۔ یہ کہتے ہیں موتوں وہ کہتا ہے لاموت بڑی دیر یہی گفتگو رہی ایک مصیبت پڑ گئی۔

ایک دیگچی کسی بڑھیا نے پائی تھی۔ پوچھتی پھرتی تھی کہ کس کی ہے ایک بدوی کی تھی اس نے کہا ہکی ہکی (حقی حقی) یعنی میری ہے۔ بڑھیا یہ سمجھی کہ کہتا ہے تو نے اس میں ہگا ہے۔ تو کیا کہتی ہے۔ اللہ کی قسم میں نے اس میں کبھی نہیں ہگا۔ تو غرض یہ لطف اور یہ تماشے ہوتے ہیں لڑائیاں بھی ہوتی ہیں یہ نہیں کہ وہ لوگ صرف عربی ہی بولیں اردو بھی بولتے ہیں مگر وہ بھی عجیب' سنئے' جب شغدف اونٹ پر رکھتے ہیں تو اونٹ پر رکھنے کے لئے دو آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک اونٹ والا ہوتا ہے دوسرا وہ حاجی جس نے کرایہ کیا ہے۔ شغدف کے اٹھوانے کے واسطے کہنا تو یہ چاہیے آگے سے اٹھا مگر کہتے یہ ہیں کہ آگے بیٹو آگے بیٹو۔ بعضے لوگ بیٹھنے لگتے ہیں۔ اس پر خوب لڑائی ہوتی ہے۔

اور لیجئے مردوں کو بی بی کہہ کر پکارتے ہیں۔ بازار والے کہتے ہیں۔ بی بی روتی (روٹی) بی بی روٹی) اور بی بی کی سمجھ میں نہ روتی آتی ہے نہ ہنسی۔ جیسی یہ اردو بولتے ہیں ہمارے ہندوستانی عربی بھی بولتے ہیں۔

ہمارے ایک رفیق ساری بات تو اردو میں کہہ دیتے۔ اور سب کے اخیر میں ہذا بڑھا دیتے۔ ہمارے حضرت حاجی صاحب کے پوتے مقصود نام تھا وہاں ان کو عربی سکھلائی گئی بتایا گیا کہ جب کسی سودے کا نرخ دریافت کرتے ہیں تو کہتے ہیں یاعم ھذابکم (اے چچا اس کی کیا قیمت ہے) اب وہ بیچارے رٹ رہے ہیں یاد کر رہے ہیں۔ اب بازار گئے وہاں اس سے پوچھتے ہیں یا عم انت بکم (اے چچا تمہاری کیا قیمت ہے) اب لوگ ہنستے ہیں سمجھ گئے کہ ھذا کی جگہ انت کہہ رہے ہیں غرض بڑی دل لگیاں رہتی ہیں گھونسے چلتے ہیں لڑائیاں ہوتی ہیں۔ اس لئے عقلاء کہتے ہیں ایسی جگہ کہاں چلے۔

کیفیت آغاز سفر

جب میں والد صاحب مرحوم کے ساتھ حج کو چلا تو چھوٹی عمر تھی ایک خط میرے پاس آیا کہ اخبار کی

خبر ہے کہ سمندر میں تلاطم وطوفان ہے اس حالت میں کہاں جاتے ہو میں نے جواب میں لکھا کہ

؎ چہ غم دیوار امت را کہ دارد چونتو پشتیبان
چہ پاک از موج بحراں را کہ باشد نوح کشتیبان

(امتیوں کو کیا غم ہے جب کہ آپؐ جیسا ان کا معاون ومددگار ہے سمندر کے طوفان سے اس کو کیا خوف جس کا کشتیبان نوحؑ ہے)

اور اس قدر دل بے فکر تھا کہ نہ مرنے کا غم نہ تکلیف کا اندیشہ۔ دل کو عجیب اطمینان تھا غازی آباد کے اسٹیشن پر ایک تحصیلدار والد صاحب کو ملے کہنے لگے کہاں چلے بڑا طوفان ہے والد صاحب نے فرمایا معاف کیجئے اور بلسان حال یہ کہا۔

عذل العواذل حول قلبی التائه وهو الا حبة منه فی سودائه

(ملامت گروں کی ملامت تو دل کے چاروں طرف رہتی ہے اور دوستوں کی محبت سودائے قلب ہے)

تجربہ کی بات ہے کہ جب ارادہ کرلیا تو پھر یہ حالت ہوتی ہے۔

نساز و عشق را کنج سلامت خوشا رسوائی کوئے ملامت

(یعنی عشق کو گوشہ سلامتی موافق نہیں اس کے مناسب کوچہ ملامت کی رسوائی بہت اچھی ہے)

کچھ بھی پرواہ نہیں۔

صورۃ عشاق

یہ تو سفر کا وقت تھا۔ آگے جب احرام کا وقت آیا عجیب گت بنائی گئی۔ نواب صاحب تھے نفیس کپڑے پہنے ہوئے تھے حکم ہوا اتاروان کو یہ کیا گدھے کا سا پالان لادے ہوئے ہو۔ عشاق کا لباس پہنو

؎ لنگے زیرو لنگے بالا نے غم و دزد نے غم کالا

(ایک لنگی اوپر ایک نیچے نہ چور کا غم نہ مال ومتاع کا)

سب ایک شکل کے ہو جاؤ۔ اب معلوم نہیں ہوتا کہ کون والی ملک ہے کون نواب ہے کون رئیس ہے۔ اب کسی نے سفید چادر سفید ہی آزار رکھی کسی نے میلا ہونے کے خیال سے زرد مٹی میں رنگ لیا۔ غرض عمامہ تاج، نکٹائی، ٹاک کٹائی کچھ بھی نہیں۔ وہاں اس کی گنجائش ہی نہیں اچھا احرام بندھ گیا۔ اب سر مت ڈھکو۔ سلا ہوا کپڑا مت پہنو خوشبو کا استعمال مت کرو۔ جوں مت مارو بال مت منڈواؤ۔ ناخن مت کتراؤ۔ غرض ایک عجیب شکل بن جاتی ہے جس سے یہ از خود رفتہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر چہ از خود رفتہ نہیں مگر کیا رحمت ہے کہ من تشبه بقوم فهو منهم (مسند احمد ۲/۵۰) (یعنی جو شخص کسی قوم کے مشابہ ہوا اس کا اسی میں شمار

کیا جائے گا۔ ہم نے شمار کرلیا ہم نے اچھوں کی شکل بنانے والوں کو بھی اچھوں ہی میں شمار کرتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں فرعون کے طلبیدہ جادوگر جس وقت آئے تو وہ موسیٰ علیہ السلام کی وضع بنا کر آئے تھے۔ پہلے تو انہوں نے مقابلہ کیا اس کے بعد سب سجدہ میں گر پڑے اور مسلمان ہو گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے پوچھا۔ اے اللہ جو لوگ مقابلہ کیلئے آئے تھے ان پر یہ رحمت! ارشاد ہوا وہ تمہاری شکل بنا کر آئے تھے۔ ہماری رحمت نے گوارا نہ کیا کہ جو ہمارے محبوب کی شکل بنا کر آئے وہ محروم واپس جائے۔

حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ اپنے شیخ کی پالکی کے ساتھ ہوئے جا رہے تھے راستہ میں مسجد میں چند قلندر مکاری سے گردن جھکائے بیٹھے تھے۔ ان میں ایک پیر بھی تھے۔ شیخ نے انہیں اس حالت میں بتلا دیکھ کر فرمایا۔ مرزا اگر شیاطین نہ دیکھے ہوں تو دیکھ لو۔ پالکی چلی گئی یہ ٹھہر گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد یہ بھی پہنچے۔ پوچھا مرزا کہاں رہ گئے تھے۔ عرض کیا حضور جس وقت چلے گئے تو میں نے یہ سوچا کہ یہ سب کے سب خاص بزرگوں کی وضع میں ہیں اور ان پر حضور کی نظر بھی پڑی ہے۔ گو نظر عتاب ہی سہی تو جنہوں نے بزرگوں کی شکل بنائی ہے اور ان پر حضور کی نظر بھی پڑی ہے وہ محروم نہ رہیں۔ میں ان کے قلوب میں القائے نسبت کرنے کے لئے ٹھہر گیا تھا۔ سب کے سب صاحب نسبت ہو گئے۔ اور آ کر شیخ سے بیعت ہوئے تو اللہ والوں کی مشابہت بھی بیکار نہیں جاتی۔

بدوضع کا اثر

اسی طرح بدوضع اور بدچلن لوگوں کی وضع بھی ضرور اثر کرتی ہے آج کہتے ہیں کہ کیا ہم کوٹ پتلون بوٹ سوٹ پہننے سے نصرانی ہو جائیں گے۔ میں نے ایک مرتبہ گورکھپور میں وعظ میں کہا کہ تم گھر میں جا کر بیگم صاحبہ کا جوڑا لے کر پہنو کڑے بھی پہنو چھڑے بھی پہنو بالیاں بھی کانوں میں اٹکا لو کیونکہ سوراخ تو ہیں ہی نہیں جو پہنو گے اور وہی دوپٹہ اوڑھ کر تھوڑی دیر مجلس میں اجلاس کر لو۔ اگر کوئی کہے ہنسے بتائے کہ زنانہ لباس پہنے ہو تو کہو کیا زنانہ کپڑا پہننے سے عورت ہو جائیں گے۔ جب تم ایسا کرلو گے تو ہم جواز کا فتویٰ تو نہ دیں گے ہم تو دونوں کو ناجائز ہی کہیں گے۔ مگر تم کو کہنا چھوڑ دیں گے۔ اور اگر تم نے یہ نہ کیا۔

فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ أُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ

(سو اگر تم نے نہ کیا) اور ہرگز نہ کر سکو گے تو اس آگ سے ڈرو جو کفار کے لئے تیار ہے، یہ کیا بات ہے کہ زنانہ لباس تو نہیں پہنتے اور نصرانیوں کا لباس نہیں چھوڑتے۔ اسی دن اخبار میں چھپا کہ تشبہ کا مسئلہ آج بالکل صاف ہو گیا عجیب مہمل مذاق ہے کہ قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کو تو دلیل نہیں سمجھتے آج کل مثال کو دلیل سمجھتے ہیں۔ بہرحال اس کے ساتھ میعابروں کے ساتھ تشبہ کرنے کی خرابی بھی بیان ہو گئی۔

بیان یہ کررہا تھا کہ عشاق کی شکل ہی بنانے سے عشاق کی فہرست میں نامزد ہوجاتے ہیں مگر عقل کا کب فتویٰ ہے کہ یہ وضع اختیار کرو۔ اچھی خاصی شکل کو بگاڑو۔ آگے ہم نہایت متین تھے۔ احرام باندھتے ہی ساری متانت رخصت پہلے آہستہ بولتے تھے اب پکار کر کہو۔

لبیک اللھم لبیک لبیک لاشریک لک لبیک ان الحمد والنعمة لک والملک لاشریک لک

(اے اللہ میں حاضر ہوں حاضر ہوں آپکا کوئی شریک نہیں میں حاضر ہوں تمام حمد اور نعمت اور ملک آپ ہی کیلئے ہے آپکا کوئی شریک نہیں۔ نمازوں کے بعد کہو اوپر چڑھو تب کہو نیچا تر و تب کہو۔ غرض ہر تغیر حالت کے وقت کہو۔

عورت کا احرام وتلبیہ

سوائے عورت کے کہ اس کے لئے تلبیہ کا جہر نہیں کیونکہ اس کی آواز میں فتنہ ہے لباس بھی وہ نہیں اس واسطے کہ اس میں کشف عورت ہے۔ لیکن اس میں ایک جزو عقل کی رسائی سے آگے ہے کہ سر پر کپڑا اڈالنا تو فرض مگر منہ پر ڈالنا ناجائز۔ عورتیں یہ کرتی ہیں کہ خاص وضع کے پنکھے جو اسی لئے بنائے جاتے ہیں اور ان میں جالی بھی ہوتی ہے ماتھے پر لگالیتی ہیں تاکہ منہ پر بھی نہ لگے اور چہرہ بھی نہ کھلے۔

احکام حرم

یہ تو احرام ہوگیا آگے حرم میں پہنچے وہاں یہ حکم ہے کہ شکار مت کرو اگرچہ طواف وسعی کے بعد احرام کھل گیا۔ مگر اب بھی وحشی جانوروں کو مت مارو چاہے اس کو پال ہی لیا ہو مگر اس کا ذبح جائز نہیں فرمایئے یہ کون سے قانون عقلی کے مطابق ہے۔

حج کی طرف کشش

خلاصہ یہ کہ اول سے آخر تک ایک فعل بھی قانون عقلی کے مطابق نہیں مگر باوجود اس کے عجیب بات ہے کہ انسان کو حج کی طرف کشش اس قدر ہے کہ بیان نہیں ہوسکتا حالانکہ اس کی غایت مدرک بالعقل بھی نہیں بلکہ جن طاعات کی غایات مدرک بالعقل ہیں ان کی طرف اتنی کشش نہیں ہوتی۔ مثلاً نماز کہ اس کے باب میں ارشاد ہے۔ اِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ (وہ گراں ہے) پس اس کے پڑھنے میں اتنی کشش تو کیا ہوتی بلکہ بہتوں کو گرانی ہوتی ہے۔ مگر حج میں خدا جانے کیا جاذبہ غیبی ہے جو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کے بعد طواف کرو۔ سب پھیرے گھومو۔ اول کے تین پھیروں میں ذرا مٹک کر شانے ہلا ہلا کر پھدک پھدک کر چلو۔ بعضے شرما بھی جاتے ہیں۔ اب چاہے متین ہوں مگر سب کرتے ہیں اور اس

قدر شوق سے کرتے ہیں کہ بے اختیار رونا آتا ہے۔ وہاں جس وقت یہ کرتے ہیں چاہیے تو یہ تھا کہ ہنسی آوے مگر الٹا رونا آتا ہے اور وہ حالت ہوتی ہے کہ

؎ یارب چہ چشمہ ایست محبت کہ من ازاں یک قطرہ آب خوردم و دریا گریستم

(اے اللہ چشمہ محبت کیسا چشمہ ہے کہ اس کا میں نے ایک قطرہ پیا اور آنسوؤں کا ایک دریا بن گیا)

عجیب چیز ہے محبت کہ ایک قطرہ اس کا دریا سے بھی بڑھ گیا۔ تو یہ بات کیا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔

علی ہذا القیاس سعی کرو دو پہاڑیوں پر چڑھو اترو اور میلین اخضرین کے درمیان میں دوڑ و بچے دوڑا کرتے ہیں۔ خیر جنگل میں تو سب ایک طرح کے ہیں مرگ انبوہ جشنی دارد (مرگ انبوہ ایک جشن رکھتی ہے)

مگر سعی کے موقع پر تو بہت بڑا بازار ہے۔ تجار تجارت میں مصروف ہیں اور یہ بچوں کی سی حرکتیں کر رہے ہیں۔ ان کے درمیان علی الاعلان ملامت لے رہے ہیں۔ غرض یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں صفا سے مروہ پر اور مروہ سے صفا پر جاؤ آؤ۔ ابھی تک آہستہ چل رہے تھے میلین اخضرین دو نشان ہیں ان کے درمیان میں دوڑنے لگے ہیں یہ کیا ہوا کیا کسی نے مارا؟ بھاگتے کیوں ہو؟ بھاگتے بھاگتے میلین اخضرین سے گزر کر پھر آہستہ چلنے لگے ابھی اگر دوڑے تھے تو دوڑتے ہی رہے ہوتے۔ جب اس پہاڑ پر پہنچے پھر وہاں جاؤ جب اس پہاڑی پر پہنچے پھر یہاں آؤ۔ آخر یہ کیوں؟ ہمیں کیا معلوم کیوں؟

ایک بڑھیا کا قصہ یاد آیا سعی کرتی کرتی بیچاری جب تھک گئی تو مطوف سے کہنے لگی اجی مولوی جی چھوڑ دو معاف کردو۔ اب تو میں بہت تھک گئی۔ مولوی جی بیچارے کیا معاف کردیں وہ خود اسی میں مبتلا ہیں۔

غرض عجیب لطف ہے اور لیجئے اچھے خاصے بال بنے ہوئے ہیں انہیں منڈ واؤ سر کو خربزہ بنادیا۔ سر منڈا ہوا ہے۔ عجیب لطف ہے ان کے دل سے پوچھو کہ اسی میں باغ باغ ہیں پہلے جو اس پر ہنستا تھا آج وہ بھی ایسا ہی بنا ہوا ہے۔

وہی حالت ہے جو حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ پر ہنس کر حضرت مولانا جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ کی ہوگئی تھی۔ ایک جولاہہ شیخ کا مرید تھا۔ مولانا جلال الدین رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بھی جایا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ شیخ تھانیسر تشریف لے گئے وہ جولاہہ مولانا کے پاس گیا۔ انہوں نے کہا تمہارے پیر آئے ہیں جو ناچا کرتے ہیں اسے یہ فقرہ بہت ناگوار ہوا۔ شیخ سے جا کر کہا کہ فلاں شخص ایسا کہتے تھے۔ شیخ کو جلال آگیا۔ فرمایا کہ اب جانا تو کہہ دینا کہ وہ ناچا بھی کرتے ہیں اور نچایا بھی کرتے ہیں۔ یہ سنکر بڑا خوش ہوا اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور قصداً چھیڑا۔ حضرت کیا فرمایا تھا انہوں نے پھر فرمادیا اس نے عرض کیا"

''حضرت! وہ ناچا بھی کرتے ہیں اور نچایا بھی کرتے ہیں۔''

اس فقرہ کا سننا تھا کہ بس کھڑے ہو کر رقص کرنے لگے۔ اب کسی طرح سکون نہیں ہوتا۔ حضرت شیخ

کی خدمت میں حاضر ہوئے عرض کیا کہ خادم کو بھی بیعت کر لیجئے۔ چنانچہ مرید ہوئے اور اس مرتبہ کو پہنچے کہ شیخ کے ارشد الخلفاء میں سے ہوئے۔ ہمارے سلسلہ کے بزرگوں میں ہیں۔ تو شیخ نے تو ذرا سی دیر کے لئے ان کی یہ حالت بنائی تھی اور یہاں پر مدتوں کے لئے یہ حالت بنائی گئی ہے۔ یہ تو مکہ تک تھا۔

منیٰ کی حاضری۔

اس کے بعد پھر آٹھویں ذی الحجہ کو فجر کی نماز پڑھ کر منیٰ میں آیئے اس دن کو یوم الترویہ کہتے ہیں یہاں ظہر، عصر، مغرب، عشاء اور فجر کی نمازیں اپنے اپنے وقت میں پڑھیئے۔

وقوف عرفہ

اس کے بعد منیٰ سے نویں تاریخ کو یوم عرفہ کو عرفات میں آیئے۔ خدا کی قدرت ہے عرفات ایک میدان ہے مزدلفہ اسی کے متصل ہے ایک بالشت ادھر تک تو کچھ نہیں جہاں ایک بالشت ادھر قدم رکھا بس اسی وقت سے حاجی کہلانے لگے۔ الحج عرفة (سنن ترمذی ۸۸۹) یعنی وقوف عرفہ ہی حج ہے۔ اس معنی کر کہ یہ سارے فرائض میں سب سے بڑھا ہوا ہے اور فرائض کا تو بدل بھی ہے مگر وقوف عرفہ کا کوئی بدل نہیں جس سے یہ ترک ہوا اس کا حج ہی نہیں اور سوائے اس کے کوئی تدارک نہیں کہ آئندہ سال قضا کرے۔ اللہ اکبر حیرت ہے یہ ایک قدم ایسا ہے جس کے لئے لاکھوں جانیں، لاکھوں راحتیں لاکھوں روپے لاکھوں قدم فدا کرے تو وہ ہے یہ قدم۔

اسی طرح بزرگوں نے فرمایا ہے کہ وصول تو دفعۃً ہوتا ہے سیر میں البتہ زمانہ خرچ ہوتا ہے اور وصول میں تو کچھ دیر نہیں لگتی وہ تو آنی ہے اس میں زمانہ بھی نہیں خرچ ہوتا۔ اب وہاں پہنچ کر خوش ہیں بس رہو یہاں شام تک۔ ایک روزمرہ کا کام تھا نماز اس کی یوں کایا پلٹ دی کہ پہلے تو وقت پر پڑھا کرتے تھے۔ آج ظہر ہی کے وقت عصر کی بھی نماز پڑھ لو۔ حضرت ابھی تو وقت نہیں آیا ہے کہاں کا وقت اور کیسا وقت، آج عصر کا وقت یہی ہے۔ وجہ وجہ یہی کہ ہمارا حکم ہے حیرت میں ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

مزدلفہ روانگی

اب دن چھپا مغرب کی نماز کے لئے تیار ہوئے۔ خبردار یہاں مت پڑھنا۔ یہاں پڑھو گے تو ہو گی نہیں۔ آج مغرب وعشاء کا وقت ساتھ ساتھ آئے گا۔ یہ کیا قصہ ہے۔ عقل حیران ہے کہ عصر کی نماز کو ظہر کے ساتھ کر دیا اور مغرب کو عشاء کے ساتھ۔ خیر جب غروب ہو گیا تو مزدلفہ میں آیئے۔ یہاں عشاء ومغرب کی نماز ساتھ ساتھ پڑھیئے۔ پہلے مغرب پڑھیئے پھر عشاء اگر اس کا برعکس کر دیا تو عشاء

پھر سے پڑھئے حالانکہ اور ایام میں غیر صاحب ترتیب کو جائز تھا کہ وہ عشاء پہلے پڑھ لے اور پھر مغرب مگر یہاں جائز نہیں کیونکہ آج مغرب ادا ہے گو وقت نکلنے سے قضا معلوم ہوتی ہے۔

منیٰ واپسی

اس کے بعد اب صبح ہوئی فجر کی نماز اول وقت پڑھئے اور آفتاب نکلنے سے پہلے جب روشنی ہو جائے تو مزدلفہ سے چل کر منیٰ میں آیئے یہ دسویں تاریخ کا دن ہے۔ یہاں کیا کیجئے کہ سب سے پہلے جمار ثلث پر سات سات کنکریاں مارو اور اس کے بعد قربانی کرو پھر سر منڈواؤ اس کا حد عقل سے آگے ہونا ابھی بیان ہی کر چکا ہوں یہاں تین دن ٹھہرو تیرھویں کو اختیار ہے کہ ٹھہرو یا جاؤ۔

طواف زیارۃ

آگے پھر طواف زیارت کرو۔ پھر جو جی چاہے کرو۔ اے لیجئے حج ختم ہو گیا۔ اب بتایئے اس میں کون سی بات عقل کے موافق ہے۔

فنائے اتم

لوگ خلاف عقل ہونے سے ان افعال کو بے وقعت ثابت کرنا چاہتے ہیں مگر ہمارے نزدیک یہی خلاف عقل ہونا وقعت کو بڑھاتا ہے۔

ع معشوق من است آنکہ بنزدیک تو زشت است (جو تمہارے نزدیک ناپسند ہے وہی ہم کو محبوب ہے) جتنا تم مخالفات عقل کی فہرست بڑھاؤ گے ہمارے دعوے کی دلیل کو قوت ہوتی جائے گی۔ کیونکہ دعویٰ تو یہ تھا کہ حج میں فنائے اتم ہے بالکل مردہ کر دیا ہے

؎ پا بدست دگرے دست بدست دگرے

(دست و پا دوسروں کے قبضے میں ہے)

کیونکہ حج کا خاصہ ہے کہ متحرک بالا رادہ ہو انہوں نے اپنے ارادہ کو بالکل مٹا دیا ہے۔ کوئی حرکت ان کی اپنے ارادہ سے نہیں ہوتی۔ ان کی وہ حالت ہے کہ ہر حاجی بزبان حال کہتا ہے

؎ زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائی تو دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

یعنی زندہ کریں آپ کی عطا ہے۔ اگر قتل کریں آپ پر قربان ہیں۔ دل آپ پر فریفتہ جو کچھ تصرف کریں ہم راضی ہیں) دوسرا شعر جو حج پر صادق آتا ہے

؎ عاشقی چیست بگو بندۂ جاناں بودن دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

(عاشقی کیا ہے؟ محبوب کا غلام بن جانا دل دوسرے یعنی محبوب کے قبضے میں دے دینا اور حیران رہنا)

اپنے کو دوسرے کے قبضہ میں دے دیا اور حیران ہیں

؎ سوئے زلفش نظرے کردن درویش دیدن گاہ کافر شدن گاہ مسلمان بودن

(محبوب کے زلف کی طرف نظر کرنا اور اس کے چہرۂ انور کو دیکھنا کبھی فانی ہونا اور کبھی باقی)

کفر کے معنی ہیں ستر۔ چونکہ اپنا ارادہ اپنی ہستی مستور ہو جاتی ہے اس لئے فنا کو کفر سے تعبیر کرتے ہیں اور اسلام بقاء کو کہتے ہیں۔ تو اب معنی یہ ہوئے کہ گاہ فانی شدن وگاہ باقی (کبھی فانی ہونا کبھی باقی ہونا) اور فنا کی تجلی کو زلف سے تعبیر کرتے ہیں اور بقاء کی تجلی کو رخ سے۔

سوئے زلفش نظرے کردن درویش دیدن گاہ کافر شدن و گاہ مسلمان بودن

یہ حالت ہے گویا حج کی کہ فنائے اتم کی شکل تو بنا ہی دی۔

مقام عبرت

اب ہمیں عبرت پکڑنی چاہیے کہ معنی فنا کا بھی کوئی حصہ میسر اگر ہوا تو مبارک ہو ورنہ نرا مرور تو ایسا ہی ہے کہ

؎ خر عیسیٰ اگر بمکہ رود چوں بیاید ہنوز خر باشد

(خر عیسی اگر مکہ میں جاوے تو مکہ کی واپسی کے بعد بھی خر ہی رہتا ہے)

اگر کوئی یہ کہے کہ یہ حصہ کیسے نصیب ہو سو وہ بہت سہل ہے تم اس کا قصد کرلو جو قصد کر لیتا ہے اس کا حج حج بیت نہیں رہتا بلکہ حج رب البیت ہو جاتا ہے۔ جس کی نسبت ارشاد ہے

؎ حج زیارت کردن خانہ بود حج رب البیت مردانہ بود

(خانہ کعبہ کی زیارت کرنا حج ہے۔ اس میں خانہ کعبہ کی مالک کی بیت کرنا حج مردانہ ہے ۱۲)

حج وقربانی مراتب فنائیت

یہ روح ہوئی حج کی اور قربانی کی کہ فنائے اتم حج کی روح ہے اور فنائے تام قربانی کی۔ نفس فنا میں دونوں شریک ہیں۔ مگر چونکہ قربانی میں عقل کیخلاف کم ہے۔ فقط اتعاب نفس ہے۔ اس لئے فنا تو وہ بھی ہے مگر حج کے برابر نہیں اور دونوں میں تام اور اتم کا تفاوت ہے۔ تو یہ ان دونوں کی روح ہوئی۔ یہی وعدہ تھا میرا کہ میں ان دونوں کی روح کا بیان کروں گا۔ چنانچہ الحمدللہ وعدہ پورا ہو گیا۔

زیارۃ مدینہ (علیٰ صاحبها الف الف تحية وسلام)

اس کے بعد ایک اور طاعت ہے جس میں خشک مزاج والوں نے اختلاف کیا ہے اور وہ زیارت

مدینہ ہے۔اس کی روح کیا ہے۔اس کی روح یہ ہے کہ فنا کے مرتبے تک بھی جو کہ روح ہے حج کی مع قربانی کے پہنچ کر یوں سمجھ لے کہ سلوک ووصول میں تفرد کافی نہیں۔اب بھی شیخ کی حاجت ہے کیونکہ بغیر اس کے فنا مثمر (نتیجہ خیز) نہیں تو شیخ الشیوخ کی زیارت سے اس وابستگی کو تازہ کرلو جو شیخ کے ساتھ حاصل ہے تا کہ فنا کا ثمرہ ظاہر ہو۔واقعی زیارت مدینہ بڑی برکت کا عمل ہے۔جو اہل قلب ہیں ان کو بڑے بڑے ثمرات عطا ہوتے ہیں۔اگر کوئی حج سے پہلے زیارت کرلے تو استعداد ان ثمرات کے حصول کی پیدا ہوتی ہے جو حج یا بعنوان دیگر فنا پر مرتب ہوتے ہیں اور اگر بعد میں زیارت کرے تو ان ثمرات کی تکمیل ہو جاتی ہے۔عجیب جگہ ہے وہاں اللہ کے بندے بڑی بڑی دولتوں سے مشرف ہوئے ہیں۔

سید احمد رفاعیؒ کا واقعہ

حضرت سید احمد رفاعی[1] رحمۃ اللہ علیہ جب مدینہ منورہ حاضر ہوتے تو آپ نے روضہ مقدسہ پر جا کر با آواز بلند عرض کیا **السلام علیک یا جدی** (دادا صاحب السلام علیک) جواب آیا **وعلیک السلام یا ولدی** (بیٹا! وعلیک السلام) خلاف توقع جواب ملا تو وجد کرنے لگے اور عرض کرنے لگے۔

فی حالۃ البعد روحی کنت ارسلھا — تقبل الارض عنی و ھی نائبتی

یعنی دوری میں تو روح کو قدم بوسی کے لئے اپنا نائب بنا کر بھیجا کرتا تھا۔)

فھذہ دولۃ الاشباح قد حضرت — فامدد یمینک کی تحظی بھا شفتی

(یعنی اب جسم کی باری آئی ہے اب تو ذرا ہاتھ بڑھا دیجئے تا کہ میں اس کو بوسہ دوں) دیکھا کہ ایک ہاتھ نکلا جیسے **کالشمس فی نصف النھار** (دوپہر میں سورج) جس کی نورانیت نے آفتاب کو بھی ماند کردیا تھا۔

علامہ سیوطی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ جس وقت یہ واقعہ ہوا تو نوے ہزار آدمی مشاہدہ کررہے تھے۔ایک ہل چل پڑ گئی پھر نہایت شوق وادب سے ہاتھ چوما۔

ایک بزرگ سے کسی نے پوچھا کہ تم کو احمد رفاعی پر رشک بھی ہوا تو فرماتے ہیں ہم تو ہم اس وقت تو حاملان عرش رشک کررہے تھے۔اللہ اللہ یہ دولت۔جب آپ کو افاقہ ہوا تو دیکھا کہ لوگوں میں بڑی عزت ہورہی ہے آپ نے نفس کا معالجہ کیا۔

صاحبو! جب ایسے ایسوں کو علاج کی ضرورت ہے تو ہم کیسے مخدوم ہو سکتے ہیں ہمیں تو بدرجہ اولی علاج کی حاجت ہے آپ نے معالجہ یہ کیا کہ مسجد نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دہلیز پر لیٹ گئے۔اور فرمایا کہ میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں۔

---

[1] ان ہی بزرگ ہستی حضرت سید احمد کبیر رفاعیؒ کی کتاب "بنیان المشید حضرت حکیم الامت تھانویؒ نے روزانہ بطور ورد کے اس کے پڑھنے کا مشورہ دیا ہے ضرور منگائیں۔

کہ میرے اوپر سے گزرو تا کہ ذلت ہو۔لوگوں نے پھاندنا شروع کیا۔

ایک بزرگ تھے ان سے کسی نے پوچھا کہ آپ نہیں پھاندے۔ فرمایا اگر میں ایسا کرتا تو مجھے آتش قہر جلا ڈالتی۔ وہ اندھے تھے جو پھاندے۔ تو اللہ کے بندوں کو وہاں یہ یہ دولتیں نصیب ہوتی ہیں۔ اتنی بڑی دولت کو بعض خشک مزاج بلا دلیل کہتے ہیں کہ نا جائز ہے۔

روح انفاق مالی

بہر حال اس وقت میرا اصل مقصود بیان کرنا تھا روح حج وقربانی کو سو بیان کر چکا کہ ان کی روح فنا ہے اب انفاق مالی کی روح کا بیان باقی رہا سو وہ انفاق سے بقا ہے جو فنا کا ثمرہ بھی ہے اور اس مناسبت سے بھی دونوں کا بیان کرنا جمع کرنا مستحسن ہوا۔ اور حقیقت بقاء کی یہ ہے کہ اپنے ارادوں کے اندر پھر ایک حالت فاعلیت کی پیدا ہو گئی۔ علوم واعمال کا پھر عود ہو گیا وہ پھر تازہ ہو گئے۔ وہ حرکت ارادیہ پھر کام دینے لگی۔ مگر جیسا قبل فنا دیتی تھی ویسا نہیں۔ مثلاً پہلے جو حرکت ہوتی تھی وہ اپنے ارادہ اور اپنے نفس کے اتباع سے ہوتی تھی۔ اس کے بعد مرتبہ فنا میں وہ منقطع ہو گئی تھی اب مرتبہ بقاء میں پھر ہونے لگی لیکن اب ارادہ عبد بالکل ارادۂ حق کے تابع ہے یعنی ارادات تشریعیہ اب اس کے لئے امور طبعیہ بن گئے ہیں اور اس کے ساتھ افاقہ بھی ہے۔ کسی سے راضی ہے کسی پر غصہ بھی ہو رہا ہے انتظام بھی کرتا ہے روپیہ پیسہ بھی لیتا ہے غرض سلطنت تک کرتا ہے اور اس وقت یہ حالت تھی۔

احمد تو عاشقی بمشیخت تراچہ کار   دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

(یعنی احمد تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام؟ دیوانہ ہو سلسلہ ہو ہو نہ ہو نہ ہو)

اور اب وہ حالت ہے

مصلحت عام را   خاص کند بندۂ

خدا تعالیٰ کی عادت ہے کہ عام کی مصلحت کے لئے کسی شخص کو خاص کر لیتے ہیں تو اب یہ حالت ہے کہ ایک لاکھ روپیہ لیتا ہے اور اس کا انتظام کرتا ہے۔ مگر اس طور پر کہ نفس کا کہیں شائبہ نہیں ہوتا تو اس مرتبہ میں پہنچ کر اس کی وہ حالت ہوتی ہے جو انبیاء کی ہے کہ صاحب مال صاحب جاہ سب ہی کچھ ہوئے۔ اور اب وہ کام کرتا ہے جو کرنا چاہیے۔ پورا تخلق باخلاق اللہ (عادت بنانا اللہ کے اخلاق کے ساتھ) کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے پہلے فنا کے مرتبے میں تو وہ افعال اس کے نہ رہے تھے۔ اور اب بقاء کے مرتبے میں تخلق باخلاق الالٰہیہ باختیار العبد (اخلاق الٰہیہ کا تخلق بندہ کے اختیار سے) حاصل ہے۔ حق تعالیٰ کے اخلاق تصرف انتظام غصہ کی جگہ غصہ رحم کی جگہ رحم جو صحابہ کی شان تھی کہ اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ (یعنی وہ کافروں پر سخت تھے آپس میں تھے سب رحم دل۔ جامع)

اس سے اس کے افعال اسی کے اختیار سے صادر ہوتے ہیں فنا میں یہ بات نہ تھی وہاں مجبوری اور حیرانی غالب تھی۔ اور بقا میں تمام افعال منضبط ہوتے ہیں کہ دیکھنے والے کو اس کے مرتبہ کا پتہ بھی نہیں چلتا مگر مرتبہ اس کا ایسا عظیم ہے کہ

بر کف جام شریعت بر کفی سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

یعنی ادھر شریعت کا خیال ادھر عشق کا خیال شریعت اور عشق دونوں کے مقتضیٰ پر عمل کرنا ہر ہوسناک کا کام نہیں ہے)

خلق جود

اور یہ حالت انبیاء و اولیاء کاملین کی ہوتی ہے کہ وہ اخلاق الٰہیہ کے ساتھ متصف ہوجاتے ہیں اور اخلاق الٰہیہ میں سے ایک خلق یہ بھی ہے کہ دوسروں کو نفع پہنچانا اور نفع عام ہے ظاہری بھی باطنی بھی اسی واسطے بیضاوی نے وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ اور جو کچھ دیا ہے ہم نے ان کو اس میں سے خرچ کرتے ہیں) کی تفسیر میں لکھا ہے کہ **ومن انوار المعرفة يفيضون** (انوار معرفت میں سے فیض پہنچاتے ہیں) چنانچہ اگر ان کو مال ملا تو وہ اس میں سے بھی دیتے ہیں اگر ان کو علم ملا تو وہ اس میں سے بھی دیتے ہیں اگر ان کو انوار ملے تو وہ ان میں سے بھی دیتے ہیں۔

اور اس خلق خاص کو جود کہتے ہیں اور یہ سب افراد نفع کو عام ہے اس میں زکوٰۃ بھی آ گئی۔ پس وہ بھی جود کی ایک قسم ہے۔ سو اس میں زکوٰۃ کی روح بھی مذکور ہوگئی کہ بقاء ہے بلکہ تمام انفاقات مالیہ کی روح آ گئی۔ صدقہ فطر کی بھی زکوٰۃ کی بھی۔ اور آیۃ میں جو ہے **فکلوا منها** (اس میں سے تم بھی کھاؤ) اس میں یہ سب داخل ہو گیا۔

باقی اگر کوئی کہے کہ آیت میں تو صرف قربانی کے گوشت کے متعلق انفاق (خرچ کرنا) کا حکم ہے۔ اس میں دوسرے انفاقات کیسے آ گئے تو بات یہ ہے کہ خصوصیت اس کی مقصود مقام نہیں۔ بلکہ محض اغنائے (غنی کرنا) مساکین مقصود ہے اس لئے سب اسی کے حکم میں آ گئے۔ بلکہ یہ دلالت ایک اعتبار سے صریح دلالت سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ یہ مستحب ہے اور زکوٰۃ فرض اور صدقہ فطر واجب جب یہ مستحب مہتم بالشان ہے تو وہ فرض و واجب تو بدرجہ اولیٰ مہتم بالشان ہوگا۔ تو مستحب کے ذکر میں واجب و فرض کا ذکر بھی آ گیا۔ پس حاصل ان سب کا جود ہے اور اس کی روح بقاء ہے اور اس سے قبل فنا تھا جو روح تھی حج و قربانی کی اور فنا کے قبل مشاہدہ تھا جس کے اثر سے فنا ہوا اور یہ روح تھی اعمال عید کی اور مشاہدہ سے قبل مجاہدہ تھا جو روح تھی اعمال صوم کی۔ سبحان اللہ جس ترتیب سے ان اعمال کا بیان ہوا یہی ترتیب سلوک کی بھی ہے کہ سب سے پہلے مجاہدہ اور اس کے بعد مشاہدہ پھر اس

کے غلبہ سے فنا اور اس کے بعد بقاء بحمد اللہ وہی ترتیب یہاں بھی رہی۔

اگر کوئی کہے کہ جب سلوک کی یہ ترتیب ہے تو سب احکام اسی ترتیب سے واجب ہونا چاہئیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے چنانچہ بعضوں پر حج فرض نہیں اور زکوٰۃ فرض ہے اس کا جواب یہ ہے کہ سب کو مختلطاً اس لئے مشروع کیا ہے کہ ان سب میں باہم ارتباط و مناسبت بھی ہے۔ پس سب کو شروع کر دینے سے جس وقت ختم پر پہنچیں گے دفعۃً کمال حاصل ہو جائے گا۔ جیسا کہ کتب درسیہ میں کہ مختلف فنون کا سلسلہ ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ جس وقت ہر فن کی کتاب کا اخیر ورق ختم ہوا بس دفعۃً محدث بھی ہو گئے اور مفسر بھی بن گئے۔ سو یہی طرز یہاں رکھا ہے۔ اب وہ شبہ بھی رفع ہو گیا۔ الحمدللہ حسب توفیق حق سبحانہ وتعالیٰ سب کا بیان ہو گیا۔

ترجمہ آیات

اب ترجمہ ان آیات کا کئے دیتا ہوں تا کہ معلوم ہو جائے کہ جن طاعات کی نسبت میں نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ ان آیات کی مدلول ہیں وہ تینوں اس میں مذکور ہیں یا نہیں۔ پس فرماتے ہیں

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِیْمَ مَكَانَ الْبَیْتِ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْــٴًـا اس وقت کو یاد کیجئے اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب ہم نے ابراہیم علیہ السلام کے لئے خانہ کعبہ کی جگہ مقرر کر دی۔ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ سے پہلے وامرنا مقدر ہے۔ یعنی ہم نے یہ بھی حکم دیا کہ ہمارے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا۔ سبحان اللہ! پہلے ہی سے انسداد کر دیا کہ کہیں کوئی اس کی تعظیم سے شبہ معبودیت کا نہ کر لے۔ آخر آریوں کو شبہ ہوا ہی جس پر اعتراض چلا دیا۔ ابھی جگہ ہی بتلائی تھی کہ فرما دیا کہ اَنْ لَّا تُشْرِكْ بِیْ شَیْــٴًـا سبحان اللہ کیا انتظام ہے۔ اس فرمانے سے معلوم ہو گیا کہ یہ بیت خود مقصود نہیں بلکہ اس وجہ سے اس کا قصد کیا جاتا ہے کہ یہ مقام ہے۔ اس کی تعظیم کا:

وَّطَهِّرْ بَیْتِیَ لِلطَّآىٕفِیْنَ وَ الْقَآىٕمِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ اور میرے بیت کو پاک رکھنا اقذار (گندگی) ظاہری سے کہ خس و خاشاک و نجاسات ہیں اور اقذار باطنی سے بھی کہ اصنام ہیں جس سے قریش نے ملوث کیا تھا کہ خانہ کعبہ کو بتوں سے بھر دیا تھا سو اس کی وہیں سے جڑ کاٹ دی۔

وَ اَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ

اور ہم نے حکم دیا ابراہیم علیہ السلام کو کہ اعلان کر دیجئے لوگوں میں حج کا آئیں گے لوگ پیادہ ہو کر اور دبلی اونٹنیوں پر کہ آئی ہوں گی وہ بڑی دور دراز سے۔ ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ میری آواز اتنی کہاں جو میں تمام دنیا کے لوگوں میں ندا دے سکوں۔

ارشاد ہوا تم پکارو آواز کا پہنچا دینا ہمارا کام ہے۔

چنانچہ انہوں نے ایک پہاڑ پر چڑھ کر پکار دیا کہ اے لوگو چلو اللہ کے گھر کا حج تم پر فرض ہے تو جس

جس کی تقدیر میں حج لکھا جا چکا تھا سب ارحام امہات اور اصلاب آباء (ماؤں کے رحموں باپ کے اصلاب) میں سے لبیک لبیک (ہم حاضر ہیں ہم حاضر ہیں) بول اٹھے۔ اور اپنے اپنے زمانہ میں حج ادا کیا اور کریں گے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ سالکو! ذکر وشغل سے ثمرات کے منتظر نہ رہو یہ تو ہمارا کام ہے تم اپنے کام میں لگے رہو۔

دیکھو ابراہیم علیہ السلام کے پاس کوئی ایسی تدبیر نہ تھی کہ وہ اپنی آواز کو اتنی دور پہنچاتے مگر ہم نے پہنچادیا۔ اسی طرح تمہیں ثمرات کی کیا فکر تم اپنے کام میں لگے رہو۔

؎ کار خودکن کار بیگانہ مکن

یعنی اپنے کام میں لگے رہو۔ ثمرات کی فکر میں نہ پڑو) چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے پکارا۔

حج میں تجارت کا درجہ

آگے بتلاتے ہیں کہ کیا غایت ہے اس پکارنے کی۔

لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ

تا کہ حاضر ہوں اپنے منافع کے پاس یہ عام ہے خواہ منافع دینی ہوں یا دنیوی اور دینی منافع میں تو بہت بڑا نفع یہ ہے کہ وہاں طاعت کرنے کی کتنی بڑی فضیلت ہے اور دنیوی نفع یہ کہ بہت سی آبادی ہوگی اس میں تجارت کریں گے۔ زراعت کریں گے اور بہت سے فائدے اٹھائیں گے۔ مگر فرق اور مقام کی تجارت میں اور یہاں کی تجارت میں یہ ہے کہ یہ للاعانة علی الدین (دین کی اعانت کی وجہ سے) ہونا چاہیے یعنی حج میں تجارت کا مال ساتھ لے جانے میں نیت یہ ہو کہ اگر مال ہوگا اطمینان رہے گا ورنہ پریشانی ہوگی۔

اور بھلا حج تو عبادت ہے اس میں دنیا کا کیا مقصود ہوتی جہاں کسب دنیا کا بھی ذکر ہے وہاں بھی اس کو مقصود نہیں ہونے دیا اس کے ساتھ ہی دین کے مقصود بنانے کا حکم دیا چنانچہ جمعہ کے باب میں جہاں فرمادیا۔

فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ

(پھر جب نماز جمعہ پوری ہو چکے تو اس وقت اجازت ہے کہ تم زمین پر چلو پھرو اور خدا کی روزی تلاش کرو) اسی کے ساتھ یہ بھی فرمادیا: وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا خوب کثرت سے اللہ کا ذکر کیا کرو۔

غرض دنیائے محض کی کہیں بھی اجازت نہیں اور جب اسلام کا یہ حاصل ہے کہ اس میں دنیا محض ہے ہی نہیں تو مسلمان کو یہ نہ کہنا چاہیے کہ ہم دنیادار ہیں۔ اصل دنیادار تو صرف کافر ہی ہیں تم شرائع کا التزام کرتے ہو یا نہیں کرتے ہو؟ جب تم شرائع کا التزام کرتے ہو تو پھر دیندار ہو دنیادار کہاں سے آئے۔ اب اس شعر کے معنی بھی سمجھ میں آ گئے ؎

اہل دنیا کافران مطلق اند روز و شب در زق زق و در بق بق اند

(یعنی صرف کفار اہل دنیا ہیں رات دن زق زق بق بق میں گرفتار ہیں۔)

اہل دنیا چہ کہیں و چہ مہین

لعنت اللہ علیهم اجمعین (یعنی دنیادار خواہ بڑے ہوں یا چھوٹے سب پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو)

ظاہر میں سارے دنیاداروں کو کافر مطلق کہہ دیا جس سے شبہ تکفیر مسلم کا بھی ہوتا ہے جو مشغول بالدنیا ہے۔ سو مولانا محمد یعقوبؒ نے اس کی توجیہ یہ فرمائی تھی کہ اہل دنیا خبر مقدم ہے اور کافران مطلق مبتدائے مؤخر۔ مطلب یہ کہ کفار صرف اہل دنیا ہی ہوتے ہیں۔ مسلمان دنیادار ہی نہیں ہوتے۔ سو یہ توجیہ نہایت لطیف ہے۔ یعنی دنیائے محض کے طلب کرنے والے جن کو دین کی بالکل پرواہ نہیں وہ کافر ہی لوگ ہیں اور جو شرائع کا التزام کرتے ہیں وہ اگر چہ دنیا بھی حاصل کریں مگر دنیادار نہیں بلکہ دیندار ہیں۔ اگر چہ ضعیف درجہ کے سہی تو کسی مسلمان کو اپنے کو دنیادار نہ کہنا چاہیے یوں کہیے ہم مسلمان ہیں، خطاوار ہیں، انکسار و تواضع کے لئے یہی کافی ہے۔ دنیادار کیوں کہو۔

یہ تو ایسی تواضع ہوئی کہ ایک مرتبہ ریل میں ایک صاحب سوار تھے جو جنٹ تھان کے ساتھ اور بھی دو چار مسخرے وکیل وغیرہ تھے۔ یہ سب کے سب مل کے ایک اجنبی مسافر کو بنا رہے تھے۔ اتفاق سے جسے بنا رہے تھے وہ بھی کہیں منصف تھا مگر ہندو تھا۔ جب کھانا کھانے بیٹھے تو جنٹ صاحب کہنے لگے کہ آپ بھی گوہ موت کھا لیجئے۔ دوسرے صاحب نے کہا کہ ہائیں کھانے کو گوہ موت کہتے ہو کہنے لگا اپنے کھانے کو کھانا کہنا یہ تو تکبر ہے۔

اور ایک صاحب کا نام نتھو تھا کسی شخص نے پوچھا آپ کا نام؟ تو آپ تواضع سے کہتے ہیں اخ تھوکتے کا گوہ میاں نتھو۔ تو یہ تواضع تو ایسی ہی ہوئی آج تواضع سے دنیادار کہا ہے۔ کل اور تواضع بڑھے گی تو کافر کہو گے۔ اچھی تواضع ہوئی۔ غرض تم سب دیندار ہو کوئی دنیادار نہیں۔ مسلمان تو دنیا میں اگر چہ کتنا ہی توغل ہو مگر اس پر غلبہ دنیا کا نہیں ہوسکتا۔ غرض جب جمعہ میں وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا (ترجمہ کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا کرو) فرمایا تو حج میں کیسے نہ ہوگا۔

اور اس تجارت فی الحج کا درجہ مقصود بالعرض ہونے میں ایسا ہے جیسے حالت روزہ میں غسل کرنے کا۔ کیا اچھا فیصلہ ہے کہ اگر غسل جزع فزع کی وجہ سے ہے تو مکروہ ہے اور اگر ازالہ جزع فزع کے لئے ہے کہ اعانت علی الصوم ہے تو جائز ہے چنانچہ ابوداؤد میں روایت ہے کہ آپ نے روزہ میں غسل کیا تو جیسے غسل روزہ میں ہے ویسے تجارت حج میں ہے کہ اگر حج اس لئے ہے کہ تجارت کریں گے تو مکروہ و ناجائز ہے اور اگر تجارت اس لئے ہے کہ حج اچھی طرح اطمینان سے کرسکیں گے تو جائز ہے۔

بقیہ ترجمہ آیات

آگے فرماتے ہیں: وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ اور ان چند متعین دنوں میں اللہ کا ذکر کریں۔ یعنی ذبح کریں اور اللہ کا نام لیں اور یہ ذبح خواہ استحباباً ہو یا

وجوباً پھر فرماتے ہیں۔

فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ ' پھر کھاؤ ان میں سے یہاں سے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہے۔ اب تک ابراہیمؑ کو خطاب تھا۔ مگر چونکہ وہ بھی بلا انکار تھا۔ اس لئے ہمیں بھی تھا۔ یعنی ان میں سے تم بھی کھاؤ۔ وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ۔ یہ مطلب نہیں کہ اغنیاء کو مت کھلاؤ۔ نہیں اغنیاء کو بھی کھلاؤ۔ چنانچہ کلوا سے یہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ اگر کسی غنی نے قربانی کی تو وہ بھی کلوا میں داخل ہے تو غنی کو بھی کھانا جائز ہوا تو اس کو کھلانا بھی جائز ہوا بلکہ چاہے سب کھالو کسی کو بھی مت کھلاؤ نہ فقیر کو نہ غنی کو مگر مستحب وہی ہے۔

ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ پھر اپنا میل کچیل دور کریں یعنی بال منڈائیں ناخن کٹائیں نہائیں دھوئیں بدن کو صاف کریں۔ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ اور چاہیے کہ اپنی منتوں کو پورا کریں نذور سے مراد مطلق واجبات کہ وجوب میں مثل منذور کے ہیں۔ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ اس کو عتیق اس واسطے کہتے ہیں کہ یہ معتق ومحفوظ ہے جبابرہ سے۔ حق تعالیٰ نے اسے آزاد رکھا ہے یعنی اور چاہیے کہ بیت عتیق کا طواف کریں۔ یہ ترجمہ ہوا ان آیات کا اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ اس میں تینوں عمل مذکور ہیں۔ حج بھی قربانی بھی انفاق مالی بھی مگر یہ آیت ملی ہے ذرا ڈھونڈنے سے۔ الحمدللہ جو کچھ میرا مقصود تھا وہ بیان ہو چکا۔

اب حق تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں توفیق دے کہ ہم نکتوں ہی میں نہ رہیں عمل بھی کریں اور جن پر حج فرض ہے وہ حج بھی کریں اور خرچ ہو تو مدینے بھی جائیں۔

نہایت اہم مسئلہ

اور ایک مسئلہ اچھی طرح سمجھ لو کہ جو لوگ مکہ اور مدینہ دونوں کے خرچ کو ملا کر اتنے خرچ ہونے پر حج فرض سمجھتے ہیں وہ بڑی غلطی میں ہیں جس کے مکہ تک کا خرچ ہے اس پر حج فرض ہے وہ حج کو جائیں البتہ جن پر حج فرض نہیں ہے وہ آج کل نہ جائیں کیونکہ جب فرض نہیں تو کیا ضرورت ہے کہ خدشہ میں پڑوا گرچہ یہ خدشہ ضعیف ہی ہے اس کے علاوہ آج کل کرایہ بھی گراں ہے اور گنجائش ہو تو مدینہ کو بھی جائیں۔ کہ بڑی فضیلت ہے

؎ زہے سعادت کہ آں بندہ کہ کرد نزول گہے بہ بیت خدا گہے بہ بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(بڑی خوش نصیبی اس بندہ کی کہ اس نے کبھی خانہ کعبہ کی زیارت کی اور کبھی مدینہ کی)

فضیلت خاص

ہر چند کہ قربانی کی فضیلت کا بیان ظاہراً قبل از وقت (وقت سے پہلے) ہے مگر ایک معنی کر قبل از وقت نہیں۔ اس لئے کہ جس کو زیادہ فضیلت حاصل کرنا ہو وہ پہلے سے قربانی کے جانور کو خرید لے اور

انہیں کھلا پلا کر خوب موٹا تازہ کر لے۔ سو اگر کسی نے یہ بیان سن کر اس وقت جانور قربانی کا خرید لیا تو اس اعتبار سے خاص یہ بیان قبل از وقت نہ ہوا وقت پر ہی ہوا۔

اور پہلے سے خریدنے میں اس لئے بھی فضیلت ہے کہ پہلے سے خرید کر اس کو جتنا کھلائے پلائے گا اس جانور سے انس ہوگا اور ارشاد ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (یعنی تم خیر کامل کو کبھی نہ حاصل کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے (تو جب محبوب کو ذبح کریگا تو یہ فضیلت خاص بھی اسکو حاصل ہوگی۔

اہتمام عبادت اور دعاء

باقی رہی زکوٰۃ و صدقہ واجبہ سو گو اس کا کوئی مہینہ مقرر نہیں مثلاً زکوٰۃ ہے کہ جب حولان حول (سال کا گزرنا) ہو جائے جب دیدینا چاہیے۔ تو اس شخص کے لئے یہ بیان شاید قبل از وقت سمجھا جاوے لیکن محتمل اور ممکن تو ہے کہ کسی کا سال شوال یا ذیقعدہ ہی میں پورا ہوتا ہو تو اس کے اعتبار سے بھی یہ مضمون احتمالاً مناسب ہے اور جن عبادات کی ارواح رمضان میں مذکور ہوئی تھیں ان کا بھی اہتمام کرنا چاہیے اور اہتمام کے ساتھ سب سے بڑی ضرورت حق تعالیٰ سے دعا کرنے کی ہے۔ اب دعا کیجئے کہ ہمیں فہم اور عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

روح الارواح

۸شوال ۱۳۳۳ھ کو جمعہ کے روز تین گھنٹے ۸ منٹ جامع مسجد تھانہ بھون میں بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔

مولانا عبدالحلیم صاحب نے اسے قلمبند فرمایا۔

سامعین کی تعداد دوسو تھی۔

خطبہ ماثورہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ نَحۡمَدُہٗ وَنَسۡتَعِیۡنُہٗ وَنَسۡتَغۡفِرُہٗ وَنُؤۡمِنُ بِہٖ وَنَتَوَکَّلُ عَلَیۡہِ وَنَعُوۡذُ بِاللّٰہِ مِنۡ شُرُوۡرِ اَنۡفُسِنَا وَمِنۡ سَیِّئَاتِ اَعۡمَالِنَا مَنۡ یَّھۡدِہِ اللّٰہُ فَلَا مُضِلَّ لَہٗ وَمَنۡ یُّضۡلِلۡہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنۡ لَّا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ وَنَشۡھَدُ اَنَّ سَیِّدَنَا وَمَوۡلَانَا مُحَمَّدًا عَبۡدُہٗ وَرَسُوۡلُہٗ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصۡحَابِہٖ وَبَارَکَ وَسَلَّمَ.

امابعد! فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم. بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم.

لَنۡ یَّنَالَ اللّٰہَ لُحُوۡمُھَا وَلَا دِمَآؤُھَا وَلٰکِنۡ یَّنَالُہُ التَّقۡوٰی مِنۡکُمۡ ط کَذٰلِکَ سَخَّرَھَا لَکُمۡ لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا ھَدٰکُمۡ ط وَبَشِّرِ الۡمُحۡسِنِیۡنَ (الحج آیت ۳۷)

ترجمہ یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون ولیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو تمہارا مسخر کردیا تا کہ تم اللہ کی راہ میں قربان کر کے) اس بات پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو۔ کہ اس نے تم کو (اس طرح قربانی کرنے کی) توفیق دی۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ اخلاص والوں کو خوشخبری سنا دیجئے)

احوال واقعی

یہ ایک آیت ہے سورۂ حج کی حق تعالیٰ جل شانہ وعم نوالہ نے اس میں مسئلہ اضحیہ یعنی قربانی کے متعلق جو دو مختلف گروہ دو مختلف غلطیاں کرتے ہیں ان کا فیصلہ فرمایا ہے اور فیصلہ بھی نہایت عجیب وغریب کہ جس سے عوام تو عوام خواص بھی غافل ہیں خواہ وہ خواص اہل ظاہر میں سے ہوں یا اہل باطن سے حق تعالیٰ نے اس آیت میں ان دونوں جماعتوں کی اصلاح اور ترمیم فرما کر ایک نہایت تحقیقی فیصلہ فرمایا ہے۔

اس مضمون کو یعنی قربانی کی روح کو شوال کے شروع میں کے وعظ روح العج والثج[1] میں بضمن احکام حج کے بیان کر چکا ہوں گو اس عنوان خاص سے نہیں اور میں نے اس وقت یہ بھی کہا تھا کہ جمعہ قریبہ

---

[1] یہ وعظ سات وعظوں میں کا ایک وعظ ہے جن کا مجموعہ ملقب بہفت اختر مستقلاً شائع ہوا ہے جن میں اعمال رمضان وفطر حج کی خصوصیت کے ساتھ مفصل اسرار بیان کئے گئے ہیں ۱۲ منہ

ذی الحجہ میں اس کا بیان نہیں کیا جاوے گا بلکہ قربانی کے احکام فرعیہ بیان کئے جاویں گے لیکن اتفاق سے قلب میں پھر حرکت ہوئی کہ ویسا ہی مضمون پھر بیان کیا جاوے گو اس کا عنوان اس بیان سابق کے عنوان سے بدلا ہوا ہوگا لیکن حقیقت اور معنون اس بیان کا ایک ہی ہوگا۔

مدعیان علم

اب اس فیصلے کے سننے کے قبل ان غلطیوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ کون کون سی ہیں سو وہ غلطیاں ایک مسئلہ میں واقع ہوئی ہیں۔ دو قسم کے علماء کے درمیان میں یعنی بعض علماء ظاہر و بعض علماء باطن۔

اور افسوس ہے کہ علماء ظاہر کے گروہ میں آج کل بعض ایسے لوگ بھی اپنے کو شامل کرنے لگے ہیں جن کو علم سے کچھ بھی مس نہیں مگر نہ معلوم وہ اپنے کو کیا سمجھتے ہیں ایسے لوگ اپنے حوصلہ سے زیادہ دعویٰ کرنے لگے ہیں اور بہت دور تک ان کی دست درازی کی نوبت پہنچ گئی ہے۔ اس لئے ہم کو مجبوراً دست اندازی کی ضرورت پڑی اور ایسے لوگوں نے صرف دنیوی امور ہی میں نہیں بلکہ دینی امور میں بھی اپنی رایوں کو دخل دینا شروع کر دیا ہے۔

وہ اپنے زعم باطل میں یہ سمجھتے کہ جب ہماری رائے دنیوی امور میں قابل تسلیم ہے تو دینی امور میں بھی کیوں نہ صائب سمجھی جاوے۔ ان کی دست اندازی دنیوی امور میں تو خیر کوئی ایسی قابل لحاظ نہیں ہے مگر ہاں دینی امور میں ضرور قابل لحاظ ہے اس زمانہ میں طبیعتیں کچھ ایسی شوخ ہوگئی ہیں کہ جس چیز میں چاہا بے باکانہ دخل دے بیٹھے وہ سادگی جو پہلے تھی اب نہیں رہی پرانے لوگ جس چیز کو نہیں جانتے تھے صاف کہہ دیتے تھے۔

دیکھئے دنیوی فنون میں سے جس فن کو جو نہ جانتا ہو اس کے متعلق کسی سے یہ کہلا لینا کہ میں نہیں جانتا نہایت آسان ہے مثلاً ہم نہایت آزادی کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم محکمہ زراعت کے کام نہیں جانتے ایک بہت بڑا افلاسفر بھی نہایت خوشی بلکہ فخر کے ساتھ کہنے کے لئے تیار ہو جائے گا کہ ہم نہیں جانتے۔ کھاد کس طرح ڈالی جاتی ہے اس کو اس اقرار جہل سے ذرا عار نہیں آئے گی مگر آج کل کے مدعیان تحقیق سے یہ منوا لینا کہ تم دینی دقائق نہیں جانتے بالکل ناممکن ہے۔ بھلا کس طرح مان لیں حضرت کی شان تحقیق میں فرق نہ آ جائے گا۔

دین سے مناسبت کچھ اس قدر کم ہوگئی ہے کہ اس عدم مناسبت کو بھی انہیں نہیں سمجھا سکتے۔ بڑے سے بڑا عالم بھی ایک جگہ پہنچ کر یہ کہہ دے گا کہ اس سے زیادہ میں نہیں جانتا آگے میں ناواقف ہوں۔ لیکن جاہل نے اگر شروع ہی میں کہہ دیا تو کہہ دیا کہ میں ناواقف ہوں لیکن اگر کہیں اول وہلہ میں اس کے منہ سے نکل گیا کہ میں جانتا ہوں تو بس پھر قیامت تک اسی کو نباہے جائے گا۔ کسی اونچے سے اونچے درجے کے مسئلہ پر بھی وہ نہیں کہے گا کہ میں نہیں جانتا۔ مگر اس کے اصرار سے کہیں حقیقت بدل سکتی ہے۔

جیسے کہ کسی سیاح نے امریکہ کا راستہ نہ دیکھا ہو اور تمام روئے زمین کی سیاحت کر کے لوٹا ہو اور

امریکہ کا پتہ اس کے بعد دوسرے سیاحوں نے لگالیا ہو اور اس کے سامنے امریکہ کا ذکر کیا جاوے تو وہ فوراً انکار کردے گا کہ امریکہ کوئی خطہ روئے زمین پر موجود نہیں کیونکہ ہم سارے روئے زمین کی سیاحت کر آئے ہیں ہمیں کہیں نہیں ملا۔ مگر کیا اس کے اس نفی کرنے سے امریکہ کی نفی ہو سکتی ہے اس سے یہی کہا جاوے گا کہ تمہارا علم محیط نہیں ہے اور تمہارا احاطہ نہ کرنے سے حقیقت کی نفی نہیں ہو سکتی۔ پس تعجب ہے کہ اس سے امریکہ کا انکار نہ کیا جاوے گا لیکن حقیقت واقعیہ کا انکار کر بیٹھیں۔ غرض خواص کے طبقہ سے نکل کر مدعیین کے طبقہ تک وہ مسئلہ پہنچ گیا۔

تحقیق مصالح

اور وہ مسئلہ یہ ہے کہ اس پر نہایت زور و شور سے گفتگو ہے کہ احکام شرعیہ کے اندر حقیقت میں کوئی مصلحت ہے یا نہیں یہ بحث معرکۃ الآ راہے کہ احکام شرعیہ کے اندر مصلحتیں بھی ہیں یا کیفما اتفق جو چاہا حکم مقرر کر دیا۔ مثلاً روزے کا حکم کیا ہے قربانی کا حکم کیا ہے آیا ان میں کوئی مصلحت ہے یا یوں ہی جو چاہا حکم کر دیا۔ نماز کو فرض کیا ہے آیا اس میں کوئی مصلحت بھی ہے یا ویسے ہی فرض کر دی سو اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ احکام میں مصلحتیں ہیں۔

رہی یہ بات کہ وہ مصلحتیں کیا ہیں سو اس کا ایک نہایت عمدہ جواب عرض کرتا ہوں۔ لیکن وہ خشک ہوگا وہ یہ کہ ہمیں نہیں معلوم کہ وہ کیا ہیں اور مغلوب العشق تو یہی جواب دے گا کہ ہم نہیں جانتے مصلحت کیا ہے۔ لیکن اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں مصلحت سے بحث نہیں نہ یہ کہ ہم کو بالکل ہی معلوم نہیں وہ تو جاننے پر بھی یہی کہے گا جو حضرت حافظ فرماتے ہیں۔

مصلحت دید من آنست کہ یاران ہمہ کار ۔۔۔ بگذارند و خم طرۂ یارے گیرند

یعنی بڑی مصلحت یہ ہے کہ سب کو چھوڑ کر بس ایک ہی کو لے لو۔ حضرت نظامیؒ کا ارشاد ہے

؎ زبان تازہ کردن باقرار تو ۔۔۔ نینگیختن علت از کار تو

(بس زبان سے اقرار کرنا چاہیے کوئی علت نہ ڈھونڈھنا چاہیے)

کیسی مصلحت کیسی علت ایک اور بزرگ فرماتے ہیں

؎ زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو ۔۔۔ دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو

(زندہ کریں آپ کی عطا ہے اگر قتل کریں آپ پر قربان ہوں دل آپ پر فریفتہ ہو گیا ہے جو کچھ کریں میں ہر حالت میں آپ سے راضی ہوں)

اور ان حضرات عشاق میں جو محقق ہیں ان سے اگر کوئی مصلحت پوچھی جاتی ہے تو ناشکری بھی نہیں

کرتے کہ باوجود معلوم ہونے کے یوں کہیں کہ مصلحت معلوم نہیں کیونکہ یہ حضرات صورت کفران سے بھی بچنا چاہتے ہیں اور یہ بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ ہمیں مصلحت سے بحث نہیں ہمیں حکم محبوب کی تعمیل سے غرض ہے لہذا وہ دونوں جمع کر کے یہ کہتے ہیں

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز ورنہ در مجلس رنداں خبری نیست کہ نیست

(یعنی کوئی ضروری بات ایسی نہیں ہے جو ہمیں معلوم نہ ہو لیکن مصلحت نہیں الخ کہ اس کو کھلم کھلا ظاہر کریں)

حکیمانہ محبت

اور مصلحت کے معلوم کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ جس کسی نے عشق کا مزہ چکھا ہوگا وہ جانتا ہوگا کہ کسی نوکر کا محبوب آقا جب اس کو حکم کرتا ہے کہ جاؤ دوڑ کر اچکن لے آؤ۔ اصطبل سے گھوڑا تیار کر کے فوراً حاضر کرو ہم فلاں حاکم سے ملنے جائیں گے وہ اس حکم کی تعمیل کے لئے دوڑ کر جائے گا۔ اب ایسی حالت ہے کہ وہ دوڑا ہوا جارہا ہے اگر راستہ میں اس سے کوئی پوچھے کہ کیوں دوڑے ہوئے جاتے ہو تو وہ صرف یہی کہہ دے گا کہ مالک نے گھوڑا منگایا ہے اچکن منگائی ہے اس پر اگر وہ شخص یہ پوچھنے لگے کہ اس حکم میں کیا مصلحت ہے تو کیا وہ اس حکم کی وجہ پر لیکچر دینے لگے گا اور گو اس حکم کی وجہ بھی ضرور ہے اور وہ اس کو جانتا بھی ہے کہ ملاقات حاکم ہے لیکن وہ صرف یہی کہہ دے گا کہ ہمیں وجہ معلوم نہیں یا ہمیں وجہ سے کیا بحث۔ بڑی وجہ ہمارے لئے یہی ہے کہ ہمارے آقا نے حکم دیا ہے وجہ خود آقا سے جا کر پوچھو وہ اس سے زیادہ ایک حرف نہ کہے گا۔ انہوں نے حکم دیا ہے کہ ہم تعمیل کے لئے جارہے ہیں کیونکہ وہ تو تعمیل کی دھن میں لگا ہے اگر اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ کھڑا ہو کر مصلحت اور وجہ پر لیکچر دینا شروع کر دیا تو معلوم ہوا کہ وہ عاشق نہیں ہے۔ صرف ایک حکیم دانشمند شخص ہے جو خالی ہے عشق سے۔ غرض اس کے اس کہنے سے کہ ہمیں وجہ معلوم نہیں یہ معنی ہرگز نہیں کہ مصلحت نہیں ہے یا اسے معلوم نہیں ہے بلکہ مصلحت بھی ہے اور اسے معلوم بھی ہے لیکن فرصت کس کو ہے کہ محبوب کے مشاہدۂ (دیکھنا) جمال اور اس کے امر کے امتثال (حکم ماننا) سے قطع نظر کرے اور توقف کرے اور تقریر بسیط (مفصل) بیان کرے فرصت ہی کس کو ہے۔

ہمارے اگر حضرت حاجی صاحب نے قطع منازعت کے لئے عجیب دستور العمل تعلیم فرمایا ہے فرماتے تھے کہ بھائی اگر کوئی شخص تم سے مباحثہ کرے تو تم اس مثل پر عمل کرنا کہ ایک حجام سے ایک شخص نے کہا کہ میری داڑھی کے سفید بال چن لو منکوحہ جوان عورت ہے اس کو سفید بال ناپسند ہیں کہیں بوڑھا سمجھ کر نفرت نہ کرے۔ جب میاں حجام کو لے کر بیٹھے تو اس نے ایک طرف سے شروع کر کے دوسرے کنارے تک پہنچا کر پوری داڑھی صاف کر کے آگے رکھ دی اور کہا مجھے کام بہت ہے آپ خود چھانٹ لیجئے۔ مجھے

اتنی فرصت نہیں کہ ایک ایک بال چنوں۔ بس اسی طرح جب تم سے کوئی کسی مضمون میں الجھے تم سب رطب ویابس اس کے حوالے کر کے اپنے کام میں لگ جاؤ اور ایسا نہ کرنا علامت اس کی ہے کہ اس کو کوئی کام نہیں۔ بالخصوص عشق و معرفت سے خالی ہونے کی تو یہ صاف علامت ہے حضرت شیرازی خوب فرماتے ہیں

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خوے چو بگذشت برعارف جنگ جوی

(بہلول مبارک خصلت نے کیا اچھی بات کہی جبکہ وہ ایک عارف جنگ جو پر گزرے)

گر ایں مدعی دوست بشناختی بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

اگر اس مدعی کو اللہ تعالیٰ کی معرفت ہوتی تو دشمن کے ساتھ لڑائی میں مشغول نہ ہوتا) منازعت (جھگڑا کرنے) کی فرصت کس کو ہے اگر کسی کی معشوقہ خواہش کرے کہ فلاں وقت آؤ ہم ملنا چاہتے ہیں مگر نہا دھوکر کپڑے بدل کر آراستہ و پیراستہ ہو کر آنا تاکہ بدن اور کپڑوں میں بو نہ آوے سو وہ بھی جان گیا کہ اس واسطے کپڑے بدلنے کا حکم دیا ہے اور تمام احکام کا امتثال بھی کیا' حکمتیں بھی معلوم مصلحت سے بھی واقف مگر جانے کے وقت کسی نے ہاتھ پکڑ کر دریافت کیا کہ آپ تو ژولیدہ (پریشان) حال پھرا کرتے تھے آخر اس تغیر کی کیا وجہ حالانکہ وہ وجہ اور وجہ کی وجہ سے بھی واقف ہے لیکن اگر مشاہدۂ محبوبہ کا مشتاق ہے تو کیا وہ وقت کو کھوٹا کرے گا اور وجہ پر لیکچر دینا شروع کرے گا۔ یا ہاتھ چھڑا کر کہے گا کہ میں نہیں جانتا یا میں نہیں بتاتا اور جا کر محبوبہ کے سامنے جا کر بیٹھ جائے گا۔ اگر اس نے لیکچر دینا شروع کیا تو معلوم ہوگا کہ اس کو محض حکیمانہ محبت ہے عاشقانہ محبت نہیں ہے۔

حقیقی محبت

اسی طرح اگر کوئی اہل اللہ سے الجھتا ہے اگر وہ واقعی طالب حق ہو اور اس کا منصب بھی تحقیق کا ہو اور بات بھی قابل تحقیق ہو تو افادہ سے دریغ بھی نہیں کرتے۔ ورنہ وہ یہ کہہ کر کہ ہم نااہل ہیں ہم کچھ نہیں جانتے اپنے محبوب کی طرف مسافت قطع کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں یعنی ذکر اللہ و طاعت میں لگ جاتے ہیں اس کا ذرا بھی خیال نہیں کرتے کہ لوگ سمجھیں گے کہ یہ کچھ نہیں جانتے انہیں اس کی پرواہ ہی نہ ہے اور واقعی جو ضروریات میں مشغول ہوگا اس کو فضولیات کی کب فرصت ہوگی۔

چنانچہ حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ نے جب بلخ کی سلطنت کو ترک کر دیا تو ان کے وزیر نے ایک روز حاضر ہو کر عرض کیا کہ حضور سلطنت تباہ ہو رہی ہے۔

رعایا سخت پریشان ہے درویشی کے ساتھ بھی تو سلطنت ہو سکتی ہے۔

آپ نے فرمایا کہ بات یہ ہے کہ جب تک کوئی فکر دماغ میں ہوتی ہے تو دوسرا کام خوش اسلوبی

کے ساتھ ہو نہیں سکتا۔ اگر تم اس فکر کو رفع کر دو تو البتہ میں وعدہ کرتا ہوں کہ سلطنت کا انتظام اپنے ہاتھ میں پھر لے لوں گا۔ وزیر نے سمجھا کہ کوئی ایسی فکر ہوگی۔

عرض کیا حضور ارشاد فرمائیں دل و جان سے ہم لوگ اس فکر کے زائل کرنے کی کوشش کریں گے۔ حضرت ابراہیمؒ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ یعنی ایک فریق جنت میں ہوگا اور ایک فریق دوزخ میں مجھے یہ فکر پریشان کیے ہوئے ہے کہ میں کون سے فریق میں ہوں گا۔ تم اس سے بے فکر کر دو۔ وزیر یہ سن کر دنگ رہ گیا وہ ان کے فکر کی زوال کی تو کیا کوشش کرتا اسے اپنی وزارت سے وحشت ہوگئی اور خود اسی کو فکر دامن گیر ہوگئی۔ یہ فکر تو باعتبار محبت و معرفت کے ہے جو تفتیش مصالح کو بیکار بتاتا ہے اور حق تعالیٰ کی عظمت و حکومت کے حقوق پر نظر کی جاوے اس کا مقتضا بھی یہی تفتیش مصالح کا ممنوع ہوتا ہے چنانچہ ظاہری سلطنت کے قوانین یقیناً متضمن (شامل) مصالح ہیں اور ان احکام کی لم (علت، سبب) کو مجلس واضعان قوانین (قوانین بنانے والی مجلس) ضرور جانتی ہے اور انہوں نے اس کو سمجھا بھی ہے اور انہیں کو سمجھنا ضروری ہے لیکن عام رعایا پر صرف عمل کرنا واجب ہے۔ اور عمل کے لئے لم (علت، سبب) کے معلوم کرنے کی انکو کوئی ضرورت نہیں۔ ہمارے لئے تو صرف یہی کافی ہے کہ سلطنت وقت کا حکم ہے اور سلطنت وقت کا حکم واجب العمل ہوتا ہے۔ لہذا ہم کو عمل کرنا چاہیے۔

اے اللہ یہ عجیب بات ہے کہ سلاطین کے احکام پر عمل کرنے کے لئے تو ہمیں صرف اتنا ہی سمجھ لینا کافی ہو کہ یہ سلطنت وقت کے احکام ہیں اور خدائے تعالیٰ کے احکام میں حکمتیں تلاش کی جائیں اور جب تک حکمت نہ معلوم ہو ان پر عمل نہ ہو۔

مقام تحقیق

مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہر طالب علمی کہ چوں و چرا نہ کندہ ہر درویشی کہ چون و چرا کند ہر دو را بچر اگاہ باید فرست (جو طالب علم چون و چرا نہ کرے اور جو درویش چون و چرا کرے دونوں کو چراگاہ میں بھیجنا چاہیے) طالب علم سے مراد وہ شخص ہے جو تحصیل علم میں مشغول ہو مثلاً ایک شخص طب پڑھتا ہے اس کو تو تحصیل کے وقت چون و چرا واجب لیکن اگر مریض چون چرا کرے تو وہ کان پکڑ کر مطب سے نکال دینے کے قابل ہے۔ درویش سے مراد عامل ہے اس کو عمل چاہیے تحقیق اس کی دلیل یہ علت کی اس کو ہرگز مناسب نہیں اور طالب علم سے مراد جو فن سیکھ رہا ہے مثلاً فقہ پڑھنے کے وقت لم و کیف (کیوں اور کس طرح) ضروری ہے اور وہ بھی اسی قدر جو فقہ کے مناسب ہے لیکن

جو شخص قربانی کرنا چاہتا ہے اس کو خود دلیل ہی پوچھنا ایک لایعنی (بے فائدہ) بات ہے اور یہ پوچھنا کہ اس میں کیا حکمت ہے یہ تو بڑی بے عظمتی حق تعالیٰ کے حکم کی ہے اور بڑی بے وقعتی اور گستاخی ہے۔

تو اگر کوئی رعایا حدود ہندوستان میں احکام گورنمنٹ کے مصالح میں گفتگو کرے تو ہے تو گستاخی لیکن جراءت کی گنجائش اس لئے ہوسکتی ہے کہ یہ ممکن ہے کہ اس گستاخی کی خبر شاہ جارج پنجم کو نہ ہو لیکن اللہ میاں تو یورپ میں نہیں ہیں وہ ہماری ذات سے بھی زیادہ ہم سے نزدیک ہیں جیسا کہ منصوص ہے خود فرماتے ہیں۔ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ الخ یعنی میں تمہاری جان سے بھی زیادہ تم سے نزدیک ہوں۔

اقربیت کا مفہوم

یہاں میں اس کے متعلق ایک موٹی بات بتلائے دیتا ہوں جس سے یہ ایک مسئلہ کشفی بالکل بدیہی اور محسوس ہو جاوے۔ ایک موٹی تقریر سے سمجھائے دیتا ہوں یعنی تم جو اپنی ذات سے نزدیک ہو تو اپنے وجود اور ہستی کے سبب نزدیک ہو لیکن خود تم میں اور ہستی میں جو علاقہ ہوا ہے وہ کیسے ہوا آیا بلا واسطہ یا بواسطہ سو ہستی بلا واسطہ تو صرف خدا کی ذات کے لئے ثابت ہے کہ واجب الوجود ہے آپ کی ہستی تو واسطہ کی محتاج ہے اور واسطہ کو بہ نسبت ذی واسطہ زیادہ قرب ہوا کرتا ہے۔ مثلاً جو دو کاغذ گوند سے چپکا دیئے گئے ہیں وہ ایک دوسرے سے اتنے قریب نہیں بلکہ گوند جو کہ واسطہ ہے وہ زیادہ قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ مثال سے پاک ہیں لیکن آخر میں تمہیں کس طرح سمجھاؤں بھی پس جب اللہ تعالیٰ تمہارے اور تمہاری ہستی کے درمیان واسطہ ہیں تو وہ ہستی سے زیادہ قریب ہوئے۔

اور یہی حاصل تھا تمہارے ساتھ نسبت تمہاری جان ہونے کا۔ پس تم سے اتنے قریب ہوئے جتنے کہ خود تم بھی اپنے قریب نہیں جیسا کہ گوند کی مثال میں سمجھایا گیا۔ یہ بہت موٹی بات ہے کہ کوئی قیل وقال کی گنجائش نہیں۔

حاصل یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ تم میں اور تمہاری ہستی میں علاقہ پیدا نہ کریں تو تم کچھ بھی نہیں اسی کے واسطہ سے تم تم ہوئے۔

مفید مراقبہ

جب وہ اتنا نزدیک ہے تو اب ایک کام کی بات بتلاتا ہوں۔ سمجھ لیجئے اور میں استدلالی گفتگو نہیں کرنا چاہتا کیونکہ استدلالی گفتگو سے اطمینان نہیں ہوتا ساکت کر دینا دوسری بات ہے عمل اور سمجھنے کے قابل بات بتلاتا ہوں وہ یہ کہ جب آپ کوئی سوال شریعت مقدسہ کی بابت کریں جس میں سوال عن الحکمت (حکمت سے سوال کرنا) بھی داخل ہے تو پیشتر یہ تصور کر لیا کریں کہ ہم ایک مجلس میں حاضر ہیں جس کے صدر مجلس حق تعالیٰ ہیں اور ہم جو سوال کرتے ہیں اس کو وہ دیکھتے سنتے ہیں اور یہ بھی تصور کریں

کہ جس کی بابت ہمارا سوال ہے وہ خدا ہی کا قانون ہے اس کے بعد یہ سوچنا چاہیے کہ آیا اس صورت مفروضہ میں ہم خدا تعالیٰ سے بھی یہ سوال کر سکتے۔ اگر ان سب مقدمات کے استحضار کے بعد بھی وجدان شہادت دے کہ ہاں پوچھ سکتے تو بس وہ سوال جائز ہے۔ ورنہ نہیں۔

اگر یہ بھی سمجھ میں نہ آوے تو یہ دیکھئے کہ اگر آپ شاہ جارج کے دربار میں پہنچ گئے اور آپ کی ایسی جگہ نشست ہوئی کہ جہاں وہ آپ کو دیکھ بھی رہے ہیں اور آپ کی باتیں بھی سن رہے ہیں تو جو سوال آپ نے قوانین کی لم کی بابت ہندوستان میں بیرسٹر سے کیا تھا وہ خود بادشاہ سے بھی اس دربار میں کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر وہاں نہیں کر سکتے تو حق عظمت یہی ہے کہ ہندوستان میں بھی نہ کرو۔ جب یہ بات اس مثال میں طے ہوگئی کہ نہیں پوچھ سکتے تو کیا خدا تعالیٰ کی عظمت دنیوی سلاطین سے بھی کم ہے اور کیا اس کا حاضر و ناظر ہونا ان کے حاضر و ناظر ہونے سے بھی کم ہے۔ نعوذ باللہ حالانکہ سلاطین کے دربار میں اگر کوئی سرگوشی کرنے لگے تو بعض اوقات سلاطین کو خبر بھی نہیں ہوتی تو گستاخی کا سوال چنداں بعید نہیں اور خدا تعالیٰ سے چھپا کر تو ایسی سرگوشی بھی نہیں ہوسکتی تو ایسی حالت میں گستاخی سخت حیرت ہے۔

ایک بزرگ فرماتے ہیں اور واقعی عاقل وہی ہے جس کی آنکھیں حق تعالیٰ نے کھول دیں وہ کہتے ہیں جب کوئی شخص مجھ سے مسئلہ پوچھنے آتا ہے تو میں خدا تعالیٰ کو حاضر ناظر تصور کر کے سوچتا ہوں کہ آیا اس جواب پر اتنا اطمینان ہے یا نہیں کہ خدا کے سامنے دے سکوں۔ اگر اتنا اطمینان ہوتا ہے تو جواب دیتا ہوں ورنہ نہیں۔ ہم لوگ حق تعالیٰ کو حاضر و ناظر کیا سمجھتے ہیں صرف الفاظ ہیں اگر حاظر و ناظر سمجھتے تو ہماری اتنی جراتیں نہ بڑھتیں۔

ایک شخص کہتے تھے وہ ایک اسلامی بادشاہ سے ملنے کے لئے گئے سخت پہرے کے بعد تو کہیں ایوان کے احاطے کے اندر رسائی ہوئی جہاں سے آرام گاہ شاہی بہت فاصلہ پر تھا لیکن وہاں ایک بلند عمارت رفیع الشان تھیں جہاں کھڑکی میں بادشاہ سلامت بیٹھے تھے اور چاروں طرف دوربینیں لگی ہوئی تھیں کبھی ادھر دیکھ لیتے کبھی ادھر دیکھ لیتے۔ جوں ہی انہوں نے دروازہ میں قدم رکھا بس ایک ہیبت طاری ہوگئی ہر وقت یہی احتمال کہ شاید اس وقت ادھر دیکھتے ہوں۔ سو باوجود یہ کہ دیکھنا بالکل مشکوک تھا لیکن صرف اسی خیال سے کہ شاید دیکھ رہے ہوں قدم نہیں اٹھتا تھا۔ اور باوجود یہ کہ ادھر اُدھر عجیب و غریب ساز و سامان مجتمع تھے کہیں روشنی کہیں سبزہ کہیں پھلواری لیکن گردن پھیر کر نہیں دیکھ سکتے تھے اس واسطے کہ شاید نگاہے کند۔ ادھر ادھر دیکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ تعجب ہے اللہ تعالیٰ کی حاضر و ناظر ہونے کے یقین کا تو اثر نہ ہوا اور بادشاہ کے دیکھنے کے احتمال کا اثر ہوا اللہ تعالیٰ کے ساتھ تو یہ حالت ہونا چاہیے۔

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی شاید نگاہے کند آگاہ نباشی

(ایک پلک مارنے کی مقدار بھی محبوب حقیقی سے غافل مت ہو شاید کہ تم پر لطف کی نگاہ کریں اور تم آگاہ نہ ہو)
ہر وقت انہیں کو تکتے رہو جو شخص اس طرح سمجھے گا اس کو ساری مشکلیں اصلاح کے متعلق آسان ہو جائیں گی۔ اسی کو یہ بزرگ فرماتے ہیں یک چشم زدن الخ جو حاصل ہے مراقبہ اَلَمْ يَعْلَمْ بِأَنَّ اللّٰهَ يَرٰى (کیا اس کو یہ خبر نہیں کہ اللہ تعالیٰ دیکھ رہے ہیں) کا محض اہل قال ایسی اصلاح نہیں کر سکتے۔

اہل قال کا علاج

ہم لفظ پرستوں کی ایسی مثال ہے جیسے طبیب غیر واقف اصول کوئی مریض آیا اور اپنا حال کہنا شروع کیا کہا کہ مجھے زکام ہے اس نے گل بنفشہ لکھ دیا پھر کہا کہ کھانسی بھی ہے اس نے ملٹھی بھی لکھ دی۔ غرض جو جو مرض وہ بیان کرتا گیا وہ طبیب صاحب ایک ایک جز بڑھاتے رہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہ نسخہ کیا ہوگا مطبع مجتبائی کی فہرست ہوگی اور اتنے بڑے نسخے کو پئے گا کون۔

سنا ہے کہ مولانا شاہ عبدالعزیز صاحبؒ سکندرہ راؤ میں پہنچے وہاں ایک بیچارے نام کے طبیب کس مپرسی کی حالت میں تھے شاہ صاحب کو بخار ہو گیا ان طبیب کو بلوایا وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ اگر شاہ صاحب کی نظروں میں چڑھ گیا تو پھر خوب شہرت ہو جائے گی اور مطب چل جائے گا۔ بہت اہتمام کے ساتھ عمامہ باندھ کر عبا قبا پہن کر پہنچے۔ نبض دیکھ کر حالات پوچھ کر ہر شکایت کے لئے بہت سے اجزاء تجویز کرتے گئے اور ایک کھرے کا کھرا نسخہ لکھ دیا۔ شاہ صاحب نے نذرانہ بھی دیا بڑے خوش ہوئے اور آ کر شیخی بگھارنے لگے کہ شاہ صاحب نے ایسی قدر کی۔ شاہ صاحب کے شاگردوں میں بڑے بڑے قابل لوگ موجود تھے۔ نسخہ پڑھا گیا سب نے ہنسنا شروع کیا۔ شاہ صاحبؒ نے فرمایا کہ اہل فن کی بے قدری نہ کرنی چاہیے۔ مولوی حیدر علی صاحب جو مشہور مناظر ہیں اور طب بھی پڑھی تھی وہ سب سے زیادہ ہنسے لیکن شاہ صاحب نے اس نسخہ کے تیار کرائے جانے کا حکم دیا۔ نسخہ پتیلی میں پکایا گیا سیر دو سیر اجزاء تھے۔ شاہ صاحب نے کئی دن تک پیالے بھر بھر کر پئے۔ شاہ صاحب کے اخلاق ایسے وسیع تھے اس طبیب کی بڑی شہرت ہوگئی اب تو گویا شاہ صاحب نے فتوے پر الجواب صحیح (جواب ٹھیک ہے) لکھ دیا۔

بعضے طبیب تو ایسے ہوتے ہیں جیسا ذکر ہوا اور بعضے وہ ہیں کہ وہ اصل جز مرض کی دیکھ لیتے ہیں کہ بلغم یا صفرا بڑھ گیا ہے اور ایک مختصر اور جامع نسخہ لکھ دیتے ہیں اگر پچاس شکائتیں بھی پیش کی جائیں تو وہ یہی کہہ دیتا ہے کہ ہاں ہم نے سب کی اصلاح کر لی ہے۔ جاہل ناواقف مریض اس کے نسخہ کی ناقدری کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ذرا سے نسخہ میں اتنے امراض کی کیسے رعایت ہو گئی۔ حالانکہ وہ ان سب امراض کی جڑ کو سمجھ گیا ہے مگر ناواقف کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اتنی شکائتوں کا سبب کوئی ایسی ایک چیز ہے جس کا علاج کر لیا گیا ہے۔

ایک بوڑھے شخص کا قصہ ہے کہ اس نے ایک طبیب سے اپنا حال کہا کہ آنکھوں میں تیرگی ہے طبیب نے کہا بڑھاپے سے اس نے کہا سانس پھول جاتا ہے کہا یہ بھی بڑھاپے سے ہے پھر کہا بھوک نہیں لگتی کہا یہ بھی بڑھاپے سے غرض جو شکایت کی اس نے یہی جواب دیا کہ یہ بھی بڑھاپے سے ہے۔ آخر وہ بڈھا بگڑ گیا اور طیش میں آ کر اس طبیب کے ایک دھول رسید کی کہ تو نے ساری طب میں بس یہی پڑھا ہے کہ بڑھاپے سے۔ طبیب نے کہا بڑے میاں یہ بے جا غصہ بھی بڑھاپے ہی سے ہے۔ تمہارے اس مارنے کا بھی برا نہیں مانتا۔ بس اصل طبیب وہ ہے جو جڑ سمجھ جاوے سو اہل قال کا علاج تو اس حکیم کا سا ہے کہ جو ہر ہر مرض کے لئے ایک ایک جزو بڑھاتا گیا۔ کسی نے شکایت کی وسوسے بہت آتے ہیں ایک وظیفہ بتلا دیا پھر اس نے کہا کہ وظیفے میں بھی وسوسے آتے ہیں ایک دوسرا وظیفہ بتلا دیا۔ جب کہا اس میں بھی وسوسہ ستاتا ہے تو ایک تیسرا بتلا دیا۔ مگر وہاں وہی وسوسے موجود جتنا علاج کیا شکائتیں بڑھتی گئیں۔ علاجوں کی کثرت سے وہ سراپا دوا اور وظیفوں کی کثرت سے مجموع وظائف ہو گیا۔ یہ دیکھ کر دین سے وحشت ہونے لگی کہ خدا کی پناہ کیسی مصیبت ہے۔

اھل اللہ کا علاج

برخلاف اس کے ایک شخص ایسا ہے جو جڑ سمجھتا ہے وہ بس یہ کہہ دے گا کہ وسوسوں کی طرف التفات مت کرو اگر آتے ہیں آنے دو تمہارا کوئی نقصان نہیں۔ یہی حاصل ہے وارد فی الحدیث کا۔ ناواقف سمجھا کہ انہوں نے نہ لمبا چوڑا وظیفہ بتلایا نہ توجہ کے لئے سامنے بٹھلایا نہ کچھ کیا یہ کیا علاج ہو گیا کہتے ہیں کہ وسوسہ کا خیال نہ کرو۔ بھلا کیسے خیال نہ کریں معلوم ہوا کہ وہ معتقد ہی نہیں اگر کوئی معتقد ہوگا تو وہ یہی کہے گا کہ

؎ قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید (قلندر جو کچھ کہتا ہے دیکھا ہوا کہتا ہے)

اسی کو حضرت حافظ فرماتے ہیں۔

بہ مے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید کہ سالک بے خبر نبود زراہ و رسم منزلہا

(امر مباح جو بظاہر طریقت کے خلاف ہونے سے منکر معلوم ہوتا ہے اگر مرشد بتلا دے تو اس پر عمل کرے اس کو مضر نہ سمجھے بلکہ مفید سمجھے کیونکہ شیخ کو اس کے نشیب و فراز کا زیادہ تجربہ ہے)

هَلْ يَسْتَوِى الَّذِينَ يَعْلَمُونَ الخ (جاہل عالم برابر نہیں)

ایک صاحب نے مجھے لکھا کہ قبض شدید میں مبتلا ہوں جی نہیں لگتا وظیفے بھی بڑھائے نفلیں بھی بڑھائیں لیکن کچھ نفع نہیں ہوا۔ انہوں نے مرض کا مرض سے علاج کیا۔ جیسے کسی کو شربت نیلوفر پینے سے تو زکام ہوا اس نے اس کے علاج میں پھر شربت نیلوفر ہی پی لیا۔ میں بفضلہ سمجھ گیا میں نے کہا وظیفے نفلیں سب یک لخت چھوڑ دو خلوت بھی چھوڑ دو۔ دوستوں سے ملو جلو، ہنسو بولو، لکھنؤ کے قریب

رہتے تھے میں نے کہا لکھؤ آؤ عیش باغ کی سیر کرو چوک میں پھرو خوب میوے کھاؤ گناہ تو کیے جیو مت اور سب طرح کی تفریح کرو۔ ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ جس نے یہ باتیں بتلائی ہیں وہ بڑا اناڑی ہے لیکن اس پر عمل کرنے کے ساتھ ہی ان کا سب قبض رفع ہو گیا اور پھر خوب جوش وخروش اور ذوق وشوق پیدا ہوا۔ پھر میں نے کہا کہ بس اب پھر حجرے میں بیٹھئے۔ شگفتہ ہو گئے کھل گئے۔ باغ وبہار لے کر اندر بیٹھ گئے۔ اہل ظاہر نے ہر چیز کا الگ الگ علاج کیا۔ توحید میں کسی نے وسوسہ کیا اس کی دلیل بیان کر دی۔ قربانی میں وسوسہ کیا اس کی بھی دلیل بیان کر دی۔ داڑھی میں وسوسہ، پانچ وقت کی نماز کے تعین میں وسوسہ۔ ہر ہر حکم میں وسوسہ۔ سب کی دلیل بیان کر دی۔ مولانا سمجھے شفا ہو گئی۔ لیکن جب وہ پھر یاران طریقت کے جلسے میں پہنچا وہاں پھر ایک شبہ پیدا ہو گیا مولانا کا ذخیرہ سب ایک دم سے ختم ہو گیا سب مقدمات میں شبہ پڑ گیا۔

حضرت محی الدین بن عربی نے امام رازیؒ کو ایک خط لکھا کہ میں نے سنا ہے کہ تم ایک روز بیٹھے رو رہے تھے۔ کسی نے سبب پوچھا تو تم نے کہا کہ ایک مسئلہ فلسفہ کا میں تیس برس سے محقق سمجھے ہوئے تھا۔ آج اس کے ایک مقدمہ میں شبہ پڑ گیا۔ میں اس لئے رو رہا ہوں کہ تیس برس تک جہل میں مبتلا رہا اور اب بھی جو کچھ علم ہے اس کی بابت یقین نہیں کہ یہ صحیح ہے سو تم نے دیکھا اپنے علم کو ہمارے علم میں قیامت تک بھی کوئی شبہ نہیں پڑ سکتا۔ اس کو حاصل کرو امام نے پھر تصوف کی طرف توجہ کی۔ حضرت نجم الدینؒ سے بیعت ہوئے شغل شروع کیا۔ اس میں کوئی چیز اپنے اندر سے انہیں سرسر نکلتی ہوئی معلوم ہوئی شیخ سے عرض کیا انہوں نے کہا فلسفہ نکل رہا ہے۔ انہیں یہ گوارا نہ ہوا کہ اتنے دن کی حاصل کی ہوئی چیز ہاتھ سے جاتی رہے بولے نا صاحب میں یہ نہیں چاہتا کہ میرا فلسفہ نکل جاوے۔ یہ کہہ کر وہاں سے چلے آئے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں کی صحبت نے یہ اثر کیا کہ وہ حقیقت کو اجمالاً سمجھ کر کہتے ہیں

نهاية اقدام العقول عقال ۔۔۔ وغاية سعى العالمين ضلال

(تمام عقلوں کے قدموں کی انتہا عقال کی طرف ہوئی تمام دنیا والوں کی کوشش کا خلاصہ ضلال ثابت ہوا)

ولم نستفد من بحثنا طول عمرنا ۔۔۔ اى ان جمعنا فيه قيل بقال

(ساری عمر بجز بک بک اور قیل وقال کے کچھ حاصل نہ ہوا۔ عمر یونہی ضائع کی۔

حضرت مرتے وقت آپ کو علوم حقیقہ اور لفظیہ کی حقیقت معلوم ہوئی ہوگی مرتے وقت تو یہ معلوم ہی ہوگی یہیں معلوم ہو جاتی ہے۔ اہل اللہ کو کوئی شبہ ہی نہیں ہوتا یا نہیں رہتا بخلاف اہل قال کے۔

وجہ فرق یہ ہے کہ وہ ہر شبہ کا الگ الگ جواب نہیں دیتے۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص سو بیگہ زمین کو جس پر جھاڑ جھنکار کھڑے ہوئے صاف کرنا چاہتا

ہے تو اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ درانتی لے کر ایک طرف سے جھاڑوں کو کاٹنا شروع کر دیا سو درانتی منگائی گئیں اور سو آدمیوں کے حوالہ کی گئیں ایک درانتی کند ہو گئی وہ بدلی پھر دوسری کند ہو گئی اسے بدلنا پڑا۔ پھر تیسری کند ہو گئی ایک شخص آیا اس کے پاس دیا سلائی کا بکس ہے اس نے مٹی کا تیل چھڑکا اور دیا سلائی لگا دی۔ آناً فاناً سب بھڑ بھڑ جل گیا۔ درانتیوں سے ایک ماہ میں جا کر کہیں صفائی ہوتی اور پھر بھی ویسی نہیں یہاں ایک گھنٹہ میں سب زمین صاف ہو گئی اب اس میں ہل چلاؤ کھیتی بوؤ۔

اسی طرح اہل اللہ سے کوئی شکایت کرتا ہے کہ وسوسے آتے ہیں وہ کہتے ہیں محبت پیدا کرو اگر کہتا ہے کہ نماز میں ادھر ادھر کے خیالات آنے لگتے ہیں وہ پھر یہی کہہ دیتے ہیں کہ محبت پیدا کرو۔ عشق پیدا کرو واقعی کہاں درانتی اور کہاں آگ وہاں درانتی بھی کافی نہیں یہاں سب جھاڑوں کا ایک علاج یعنی (عشق و محبت) اسی کو حضرت مولانا رومیؒ فرماتے ہیں

ہر کرا جامہ ز عشق چاک شد ۔۔۔۔ اوز حرص و عیب کل پاک شد

(جس کو محبوب حقیقی کا عشق ہو جائے وہ حرص اور تمام نقائص اور اخلاق ذمیمہ سے بالکل پاک ہو جاتا ہے)

شاد باش ای عشق سودای ما ۔۔۔۔ دے طبیب جملہ علتہائے ما

(اے عشق تو ایسا ہے کہ تیری بدولت خیالات درست ہو جاتے ہیں اور تجھ سے سب امراض کا علاج ہو جاتا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں

عشق آں شعلہ است کو چوں بر فروخت ۔۔۔۔ ہر چہ جز معشوق باقی جملہ سوخت

(یعنی عشق وہ شعلہ ہے کہ جب وہ روشن ہوتا ہے تو سوائے محبوب کے سب کو فنا کر دیتا ہے۔ ہر چہ میں سب شامل ہے خواہ نماز میں شبہ ہو یا روزہ میں شبہ ہو

تیغ لا در قتل غیر حق براند ۔۔۔۔ درنگر آخر کہ بعد لا چہ ماند

لا الہ کی تیغ غیر اللہ کے ہلاک کرنے میں چلاؤ لا الہ کے بعد دیکھو کیا رہ گیا)

ماند الا اللہ باقی جملہ رفت ۔۔۔۔ مرحبا اے عشق شرکت سوز رفت

(یعنی الا اللہ باقی رہ گیا تمام فنا ہو گئے اے عشق عزت شرکت سوز تجھ پر آخرت کے سوائے محبوب حقیقی کے سب کو فنا کر دیا)

شرکت سوز ہے کسی کو شریک نہیں رکھتا کیونکہ

چو سلطان عزت علم بر کشد ۔۔۔۔ جہاں سر بجیب عدم در کشد

جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں۔

آفتاب کے سامنے سب ستارے ماند پڑ جاتے ہیں۔اسی طرح جب تجلی حق قلب پر ہوتی ہے واللہ سب چیزیں رخصت ہو جاتی ہیں۔جیسا آفتاب کے سامنے سب ماند ہو جاتے ہیں۔چاہے وہ چاند ہی ہو۔

ایک عارف کا قول ہے کہ اندھیری کوٹھڑی میں چوہے چھچھوندر سانپ بچھو سب نے آ کر گھیر لیا ساری رات لکڑیاں بجاتا پھرا لیکن نہ بھاگے بلکہ کہیں چوہیا نے پیر میں کاٹ لیا۔کہیں اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گر پڑے غرض ساری رات یہ مصیبت رہی لیکن موذیوں سے نجات نہ ہوتی۔دلائل کی حالت ان لکڑیوں کی سی ہے۔محبت حق کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک شمع روشن کر دی اس کے روشن ہوتے ہی سب سانپ بچھو چوہے چھچھوندر بھاگے چلے جا رہے ہیں اسی وقت میدان صاف ہو گیا۔ بات یہ ہے کہ یہ سب چیزیں روشنی میں نہیں ٹھہر سکتیں۔جہاں ظلمت ہوتی ہے وہیں رہتی ہیں۔ان کے دفع کرنے کا یہی طریقہ ہے کہ چراغ روشن کرو۔گنڈاسہ لکڑ کہیں کام دے سکتا ہے۔سو اہل اللہ کا علاج ایسا ہی ہے یعنی محبت حق جس وقت عظمت اور محبت حق تعالیٰ کی قلب میں سما جاتی ہے کچھ بھی شبہ نہیں رہتا۔ محققین نے یہی علاج تجویز کیا ہے کہ ہر حکم کو محبت سے قبول کرتے ہیں۔چاہے حکمت معلوم ہو یا نہ ہو۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ مجھے تعجب ہے ان احمقوں پر جو پوچھتے ہیں کہ قبر کا عذاب کیونکر ہو گا۔اس تحقیق کی کیا ضرورت ہے فکر تو اس کی چاہیے کہ اس سے نجات کا کیا طریقہ ہے اگر کسی پر مقدمہ فوجداری کا قائم ہو کر سزائے موت کا حکم ہو گیا ہو اور لوگ کہتے ہوں کہ اپیل کی بھی گنجائش ہے تو اس کو تو یہ مناسب ہے کہ برات کی کوشش کرے نہ یہ کہ اس فکر میں پڑ جائے کہ کس طرح موت ہو گی آیا پھانسی پر لٹکا یا تلوار سے گردن ماری جاوے گی اور یہ کہ پھانسی سے آدمی مر کیوں جاتا ہے۔گلا گھونٹنے کو موت میں کیا دخل ہے۔اس احمق سے کوئی یہ پوچھے کہ اگر ایسی تحقیقات میں پھانسی کا وقت آ گیا تو تجھے تیری سائنس کیا کام دے گی جو بات خود معلوم ہونے والی ہے اس کی تحقیق کیا۔

حضرت امام غزالی فرماتے ہیں کہ بس اس تحقیقات کو چھوڑ کر قبر کا عذاب کیونکر ہو گا اس کی تلاش کر کہ اس سے نجات کی سبیل کیا ہے۔اگر نجات ہو گئی اور کیفیت عذاب قبر کی نہیں معلوم ہوئی تو ہمارا ضرر ہی کیا۔ہم کہتے ہیں کہ نقصان ہی کیا ہو گا۔پھانسی سے رہائی ہو گئی اور یہ تحقیق نہ ہوا کہ کیونکر جان نکلی ہے تو اس کا ضرر کیا بخلاف اس کے اگر یہ تحقیق بھی ہو گیا مگر جان نہ بچی تو نفع کیا ہوا۔

ترک مالایعنی

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قربان جایئے ہم کو کیسی اچھی تعلیم فرمائی ہے کہ من حسن اسلام المرء ترک ما لا یعنیہ (مجمع الزوائد ۱۸/۸) (انسان کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ لایعنی (امور)

کو چھوڑ دے) جس کام سے کوئی غرض متعلق نہ ہواس کو چھوڑ و۔اگر حکمت کسی حکم کی نہ معلوم ہوئی تو اس پر ہمارا کون سا کام اٹکا ہے۔اگر بے حکمت سمجھے کرلیا تو حرج کیا ہوا۔

حکمت سے بحث کرنے والوں کا ایک عذر اور اس کا جواب

لوگ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہم مخالفین کا بھی تو کچھ جواب دیں تو کیا بس ان کے لئے یہی جواب ہے کہ ہر ہر حکم کی حکمت بتلائی جاوے۔ کہ یہ جواب دے دیا کرو کہ ہم عالم نہیں علماء سے پوچھو۔ پھر عالم لوگ آپ نمٹ لیں گے تم کس فکر میں پڑے؟

مولانا نعیم صاحب لکھنوئیؒ سے کسی شخص نے پوچھا کہ حضرت معاویہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی بابت کیا تحقیق ہے۔کون حق پر تھا۔انہوں نے فرمایا کہ یہ تمہارا سوال ہے یا کسی اور کا۔انہوں نے کہا کہ فلاں حافظ جی نے پوچھا ہے۔ دریافت فرمایا کہ وہ کیا کام کرتے ہیں کہا جوتے بیچتے ہیں اور تم کیا کرتے ہو عرض کیا میں کپڑا رنگتا ہوں۔آپ نے فرمایا کہ تم اطمینان رکھو تمہارے پاس یا حافظ جی کے پاس ان کا مقدمہ نہیں آوے گا۔تم جا کر اپنا کپڑا رنگو اور حافظ جی اپنے جوتے بیچیں۔تمہارے پاس مقدمہ آوے تو کہہ دینا کہ ہمارے حد اختیار سے خارج ہے۔ ان کے مقدمہ کا فیصلہ اللہ میاں کے یہاں ہو رہے گا۔تمہیں اس کی تحقیقات کی ضرورت ہی نہیں۔تم اپنے کام میں لگو کس جھگڑے میں پڑے۔اگر کوئی ادنیٰ درجے کی رعایا سے پوچھے کہ وزیر کوئی جرم کرے تو اس کی کیا سزا ہے تو وہ یہی کہے گا کہ میرے پاس اس کا مقدمہ ہی نہ آوے گا۔میں کیا جانوں۔اسی طرح جن کے پاس حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کا مقدمہ جاوے گا وہ خود جانتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیے۔عوام کو کیا بحث؟

علماء سے شکایت

مگر علماء کے اخلاق نے عوام کے دماغ کو خراب کر دیا ہے میں تو ایسے علماء ہی پر الزام لگاتا ہوں

ہر کس از دست غیر نالہ کند   سعدی از دست خویشتن فریاد

یعنی ہر شخص دست غیر سے نالاں ہے اور سعدی اپنے ہاتھ سے یعنی ہر شخص عوام کی شکایت کرتا ہے مگر مجھے علماء کی شکایت ہے۔

اگر کسی نے حکمتیں پوچھیں بس انہوں نے حکمتیں بیان کرنا شروع کر دیں۔اس کے بعد کہیں اس میں شبہ کہیں اس میں شبہ البتہ اگر کسی قانونی مولوی سے کوئی حکمتیں پوچھے وہاں صاف جواب ملے گا کہ حکم پوچھو حکمت نہ پوچھو۔

ایک شخص نے مجھے لکھا کہ فلاں حکم شرعی میں کیا حکمت ہے میں نے پوچھا کہ آپ کے سوال عن

الحکمت (حکمت کے دریافت کرنے) میں کیا حکمت ہے۔تم خدا تعالیٰ کے فعل کی ہم سے حکمت پوچھتے ہو۔ہم تمہارے ہی فعل کی حکمت تم سے پوچھتے ہیں اور ہم نہیں بتلاتے کہ کیا حکمت ہے جاؤ۔

کئی دن ہوئے ایک صاحب نے پوچھا کہ فلاں فتویٰ پر آپ کی مہر ہے میں نے کہا کہ آپ کیوں تفتیش کرتے ہیں۔کیا آپ میرے انسپکٹر ہیں یہ کیوں پوچھتے ہو اس پر تمہارا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ سے تعلق ہے اور لوگ پوچھتے ہیں۔میں نے کہا آج سے تعلق قطع کر دو دل سے محبت نکال دو اور اگر محبت رکھتے ہو تو ہمارا یہ کہنا مانو کہ یہ سوال مت کرو۔علماء نے عوام کے اخلاق خراب کر دیئے۔

ایک صاحب کا جو کہ سب انسپکٹر تھے میرے پاس خط آیا انہوں نے یہ لکھا کہ کافر سے سود لینا کیوں حرام ہے۔ میں نے جواب میں لکھ بھیجا کافر عورت سے زنا کیوں حرام ہے۔اس پر شکایت کا خط آیا کہ علماء کو ایسا خشک جواب نہ دینا چاہیے۔ میں نے اس خط کا کچھ جواب نہیں دیا۔

اتفاق سے ایک مقام پر وہ مجھ سے ملے تو میں نے انہیں پہچانا نہیں وہ مجھے پہچانتے تھے انہوں نے مجھ سے اس خط کا ذکر کر کے کہا کہ میں ہی وہ شخص ہوں جس نے وہ خط بھیجا تھا میں نے کہا آہا آپ سے تو بڑی پرانی بے تکلفی نکلی۔ کہنے لگے آپ نے ایسا خشک جواب کیوں دیا تھا؟ میں نے کہا کہ آپ سب انسپکٹر ہیں مجھے یہ بتلایئے کہ آیا آپ کا برتاؤ سب کے ساتھ خصوصیت کا ہے یا بعضوں کے ساتھ ضابطہ کا بھی ہے انہوں نے کہا کہ سب کے ساتھ خصوصیت کا برتاؤ نہیں ہو سکتا جو خاص ملنے والے ہیں ان سے خصوصیت کا معاملہ ہے باقی سب سے محض ضابطہ کا۔

میں نے کہا تو بس آپ بھی یہی سمجھ لیجئے کہ ہم لوگ بھی یوں ہی کرتے ہیں صرف بے تکلفوں سے ہمارا خصوصیت کا برتاؤ ہے۔باقی اوروں سے ضابطہ کا۔چونکہ آپ سے پہلے ملاقات نہیں تھی اس لئے آپ کے حالات وخیالات کا اندازہ نہیں ہو سکتا تھا۔اس لئے ہم نے ضابطہ کا جواب دیا۔لیکن اب آپ کے پاس ایسا جواب نہ پہنچے گا۔

مگر جیسا کہ اس ملاقات کا اثر میرے اوپر ہوا ہے آپ پر یہ اثر ہوگا کہ اب آپ بھی ایسا بیہودہ سوال کبھی نہ کریں گے۔ میں نے سوچا کہ جب میں اپنے کو مقید کر رہا ہوں تو انہیں بھی کیوں نہ مقید کروں۔انہیں کیسے یوں ہی چھوڑ دوں لوگ اب ایسے ہی فضول سوالات کرنے لگے ہیں۔

کیرانہ کا قصہ ہے کہ ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ نماز پانچ وقت کیوں مقرر ہوئی اس میں کیا مصلحت ہے۔میں نے ان سے پوچھا کہ تمہاری ناک آگے کیوں لگی ہے پیچھے کیوں نہ لگی یہ سن کر بڑے دنگ ہوئے اور کہنے لگے کہ اللہ میاں نے ایسی ہی بنادی۔ میں نے کہا کہ میں قسم کھاتا ہوں کہ نماز بھی میرے ابا جان کی بنائی ہوئی نہیں ہے یہ بھی اللہ میاں کی ہی بنائی ہوئی ہے۔کیا لوگوں کا یہ

خیال ہے کہ یہ احکام مولویوں کے تصنیف ہیں۔

ایک بڑھیا کی حکایت یاد آئی جب حج میں صفا مروہ کے دو تین چکر لگا چکی تو ہاتھ جوڑ کر مطوف سے کہتی ہے کہ مولوی صاحب اب چلا نہیں جاتا اللہ کے واسطے معاف کر دو۔ اس نے جواب دیا کہ میرے گھر کی تو بات نہیں مت چل تجھے اختیار ہے غرض احکام شرعیہ سب اللہ میاں کے بنائے ہوئے ہیں۔ انہیں سے حکمتیں پوچھ لینا وہ یا تو زبان سے جواب دیں گے یا ہاتھ سے اور زبان سے کیوں دینے لگے ہاتھ سے ہی جواب دیں گے۔ فقط اتنی بات کہ خدا کا حکم ہے یا نہیں یہ تو تحقیق کر لو۔ پھر یہ مت دیکھو کہ اس میں کیا حکمتیں ہیں۔ حکمتیں مقرر کرنے والا جانے ہمیں امتثال سے مطلب۔ اس طرز کی برکت سے ان شاء اللہ ایک دن وہ بھی آ جاوے گا کہ حکمتیں اور اسرار بھی معلوم ہو جائیں گے۔

ثمرہ اطاعت

شاید کسی کو بہت ہی شوق ہو۔ میری تقریر سنکر وہ کہتا ہو گا کہ انہوں نے تو بالکل ہی بند کر دیا جی میں ارمان ہی رہ گیا۔ سو میں بشارت دیتا ہوں کہ اگر اسرار جاننے کا شوق ہے تو یہ طرز یعنی اطاعت اختیار کیجئے۔ میں وعدہ بلکہ دعویٰ تجربہ کی بناء پر کرتا ہوں کہ اطاعت سے ایک نور اس کے قلب میں ایسا پیدا ہو گا جس سے یہ حالت ہو گی کہ

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا

(اپنے اندر بے کتاب و بے مددگار و استاد انبیاء کے جیسے علوم دیکھو گے) خود بخود اس کے قلب میں اسرار جھلکیں گے۔

اس کو ایک مثال سے سمجھئے کہ ایک شخص بغاوت کرتا ہے اور پھر چاہتا ہے کہ میں شاہی اسرار پر مطلع ہو جاؤں خزانہ شاہی کے حالات معلوم ہو جائیں بلکہ شاہی بیبیوں کے خط و خال اور حسن و جمال تک کا مشاہدہ کر لوں تو بادشاہ اس کے اتنے لگاوے گا کہ یہ بھی یاد رکھے گا۔ اگر اسرار معلوم کرنا چاہتے ہو تو فدا ہو جاؤ بادشاہ پر۔ فدوی جو آج کل لکھا جاتا ہے یہ شاہی زمانہ میں بڑا رتبہ تھا جس سے بہت ہی زیادہ خصوصیت ہوتی تھی اس کو فدوی کا منصب دیا جاتا تھا۔ اس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ بادشاہ کے فدائیوں اور جانثاروں میں ہیں۔ پرانے زمانہ کی مہریں میں نے دیکھی ان میں بعضے ناموں کے ساتھ فدوی لکھا ہے۔ یہ بڑی خصوصیت کا رتبہ تھا عاشق کا ہم معنیٰ ہے تو بس تم بھی حق کے فدوی ہو جاؤ۔ کامل اطاعت اور جان نثاری کی شان پیدا کرو۔ عجب نہیں کہ وہ دن آ دے کہ بادشاہ خوش ہو کر خود ہی کہے کہ آؤ میں تمہیں اپنا خزانہ دکھلا دوں۔ اور خزانہ شاہی پر لے جا کر کھڑا کر دے کہ یہ جواہرات ہیں اور یہ محلات ہیں اور عجب نہیں جو زیادہ مہربان ہو اور زیادہ اعتماد ہو جاوے تو محل سرائے

میں بھی لے جا کر دکھلا دے کہ یہ ہماری بیبیاں یہ ہماری باندیاں ہیں وہاں تمام اسرار اسے نظر آ جاویں گے۔ بس اطاعت ہی اس کا طریقہ ہے۔ خدا جانتا ہے ترک استدلال سے اطلاعیں ہوئی ہیں جس کو ہوئی ہیں اسرار منکشف ہوئے ہیں خودرائی کے چھوڑنے سے حضرت عارف شیرازی فرماتے ہیں

فکر خود وزائے خود در عالم رندی نیست　　　　کفر ست دریں مذہب خود بینی وخودرائی

(یعنی عالم عاشقی میں اپنی فکر ورائے بالکل بیکار ہے اس مذہب میں خود بینی اور خودرائی کفر ہے)

دیکھئے خودرائی کو کفر کہتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے کو فدا کر دیا اور بلا تفتیش اور بلا چون و چرا کامل اطاعت اختیار کی ان کو حق تعالیٰ اپنے اسرار پر مطلع کر دیتے ہیں۔ حسب استعداد یہ میں نہیں کہتا کہ تمام اسرار پر مطلع کر دیتے ہیں لیکن اتنا ضرور کر دیتے ہیں کہ ان کو اطمینان ہو جاتا ہے کوئی شبہ وشک نہیں رہتا۔

حقیقت صدیقیت

اور اس مرتبہ کا نام صدیق ہے۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہی مرتبہ تھا۔ ایسا شخص نہ معجزہ کا طالب ہوتا ہے نہ کرامت کا اس کا قلب گواہی دینے لگتا ہے کہ یہ حق ہے اس کو کبھی وسوسہ نہیں ہوتا۔ حضرت صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نبی ہوں آپ نے فوراً تصدیق کی اور پڑھا۔

اشهد ان لا اله الا الله و اشهد ان محمد اعبده و رسوله'

(میں گواہی دیتا ہوں کہ بجز اللہ تعالیٰ کے کوئی معبود نہیں اور گواہی دیتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں) حضرت عبداللہ بن سلام کہتے ہیں:

فلما تبينت وجهه عرفت انه' ليس بوجه كذاب

(یعنی جبکہ آپ کا چہرہ مبارک ظاہر ہوا تو میں پہچان گیا کہ یہ چہرہ جھوٹے کا نہیں ہو سکتا) طلب سے بھی صدیقیت کی شان پیدا ہو جاتی ہے جیسا عبداللہ بن سلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھتے ہی فرمایا کہ یہ چہرہ جھوٹے کا نہیں ہے سچ ہے

؎ نور حق ظاہر بود اندر ولی　　　　نیک بیں باشی اگر اہل ولی

(ولی میں انوار الٰہی نمایاں ہوتے ہیں مگر اس کا ادراک اہل دل کو ہوتا ہے) اس کا ترجمہ مولوی ابوالحسن صاحب نے کیا ہے۔

؎ مرد حقانی کی پیشانی کا نور!　　　　کب چھپا رہتا ہے پیش ذی شعور

اھل کمال کی پہچان

اور یہاں میں ایک بات قابل یاد رکھنے کی بتلاتا ہوں کہ ایسی شہادت ہر شخص کے قلب کی معتبر نہیں ہے

بلکہ اہل دل کی معتبر ہے یعنی جس کی طرف علماء صلحاء اتقیاء متوجہ ہوں وہ درویش کامل ہے اور جس کی طرف عوام زنا کار شرابی اہل مال وجاہ رجوع ہوں وہ درویش نہیں۔ اہل تقویٰ کی آنکھ میں جو سما گیا وہ کامل ہے، بہت شعبدہ باز مکار اس زمانہ میں ایسے پیدا ہو گئے ہیں جن کی طرف عوام ہجوم کرتے ہیں ایسے ایسے سائل گداگر آتے ہیں کہ ڈیوڑھی پر کھڑے بتلا دیتے ہیں کہ دیکھو فلانی الگنی پر یہ کپڑا پڑا ہے ہم وہی لیں گے لوگ ہیبت کے مارے لا کر دے دیتے ہیں۔ کہ شاہ صاحب بڑے غیب دان ہیں حالانکہ وہ غیب دان نہیں بلکہ عیب دان ہیں عوام ایسے کو سمجھتے ہیں کہ بڑا بزرگ ہے گھر کی بات بتلا دی اگر بزرگ ہوتے تو بھیک کیوں مانگتے۔

ایک ایسے ہی شاہ صاحب ہمارے دروازے پر پہنچے اور صدا لگائی اندر سے کچھ آٹا بھیجا گیا لیکن آٹا بھلا وہاں کیا قبول ہوتا لمبی چوڑی فرمائشیں شروع کیں۔ میں اوپر تفسیر لکھ رہا تھا۔ دیر تک جھک جھک چق چق ہوتی رہی۔ میرا جی گھبرایا بالآخر خود مجھے نیچے آنا پڑا دیکھا تو ایک نہایت وجیہ شخص ہیں۔ بڑا چوغہ زیب تن کئے ہوئے لنگی باندھے ہوئے۔ بڑا سا عمامہ باندھے تسبیحیں بہت سی گلے میں ڈالے ہوئے عصا ہاتھ میں لئے جیسے کوئی شیخ المشائخ۔ میں نے کہا شاہ صاحب کیا تکرار ہے کہا ہم نقد لیں گے ہم آٹا نہیں لیتے۔ میں نے کہا شاہ صاحب جس کو جو توفیق ہو۔ وہی لے لینا چاہیے ہمیں آٹے کی توفیق ہوئی اسی کو قبول فرما لیا جاوے۔ میرے پاس کوئی عبا نہیں ہوتی۔ قبا نہیں ہوتی۔ سادہ کرتہ پاجامہ پہنتا ہوں۔ مجھے انہوں نے دھمکانا شروع کیا اور بڑے زور میں آ کر پڑھا

؎ ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست — شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

(ہر شخص کو خالی تصور نہ کرو شاید کہ کشف و کرامت اور محبت الٰہی سے لبریز خدا رسیدہ اور قطب و ابدال ہو)

میں نے کہا کہ جناب آپ کو بھی تو یہی خیال کرنا چاہیے کہ

؎ ہر بیشہ گماں مبر کہ خالی ست — شاید کہ پلنگ خفتہ باشد

(ہر شخص کو خالی گماں نہ کرو شاید کشف و کرامت اور محبت الٰہی سے لبریز خدا رسیدہ اور قطب و ابدال ہو)

پھر تو شاہ صاحب بڑے چکرائے اور سمجھے کہ یہ تو طالب علم نکلا۔ اس سے بے ڈھب پالا پڑا۔ پھر میں نے سختی کے ساتھ کہا کہ آپ کی عقل ماری گئی ہے آپ نے میری نرمی کی قدر نہ کی اب یا تو سیدھی طرح سے اپنا راستہ لیجئے ورنہ میں کان پکڑ کر باہر کر دوں گا بس پھر دم بھی نہیں مار چکے چلے گئے۔ ایسوں کا یہی علاج ہے۔

شاہجہاں پور میں ایک بنا ہوا فقیر آ پہنچا پٹھانوں کے پاس آ کر کہا کہ میں یہاں قطب ہو کر آیا ہوں۔ مجھ پر ایمان لاؤ۔ پٹھان بیچارے سیدھے سادھے ہوتے ہیں انہوں نے کہا اچھا بھائی تم قطب سہی ایک پٹھان بڑے چلتے ہوئے تھے ان کے پاس بھی جا کر یہی کہا کہ میں یہاں قطب ہو کر

آیا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ ہاں آپ قطب ہوں گے لیکن میں تصدیق نہیں کر سکتا کیونکہ آپ سے پہلے میں یہاں کا قطب تھا۔ میرے پاس آپ کے قطب ہونے کی اطلاع نہیں پہنچی بلا اطلاع میں آپ کو چارج نہیں دے سکتا۔ یا تو آپ اپنی تقرری کی چٹھی میرے پاس بھجوایئے ورنہ میں سمجھوں گا کہ آپ باغی ہیں اور شہر سے پٹوا کر نکلوا دوں گا۔

غرض انہوں نے ایسا آڑے ہاتھوں لیا کہ اس کو پیچھا چھڑانا مشکل پڑ گیا۔ اور سوچا کہ بھائی یہاں دال نہیں گلے گی۔ اور دوسرے ہی دن غائب ہو گئے۔ اس خوف سے کہ کہیں پٹ نہ جاؤں ساری قطبیت ختم ہو گئی۔

اعتقاد عوام

مگر عوام الناس کے اعتقاد کی یہ کیفیت ہے کہ میں ایک دفعہ مسجد سے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص ننگ دھڑنگ لنگی زمین پر بچھائے ہوئے اس پر بیٹھا ہے اور مجمع کا مجمع مسلمان ہندو چاروں طرف حلقہ باندھے کھڑے ہیں جیسے شمع کے گرد پروانہ غور کیا تو یہ وہی شخص تھا جس نے ہماری مسجد میں تھوڑی دیر پہلے آ کر چھڑکاؤ کیا تھا اس وقت تو لنگی باندھے ہوئے تھا اور باہر لنگی اتار کر ننگا جا بیٹھا۔ خدا کی مار پھر عصر کے وقت مع لنگی کے مسجد میں موجود میں نے پوچھا کہ تم بلا لنگی کے باہر کیوں بیٹھے تھے۔ بس اس پوچھنے پر خفا ہو کر چلے گئے بعض کا گمان تھا کہ قطب ہے۔ اگر ایسے ایسے لوگ بھی قطب ہونے لگے تو پھر دنیا میں کوئی اہل باطل ہی نہیں۔ آج کل یہ حالت ہے کہ جو جتنا شریعت سے دور اتنا ہی وہ خدا رسیدہ اور مقبول اور جو شخص جتنا شریعت سے قریب بس ملا ہے۔

یاد رکھئے جس کو آنکھوں والے کہہ دیں کہ یہ کامل ہے وہی کامل ہے ورنہ ایسا ہی ہے جیسا اندھوں نے ہاتھی کا حلیہ بیان کیا تھا۔ اندھوں کی آنکھیں تو ہاتھ میں ہوتی ہیں اندھوں کے شہر میں ایک ہاتھی کہیں سے پہنچ گیا جلسہ ہوا کہ تحقیقات ہو گی ہاتھی کیسا ہوتا ہے ایک ایک کر کے سب پہنچے اور ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر حلیہ دریافت کیا ایک نے آ کر کہا کہ سانپ کے مشابہ ہوتا ہے اس نے سونڈ ٹٹولی تھی دوسرا بولا نہیں مورچھل کی طرح ہوتا ہے اس کا پونچھ پر ہاتھ پڑا ہو گا۔ تیسرا آیا کہ پنکھے کی مانند ہوتا ہے اس نے کان دیکھا تھا۔ ایک نے کہا نہیں تخت کے مشابہ ہوتا ہے اس نے کمر دیکھی تھی پھر آپس میں خوب لڑائی ہوئی۔ اگر کوئی سوانکھا وہاں ہوتا تو وہ کہتا کہ سب جھوٹے ہو اور سب سچے ہو۔ سب نے ایک ایک جز دیکھا ہے پورا ہاتھی کسی نے نہیں دیکھا۔ اسی کو حضرت حافظ فرماتے ہیں۔

؎ جنگ ہفتاد دو ملت ہمہ را عذر بنہ   چوں نہ دیدند حقیقت رہ افسانہ زدند

(سوائے طریق سنت کے تمام طرق ڈھکوسلے اور باطل ہیں)

سو آنکھیں اطاعت کی برکت سے کھلتی ہیں ایسا ہی شخص خدا کو بھی اور خدا والوں کو بھی پہچانتا ہے حکموں کو بھی جانتا ہے اور ان کی حکمتوں کو بھی گو اجمال ہی کے درجہ میں سہی لیکن اس قدر علم ضرور دیدیا جاتا ہے کہ اس کی تسلی ہو جاوے۔ تسلی داد ہر یک را برنگے

(ہر ایک کو اس کی ضرورت کے موافق علم دے کر تسلی عطا کی ہے)

ہمیں ضرورت صرف اتنے ہی علم کی ہے کہ شبہات رفع ہو جاویں البتہ انبیاء کو زیادہ علم کی ضرورت ہے۔ سو اطاعت کی برکت سے اتنا علم ضرور ہو جاتا ہے کہ پھر شبہ نہیں ہوتا۔ اہل اللہ کو دیکھا انہیں وساوس کبھی نہیں آتے۔ وساوس کا علاج سوائے اطاعت و فنا کے کچھ نہیں خوب سمجھ لو۔

روح ارواح

اور اس کے متعلق ایک اور ضروری بات سمجھئے دیتا ہوں کہ یہ برکت اطاعت میں جب ہوگی کہ اس کو بقصد اطلاع اسرار نہ اختیار کیا جاوے ورنہ کچھ بھی نہ ہوگا۔ یہ تو غرض کے واسطے اطاعت ہوئی۔

جیسے کوئی بادشاہ کے یہاں صبح و شام ہر روز دو بار حاضری دے آیا کرتا ہے اور لوگوں کے پوچھنے پر کہہ دیتا ہے کہ میں اس خیال سے جایا کرتا ہوں کہ ہمیں خزانہ شاہی کا حال معلوم کرنا ہے۔ شاید مہربان ہو جاوے اور خزانہ میں آنے جانے کی ممانعت مجھ سے اٹھا دی جاوے۔ خفیہ پولیس نے خبر لگا کر بادشاہ کو اس کے مقصود سے مطلع کیا کہ حضور یہ آپ کا طالب نہیں ہے آپ کے اسرار معلوم کرنا چاہتا ہے اس کو بھید لینا ہے آپ کے خزانوں کا عجب نہیں بادشاہ اس کی اس حرکت پر اسی دن حکم دے دے کہ دربار کی حاضری بند ایسے شخص کو ہرگز نہ آنے دیا جاوے مگر بادشاہ کو تو اس کی نیت کی اطلاع خفیہ پولیس کے ذریعے سے ہوئی۔ اور اللہ تعالیٰ کو تو بلا واسطہ اطلاع ہے اگر اس غرض سے اطاعت کسی نے شروع کی کہ اس کو اسرار کی اطلاع ہو جاوے تو یہ غرض کی اطلاع ہوئی پھر نہیں ہوگی اطلاع۔

اطاعت اطاعت کی غرض سے کرنا چاہیے اسرار کا قصد ہی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ بقدر آپ کی تسلی کے اسرار کی بھی اطلاع کر دیں گے۔ بس طریق یہ ہے کہ جس کو اہل اللہ نے تجویز کیا ہے اس لئے وہ اسرار قصداً نہیں بیان کرتے سب جوابوں کا جواب یہی دیتے ہیں کہ ہم نہیں جانتے یا ہم نہیں بتلاتے۔ بجز اس کے کہ مالک اور محبوب کا حکم ہے کرنا چاہیے اور یہی وہ معنی ہے جو اعمال کے سب ارواح کی روح ہے۔ اور جو منشاء ہے اس وعظ کے روح الارواح کے ساتھ مسمی ہونے کا۔ پس اصل جواب مشترک تو اس سوال کا جو کہ شروع وعظ میں مذکور ہے کہ احکام میں کیا مصلحتیں ہیں یہی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہر عمل اور حکم میں جدا جدا اسرار اور مصالح بھی ہیں جو محققین کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ سو اس پر تو سب کا اتفاق ہوا کہ احکام میں مصالح ہیں۔

غیر محققین کی غلطی

لیکن ان مصالح کے متعلق دو جماعتوں میں دو قسم کی غلطیاں واقع ہو رہی ہیں ایک ان میں جو محض اہل ظاہر ہیں ایک ان میں جو محض اہل باطن ہیں۔ ان ہی دو جماعتوں کو میں نے شروع وعظ میں بلفظ بعض علماء تعبیر کیا ہے اور ان کے مقابل ایک تیسری جماعت جو محققین ہیں وہ ان سے محفوظ ہیں اور ان کا مسلک وہی فیصلہ ہے ان اہل اختلاف کی اغلاط کا اس وقت ان ہی دونوں غلطیوں کی اصلاح مقصود ہے اور وہ ایک معرکہ کی بات[1] ہے۔

اور اس وقت اسی غرض سے اس آیت کی تلاوت کی گئی ہے۔

بیان اس کا یہ ہے کہ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ شرائع میں حکمتیں ہیں جن کے دوسرے نام روح اور مغز اور جوہر اور حقیقت اور اسرار ہیں۔ مگر باوجود اس اتفاق کے ان کے ساتھ معاملہ غیر محققین کا مختلف ہوا البتہ محققین جو کہ جامع ہوتے ہیں ظاہر و باطن اور صورت و حقیقت کے وہ حکمت باطنی اور صورت ظاہری دونوں پر عمل کرتے ہیں۔ مثلاً صورت بھی بناتے ہیں نماز کی اور اس کی حکمت کہ توجہ الی اللہ ہے، جو اس کا مغز ہے اس کا بھی اہتمام کرتے ہیں پس وہ دونوں کو جمع کرتے ہیں۔

باقی غیر محققین میں سے جو محض اہل قال ہیں وہ یہ غلطی کرتے ہیں کہ عمر بھر صورت ہی پر اکتفا کرتے ہیں روح یعنی توجہ الی اللہ کی طرف التفات نہیں کرتے۔ نہایت نادان ہیں کہ نماز پڑھتے ہیں سب کچھ ہے سمت قبلہ بھی وضو بھی رکوع بھی سجدہ بھی مگر مقصود اعظم کی فکر نہیں نہ توجہ اور نہ اس کی تحصیل کی کوشش۔ بس ہم سوالوں کی نماز یہ ہے پھر سمجھتے ہیں کہ کامل نماز ہے مگر یہ غلطی محض عملی ہے اور اس کے ساتھ ہی باطن کے وہ منکر نہیں۔

اب رہ گئے وہ غیر محققین جو محض اہل باطن سمجھے جاتے ہیں وہ صوفیہ منکرین ہیں۔ ظاہر شریعت کے ان کی حالت یہ ہے کہ انہوں نے صرف باطن کو دیکھا۔ انہوں نے سمجھا کہ مقصود اصلی ہے انہوں نے صورت کو بالکل ہی اڑا دیا۔ انہوں نے سمجھا کہ نماز رکوع سجدہ پوست ہے مغز نہیں مقصود محض مغز ہوتا ہے پوست حذف کر دیا جاوے انہوں نے توجہ کو کافی سمجھا لہٰذا صورت ارکان کو انہوں نے بے وقعت قرار دیا حتیٰ کہ بعضوں نے صاف کہہ دیا کہ نماز بہیئت کذائیہ فرض نہیں۔

اسی طرح ستر عورت کی روح لباس تقویٰ عن الحرام (حرام سے پرہیز کرنا) قرار دے کر اور اس کو اپنے نزدیک حاصل کر کے سمجھے کہ ظاہر بدن کا ڈھکنا فرض نہیں برہنہ رہنا جائز ہے۔ روزہ کی حقیقت قوت بہیمیہ کا توڑنا سمجھے اس کو اپنے زعم میں توڑ ڈالا اب ضرورت روزہ کی نہیں۔ حج کی روح معیت مع اللہ اور کیفیت محبت و عشق کی نکالی اور بزعم خود کیفیت عشق و محبت کے حاصل کر کے اپنے زعم میں جو حج کا

---

[1] اور اتفاق سے اس میں جواب شافی بھی ہے اس سوال کا جواب رسالہ الکاشف الاسرار میں دیا گیا ہے جس سے غلطیوں کا زیادہ اندیشہ ہے۔

مقصود تھا وہ حاصل کر لیا اور اپنے مشرب کے لئے بزرگوں کے کلام زود جود سے استدلال کیا اور اپنے مذاق پر ڈھال کر تمام احکام پر ایسا ہی تصرف کیا اور شریعت ظاہرہ کو اڑا دیا۔

اور اہل ظاہر پر طعن کیا کہ زکوٰۃ پر خوش ہیں حالانکہ جب تک حب مال نہ زائل کریں تو سب بیکار ہے۔ غرض اہل صلوٰۃ اہل زکوٰۃ پر طعن کئے اور ان پر ہنسے۔ جس کا انجام ان کے لئے کفر اور دوسروں کے لئے مطلق العنانی ہوا۔ پھر انہوں نے تو ریاضت مجاہدہ کے بعد یہ کیا۔ دوسروں نے بلا رضایت نماز روزہ چھوڑ کر فسق و فجور اختیار کیا۔ طوائفوں میں ڈھیرے منہ کالا کیا اور کسی نے اعتراض کیا تو کہہ دیا کہ میاں ہمہ اوست کون کرتا ہے کون کراتا ہے۔ ایسے لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کوشش کو مٹانا چاہا لیکن اسلام کے حافظ حضرت حق ہیں۔ ان کا وار چلا نہیں۔ انہوں نے کوتاہی نہیں کی شریعت بزبان حال ان سے خطاب کر رہی ہے

قتل ایں خستہ بشمشیر تو تقدیر نبود ورنہ ہیچ از دل بے رحم تو تقصیر نبود

تم نے تو کسر نہ چھوڑی میرا مٹنا مقدر نہ تھا نہ مٹا سکے خدا کا ہاتھ میرے سر پر تھا خدائی چراغ کو کوئی نہیں بجھا سکتا۔ پس ایک جماعت نے روح کی طرف التفات نہیں کیا اور ایک نے صورت کی طرف۔

درجات روح اعمال

لیکن پھر بھی ان دونوں میں تفاوت عظیم ہے۔ جنہوں نے روح کی طرف التفات نہیں کیا انہوں نے روح کا انکار نہیں کیا اور جنہوں نے صرف روح کو لیا انہوں نے صورت کا انکار کیا۔ نیز جنہوں نے روح کی طرف التفات نہیں کیا وہ روح کو بالکل چھوڑے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ ایک باریک بات سمجھنے کے قابل ہے یعنی روح کے درجات متفاوت ہیں۔ صوفیہ نے روح کے بعض درجات کو ذکر کیا ہے۔ رمضان کے وعظوں میں میں نے انہیں ارواح کو بیان کیا ہے لیکن ارواح میں ان کے علاوہ اور مراتب بھی ہیں گو ان سے ضعیف ہوں جیسے انسان زندہ ہوتا ہے روح حیوانی سے اور اس کے مراتب مختلف ہیں۔ ایک پہلوان قوی الجثہ کے اندر روح ہے اس کی روح ایسی قوی ہے کہ چلتا پھرتا شہ زوروں کو اٹھا کر پٹک دیتا ہے۔ سیر سیر بھر کھا جاتا ہے پیسوں کو مل دیتا ہے ایک ایسے بیمار کی روح ہے جو چار برس سے مدقوق ہے اور اس کی دق درجہ ثالث کو پہنچ گئی ہے۔ کھانسا بھی نہیں جاتا۔ آنکھ کھولنے میں بھی تکلیف اس کی روح بہت ضعیف ہے۔ لیکن ایسی باقدر ہے کہ اس کی خاص طور سے حفاظت کی جاتی ہے اس کو صدمات سے بچایا جاتا ہے۔ اس کی ایسی قدر ہے کہ وہ خود ہی چار دن بعد مرنے والا ہو۔ لیکن اگر کوئی اس کو مار ڈالے تو پھانسی ہوگی۔ قوی الجثہ پہلوان اور مریض مدقوق دونوں کے مار ڈالنے میں ویسے ہی پھانسی ہوگی۔ بلکہ جو ایسے مریض کو مار ڈالے تو اس کو علاوہ پھانسی کے یہ بھی ملامت کی جاوے گی کہ شرم نہیں آئی مرتے کو مارا قانون کے مرتبے میں پھانسی اور

رنج کے طور پر ملامت۔ پس ایسا مریض گو کمزور ہے لیکن روح سے خالی نہیں گو روح ضعیف سہی۔

اسی طرح اعمال کی روح کو سمجھو۔ پس منکرین ظاہر کہتے ہیں کہ صورت کو لے کر بیٹھے ہیں یہ معترض نادان یہ نہیں جانتا کہ یہ صورت محضہ نہیں ہے۔ اس میں بھی روح ہے گو ادنیٰ درجہ کی سہی پس جس وقت نیت نماز کی باندھی وہی نیت روح ہے نماز کی چنانچہ اگر نیت نہ ہو روزہ صحیح نہ ہو خواہ دن بھر کچھ نہ کھائے نہ پئے روزہ کی شرط نیت ہے اور نیت فعل القلب ہے۔ جب نیت کی بس روح متحقق ہو گئی۔ جنیدؒ و شبلیؒ کے اعمال میں بڑی بڑی قوی روح ہے کہ نیت بھی زیادہ خالص اور توجہ الی اللہ بھی مستمر ہمارے اعمال میں ضعیف ہے لیکن ہے ضرور مگر اس ضعیف روح کا بھی جو شخص حق ضائع کرے گا وہ بھی سرکاری مجرم ہوگا۔

چنانچہ ان مدعیان تصوف نے اس روح کا حق ضائع کیا اور عجب نہیں جنیدؒ کی نماز سے زیادہ سرکار عالی میں ہماری نماز کی حفاظت کی جاوے کیونکہ اس میں بہت ہی ضعیف روح ہے کہیں نکل نہ جاوے خیر یہ تو لطیفہ ہے ہمیں یہ ثابت کرنا ہے کہ ہماری نماز زکوٰۃ بے روح نہیں۔ اس مدعی نے ہماری زکوٰۃ پر اعتراض کیا کہ زکوٰۃ دینے سے کیا ہوا جبکہ صفت بخل زائل نہ ہوئی۔ لیکن اس نے یہ نہ دیکھا کہ اتنی تو بخل کی صفت ہو گئی کہ پچاس روپے دے دیئے غرض ہماری زکوٰۃ بالکل بے جان تو نہیں معترض نے ہماری زکوٰۃ کو پوست بے مغز سے تشبیہ دی لیکن وہ تشبیہ غلط ہے البتہ اس کی تشبیہ ہے پوست بامغز کم روغن کے ساتھ مغز ہے۔ لیکن کم روغن ہے سوکھا روکھا مگر ہے ضرور ایسا ہے کہ جتنا روغن اچھے مغز سے ایک سیر میں نکلتا یہاں چار میں سے نکلے گا۔ حضرت جنیدؒ کی دو رکعتیں ہماری بیس رکعتوں کے برابر ہوں گی جمع ہو کر ان شاء اللہ تعالیٰ بامغز کے برابر ہو رہے گا۔ الحمد للہ یہ علم عظیم آج ہی عطا ہوا ہے گو یہ مضمون ذہن میں مدت سے تھا لیکن مبہم تھا۔ اس کی تفسیر کبھی بیان نہیں کر سکا۔ میں سوچتا تھا کہ کیا چیز اٹکی ہوئی ہے جو زبان پر نہیں آتی سو آج وہ مضمون زبان پر بھی آ گیا۔ الحمد للہ غرض نیت بھی روح ہے۔ گو ادنیٰ درجہ کی روح ہے تو ہماری نماز بے روح نہیں پس ان کے یہاں روح بلا صورت ہے اور ہمارے یہاں صورت مع الروح الضعیفہ (کمزور روح کے ساتھ)

مدعیان باطن کی محرومی

اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ جن کو دعویٰ نری روح کا ہے ان کے یہاں روح بھی نہیں اگر میں اول سے یہ دعویٰ کرتا تو تسلیم بھی نہ کیا جاتا اس لئے اول روح بلا صورت کا دعویٰ کیا۔ اب ان شاء اللہ اس کو بھی ثابت کئے دیتا ہوں کہ روح بھی نہیں اور اس میں جواب ہو جائے گا بعضی ایسی کتابوں کا بھی جن کی نسبت میرا خیال تھا کہ ان کا جواب ہونا چاہیے سو بحمد اللہ بلا قصد اس کا جواب ہو گیا۔ گو مختصر ہے لیکن الحمد للہ پورا جواب ہے رنجک (وہ بارود جو بندوق کی پیالی میں رکھی جاتی ہے جس سے پہاڑ اڑائے

جاتے ہیں) تھوڑی سی ہوتی ہے لیکن پہاڑ اڑانے کے واسطے کافی ہے۔ پس میں کہتا ہوں کہ جس کو وہ لوگ بلانماز کے روح نماز کی سمجھتے ہیں وہ روح نماز ہی نہیں۔ یہ میرا دعویٰ ہے۔

تحقیق اس کی یہ ہے کہ بعض ارواح کے تحقق کے بعض شرائط ہوتے ہیں قاعدہ عقلیہ ہے کہ بلاشرط کے مشروط نہیں پایا جاتا۔ پس نماز کی جو روح ہے یعنی توجہ الی اللہ (اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ کرنا) نصوص قطعیہ سے ثابت ہے کہ بدون نماز کی صورت کے نماز کی اس روح کا تحقق ہی نہیں ہوتا یعنی جب نماز مع توجہ الی اللہ اللہ کی طرف توجہ کرنے کے ساتھ' فرض کی گئی تو اس سے ثابت ہوا کہ مطلق توجہ الی اللہ نماز کی روح نہیں ہے بلکہ خاص وہی توجہ الی اللہ جو نماز کے ضمن میں پائی جاوے اور ظاہر ہے کہ بدون نماز کے نہ پائی جاوے گی۔ پس ان کا یہی دعویٰ غلط ہے کہ ہم نے نماز کی روح بدون نماز کے حاصل کر لی ہے۔ مثلاً روح انسانی کے فیضان کے لئے بدن انسانی کا شرط ہونا معلوم ہے تو اگر گائے سامنے آوے اور یہ کہا جاوے کہ اس کے اندر روح انسانی ہے تو اس کی کبھی کوئی تصدیق نہ کرے گا کیونکہ عادۃ اللہ یوں ہی جاری ہے کہ روح انسانی کا جب تحقق ہوگا اسی قالب انسانی میں ہوگا۔ پس کہیں گے کہ گائے کے اندر روح حیوانی ہے' روح انسانی نہیں۔ وہاں اللہ تعالیٰ کے فعل سے یہ بات معلوم ہوئی یہاں اللہ تعالیٰ کے قول سے کہ اِرْکَعُوْا وَاسْجُدُوْا (رکوع اور سجدہ کرو) سے مع وعید ترک نماز یہ معلوم ہوا کہ نماز کی روح نماز سے مجرد ہو کر کبھی پائی نہیں جا سکتی جب قالب نہیں ہے تو روح جس کا دعویٰ ہے وہ نماز کی روح ہی نہیں کسی اور چیز کی روح ہوگی چاہے روح نماز کی ہو۔

روح بلا تشخص

اب ایک اور ترقی کرتا ہوں کہ جس طرح وہ نماز کی روح نہیں پس کسی قسم کی بھی روح نہیں۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ نماز کی روح اللہ کی یاد ذکر اللہ یا خلوص یا مثلاً عبادت کی روح محبت و عشق یہ سب جب پایا جاوے گا کسی نہ کسی تشخص کے ساتھ پایا جاوے گا کیونکہ مطلق من حیث ہو مطلق (اس اعتبار سے کہ وہ مطلق ہے) نہیں پایا جا سکتا جب پایا جاوے گا کسی تشخص کے ساتھ ہوگا۔ کلی مرتبہ کلی میں کبھی نہیں پائی جا سکتی۔ جس طرح کہ انسان جب کبھی پایا جاوے گا کسی نہ کسی شخص کے ضمن میں پایا جاوے گا یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ زید بھی نہ ہو بکر بھی نہ ہو۔ اللہ بخش بھی نہ ہو کوئی نہ ہو اور انسان ہو۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ روح یعنی توجہ الی اللہ کے جو افراد مطلوب ہیں وہ اس تشخص کے ساتھ تو مطلوب نہیں جو بلاواسطہ کسی عمل ظاہری کے ہو کیونکہ ان میں کوئی مشقت و کلفت و مجاہدہ ہی نہیں بلکہ مطلوب خاص وہ افراد ہیں جو ضمن میں کسی عمل ظاہری کے ہوں پس اگر کوئی عمل ظاہری نہیں تو وہ تشخص نہیں اور کلی من حیث

ھو کلی کا وجود ہوتا نہیں پس وہ توجہ الی اللہ ہی نہ پائی گئی۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ کوئی روح ہی نہ پائی گئی نہ نماز کی نہ غیر نماز کی اور اگر کوئی عمل غیر نماز کیا ہے تو صورت کی حاجت ہوتی تو اے مدعی پھر وہی صورت کیوں نہیں قبول کرتا جو محبوب نے تجویز کی۔ ہم تو تیری نفی صورت کو جب جانتے جب نری روح کو لا کھڑا کر دیتے۔ جب صورت سے چارہ نہیں تو صورت مجوزہ محبوب سے کون سی اچھی صورت ہوگی۔

ایک سیاح نے ایک جوگی کو دیکھا جو قشقہ لگائے ہوئے مندر میں بیٹھا تھا مگر اس کے چہرہ سے نور ایمان نمایاں تھا کیونکہ ایمان کا نور چھپا نہیں رہ سکتا چاہے لاکھ پردوں میں ہو اس سیاح نے اس جوگی سے خلوت میں پوچھا تو اس نے اقرار کیا کہ ہاں میں مسلمان ہوں وجہ اس ظاہری وجہ کی دریافت کی تو کہا اسلام میں قیود بہت ہیں میں آزاد ہوں۔ قیود سے وحشت ہوتی تھی۔ سیاح نے کہا کہ شرم نہیں آتی اطلاق کا دعویٰ ہے تو یہاں بھی قید کفر کی ہے وہاں قید اسلام کی تھی۔ وہاں زمزم کی قید تھی تو یہاں گنگا کی قید ہے۔ وہاں سیمائے سجدہ تھا تو یہاں قشقہ ہے وہاں قمیص وقبا تھا تو یہاں زنار ولنگوٹ ہے غرض اطلاق کا محض دعویٰ ہی ہے آزادی یہاں بھی نہیں۔

ہاں البتہ اتنا فرق ہے کہ ایک قید محبوب کو پسند ہے اور ایک ناپسند۔ پس تنبہ ہوا چونکا فوراً توبہ کر کے مسلمان ہوا اور ابزبان حال پڑھا

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی   مرا باجان جاں ہمراز کردی

(اللہ تعالیٰ تجھے اچھا بدلہ دیں کہ تو نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اور میرا محبوب حقیقی سے تعلق کر دیا)

ایسی غلطیاں بڑوں بڑوں کو ہو جاتی ہیں یعنی عوام کے نزدیک جو بڑے ہیں جن کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ (اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمۃ نازل ہو) لگا ہوا ہے ورنہ دراصل تو بڑا وہ ہے جو متبع شریعت ہو۔ کیونکہ ولایت شعبہ ہے نبوت کا جتنا کوئی نبی کے مشابہ ہوگا اتنا ہی وہ بڑا ہوگا حاصل یہ ہے کہ ان کی جو روح ہے وہ روح بھی نہیں ہے موٹی بات ہے کہ گنے کا رس گنے سے حاصل ہو کر پایا جا سکتا ہے انگور سے نہیں جو رس انگور سے حاصل ہوگا وہ انگور کا شیرہ ہوگا گنے کا رس نہ ہوگا۔ گو مشابہ گنے کے رس کے ہو۔ اس راہ میں بہت دھوکے ہو جاتے ہیں۔

وسوسہ راہ عشق

بعضے بڑوں کو بھی دھوکے ہوئے ہیں اور وہ چونکہ مر گئے ہیں اس لئے ہم ان کی شان میں گستاخی کرنے سے زبان کو بچاتے ہیں کہ اللہ کا نام لینے والے تھے۔ یہ اللہ کے نام کا ادب ہے۔ لیکن ان کے مقالات سے ہم قرآن وحدیث کو نہیں چھوڑ سکتے۔ ان کے حق میں یوں تاویل کر لیں گے کہ ان سے غلطی ہوئی حال کا غلبہ ہو گیا۔ غرض جو تاویل ہو سکے گی کریں گے چاہے وہ واقعی ہو یا غیر واقعی۔

جب کوئی نہ مانے گا تو ہم صاف طور سے کہیں گے کہ ہم ان کی نہیں مانتے وہ کوئی نبی نہیں تھے فرشتے نہیں تھے جن کا ماننا فرض ہو۔ یہ طریق ہے بڑا نازک اہل باطن سے جو غلطی ہوتی ہے وہ کفر تک پہنچ جاتی ہے اور اہل ظاہر کی غلطی محض معصیت تک رہتی ہے۔اسی واسطے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ

نحن نخاف الكفرو انتم تخافون المعصية

تم تو غلطی سے گناہ ہی کا خوف کرتے ہو ہم کو تو کفر کا اندیشہ ہے) فرماتے ہیں

؎ در راہ عشق وسوسہ اہرمن بسی است ہشدار وگوش رابہ پیام سروش دار

(طریق باطن میں شیطان کے وساوس اور خطرات ہیں اور ان سے بچنا چاہتے ہو تو ہوشیار رہو اور شریعت کا اتباع کرو) ہزاروں وسوسے ہزاروں خطرے یہاں تک حالت ہے کہ بعض کے سامنے شیطان ایک آسمان پیش کر دیتا ہے جس میں اشکال مثل فرشتوں کے نظر آتے ہیں جو گفتگو کرتے ہیں پھر وہ لوگ کسی مولوی کی نہیں سنتے۔

ایک بزرگ کو روح کا نور منکشف ہوا بوجہ غایت لطافت کے اس کو وہ نور حق سمجھے اور تیس برس تک اس غلطی میں مبتلا رہے تیس برس کے بعد سمجھے کہ یہ تو روح کا نور تھا سخت حرماں ہوا کہ میں اتنے عرصہ تک شرک میں مبتلا رہا۔اسی واسطے بہت بڑے شیخ کامل محقق جامع بین الظاہر والباطن (ظاہر و باطن کا جامع) کی ضرورت ہے جس کی یہ شان ہو

؎ برکفے جام شریعت برکفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سنداں باختن

(ایک ہاتھ میں جام شریعت ہو دوسرے ہاتھ میں سنداں عشق، یعنی شریعت اور حقیقت دونوں میں ماہر ہو شریعت اور حقیقت طریقت دونوں میں پورے طور سے واقف ہونا ہر ہوسناک کا کام نہیں ہے)

یہ نہ نرے صاحب ظاہر کا کام ہے کہ صاحب ظاہر اہل باطن کی غلطیاں نہیں نکال سکتا۔نہ نرے صاحب باطن کا کام ہے کہ اس کی بھی نظر نا تمام ہے اس وجہ سے بہت بڑے جامع بین الظاہر والباطن (ظاہر و باطن کے جامع و ماہر) کی ضرورت ہے (الحمدللہ کہ ایسا جامع شخص اس زمانہ میں حق تعالیٰ نے پیدا فرما کر دکھلا بھی دیا اس شخص کا نام ہے امداد اللہ)

حضرت حاجی صاحب کی شان تحقیق

ان الفاظ کو نہایت جوش وخروش سے فرمایا اور بے اختیار آنکھوں میں آنسو آ گئے جس کا اثر سامعین پر بے حد پڑا اور بہت سے لوگوں پر جن میں بعضے انگریزی خواں بھی تھے۔ بے اختیار گریہ طاری ہو گیا بعد کے بھی کلمات اسی جوش وخروش سے بمشکل گریہ کو ضبط فرما کر متغیر لہجہ میں فرماتے رہے جامع) وہ شخص فن تصوف کا مجتہد تھا' امام تھا' مجدد تھا اس نے کفر وایمان کو بالکل الگ الگ کر دیا۔حق

و باطل کو جدا کر دیا فن کو ایسا صاف کیا ہے کہ کہیں گنجلک نہیں رہی۔ ظاہری حالت بالکل معمولی تھی نہ جبہ تھا نہ عبا نہ قبا۔ تھانہ کے ایک شیخ زادے معلوم ہوتے تھے۔ لیکن سبحان اللہ حق تعالیٰ نے اس شخص میں کیا کمال رکھا تھا جب ہی تو بڑے بڑے علماء نے ادھر رجوع کیا مگر حق یہ ہے کہ اس شخص کو سب علماء نے بھی نہ پہچانا۔ انہوں نے یہ مذکورہ غلطیاں رفع کی ہیں (گر یہ و جوش و خروش جاری ہے) ہم پر دو زمانے گزرے ہیں ایک وہ کہ صوفیہ میں جو ذرا ظاہر کے خلاف نظر آیا اسے گمراہ سمجھے اور ایک وہ زمانہ گزرا ہے کہ کوئی صوفی چاہے جتنا گمراہ ہوا سے بھی کامل سمجھے اس شخص کی بدولت معلوم ہوا کہ دونوں راہ غلط تھے۔ الحمدللہ اب غلطی ایسی نظر آتی ہے کہ غلطی کرنے والا بھی سمجھ لیتا ہے کہ دکھتی ہوئی رگ پکڑی ہے۔ اگر صاحب تلبیس (فریبی و مکار) بھی سنتا ہے اس کا دل بھی مان لیتا ہے محض یہ کہنا کافر کافر اس سے غلطی نہیں نکلتی اس غلطی کے متعلق جو اعمال کے ظاہر و باطن کے باب میں مذکور ہوئی ہے۔

ازالہ غلطی

ایک درویش صاحب سے بھی سوال کیا گیا ہے انہوں نے ایک رسالہ کی شکل میں شریعت و طریقت کو ظاہر اور حقیقت و معرفت کو باطن قرار دے کر متبعین نبی کے دو فرقے ٹھہرا دیئے ہیں وہ بھی جو باطن اصلاحی کو لئے ہوئے نہیں اور وہ بھی جو ظاہر کے بالکل تارک ہیں اور دونوں کو متبعین نبی بتلایا ہے بلکہ ان دونوں میں طرف اہل باطن کو ترجیح دی ہے اور اہل ظاہر پر طعن کیا ہے اس میں ایک غلطی یہ بھی ہے کہ ان الفاظ کو عمل کے چار درجنوں کا نام سمجھے ہیں۔ جن میں اصطلاحی معنی بھی متروک ہو گئے۔

الفاظ شریعت و طریقت و حقیقت

کیونکہ شریعت کہتے ہیں مجموعہ احکام الہیہ کو جن میں احکام ظاہر و باطن سب داخل ہیں۔ احکام ظاہری و احکام باطنی میں تضاد نہیں بلکہ احکام ظاہری کے معنی یہ ہیں کہ احکام متعلق بالظاہر مثلاً حکم ہے کہ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ یعنی نماز پڑھو اور ادائے حقوق کیساتھ پڑھو۔ اس میں وہ احکام ہیں ظاہر و باطن ظاہر ادائے ارکان بااعتدال اور باطن اخلاص و خشوع جو حقوق صلوٰۃ میں داخل ہیں متاخرین کے اصطلاح میں احکام باطن کی تحصیل کے طریق کو طریقت کہتے ہیں اور شریعت اس سب مجموعہ کا نام ہے۔ طریقت اسی کا ایک جزو ہے جیسے شریعت کا ایک جز کتاب الصلوٰۃ ہے ایک کتاب الزکوٰۃ ہے ویسے ہی اس کا ایک جزو کتاب الشکر ایک جزو کتاب الصبر ایک جزو کتاب الاخلاص ایک جزو کتاب المحبت بھی ہے غرض طریقت شریعت ہی کا ایک جزو ہے اس کے مقابل کوئی چیز نہیں ہے اور شریعت مجموعہ ہے ان سب کا پھر جب آدمی شریعت پر پورا پورا عمل کرتا ہے تو اس سے حسب استعداد بعض

وجوہ تکوینیہ تعلق بین الحق والخلق (خالق اور مخلوق کے درمیان) کے منکشف ہوتے ہیں مثلاً مسئلہ تقدیر کی تحقیق تجدد امثال کی کیفیت روح کی حقیقت جن کا عدم انکشاف بھی مضر نہ تھا اور بعض وجوہ تشریعیہ تعلق مذکور کے منکشف ہوتے ہیں جس کو علم معاملہ کہتے ہیں اور جس کا انکشاف حسب استعداد لازم ہے ان وجوہ کو حقیقت کہتے ہیں۔ ان انکشافات سے خدا تعالیٰ کی شناخت بڑھتی ہے اس کو معرفت کہتے ہیں۔ یہ تخصیص ہے ان الفاظ کی نہ یہ کہ چاروں متقابل ومتغائر ہیں جیسے حیدر آباد میں چار منارے ہیں۔

بحمد للہ اس تقریر سے سب غلطیاں لفظی ومعنوی سب رفع ہوگئیں۔ اور ثابت ہوگیا کہ نرے باطن پر اکتفا کیا تو محض باطل ہے اور جس کو ظاہر پر اکتفا کرنا سمجھا جاتا ہے وہ محض عاطل (بیکار) نہیں۔

پس نرا ظاہر والا نرے باطن والا سے اچھا ہے کیونکہ وہاں ظاہر تو خود ان کے اقرار سے ہے ہی نہیں اور باطن بھی دلیل سے ثابت ہو چکا کہ نہیں اور یہاں ظاہر کے ساتھ باطن بھی ہے گو کم ہی سہی پس نرا باطن والا ازیں سو راندہ ازاں سو ماندہ (نہ ادھر ہی کا نہ ادھر کا) کا مصداق ہے مسئلہ تو بفضلہٖ تعالیٰ ثابت ہو چکا۔

اولیائے مستہلکین

اب اگر مسلم حضرات میں سے کسی نے اس کے خلاف کہا ہے یا کیا ہے تو اس میں تاویل کریں گے اور اگر تاویل نہ ہو سکے کہہ دیں گے کہ غلطی ایسے لوگ اولیاء مستہلکین (ہلاک ہونے والے) کہلاتے ہیں۔

باقی یہ کہ ایسے لوگوں کے ساتھ معاملہ کیا ہوگا یقینی تو یہ حق تعالیٰ کو معلوم ہے باقی ظن یہ ہے کہ چونکہ نیت بری نہیں تھی۔ ممکن ہے معاف کر دیئے جاویں دیکھئے اجلاس احکام میں بڑے بڑے خون ناحق نیت بری نہ ہونے سے معاف ہو جاتے ہیں۔ رہا یہ کہ بعض اقوال وافعال منقولہ تو قاعدہ سے کفر معلوم ہوتے ہیں سو کفر کس طرح معاف ہو سکتا ہے لیکن یہ ایک دقیق بات ہے جس سے وہ کفر نہیں ہو سکتا اور یہ بھی میں ہی کہہ رہا ہوں اور کسی مولوی سے تو کہلوا لو اور یہ سب حضرت کا طفیل ہے۔ حضرت کی جوتی سیدھی نہ کی ہوتی تو ہم کو بھی فتویٰ کفر میں باک نہ ہوتا مگر ہم نے وہاں ادب ہی ادب دیکھا۔

حضرت بہت سے کفر کے فتویٰ کے موارد کو بھی یہی فرماتے تھے کہ نہیں صاحب باطن تھے غلطی میں پڑ گئے جب سے وہاں یہ حال دیکھا ہم بھی ایسے فتوے سے بچنے لگے ہیں۔

ایک بار مولوی محمد احسن صاحب ایک تارک ظاہر کا کفر ثابت کر رہے تھے اور حضرت ان کی تقریر کا رد فرما رہے تھے۔ اللہ اکبر اس قدر حلم وکرم اور دقت نظر (باریک) تھی کہ کبھی کسی کو کچھ نہیں کہتے تھے اب میں وہ دقیق بات مانع عن التکفیر (تکفیر سے مانع) بتلاتا ہوں۔ حدیث میں ہے کہ تین شخص مرفوع القلم ہیں اس میں یہ بھی ہے عن المجنون حتیٰ یعقل (سنن ترمذی ۱۴/۳) (مجنوں کے جب تک ہوش درست نہ ہو مرفوع القلم ہے) اور ایک روایت میں ہے عن المتعوہ حتی یبراء یعنی مختل الحواس

(جب تک صحت یاب نہ ہو) بھی مرفوع القلم ہے اور ایک روایت میں ہے عن الخوف (یعنی جس کی عقل میں بڑھاپے کی وجہ سے فتور آ گیا ہو وہ بھی مرفوع القلم ہے) رواہ کلھا ابو داؤد (ان سب کو ابوداؤد نے روایت کیا ہے) اور عتہ (مختل حواس ہونا) جس طرح مرض سے ہوتا ہے اسی طرح دوسرے اسباب باطنہ سے بھی ہو سکتا ہے گو ان اسباب کا ادراک عوام کو نہ ہو بلکہ اخیر کی روایت سے تو زوال عقل کا جنون وعتہ میں عدم انحصار زیادہ صریح ہے۔ بس آپ کیا سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی کیا حالت ہوتی ہے۔ بظاہر ہوش وحواس رہتے ہیں فرزند اور بیوی سب کا ہوش رہتا ہے لیکن ان کی ایک ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ ان کے اقوال وافعال غیر منتظم ہو جاتے ہیں ایسی ہی حالت کو خسرو حیرت سے تعبیر کر کے کہتے ہیں

حیراں شدہ ام در آرز دیت اے چشم جہانیاں بسویت

(تیری آرزو میں حیران ہوں اے محبوب جہاں والوں کی آنکھیں تیری طرف لگی ہوئی ہیں)

مائم و تحیر و خموشی آفاق ہمہ بگفتگویت

(ہم ہیں اور تحیر اور خموشی ہے تمام دنیا تمہاری گفتگو میں لگی ہوئی ہے)

خسرو بکمند تو اسیر ست بیچارہ کجا رود زکویت

(خسرو تمہاری کمند کا قیدی ہے تمہارے کوچہ کو چھوڑ کر بیچارہ کہاں جائے)

پس ایسے حواس مختل ہو جاتے ہیں کہ پورے ہوش نہیں رہتے کہ صحیح عقیدے کیا ہیں سمجھ میں ایسا تغیر ہوتا ہے کہ آیتوں کے معنے الٹ پلٹ کر دیتے ہیں لیکن نیت بری نہیں ہوتی خلاف خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قصد نہیں کرتے غلبہ حال میں خیال ہوتا ہے کہ جو میں سمجھتا ہوں وہی ٹھیک ہے باقی سب غلط ہیں سمجھتا ہے کہ میں ہی ٹھیک سمجھا ہوں اور علامت آمیزش نفس نہ ہونے کے یہ ہوتی ہے کہ وہ تمہارے کافر کہنے کا برا نہیں مانتا تمہارے کافر کہنے کا تو وہ کیا برا مانتا وہ اپنے کو خود فرعون سے بدتر خیال کرتا ہے یہ وجدانی حالت ہے دوسرا سمجھ نہیں سکتا۔ غرض وہ ایک حیرت کی کیفیت ہے وہ پیشوا نہیں معذور ہے کیا عجب حق تعالیٰ معاف کر دے۔ اسے شریعت حیرت کا منہدم کرنا مقصود نہیں حیرت سے پریشان ہو کر کبھی ننگا پھرنے لگتا ہے کبھی ڈاڑھی منڈا دیتا ہے کبھی شوالہ میں گھنٹنا قوس جا کر بجانے لگتا ہے اس کی طرف سے میں آپ سے یہ کہوں گا

شب تاریک بیم موج و گردابے چنیں ہائل
کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

(حیرت میں ہماری حالت ایسی ہے جیسے اندھیری رات ہو اور موج کا خوف ہو اور ہولناک بھنور میں کشتی آ گئی ہو تو ہمارے اس حال کی ان لوگوں کو کب خبر ہو سکتی ہے جو ہلکے پھلکے کنارے پر کھڑے ہیں دریا میں قدم نہیں رکھا)

اولیائے کاملین

مگر یہ یادرہے کہ اس ساحل سے مراد ادھر کا ساحل ہے جس کے کھڑے ہونے والے ابھی دریا میں بھی نہیں گھسے۔ کیونکہ ادھر کے ساحل والے جو کہ دریا سے پار ہو چکے ہیں۔ الحمد للہ حال بھی جانتے ہیں اور اگر ان کے ہاتھ میں یہ شخص ہاتھ دے دے تو بچا بھی سکتے ہیں۔ البتہ ادھر والے سوائے ہنسنے کے کچھ نہیں کر سکتے۔ سو کاملین اس ساحل پر ہیں۔

حضرت غوثؒ پاک فرماتے ہیں کہ اگر منصور میرے زمانہ میں ہوتا تو میں اس کو بچا لیتا۔ شیخ عبدالحقؒ ہمارے سلسلہ کے بزرگ فرماتے ہیں کہ۔ ''منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد ایں جا مردانند کہ دریاہا فرو برندو آروغ نہ زنند'' (یعنی منصور بچہ تھا کہ ایک قطرہ سے جوش وخروش میں آ گیا۔ یہاں مرد ہیں کہ دریا کے دریا چڑھا جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے) حالانکہ شیخ اس قدر مغلوب تھے کہ چالیس برس یا کم وبیش ردولی کی مسجد میں پانچ وقت نماز پڑھی لیکن راستہ نہیں یاد ہوا۔ بختیار خادم آگے آگے حق حق کہتے جاتے تھے اس آواز پر چلتے تھے۔ رستہ کی خبر نہیں مگر باوجود اس کے اس قدر سنبھلے ہوئے ہیں کہ فرماتے ہیں کہ منصور بچہ بود کہ از یک قطرہ بفریاد آمد ایں جا مردانند کہ دریاہا فرو برندو آروغ نہ زنند (منصور بچہ تھا کہ ایک قطرہ سے جوش وخروش میں آ گیا یہاں مرد ہیں کہ دریا کے دریا چڑھا جاتے ہیں اور ڈکار تک نہیں لیتے) کبھی شریعت کے خلاف نہیں کیا۔

بارہ برس حضرت مخدوم صابر مراقبہ ہو میں مدہوش رہے۔ لیکن ایک وقت کی نماز قضا نہیں ہوئی جہاں کان میں اذان دی گئی بس آنکھیں کھول دیں۔ پانی تیار رہتا تھا۔ وضو کر کے نماز پڑھ کر پھر بے ہوش۔ بارہ برس تک یہی حال رہا۔

ان کے پیر یعنی شیخ فرید رحمۃ اللہ علیہ نے ڈوم کو خیریت دریافت کرنے کے لئے بھیجا جس وقت پہنچا افاقہ کا وقت تھا۔ بس اتنا دریافت فرمایا کہ پیر اچھے ہیں اور پھر چپ آپ کی یہ حالت تھی کہ بارہ برس تک گولر کھائے اس روز فرمایا کہ پیر کا بھیجا ہوا ڈوم ہے آج نمک ڈال دینا پیر کا مہمان ہے۔ یہاں سے وہ ڈوم دہلی پہنچا۔

حضرت سلطان جی بھی حضرت شیخ کے مرید تھے۔ یہاں شاہی دربار تھا چنانچہ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ وزیر شاہی حاضر خدمت تھا کھانے کا وقت آ گیا۔ وزیر نے خیال کیا کہ مچھلی کے کباب ہوں تو اچھا ہے جب خادموں نے کھانا لانے کے لئے اجازت چاہی تو فرمایا ذرا ٹھہرو جب کچھ دیر ہو گئی تو پھر آ کر عرض کیا کہ حضرت کھانا بے لطف ہوا جاتا ہے آپ نے فرمایا کہ ذرا ٹھہرو تھوڑی دیر بعد ایک شخص سر پر خوان رکھے ہوئے آیا اور عرض کیا کہ فلاں صاحب نے مچھلی کے کباب بھیجے ہیں۔ سلطان جی نے حکم دیا

کہ اب کھانا لایا جاوے۔ اب وزیر صاحب چونکے دستر خوان لگایا گیا وزیر کو خیال ہوا کہ مچھلی کے کباب اتفاقاً آ گئے ہیں سلطان جی نے خادم سے کہا کہ مچھلی کے کباب آپ کے سامنے زیادہ رکھنا۔ آپ کو زیادہ شوق ہے وزیر کو پھر بھی خیال ہوا کہ اتفاقی بات ہے۔ تب حضرت سلطان جی نے فرمایا کہ جناب وزیر صاحب فرمائش کا تو مضائقہ نہیں لیکن ذرا وقت گنجائش دیکھ کر ہونا چاہیے۔ عین وقت پر فرمائش کرنا تکلیف دینا ہے۔ ویسے مہمان کو حق ہے فرمائش کرنے کا۔ وزیر اب سمجھے کہ یہ میرے خطرہ کا جواب تھا۔

حضرت سلطان جی کو وزیر کی خواہش کا کشف ہوا آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ بادشاہ یہ لوگ ہیں۔ اور یہ حضرت اللہ میاں ہی سے کہتے ہیں جب کہتے ہیں جیسے کسی رئیسہ کا بچہ ہو کہ سارا حشم خدم اس کا فرمانبردار ہے لیکن جب اسے کسی چیز کی خواہش ہوگی تو اپنی ماں ہی سے مانگے گا کہ اماں یہ لوں گا۔ اماں چاہے جس کو حکم دے کر اسے دلوا دے۔ حضرت سلطان جی نے بھی اسی طرح اللہ تعالیٰ ہی سے عرض کیا کہ کباب دیجئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایک ادنیٰ پیادہ کو حکم دیا کہ لیجاؤ ہمارے محبوب کے سامنے۔

غرض یہاں یہ سامان تھا۔ جب پیر کا ڈوم قریب پہنچا تو حشم و خدم سے اس کا استقبال کرایا اور خوب خوب کھانے کھلائے۔ چلتے وقت انعام و اکرام بھی دیا۔ ڈوم نے واپس ہو کر حضرت شیخؒ سے سلطان جی کی بڑی تعریف کی اور حضرت مخدوم کے بارہ میں کہا کہ وہ بڑے روکھے ہیں۔ مجھے تو کیا تمہیں بھی نہیں پوچھا۔ بس اتنا دریافت کیا کہ پیر اچھے ہیں۔ یہ سن کر حضرت فریدؒ رقص کرنے لگے کہ الحمدللہ میں ابھی تک انہیں یاد ہوں۔ ورنہ مجھے کچھ بھی نسبت نہیں رہی ہے ان کے مقام سے مگر مجھے اب تک یاد رکھتے ہیں۔

ہمارے مشائخ

ہمارے مشائخ میں بحمد اللہ ایسے ایسے بکثرت گزرے ہیں کہ جن کو ماسوا اللہ کا ہوش نہیں رہا۔ مگر ان کو اللہ کا ہوش تھا۔ اس لئے ان سے ایسی غلطیاں نہیں ہوتیں اور جو مغلوب الحال غلطیاں کرتے ہیں وہ واقع میں خدا سے بھی بے ہوش ہیں کیونکہ اگر بادشاہ پر پوری نظر ہو تو کوئی بے ادبی اس سے نہیں ہو سکتی۔

ہمارے حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید ہیں خورجہ کے وہ بڑے صاحب حال ہیں ہمیشہ تڑپتے لوٹتے رہتے ہیں۔ اپنے سلسلہ کے حضرات کو دیکھ کر بلکہ ان کا نام سن کر تڑپنے چیخنے لگتے ہیں مگر نماز میں ان کی کبھی آہ بھی نہ نکلی۔ یہ اتباع سنت کی برکت ہے

؎ برکف جام شریعت برکفی سندان عشق　　ہر ہوسنا کے نداند جام و سنداں باختن

(ادھر شریعت کا مقتضیٰ ادھر عشق کا مقتضیٰ شریعت اور عشق دونوں کے مقتضیٰ پر عمل کرنا ہر ہوسناک کا کام نہیں)

عوام کو ایسے لوگوں پر گمان خالی ہونے کا ہوتا ہے لیکن وہ اس گمان سے خوش ہوتے ہیں۔ کیمیا گر اسی میں خوش رہتا ہے کہ اسے کوئی نہ جانے کیونکہ وہ پولیس کے مواخذہ سے بچا۔ لوگوں کے ہجوم سے بچا۔ جب اسے معلوم ہوا لوگ اب اس کو سمجھنے لگے اور بھیڑ ہوئی پس وہاں سے روپوش ہو جاتا ہے۔ ایسے متبع سنت کاملین پر عام لوگوں کا گمان خالی ہونے کا ہے۔ لیکن وہ پورے بھرے ہوئے مگر پر ہونے کے ساتھ ابلتے نہیں تو وجہ یہ ہے کہ ان کو دوسری چیز نے روک رکھا ہے وہ نکلنے نہیں دیتی غیر ضابطہ تو تنگ ہو کر یہ کہہ اٹھا کہ

؎ درمیان قعر دریا تختہ بندم کردہ　　باز میگوئی کہ دامن ترمکن ہشیار باش

(یعنی گہرے دریا میں تختہ میں جکڑ کر ڈال دیا ہے۔ پھر کہتے ہو کہ ہوشیار دامن تر نہ ہو) کاملین باوجود اس کے قعر دریا میں غرق ہیں لیکن پھر بھی ان کا دامن تر نہیں ہوتا۔ ہر زمانے میں اللہ کے بندے ایسے پیدا ہوئے ہیں اور اب بھی موجود ہیں۔ عوام الناس ایسوں کو نہیں سمجھتے۔

شیخ کامل سے وابستگی کی ضرورت اور انکا اصلی کمال

پس اگر ایسی جامعیت وضبط مطلوب ہے تو کسی متبع سنت شیخ کامل کا دامن پکڑنا چاہیے اور بہت ہی سنبھال کر قدم رکھنا چاہیے نیز شیخ کے تجویز کرنے میں بھی عجلت نہیں چاہیے۔ پہچان میں نہایت جانچ کی ضرورت ہے پس شیخ بنانے کے قابل وہ شخص ہے جو غلطیوں کا پکڑنے والا ہو یہ نہیں کہ نا تمام سا قال وحال دیکھ لیا اور پھنس گئے

؎ نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند　　نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(جو شخص بھی چہرہ کو برافروختہ کرے لازم نہیں کہ دلبری جانتا ہو جیسے جو شخص بھی آئینہ بناتا ہو لازم نہیں کہ سکندری بھی جانتا ہو یعنی جس نے کاملین کی وضع اختیار کی ضرور نہیں کہ کامل بھی ہو۔ خوب کہا ہے

؎ شاہد آں نیست کہ موئے درمیانے دارد　　بندۂ طلعت آں باش کہ آنے دارد

محبوب وہ نہیں کہ جس کے بال عمدہ کمر پتلی ہو بلکہ محبوبیت اس کی آن اور ادا میں ہوتی ہے جو محبوب اور دل کش ہوتی ہے)

نہ مجاہدہ دیکھو نہ ریاضت نہ کشف دیکھو نہ کرامت یہ دیکھو کہ فن کو کتنا سمجھتا ہے صحبت میں کیا برکت ہے حضرات مجتہدین کو ہم سے حدیثیں زیادہ یاد نہیں تھیں لیکن ان میں ایک شان تھی مناسبت فن کی فن کو اتنا جانتے تھے کہ ہم لوگ قیامت تک بھی نہیں جان سکتے۔ بوعلی سینا کو نسخے زیادہ یاد نہیں تھے لیکن فن کو ایسا جانتے تھے کہ بعد کو لوگوں نے بڑی بڑی قرابادین لکھیں۔ لیکن شیخ سے نہ بڑھ سکے اور اس کی کتاب قانون شاہد ہے اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس کے بعد ایسا شخص نہیں ہوا۔

اور یہ بات خدا کی جانب سے ہوتی ہے اور شیخ میں یہ بھی دیکھ لینا کہ عارف کے ساتھ عاشق بھی

ہو۔ نرے عارف کا دامن مت پکڑنا کہ کفایت اس کی قلیل ہے۔ حضرت مرشدی رحمۃ اللہ علیہ میں دونوں شانیں ایسی بڑھی ہوئی تھیں کہ سبحان اللہ میں نے تو دیکھا برتا ہے یہ جی چاہتا تھا کہ ہر ہر بات پر ہر ہر ادا پر جان فدا کر دیں۔ حضرت کے عارف ہونے پر بعضے تذکرے یاد آئے۔

حضرت حاجی صاحب رحمہ اللہ کی روحانی بصیرت

حضرت جب یہاں وطن میں تھے تو مولانا گنگوہیؒ اور بھی بعض ذاکرین اپنے اپنے حالات حضرت سے بیان کرتے۔ لیکن مولانا محمد قاسم صاحب کچھ بھی نہ بیان فرماتے۔ حضرت نے ایک دن پوچھا کہ آپ کچھ نہیں کہتے۔ مولانا یہ سن کر رونے لگے اور عرض کیا کہ حضرت حالات وثمرات تو بڑے لوگوں کو ہوتے ہیں مجھ سے تو جتنا کام حضرت نے فرمایا ہے وہ بھی نہیں ہوتا جہاں تسبیح لے کر بیٹھا۔ بس ایک مصیبت ہوتی ہے اس قدر گرانی کہ جیسے سو من کے پتھر کسی نے رکھ دیئے ہوں زبان قلب سب بستہ ہو جاتے ہیں حضرت کے کامل یا شفیق ہونے میں شبہ نہیں لیکن

؎ تہی دستاں قسمت راچہ سود از رہبر کامل کہ خضر از آب حیواں تشنہ می آرد سکندر را

(بدقسمت لوگوں کو رہبر کامل سے کیا فائدہ ہو۔ خضر علیہ السلام سا رہبر کامل سکندر کو آب حیات کے چشمہ سے واپس لاتا ہے کیونکہ سکندر قسمت کا تہی دست تھا)

میں ہی بدقسمت ہوں ایسا ہوتا ہے جیسے کسی نے زبان کو جکڑ دیا ہو تو یہ حال سن کر بے ساختہ حضرت فرماتے ہیں کہ مبارک ہو۔ یہ نبوت کا آپ کے قلب پر فیضان ہوتا ہے اور یہ وہ ثقل ہے جو حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے وقت محسوس ہوتا تھا اس زمانہ میں مولانا محض نو آموز طالب علم تھے۔ اس وقت یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ اس قدر بڑے عالم ہونے والے ہیں اب تو اس پیشین گوئی کا انطباق آسان ہے لیکن اس وقت یہ فرما دینا عجیب وغریب بصیرت کا پتہ دیتا ہے حضرت نے فرمایا کہ تم سے حق تعالیٰ کو وہ کام لینا ہے جو نبیوں سے لیا جاتا ہے۔ جاؤ دین کی خدمت کرو ذکر و شغل کا اہتمام چھوڑو۔

احمد جام فرماتے ہیں

؎ احمد تو عاشقی بہ مشیخت تراچہ کار دیوانہ باش سلسلہ شد شد نشد نشد

احمد تو عاشق ہے مشیخت سے تجھ کو کیا کام محبوب کا دیوانہ ہو سلسلہ ہو ہو نہ ہو نہ ہو)

سبحان اللہ حالت کو کیسا پہچانا بصیرت کیسی زبردست تھی۔ حضرت کی پہچان غضب کی تھی مکہ مکرمہ میں حضرت کے ایک خلیفہ ہیں ولایتی۔ انہوں نے دو رکعت نماز اس اہتمام سے پڑھیں کہ سوائے حق تعالیٰ کے خیال کے اور کوئی وسوسہ نہ آوے۔ وسوسوں کے روکنے کی غرض سے آنکھیں بھی بند کر لیں۔

بعد کو وہ متوجہ ہوئے حقیقت صلوٰۃ کی طرف دیکھیں حق تعالیٰ کے یہاں میری اس نماز کی کیا شکل ہوئی چنانچہ ایک نہایت حسین وجمیل عورت کی شکل میں انہیں وہ نماز دکھلائی گئی مگر اندھی۔

حضرت سے عرض کیا کہ میں نے نماز کامل آداب کیساتھ پڑھی تھی لیکن یہ کیا ہوا کہ اندھی دکھائی گئی۔

فی البدیہہ فرمایا معلوم ہوتا ہے تم نے آنکھیں بند کر کے نماز پڑھی تھی۔ عرض کیا کہ جی ہاں وساوس کے روکنے کے لئے بند کر لی تھیں۔ فرمایا کہ یہی سبب ہے کہ اندھی دکھلائی گئی کیونکہ نماز میں آنکھیں بند رکھنا سنت کے خلاف ہے۔ خلاف سنت نماز پڑھنے کا یہ اثر ہوا سنت کے موافق آنکھیں کھول کر نماز پڑھتے تو گو ہزاروں وسوسے آتے لیکن وہ نماز اس نماز سے ہزار درجہ افضل ہوتی جو خلاف سنت طریقہ پر آنکھیں بند کر کے ادا کی گئی خواہ اس میں ایک بھی وسوسہ نہ آیا ہو۔ اللہ اکبر کیا ٹھکانا ہے پہچان کا بھی اور اتباع سنت کا بھی۔

اسی وجہ سے مولانا مظفر حسین صاحب کاندھلوی جو ایک مشہور نہایت متقی جامع ظاہر و باطن عالم تھے یوں فرمایا کرتے تھے کہ حاجی صاحب اکابر سلف میں سے ہیں۔ گو پیدا اس زمانہ میں ہوئے ہیں لیکن درجہ ان کا سا ہے۔ اس طبقہ میں سے ہیں میں نے یہ روایت قاری محمد علی خان صاحب جلال آبادی سے سنی انہوں نے مولانا سے سنا واللہ رحمت تھی حق تعالیٰ کی کہ اس زمانے میں ایسے ایسے حضرات پیدا فرمائے۔ حضرت کی صحبت کے وقت سے زیادہ مجھ کو مثنوی شریف کی شرح لکھتے وقت حضرت کے علوم و معارف کی قدر معلوم ہوئی وہاں آنکھیں کھلیں۔ حضرت ہی کے علوم ہی کی بدولت یہ دقیق کتاب سمجھ میں آئی ورنہ ناممکن تھا۔ لکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ کوئی ایک ہی دفتر کی شرح لکھ دے کوئی لکھ کر تو دیکھے ؎ ہمیں میداں ہمیں چوگاں ہمیں گوئی

(یعنی یہی مثنوی اور یہی لکھنے والے اب بھی موجود ہیں) یہ حضرت ہی کے کلیات کے سہارے ساری شرح لکھی ہے چونکہ وہی کلیات ذہن میں محفوظ تھے کوئی مشکل مقام ایسا نہیں آیا کہ حل نہ ہو گیا ہو کسی جگہ ذہن نہیں اٹکا۔ کوئی میرے دل سے پوچھے کتنے باوقعت وہ کلیات تھے۔ اس کشتی کی قدر وہ جانے جس نے اس سے دریا قطع کیا ہو کہ وہ جب کشتی لے کر چلا کوئی سمندر ایسا نہیں ملا جس نے اسے روکا ہو۔

اسی طرح الحمد للہ کوئی طالب علم ایسا نہیں ہوتا کہ جس کا مرض اور دوا سب اس طرح کی تھوڑی سی حالت دیکھتے ہی سمجھ میں نہ آ جاتا ہو۔ یہ سب انہیں کلیات کی بدولت ہے ہم نے بخاری مسلم سب کچھ پڑھا تھا لیکن کچھ نہ سمجھے تھے۔ اگر چند کلمے حضرت سے نہ سنتے تو ساری کتابیں کچھ بھی نہ سمجھی ہوتیں۔

جب ہی تو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ہم علم کی وجہ سے حضرت کے معتقد ہوئے ہیں۔ حضرت کی شان علمی کے متعلق اک عجیب قصہ یاد آیا کہ ایک جلسہ میں جبکہ حقائق کا بیان فرما رہے تھے۔ دوران تقریر میں ایسے ایسے الفاظ بشرط شئے بشرط لا شئے لا بشرط شئے استعمال فرمانے لگے ایک معقولی بھی

شریک جلسہ تھے ان کے دل میں خیال ہوا کہ درسی علم تو حضرت نے حاصل کیا نہیں پھر یہ اصطلاحیں کیا جانیں۔ معاً حضرت کو اس خطرہ کا کشف ہوا۔ فرمایا کہ معانی کا القاء بھی بواسطہ الفاظ بھی ہوتا ہے اس وقت ایسی اصطلاحات بول سکتا ہے وہ معقولی صاحب دم بخود رہ گئے۔ غرض ایسے شخص کی بدولت ایسی غلطیاں رفع ہوتی ہیں کہ شریعت میں الحاد بھی نہ ہو اور جنہوں نے ایسی غلطیاں غلبہ حال میں کی ہیں ان پر فتویٰ کفر وارتداد بھی نہ ہو۔

تکلیف بقدر عقل

چنانچہ اوپر حدیث سے ایسے لوگوں کا عذاب بیان کیا گیا ہے اور وہ حدیثیں قواعد کلیہ تھیں۔ اب ان کی تائید ایک حدیث جزئی سے عرض کرتا ہوں اور کوئی جامد علی الظاہر (یعنی ظاہر پر اڑا ہوا یعنی ظاہر پرست) اس کو صوفیہ کی طرف داری نہ سمجھیں میں کسی صوفی کے قول سے استدلال نہیں کرتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث نقل کرتا ہوں کہ ایک گنہگار شخص تھا اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کی کہ میں مر جاؤں تو میری نعش کو جلا کر خاک کر کے ہوا میں اڑا دینا پھر یا تو بچ جاؤں اور اگر کہیں اللہ تعالیٰ کے ہاتھ آ گیا تو پھر وہ ایسی سزا دیں گے کہ کسی کو بھی نہ دی ہوگی۔ اس کے بیٹوں نے ایسا ہی کیا اور اس کے مرنے کے بعد اس کی نعش کو جلا پھونک آندھی کے دن اڑا دیا کچھ دریا میں کچھ خشکی میں وہ سمجھتا تھا کہ اللہ میاں کہاں جمع کر سکیں گے۔ جیسا کہ اس کا قول لئن قدر اللہ علی (یعنی اگر اللہ تعالیٰ مجھ پر قدرت پالے) اس پر دال ہے لیکن وہاں کیا تھا کن فرمایا اور فوراً سب اکٹھا ہو گیا۔ دریافت فرمایا کہ کیوں تم نے ایسا کیا۔

من خشیتک یا اللہ تیرے خوف سے۔ فرمایا جاؤ بخش دیا۔ اس مقام پر علماء کو دقتیں ہوئی ہیں کہ حق تعالیٰ کی قدرت میں اس نے شک کیا لہٰذا کافر ہوا۔ پھر مغفرت کیسی۔ بات یہ ہے کہ عقل کم تھی خدا کی قدرت کو بڑا تو جانتا تھا لیکن کتنی اس کا اندازہ نہیں کر سکا۔ ہر شخص کا اندازہ اس کی عقل کے موافق ہوتا ہے۔ پس ایسے شک سے وہ کافر نہیں ہوا۔ اسی کی فرع کا ایک اور قصہ ہے کہ ایک شخص نے وعظ میں سنا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہیں نہ پاؤں ہیں وہ تھا محض ایک گنوار دیہاتی آدمی اسے نہایت غصہ آیا اور کہا کہ کیا وہ بطیخ شامی ہے۔ اور بولا ہمارے خدا کے ہاتھ بھی ہیں پاؤں بھی ہیں تیرا خدا ہوگا جس کے ہاتھ نہ پاؤں جیسے شام کا خربوزہ۔ اب کیا ایسے شخص کو کافر کہہ سکتے ہیں وہ ہرگز کافر نہ تھا۔ اس میں عقل ہی نہ تھی بلکہ اس سے یہ کہنا کہ خدا تعالیٰ کے ہاتھ پیر مت سمجھا اس کو کفر میں ڈالنا تھا۔

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی نے آ کر عرض کیا کہ میں نے ایک لونڈی کے تھپڑ مار دیا ہے اس کو ایک کفارہ میں آزاد کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے آزاد کرنے کے لئے ایمان کی شرط ہو گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لونڈی کو طلب فرمایا۔ اس سے دریافت فرمایا این اللہ (موطا مالک ۷۷۷) یعنی اللہ تعالیٰ کہاں ہیں اس نے کہا فی السماء آسمان میں پھر دریافت فرمایا کہ میں کون ہوں عرض کیا انت رسول اللہ آپ اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابی سے فرمایا کہ یہ مومن ہے اس کو آزاد کر دو۔ باوجود اس کے کہ وہ لونڈی یہ سمجھتی تھی کہ اللہ تعالیٰ آسمان

میں ہیں۔ لیکن پھر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے مومن فرمایا۔ حالانکہ بھلا اللہ تعالیٰ آسمان میں کیا سماتا۔ عام آدمی بھی سمجھ سکتا ہے مظروف سے ظرف بڑا ہونا چاہیے۔ سو خدا تعالیٰ کی عظمت کے سامنے عرش تک تو کوئی چیز ہی نہیں تو آسمان تو کیا ہوتا ادھر دلائل قطعیہ قائم ہیں کہ حق تعالیٰ پاک ہیں کسی مکان کے اندر آنے سے لیکن اس جاریہ (لونڈی) کی عقل اتنی ہی تھی۔ چنانچہ اگر بچوں سے پوچھو کہ خدا کہاں ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اوپر ہے حالانکہ حدیث میں ہے۔

لو دليم الحبل الى الارض السفلى لهبط على الله (العلل المتناهيه ۱/۱۳)

یعنی اگر رسی ساتوں زمین پار ہو کر اترے گی وہاں بھی اللہ میاں ہیں وہ نہ زمین کے ساتھ مقید ہیں نہ آسمان کے ساتھ مگر فطری امر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوپر ہی ہونے کا گمان ہوتا ہے کیونکہ اس کی ذات عالی ہے۔ عوام کی سلامتی اسی میں ہے کہ اوپر سمجھیں عرش پر سمجھیں یا آسمان پر سمجھیں کچھ حرج نہیں خواص کے لئے ہے اس کو مکان سے پاک سمجھنا۔

چنانچہ میں نے ایک بار یہیں تھانہ بھون میں حق تعالیٰ کو خواب میں دیکھا کہ ایک رفیع الشان مکان کے فوق کی طرف جلوہ فرما ہیں لیکن بلا کسی لون اور رنگ یا مقدار یا کیفیت کے چونکہ میرے اعتقاد میں تنزیہ ہے اور بہت سوں نے جن پر کہ تشبیہ کا مذاق غالب تھا آدمی کی شکل میں دیکھا اور اس فرق کے اور بھی اسباب ہیں۔ سو اسی طرح یقظہ (بیداری) میں جتنی جیسی عقل ہوگی اتنا ہی سمجھے گا۔ چنانچہ وہی شخص حق تعالیٰ کی قدرت کا قائل سب کچھ تھا لیکن کچھ عقل کی کمی کچھ خشیت کا غلبہ اس نے اس کو بدحواس کر دیا۔ اسی طرح مغلوب الحال کی عقل ٹھکانے نہیں رہتی۔ غلبہ حال سے کم ہو جاتی ہے۔

ایسے لوگ معذور ہیں معاملہ معذور

ایسے لوگوں کے ساتھ نہ گستاخی چاہیے۔ نہ ان کا اتباع چاہیے معذور سمجھ کر معافی کی امید رکھنا چاہیے۔ اور اگر ان حضرات کی طرف ان اقوال و افعال کی نسبت ہی ثابت نہ ہو تو ایک جواب سب سے سہل یہ ہے کہ یہ ثابت ہی نہیں۔ الحمد للہ ان معذورین کے ساتھ جو معاملہ رکھنا چاہیے اس وقت سمجھ میں آ گیا ہوگا۔ یہ تو تاویل بھی معذورین۔ اہل اغلاط کی باقی جو شرعاً معذور نہیں اور وہ محض نقل اور تقلید سے ایسے اغلاط کو اختیار کرتے ہیں۔ وہ یقیناً دائرہ ایمان سے خارج ہیں۔ بہرحال یہ تھا بیان ان اغلاط اہل ظاہر و اہل باطن کا جو آیتیں میں نے پڑھی ہیں ان میں ان اغلاط و اختلافات کا فیصلہ ہے جس کو میں بضمن اپنی تقریر کے بیان بھی کر چکا ہوں۔

جمع بین الظاہر والباطن

جس کا حاصل جمع کرنا ہے ظاہر و باطن کے درمیان میں اب اسی کو ان آیات پر منطبق کئے دیتا ہوں اور میرا ارادہ اس انطباق کی بھی زیادہ تفصیل کا تھا لیکن وقت زیادہ ہو گیا ہے لہذا میں ترجمہ آیت کا کر کے ختم

کئے دیتا ہوں۔ اور اسی کے ضمن میں انطباق سے بھی مختصراً تعرض ہو جائے گا۔ پس حق تعالیٰ فرماتے ہیں
لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ (یعنی اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون ولیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے)

صوفیوں کے یہاں بھی رعایت فرمائی کہ پہلے لن ینال اللہ میں اہل ظاہر کی غلطی بیان فرمائی اور غلطی بھی ایسی بلاغت سے بیان کی کہ کوئی بیان نہیں کر سکتا۔

پھر دوسرے جملہ میں ولٰکن ینالہ التقویٰ قربانی کی حکمت واللہ کیا بیان کی اور اس تقویٰ کا مصداق اس سے اوپر ارشاد فرمایا ہے۔ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (جو شخص تعظیم کرے شعائر اللہ واحکام الٰہیہ کی تو ان کی یہ تعظیم کرنا دلوں کے تقویٰ سے ہے) یعنی یہ تقویٰ تعظیم ہے شعائر اللہ واحکام الٰہیہ کی اس حکمت تعظیم شعائر اللہ کی جامعیت پر نظر کر کے مجھے تو وہ شعر شریعت کی شان میں یاد آ جاتا ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ میدارد بہ رنگ اصحاب صورت را بو ارباب معنی را

اس کی عالم حسن کی بہار ظاہر پرستوں کے دل و جان کو رنگ سے اور حقیقت پرستوں کے دل وجان کو بو سے تازہ رکھتی ہے)

قربانی کرنے والوں کی اقسام

یعنی عاملین میں دو طرح کے لوگ ہیں ایک تو وہ جو قربانی کی حکمت سمجھ گئے ہیں دوسرے وہ جو حکمت نہیں سمجھے جو حکمت سمجھ گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ حکمت معلوم ہو جانے سے وقعت بڑھتی ہے حکم کی وہ تو یوں حکم کی تعظیم کریں گے اور جو حکمت نہیں سمجھے انہوں نے اتنی تعظیم کی کہ حکمت بھی نہ سمجھے اور پھر بھی کر ڈالا وہاں تو کسی درجہ میں رائے کا بھی دخل تھا یہاں کچھ بھی نہیں اگر کسی نے کہا کیوں کرتے ہو کہا حکم خدا کا۔

پس آیت وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (جو شخص اللہ تعالیٰ کے شعائر اور اس کے احکام کی تعظیم کرے تو ان کی یہ تعظیم کرنا دلوں کے تقویٰ سے ہے) میں روح بتلا دی قربانی کی۔

روح قربانی: آگے اس آیت لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ میں فرماتے ہیں کہ اس روح یعنی تقویٰ خاص کی کہ تعظیم شعار ہے بہت حفاظت کرو اور سمجھو کہ ذبح بالذات مقصود نہیں دیکھو وہاں نہ خون پہنچتا ہے نہ گوشت جو چیز مقصود ہے وہ البتہ پہنچتی ہے یعنی تقویٰ چنانچہ اگر یہ لحم ودم (گوشت وخون) مقصود ہوتا تو سارا جانور اٹھ کر چلا جایا کرتا۔ پس صرف ذبح کو مقصود مت سمجھو خدا کے یہاں تقویٰ پہنچتا ہے۔ اس کو دیکھو کہ اس ذبح کے ساتھ تقویٰ بھی مقترن (شامل) ہے جو کہ تعظیم شعائر اللہ سے پیدا ہوتا ہے کہ ایک مدلول من کا یہ بھی ہو سکتا ہے اس طرح سے کہ تعظیم شعائر منجملہ تقویٰ ہے جب تعظیم بجالائے تقویٰ متحقق ہو گیا یا تقویٰ سے تعظیم شعائر اللہ پیدا ہوتی ہے ایک مدلول من کا یہ بھی ہو سکتا ہے اس طرح کہ تعظیم پیدا ہوتی ہے تقویٰ سے غرض جو چاہو کہو بقول حافظ

؎ بخت اگر مدد کند دامنش آدم بکف گر بکشد زہے طرب و ربکشم زہے شرف

(خوش قسمتی ہے اس کا دامن ہاتھ میں آ جائے وہ کھینچ لے تب بھی مقصود حاصل ہم کھینچ لیں تب بھی)

سوتقویٰ ہر حال میں مقصود بالذبح ہوا۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں سینہ کی طرف اشارہ کر کے کہ یہاں ہے تقویٰ اور مافی الصدر (اندرون سینہ) باطن ہے پس معلوم ہوا کہ اس ظاہر کا ایک باطن بھی ہے اس کو حاصل کرو۔

شاید اس کو سن کر اہل باطن پھولتے کہ دیکھو ہم نہ کہتے تھے کہ باطن ہی ہے جو کچھ ہے لہذا آگے ان کی غلطی بیان کرنے کے لئے ایک ظاہر کو فرماتے ہیں۔

كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان جانوروں کو تمہارا مسخر کر دیا ہے تا کہ قربانی کر کے اس بات پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو کہ تم کو اس طرح قربانی کرنے کی توفیق دی (یعنی نرے تقویٰ کو کوئی نہیں پوچھے گا تقویٰ مطلق مقبول نہ ہوگا۔ تقویٰ وہ قبول ہوگا جس کو قربانی سے تعلق ہو۔

حکمت تکبیر: یہاں نحر کا مفعول بھی ہو جس سے تکبیر کا فعل بھی متعلق ہو پس اس میں اچھی طرح سے ثابت کر دیا گیا کہ روح سے مراد وہی روح ہے۔ جو اس قلب کے ساتھ ہو اسی کو فرماتے ہیں کہ جانوروں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا تا کہ تم نعمت ہدایت وتوفیق للذبح پر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو اس میں اللہ اکبر کہنے کی بھی حکمت بتلا دی کہ یہ دراصل شکر ہے اللہ کا کہ اللہ بہت بڑا ہے کہ اس نے توفیق دی کہ ہم حکم بجالا سکیں واقعی اگر خدا کی توفیق نہ ہوتی تو ترحم طبعی ہاتھ کو گردن پر نہیں چلنے دیتا جو ملحدین کے شبہ کی بنا تھی یعنی ذبح کا خلاف ترحم ہونے کے سبب مخالف حکم الٰہی ہونا۔

ذبح کے خلاف عقل ہونے کا جواب

اسی سے ہم جواب دیتے ہیں کہ یہی خلاف ترحم ہونا بہت بڑی علامت ہے اس ذبح کے حکم الٰہی ہونے کی بعضے معترض اس مخالفت ترحم مخالف عقل قرار دیکر کہتے ہیں کہ ذبح کرنا عقل کے خلاف ہے، ہم کہتے ہیں کہ اگر ذبح کرنا عقل کے خلاف ہے تو جانوروں کو کاٹنا پیٹنا بھی عقل کے خلاف ہے بلکہ یہ تو ساری عمر سسکا سسکا کر مارنا ہے ذبح میں تو ایک ساتھ کام تمام کر دیا جاتا ہے دم کے دم میں جان نکل جاتی ہے اس میں ذرا سی دیر تکلیف ہے جو ہوئی اور گزر گئی اور سچ تو یہ ہے کہ نہ یہ عقل کے خلاف ہے نہ وہ۔ ہم تحقیق کے تابع ہیں، ہم ان کی طرف سے بھی کہتے ہیں کہ مارنا عقل کے خلاف نہیں اور اپنی طرف سے بھی کہتے ہیں کہ ذبح عقل کیخلاف نہیں اور حقیقت یہ ہے کہ خلاف عقل وہ ہوتا ہے جس میں کوئی محال لازم آوے خلاف عقل ہے خدا کا دو ہونا اجتماع ضدین کا واقع ہونا دور وتسلسل کا صادق آنا تو ذبح کرنے میں یا مارنے کوٹنے میں کون سی بات عقل کے خلاف استحالہ (محال ہونے) کی لازم آئی جو بات خلاف عقل ہوتی ہے وہ تو واقع ہی نہیں ہوئی۔ معترض ایسے بے عقل ہیں کہ غیر ممتنع

الوقوع (جن کا واقع ہونا محال ہے) کو عقل کے خلاف کہتے ہیں ذبح تو واقع ہوتا ہے وہ عقل کے خلاف کیسے ہوا۔
بلکہ ان کا یہ کہنا خود ان کی اصطلاح کے مطابق خلاف عقل ہے بات یہ ہے کہ یہ لوگ علوم عقلیہ پڑھتے نہیں جو چیز ترحم طبعی کے خلاف ہے اسے عقل کے خلاف کہتے ہیں۔ ترحم طبعی کے خلاف کہو تو البتہ ہم مانتے ہیں واقعی ذبح ترحم کے خلاف ہے لیکن اے صاحب یہی تو بڑی عبدیت ہے کہ گو ترحم کے خلاف ہے لیکن خلاف طبع و خلاف نفس مالک کے امتثال امر کے لئے دل پر پتھر رکھ کر کرتے ہیں۔ جلاد کا بیٹا کسی جرم میں پکڑا آیا ذرا غور کر کے دیکھئے کہ بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک درجن بید لگاؤ۔ اس وقت باپ سے پوچھئے کہ دل کی تو کیا حالت ہوگی مگر اس کے ساتھ ہی یہ سوال ہے کہ خیر خواہی سرکاری اور جانثاری کس میں ہے۔ آیا جانثاری یہ ہے کہ کہدے مجھ سے نہیں ہوسکتا یہ آپ کی نوکری رکھی ہے یا یہ ہے کہ بادل نخواستہ سرسر بید لگا رہا ہے دل اندر سے لوٹ پوٹ ہو رہا ہے لیکن حکم کی تعمیل کئے جا رہا ہے ایمان سے بتاؤ یہ ہے جان نثاری اور خیر خواہی یا وہ اگر حاکم کو یہ معلوم ہو جاوے کہ یہ اس کا بیٹا تھا اور باوجود یہ کہ اس سے محبت ہونے کے اور ضرب میں بے حد چینی کے پھر بھی اس نے میرا حکم بلا چوں و چرا مانا تو اس کی نظر میں اس شخص کی کتنی قدر ہوگی آج کل جنگ میں جان دینے بہت جارہے ہیں ان کی مدح کی جاتی ہے کہ بڑے خیر خواہ سرکار ہیں جاں نثار ہیں یہ کیوں حالانکہ بقول آپ کے جان دینا عقل کے خلاف ہے (یہ خوب ہے کہ کہیں تو عقل کے خلاف ہے کہیں نہیں یہ عجیب بے جوڑ بات ہے)

معترض کہتے ہیں کہ مسلمان بڑے قصائی ہیں اس کے مختلف جواب دیئے جاتے ہیں۔ لیکن جواب اصلی یہ ہے کہ معترض کیا جانیں ہم پر کیا گزرتی ہے جب چھری پھیرتے ہیں ہم سے حلف لے لو جس وقت گائے کٹتی ہے ہمارا دل نکلا جاتا ہے لیکن دل پر پتھر رکھ کر یہ حکم معلوم کر کے کہ قربانی کرو کرتے ہیں ترحم تو ہے مگر ترحم پر عمل نہیں حکم کی تعمیل کرتے ہیں یہ ہے عبدیت پوری اسی کی توفیق ہے کہ اتنے بڑے عمل پر قادر ہو گئے۔

اسی کو فرماتے ہیں لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ (تا کہ اللہ تعالیٰ کی اس بات پر بڑائی بیان کرو کہ اس نے قربانی کرنے کی توفیق دی۔

تفتیش حکمت

اس سوال و جواب پر ایک حکایت یاد آئی مجھ سے ایک صاحب نے پوچھا کہ طاعون سے بھاگنا کیوں ناجائز ہے حالانکہ وہاں رہنا عقل کے خلاف ہے میں نے کہا کہ لڑائی سے بھاگنا کیوں جرم ہے حالانکہ وہاں طاعون سے بھی زیادہ ہلاکت کا خوف ہے یہاں تو موت میں رہنا خلاف عقل اور وہاں عقل کے خلاف نہیں وہ سمجھ گئے میں نے کہا کہ بادشاہ تو تیس روپیہ تنخواہ دے کر جان کا مالک ہو جاوے اور حق تعالیٰ جان کو پیدا کر کے بھی جان کا مالک نہ ہو اور اس میں تصرف اور اپنے قانون کی تنفیذ نہ کر سکے۔ وہ صاحب یہ جواب سن کر کھل گئے یہ شاندار مولویوں کے جواب نہیں ہیں۔ خاکسار غریبوں کے جواب ہیں سچی بات سیدھی سادی قناعت دینے والی ہوتی ہے۔ پس حکمتوں کی تفتیش کے درپے مت ہو صرف یہ دیکھو کہ آیا یہ خدا کا حکم ہے یا نہیں پس یہ معلوم

کرلیا اور اطمینان ہوگیا چنانچہ جس طرح جلاد کو حکم ہے کہ بید مارو ہمیں یہ حکم ہے کہ قربانی کرو۔

اسی طرح تمام احکام میں بعد اس امر کے ثابت ہو جانے کے کہ خدا کا حکم ہے پھر حکمتیں مت پوچھو ورنہ بتلاؤ کہ انجام اس کا خطرناک ہے کیونکہ سور کے حرام ہونے کی اگر یہ حکمت بیان کی کہ وہ بے حیا ہوتا ہے اور اس کے بعد ایک شخص نے اس کا حیادار ہونا ثابت کر دیا جیسا کہ ایک شخص نے اس کا دعویٰ کیا ہے۔ پس اگر کسی فلسفی مسلمان کا عقیدہ یہی ہو کہ سور اس لئے حرام ہوتا ہے کہ بے حیا ہوتا ہے تو جب اس کے نزدیک وہ حیادار ثابت ہو جاوے گا اسی روز پھر وہی شبہ موجود یہ بڑا خطرناک طرز ہے خدا کے لئے اس طرز کو چھوڑو اور غیر منصوص حکمتیں جتنی بیان کی جاتی ہیں وہ اکثر انکل پچو ہوتی ہیں اگر ہم نے شریعت کو انہیں پر مبنی سمجھ لیا تو اگر کبھی پچاس برس کے بعد ایسے عقلاء پیدا ہوئے جنہوں نے ان کی نفی کر دی تو جب بناء منہدم ہوگی مبنی بھی منہدم ہو جاوے گا ہم ایسی حکمتیں نکال کر شریعت کی بنیاد ریت پر کھڑی کر رہے ہیں جہاں ایک سیلاب آیا سب رخصت بس یوں کہو سور حرام ہے اس لئے کہ خدا کا حکم ہے۔ قیامت آجائے تو اس کو توڑ ہی نہیں سکتا۔

جس طرح کوئی سرکاری آدمی سے پوچھے کہ موروثی کا کیا حکم ہوا یا پوچھے کہ تولہ بھر تک ٹکٹ لگا لینے سے بیرنگ نہیں ہوتا۔ دو تولہ کا بیرنگ ہو جاتا ہے اس پر یہی کہے گا کہ واضعان قانون جانیں ضابطہ یونہی ہے۔ اے مسلمانوں سیدھا جواب ہے کہ ہم واضع قانون نہیں ہم سے کیوں پوچھتے ہیں۔ یہ خدا سے پوچھے۔

اصول اسلام عقلی ہیں

البتہ اصول اسلام کے ضرور عقلی ہیں باقی فروع کا عقلی ہونا ضروری نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جارج بادشاہ کا بادشاہ ہونا عقلی طور پر ثابت کیا جاوے گا۔ باغی کو مباحثہ سے سمجھایا جاوے گا۔ پھر جب اس کو صاحب سلطنت مان لیا پھر ہر حکم میں حکمتیں تلاش کرنا بغاوت کا شعبہ ہے اگر کسی کو چوری میں سزا دی گئی اور اس نے کہنا شروع کیا کہ فوجداری کی دفعہ سرقہ میری سمجھ میں نہیں آئی آیا دو پیسہ کا سرقہ بھی کوئی جرم ہے تو کیا جج اس کو لم سمجھا کر سزا دے گا۔ یا یوں کہہ دے گا کہ بادشاہ وقت کا یہی قانون ہے اگر اصرار کرے گا تو ڈانٹ دے گا کہ بکومت اور الٹی توہین عدالت کی بھی سزا بڑھا دے گا اور کہہ دے گا کہ ہم جڑ کی بات سمجھا چکے کہ بادشاہ وقت کا یہی قانون ہے۔

اسی طرح توحید و رسالت عقلی طور پر سمجھ لو پھر قال اللہ و قال الرسول بس ہے۔ نصرانی۔ آریہ۔ یہودی جو کوئی پوچھے یہی جواب ہے کہ خدا کا حکم ہے قرآن میں ہے۔ قرآن کا اللہ تعالیٰ کا کلام ہونا دلیل عقلی سے ثابت کر دیں گے۔ بس سنار کی کھٹ کھٹ اور لوہار کی ایک میں ساری شریعت کی حفاظت کا سامان بتلا رہا ہوں۔ ورنہ اگر حکمتیں بتلانے پر آئے تو آخر کہیں تو عاجز ہو گے مثلاً پوچھا گیا نماز کیوں فرض ہوئی کہا عبدیت کا اظہار ہے پانچ وقت کیوں مقرر ہوئے تا کہ پابندی میں سہولت ہو یہاں تک چلتا رہا رکعتیں کیوں مختلف تعداد میں مقرر کی گئیں ظہر میں چار فجر میں دو مغرب

اور وتر میں تین بس یہاں آ کر تھک گئے جو یہاں آ کر کہو گے وہ پہلے ہی کیوں نہ کہہ دو جس راہ پر دو کوس چل کر بالآ خر آنا ہے اسے ابھی سے کیوں نہ اختیار کرو خواہ مخواہ اتنا تعب بھی کیوں سر لیا؟

عالم گیر مرض

جیسا اس وقت ایک اور مرض عالم گیر ہو رہا ہے کہ باوجود یکہ حجج شرعیہ (حجتیں و دلیلیں) چار ہیں مگر پھر بھی ہر حکم کا ثبوت قرآن مجید سے مانگا جاتا ہے اور ہمارے ذہین اہل علم اس قدر سخی ہیں کہ ثبوت دینے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ میں وہاں بھی یہی کہا کرتا ہوں کہ کہیں تو عاجز ہو کر کہنا ہی پڑے گا کہ ہر حکم کا ثبوت قرآن سے ضروری نہیں پھر یہ جواب اول ہی سے کیوں نہ دے دو۔

میرے ایک صاحب علم دوست سے کسی نے ڈاڑھی کا ثبوت قرآن شریف سے مانگا انہوں نے یہ آیت پڑھی لَا تَاْخُذْ بِلِحْيَتِیْ وَلَا بِرَاْسِیْ. (میرا سر اور میری داڑھی مت پکڑو) کہ دیکھو موسیٰ علیہ السلام نے ہارون علیہ السلام کی ڈاڑھی پکڑ لی تھی معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کے ڈاڑھی تھی لیجئے ڈاڑھی کا ہونا قرآن سے ثابت ہو گیا۔ مجھ سے انہوں نے جواب نقل کیا میں نے کہا کہ مولانا وہ تو وجوب ڈاڑھی کا پوچھتا تھا اور ثابت ہوا وجود اگر وہ یہ سوال کرتا تو کیا ہوتا۔ مولوی صاحب نے کہا اجی اتنی عقل اس میں کہاں تھی کہ وہ یہ سوال کرتا۔ مگر صاحب ہمیں تو شرم آتی ہے ایسی ویسی بات کہتے ہوئے جو بات ہو محقق و باوقعت ہونا چاہیے۔ خیر اس سے تو وجوب ثابت ہی نہیں ہوا لیکن اگر کسی آیت سے وجوب بھی ثابت ہو جاتا تب بھی اول وہلہ میں سائل کے جواب میں یہی کہنا چاہیے تھا کہ ہر حکم کا ثبوت قرآن سے ضروری نہیں۔ ورنہ اگر وہ اور کوئی سوال کرتا تو کہیں نہ کہیں تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہر حکم کا ثبوت قرآن سے ضروری نہیں۔ مگر آج کل اس محقق جواب کو بے وقعت سمجھا جاتا ہے اور تلبیس کے جواب کی وقعت ہوتی ہے۔

عالم اور غیر عالم کی تقریر کا فرق

لیکن اس کی بے وقعتی اور اس کی وقعت چند روزہ ہوتی ہے پھر معاملہ منعکس ہو جاتا ہے۔

مجھ سے ایک انسپکٹر ڈاک خانہ کہتے تھے کہ میں ایک لیکچرار کو جو اخباری دنیا میں مشہور شخص ہیں میں یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں ایسا محقق نہیں بعد کو جو علماء کی جو تقریریں سنیں تو غور سے یہ فرق معلوم ہوا کہ علماء کی تقریریں فوری اثر تو زیادہ گہرا نہیں کرتیں مگر جتنا زمانہ گزرتا گیا دل میں گھستی گئیں۔ اور اس شخص کی تقریریں جتنا زمانہ گزرتا گیا ڈھلتی گئیں۔ بس یہ معلوم ہونے لگا کہ محض روغن قاز ملتا تھا علماء جڑ کی اور گر کی کہتے ہیں۔ غرض اصل جواب سوال حکمت کا یہ ہے کہ خدا کا حکم ہے اور اس کے بعد اگر تبرعاً کچھ حکمتیں بیان کر دی جائیں وہ اور بات ہے۔

میرا بھی ارادہ تھا کہ اس آیت میں مفصل حکمتیں قربانی کی بیان کروں گو اجمال کا درجہ تو بفضلہٖ حاصل ہو گیا لیکن تفصیل کا درجہ نہیں ہو سکا۔ مگر چونکہ وعظ روح الحج والثج میں بیان بھی ہو چکا ہے اور اس وقت وقت بھی نہیں اس لئے اجمال ہی پر کفایت کرتا ہوں۔ نیز اس وقت زیادہ مقصود بیان کرنا اس کا تھا کہ مسلک محقق جمع بین الظاہر والباطن (ظاہر و باطن دونوں کو جمع کرنا) ہے سو اسی کو یہاں سمجھ لیجئے کہ اس عمل کا باطن تقویٰ اور تعظیم شعائر اللہ ہے اور ظاہر یہ ہے کہ ذبح کرو یہ نہیں کہ دام ادا کر دیئے۔

قربانی کی جگہ قیمت

ایک بزرگ اہل حال اس غلطی میں مبتلا تھے کہ ہمیشہ دام دیدیا کرتے قربانی نہ کرتے ایک روز خواب میں دیکھا کہ قیامت قائم ہے۔ سب کے پاس سواری ہے ان کے پاس نہیں۔ انہوں نے سواری طلب کی جواب ملا کہ یہاں کہاں سواری جو قربانی کرتے ہیں ان کو یہاں سواری ملتی ہے تم قربانی نہیں کرتے جاؤ گھسٹتے ہوئے۔ بیدار ہوئے تو بہت پریشان ہوئے فوراً توبہ کی اور قربانی کرنا شروع کر دیا۔

واہیات سوال

اس پر بعضے تو عمر ہنستے ہیں کہ بہت سے جانور ہوں گے کون سے جانور پر سواری ہوگی۔ اللہ تعالیٰ سب پر قادر ہیں۔ ایک تو یہ صورت ہے کہ سب کے عوض میں ایک بہت بڑا جانور دیدیں ورنہ سب کی ڈاک لگا دیں اگر کسی کے اصطبل میں بہت سے گھوڑے بندھے ہوں تو کیا اس پر بھی کبھی تعجب کیا ہے کہ اتنے گھوڑوں میں کس پر سواری کرتا ہوگا۔ وہاں تو یہ سمجھ لیتے ہو کہ مثلاً یہ ڈاک لگانے کے کام میں آتے ہیں طویل سفر ہو تو ایک گھوڑا کام نہیں دے سکتا۔ تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر ایک ایک گھوڑا بھیج دیا جاتا ہے اور نہایت سہولت سے اتنا بڑا سفر بہت جلد قطع ہو جاتا ہے۔ آخرت کی سب باتوں پر تعجب اور دنیا کی کسی بات پر تعجب نہیں دنیا کی سب باتوں کو عقل کے قریب کر لیتے ہیں۔

مولانا احمد حسن صاحب امروہی خود مجھ سے بیان فرماتے تھے کہ میں ریل میں سوار تھا۔ دوسرے درجہ میں ایک مولوی صاحب پرانی وضع کے اور ایک نئی وضع کے میانہ عمر شخص سوار تھے۔ ایک اسٹیشن پر گاڑی پہنچی تو چند انگریزی خواں لڑکے آ کر اسی دوسرے درجہ میں بیٹھے اور ان مولوی صاحب کا اسباب منتشر کر کے خود اپنا اسباب جما کر بیٹھ گئے۔ وہ مولوی صاحب آئے تو ملامت کی شرمندہ ہوئے چاہا کہ مولوی صاحب کو شرمندہ کریں۔ کہنے لگے کیوں صاحب نماز پنجگانہ فرض ہے انہوں نے کہا ہاں کہا یہ سب جگہ پانچ ہی وقت فرض ہے انہوں نے کہا ہاں کہنے لگے جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے وہاں بھی پانچ ہی وقت فرض ہے مولوی صاحب نے کہا کیا تم وہاں سے آ رہے ہو۔ یا وہاں جا رہے ہو کہنے لگے نہیں۔ مولوی صاحب نے کہا تو بس ہم ایسے فضول سوال کا جواب نہیں دیتے۔ اس پر وہ سب قہقہہ مار کر ہنسے اور اس ہنسنے میں وہ میانہ عمر شخص بھی شریک تھے۔

مولانا فرماتے تھے کہ مجھ کو ان کا ہنسنا بہت ناگوار ہوا۔ آئندہ اسٹیشن پر وہ لڑکے تو اتر گئے میں وہاں جا کر بیٹھا اور ان صاحب سے میں نے پوچھا کیوں جناب آپ کا دولت خانہ کہاں ہے آپ ملازم کہاں ہیں۔ سب کا جواب ملا پھر میں نے پوچھا آپ کو شب و روز میں کے گھنٹہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اس کا بھی جواب دیدیا۔ میں نے کہا کیوں جناب اگر گورنمنٹ کی سلطنت اس مقام پر ہو جاوے جہاں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہوتی ہے اور آپ کی وہاں کی بدلی ہو جاوے تو کیا وہاں بھی ایک شب و روز میں اتنے ہی گھنٹے کام کرنا ہوگا۔ کہنے لگے کہ نہیں بلکہ اندازہ وقت کا کر کے اس شب و روز کو سال بھر قرار دے کر سال بھر کا کام کیا جاوے گا۔

میں نے کہا افسوس سلطان دنیا کے احکام و تجویز کی تو آپ کے ذہن میں یہ وقعت کہ اس پر اشکال واقع ہو تو فوراً اس کی توجیہ کر لی اور سلطان دارین کے احکام کی اتنی بھی بے وقعتی کہ اس پر جو ایسا ہی اشکال واقع ہوا تو بجائے توجیہ کے اس کی تحقیر کی اور اس پر تمسخر اڑایا۔ وہ شخص بے حد شرمندہ ہوا اور معذرت اور توبہ کی۔

بس اس طرح یہاں بھی ایسی ہی توجیہ کر سکتے ہو۔ بس یہ سوال ہی واہیات ہے کہ بہت سے جانور ہوں گے کون سے جانور پر سواری ہوگی یہاں بھی اس کی نظیر موجود ہے۔ اور اصل بات تو یہ ہے کہ اس توجیہ پر کچھ موقوف نہیں ہم یوں کیوں نہ کہہ دیں کہ تعدد کے وقت ہم کو معلوم نہیں کس طرح ہوگا۔ کیونکہ بتلایا ہم کو گیا نہیں اور رائے کا کام نہیں۔ خواہ یہ صورت ہو جاوے یا کچھ اور ہو جاوے۔

ایک مجذوب کا قول مجھے بہت پسند آیا اس سے کسی واقعہ کی نسبت پوچھا کب ہوگا اس نے کہا ہم اللہ میاں کے بھتیجے نہیں کہ چچا جان نے یہ کیا ہو کہ لاؤ بھتیجے سے بھی مشورہ کر لیں۔ ہم ان کے سر رشتہ دار نہیں ہم کو کیا خبر کب ہوگا۔ پس تکوینیات میں بھی اور تشریعیات میں بھی بندہ کو اپنا یہ مذہب رکھنا چاہیے ؎

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار　　کار ملک است آں کہ تدبیر و تحمل بایدش

(رند عالم سوز یعنی عاشق کو مصلحت بینی سے کیا تعلق اس کو تو محبوب حقیقی کا کام سمجھ کر تحمل و تدبیر چاہیے)

کار کن کار بگذر از گفتار　　اندریں راہ کار باید کار!

(عمل کرو دعوے کو ترک کرو۔ اس طریق میں عمل و کام ہی کی ضرورت ہے)

قدم باید اندر طریقت نہ دم　　کہ اصلے ندارد دم بے قدم

(یعنی طریقت میں قدم رکھنا چاہیے یعنی عمل کرنا نہ دعویٰ کرنا اس لئے بغیر قدم رکھے عمل کئے دعویٰ کی کچھ اصلیت نہیں)

اب دعا فرمایئے فہم سلیم و عمل مستقیم کی (پھر دعا کر کے جلسہ ختم کیا) فقط

تمت بالخیر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

احکام حج

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

تمہید بعد از خطبہ

چونکہ رسالہ الہادی ہر ماہ کی تین تاریخ کو شائع ہوتا ہے اور نماز عید وصدقہ فطر وغیرہ کے مسائل کی ضرورت اس سے پیشتر ہی ہو جاتی ہے اس لئے ماہ شوال کے متعلق ضروری احکام رمضان المبارک کے رسالہ میں ہدیہ ناظرین ہو چکے ہیں لیکن احکام حج کا بیان باقی رہ گیا تھا۔ جس کا تعلق اس بابرکت ماہ کے ساتھ دو وجہ سے ہے اول یہ کہ اس مہینے سے اشہر حج شروع ہوتے ہیں جیسا کہ آئندہ حدیث شریف سے معلوم ہوگا دوسرے یہ کہ ہمارے ملک سے اکثر اسی ماہ میں سفر حج شروع کیا جاتا ہے لہذا اب احکام حج لکھے جاتے ہیں۔ واللہ الموفق والمعین

اشہر حج: ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قول خداوندی الحج اشھر معلومات میں کہ وہ (یعنی حج کے معین مہینے) شوال اور ذیقعدہ اور ذوالحجہ (کے دس روز) ہیں الدر المنثور عن اوسط الطبرانی والخطیب وابن مردویہ ونقل عن کثیر من السلف فائدہ شوال سے قبل حج کا احرام باندھنا مکروہ ہے اور احرام کے علاوہ افعال حج میں سے کوئی فعل شوال سے قبل ہو تو وہ بالکل غیر معتبر ہے مثلاً کسی شخص نے طواف قدوم کے بعد سعی بین الصفا والمروہ رمضان میں کر لی تو سعی کافی نہیں اھ اور حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اللہ کے لئے لوگوں کے ذمہ بیت اللہ کا حج کرنا ہے ان پر جو کہ اس تک سبیل (یعنی زادراہ) کی طاقت رکھیں۔

تاخیر حج: اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ جو شخص حج کا ارادہ رکھتا ہو اس کو چاہیے کہ جلدی کرے۔ (ابوداؤد دارمی) یعنی فرض ہونے کے بعد اول ہی سال جانا لازم ہے اگر نہ گیا تو تاخیر حج کا گناہ ہوگا۔ اور اگر کئی سال تک تاخیر کرتا رہا تو فاسق مردود الشہادۃ ہے۔ کمافی الدر وغیرہ اھ۔ ونیز ارشاد فرمایا رسولؐ خدا نے کہ جس شخص کو حج سے کھلم کھلا ضرورت یا ظالم بادشاہ یا رکاوٹ کے قابل مرض نے حج سے نہ روکا ہو اور پھر بھی (باوجود فرض ہونے کے) اس نے حج نہ کیا ہو پس خواہ وہ یہودی ہو کر مرے خواہ نصرانی (دارمی)

فضیلت حج: ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص نے (خالص) اللہ کے لئے حج کیا اور اس میں فحش گوئی نہ کی۔ اور گناہ نہ کیا تو وہ شخص اس دن کی مانند لوٹتا ہے جس دن کہ اس کی ماں نے اس کو جنا تھا (متفق علیہ)

عمرہ کی فضیلت: اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چار عمرے کئے ہیں وہ سب ذیقعدہ میں تھے۔ سوائے اس ایک کے جو حج وداع کے ساتھ تھا (کہ وہ ذوالحجہ میں واقع ہوا تھا۔ متفق علیہ)

فائدہ: عمرہ سنت مؤکدہ ہے بلکہ بعض فقہاء نے واجب کہا ہے اور عمرہ اس کو کہتے ہیں کہ احرام میں عمرہ کی نیت کی جاوے اور طواف کعبہ اور صفا مروہ کے درمیان سعی کرے پوری تفصیل کسی واقف سے زبانی معلوم کرلیں۔

فائدہ-۲: اس جگہ ایک بات قابل تنبیہ یہ ہے کہ عام لوگ جو ماہ ذیقعدہ کو منحوس سمجھتے ہیں یہ بڑی سخت بات ہے اور باطل عقیدہ ہے دیکھئے آنحضرتؐ نے اس ماہ میں تین عمرے کئے ہیں اس سے کتنی برکت ثابت ہوتی ہے و نیز ذیقعدہ حج کے مہینوں میں سے ہے۔ جیسا کہ حدیث اول میں گزر چکا اھ اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ حج اور عمرہ ملا کر کیا کرو کیونکہ وہ دونوں فقر اور گناہوں کو اس طرح دور کرتے ہیں جیسا کہ بھٹی لوہے اور چاندی اور سونے کے میل کو دور کرتی ہے اور حج مبرور (یعنی مقبول) کی جزا جنت کے سوا کچھ نہیں۔ (ترمذی ونسائی)

فضیلت یوم عرفہ: اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ شیطان کسی دن عرفہ کے دن سے زیادہ ذلیل ورانده ہوا اور حقیر ورنجیدہ نہیں دیکھا گیا اور نہیں ہے۔ یہ مگر اسی کی وجہ سے جو کہ وہ رحمت کا نازل ہونا۔ اور خدا تعالیٰ کا بڑے بڑے گناہ سے درگزر فرمانا دیکھتا ہے سوائے جنگ بدر کے (کہ اس میں تو یوم عرفہ کے برابر یا زیادہ اس کی خواری وغیرہ دیکھی گئی) کیونکہ (اس روز) اس نے جبرئیل علیہ السلام کو فرشتوں کی صفیں ترتیب دیتے ہوئے دیکھا تھا۔ (مالک مرسلاً وشرح السنہ) اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ (ایک) عمرہ (دوسرے) عمرے تک کفارہ ہے ان دونوں کے درمیان (کے گناہوں) کا (ترغیب عن مالک والشیخین والترمذی والنسائی وابن ماجہ)

خدائی مہمان: اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ حج کرنے والے اور عمرہ کرنے والے اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں اگر دعا مانگیں تو خدا قبول کرتا ہے اور وہ استغفار کریں تو خدا ان کی مغفرت کر دیتا ہے (ترغیب نسائی وابن ماجہ) ۱۲

زیارت مدینہ: اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ جس شخص نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لئے میری شفاعت ضروری ہوگئی۔ (آثار السنن عن ابن خزیمہ فی صحیحہ والدارقطنی وآخرین ونسائی واسنادہ حسن)

فائدہ: جن کو گنجائش ہو وہ حج کے ساتھ زیارت مدینہ کا شرف بھی ضرور حاصل کریں کہ اس کی بڑی فضیلت وارد ہوئی ہے بلکہ تاکید بھی روایات میں آئی ہے اور اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قبر شریف کی نیت سے جانا بھی مضائقہ نہیں رکھتا۔ ۱۲۔ اور حق تعالیٰ شانہٗ نے ارشاد فرمایا ہے کہ (ابراہیم علیہ السلام سے بھی کہا گیا تھا کہ) لوگوں میں حج (کے فرض ہونے کا) اعلان کر دو۔ لوگ تمہارے پاس (حج کے لئے) چلے آئیں گے پیادہ بھی اور دبلی اونٹنی پر بھی جو کہ دراز رستوں سے پہنچی ہوں گی۔

حج کے متعلق چند ضروری ہدایات

تارک حج: (۱) جس کے پاس ضروریات سے زائد اتنا خرچ ہو کہ سواری پر متوسط گزران سے کھانا پینا چلا جاوے اور حج کر کے چلا آوے اس کے ذمے حج فرض ہو جاتا ہے اور حج کی بہت بڑی بزرگی آئی ہے۔ چنانچہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو حج گناہوں اور خرابیوں سے پاک ہو اس کا بدلہ بجز بہشت کے اور کچھ نہیں ہے اسی طرح عمرہ پر بھی بڑے ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح دور کرتے ہیں جیسے بھٹی لوہے کے میل کو دور کرتی ہے اور جس کے ذمے حج فرض ہوا اور وہ نہ کرے اس کے لئے بڑی دھمکی آئی ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس کے پاس کھانے پینے اور سواری کا اتنا سامان ہو کہ وہ بیت اللہ شریف تک جا سکے اور پھر وہ حج نہ کرے تو کچھ بعید نہیں کہ وہ یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر مرے۔ (نعوذ باللہ) غرضیکہ حج کی بیحد فضیلت آئی ہے اور اس کے تارک پر جبکہ اس پر فرض ہو چکا ہے سخت وعید آئی ہے سو اتنی بات تو اکثروں کو معلوم ہے لیکن اس میں بعض غلطیاں عام ہو رہی ہیں ان کو اس جگہ ظاہر کیا جاتا ہے۔

مسائل حج: الف:۔ جب حج کے خرچ کا حساب لگاتے ہیں تو اس میں زیارت مدینہ منورہ کے خرچ کا بھی حساب لگاتے ہیں۔ پس اگر مدینہ منورہ تک جانے کا خرچ ہوتا ہے جب تو حج کو فرض سمجھتے ہیں ورنہ فرض نہیں سمجھتے تو یاد رکھو کہ اگر صرف سفر حج کے لئے جانے کا اور وہاں سے واپس چلے آنے کا خرچ ہو تو حج فرض ہو جاتا ہے گو مدینہ منورہ کی زیارت کے لئے خرچ نہ ہو۔ البتہ اگر اس کی زیارت کا سامان یا ہمت ہو تو اس کا ثواب بھی بے حد و حساب ہے لیکن حج کا فرض ہونا اس پر موقوف نہیں اگر ایسا شخص حج نہ کرے گا تو اس کے لئے وہی وعید ہے جو مرقومہ بالا حدیث میں آئی ہے۔ (ب) راستہ میں اگر ذرا سا بھی شبہ ہوتا ہے تو لوگ حج کو فرض نہیں سمجھے حالانکہ معمولی اندیشہ کا اعتبار نہیں۔ پس اگر راستہ میں غالب گمان سلامتی کا ہے اور گمان بدامنی کا مغلوب ہے تو حج فرض ہو جاتا ہے۔ (ج) بعض لوگوں کو حج کی گنجائش ہوتی ہے و لیکن تعمیر مکان یا شادی وغیرہ میں خرچ کرنے کو مقدم سمجھ کر حج سے اپنے آپ کو سبکدوش خیال کرتے ہیں اس کے متعلق یہ مسئلہ ہے کہ جس زمانہ میں عموماً لوگ حج کو جاتے ہیں (مثلاً ہمارے ملک میں ماہ شوال) اس سے قبل اگر کسی نے دوسرے کام میں رقم وغیرہ خرچ کر دی تب تو حج فرض نہ ہوگا اور اگر سفر حج کا زمانہ آ گیا تو حج فرض ہو گیا۔ اور تعمیر مکان یا شادی وغیرہ امور غیر ضروریہ عندالشرع میں خرچ کرنا جائز نہیں۔ گو اس تعمیر وغیرہ کی حاجت ہی ہو اگر خرچ کرے گا تو گنہگار ہوگا۔ اور حج ذمہ رہے گا خوب سمجھ لو۔

(۱) جس پر حج فرض ہوا اور اس کے والدین منع کرتے ہوں اس کو جانا فرض ہے اس میں والدین کی اطاعت جائز نہیں (۲) اسی طرح جس عورت پر حج فرض ہوا اور اس کے ساتھ اس کا محرم بھی ہو مگر اس کا

شوہر منع کرتا ہو اس کو شوہر کا کہنا ماننا جائز نہیں۔ (۳) بعض عورتیں بدوں محرم کے دوسری عورتوں کے ساتھ یا ثقہ مردوں کے ساتھ حج کو چلی جاتی ہیں یہ جائز نہیں (۴) عورت اگر عدت میں ہو اس کو حج کا سفر کرنا بھی جائز نہیں خواہ عدت وفات ہو یا عدت طلاق۔ اور طلاق رجعی ہو یا بائن یا مغلظہ حتیٰ کہ اگر حج کے راستہ میں عدت واجب ہو جاوے یعنی تین منزل سفر کرنے[1] کے بعد راستہ میں خاوند نے طلاق بائن دے دی ہو یا اس کا انتقال ہو گیا ہو تو اسی جگہ عدت پوری کرے۔ البتہ اگر جہاز یا جنگل وغیرہ میں ایسا اتفاق پیش آ جاوے تو ساحل تک یا قریبی آبادی تک پہنچنا جائز ہے۔ اور یہ تفصیل جب ہے کہ مقام طلاق یا وفات سے مکہ معظمہ تین منزل ہو اور اگر تین منزل سے کم ہو تو پھر حج کو چلی جائے اور اگر خاوند نے طلاق رجعی دی ہے اور خاوند ساتھ جا رہا ہے تو سفر حج موقوف کرنے کی ضرورت نہیں۔ (۵) جس نے نابالغی میں حج کیا ہو اور پھر اس کو گنجائش سفر حج کی ہو جاوے تو پھر اس پر حج فرض ہو گا وہ پہلا حج کافی نہیں۔ (۶) اگر بلوغ کے بعد ناداری کی حالت میں حج کیا ہو اور پھر مالدار ہو جاوے تو وہ پہلا حج کافی ہے۔

حج اکبر کیا ہے؟: (۷) حج بدل کے مسائل بہت نازک ہیں جب کوئی حج بدل کے لئے جاوے یا کسی کو بھیجے تو کسی محقق عالم سے اس کے مسائل تحقیق کر لے۔ (۸) بعض لوگ تبرکات لانے کو ایسا لازم سمجھتے ہیں کہ اگر اس کے زیادہ خریدنے کے لائق خرچ نہ ہو حج کو ہی نہیں جاتے یا اسی طرح واپس آ کر دعوت دینے کو بھی۔ سو ان امور کی وجہ سے حج کو ملتوی کرنا حرام ہے۔ (۹) عوام الناس میں جمعہ کے روز کے حج کا لقب حج اکبر مشہور ہے۔ سو یہ شریعت میں لفظی تحریف کرنا ہے کیونکہ اطلاقات شرعیہ میں حج اکبر مطلق حج کو کہتے ہیں اس عمرہ سے ممتاز کرنے کے لئے جس کو حج اصغر کہتے ہیں اور قرآن مجید میں جو شروع سورۃ براءت میں یَوْمَ الْحَجِّ الْاَکْبَرِ آیا ہے وہاں یہی تفسیر ہے اب اس اصطلاح مخترع سے احتمال ہے تفسیر میں غلطی کا اور عوام اس کے اہتمام میں بھی بہت غلو کرتے ہیں یہ شریعت میں تحریف معنوی یعنی بدعت ہے۔ البتہ حج یوم جمعہ کی فضیلت کا انکار نہیں ایک بڑی فضیلت یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حج جمعہ کے روز واقع ہوا تھا۔ مگر عوام کی زیادات یہ محض بے اصل ہیں۔

فرضیت حج کے بارے میں تنبیہ: عام طور پر یوں سمجھا جاتا ہے کہ جب نقد روپیہ مصارف حج کے لئے کافی موجود ہو تب حج فرض ہوتا ہے۔ حالانکہ جس کے پاس حاجت سے زائد اتنی زمین وغیرہ ہو جس کی قیمت مصارف حج کے واسطے کافی ہو اس پر بھی حج فرض ہے لہٰذا عالمگیری سے وہ صورتیں مفصل لکھی جاتی ہیں جن میں بدوں نقد کے بھی حج فرض ہو جاتا ہے۔

(۱) رہائشی مکان کے علاوہ کوئی زائد مکان ہو تو اس کو بیچ کر حج کرنا فرض ہے۔ (یعنی جبکہ اس کی

---

[1] اور اگر ابھی تین منزل سفر نہ ہوا تھا اور مکہ معظمہ تک تین منزل باقی ہوں تو گھر واپس آنا ضروری ہے اور اگر وہاں سے گھر بھی تین منزل سے کم ہو اور مکہ معظمہ بھی تو اختیار ہے کہ واپس آ جائے یا حج کو چلی جائے۔ ۱۲ منہ

قیمت میں حج ہو سکے اسی طرح کسی کے پاس غلام ہو اور اس سے خدمت لینے کی ضرورت نہ ہو تب بھی فرض ہے کہ غلام کو فروخت کر کے حج کرے۔ (یہی حکم جب ہے جبکہ ضرورت سے زائد گھوڑا وغیرہ کسی کے پاس ہو) لیکن اگر کسی کے پاس صرف ایک مکان ہو اور وہ اتنا بڑا ہو کہ ایک حصہ اس کی رہائش کے لئے کافی ہے اور باقی کی قیمت حج کے واسطے کافی ہو سکتی ہے تو اس کا حصہ فروخت کرنا ضروری نہیں ہے اسی طرح اگر کسی کے پاس بہت قیمتی مکان ہے کہ اس کی قیمت میں حج بھی ہو سکتا ہے اور معمولی مکان بھی مل سکتا ہے تب بھی اس کے ذمہ حج فرض نہیں ہے گو افضل یہی ہے کہ ان دونوں صورتوں میں حج کرے۔

(۲) اگر کسی کے پاس قیمتی کپڑے ہیں جو استعمال میں نہیں لائے جاتے تو لازم ہے ان کو فروخت کر کے حج کیا جائے۔ زائد برتنوں کا بھی یہی حکم ہے اور زیور تو شرعاً بالکل نقد کے حکم میں ہیں۔

(۳) اگر کسی جاہل کے پاس کتابیں ہوں تو ان کو حج کے واسطے فروخت کرنا ضروری ہے البتہ اگر عالم کے پاس[۱] فقہ کی کتابیں ہوں تو ان کو فروخت کرنا ضروری نہیں (اور کتب تفسیر و حدیث وغیرہ کا بھی یہی حکم ہے اور شامی میں ہے کہ علوم الٰہیہ یعنی صرف، نحو وغیرہ کی کتابیں بھی کتب دینیہ کے ساتھ شمار کی جائیں گی اور طب و نجوم (وغیرہ) کی کتابوں کو فروخت کرنا ہر حال میں ضروری ہے۔ خواہ وہ جاہل کے پاس ہوں یا اہل علم کے اور گو وہ استعمال میں آتی ہوں اور بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ منطق فلسفہ وغیرہ کی کتابوں کا وہی حکم ہے جو طب کی کتابوں کا ہے۔ واللہ اعلم

(۴) اگر کسی دکاندار کے پاس اتنا مال تجارت ہے کہ اگر کچھ مال فروخت کر کے حج ہو سکتا ہے اور باقی ماندہ مال سے بقدر ضرورت تجارت ہو سکتی ہے تو حج کرنا فرض ہے۔

(۵) جس پیشہ ور کے پاس اتنی زمین ہے کہ اگر مصارف حج کی مقدار فروخت کر دے تو باقی زمین کی آمدنی سے گزر ہو سکتا ہے تو اس پر زمین فروخت کر کے حج کرنا لازم ہے۔

(۷) کاشتکار کے پاس اگر ہل اور بیل وغیرہ کے علاوہ اتنا سامان ہو کہ اس کو مصارف حج کے لئے کافی ہو سکتی ہے تو اس کے ذمہ بھی لازم ہے کہ زائد سامان کو فروخت کر کے حج کرے۔ فقط واللہ اعلم

احقر عبدالکریم گمتھلوی عفی عنہ، مقیم خانقاہ امدادیہ

تھانہ بھون ضلع مظفرنگر

مورخہ ۱۳ رمضان ۱۳۵۱ھ

---

[۱] عالمگیری میں یہ قید بھی ہے کہ اس عالم کو ان کتابوں کی ضرورت بھی ہو مگر شامی نے یہ قید نہیں لگائی۔ احقر کے خیال میں وجہ تطبیق یہ ہے کہ قید کو اتفاقی کہا جائے اسی لئے اسکو متن میں احقر نے نہیں لیا۔ لیکن جس صاحب کو اس مسئلہ کی ضرورت پیش آوے اس کو چاہیے کہ علمائے کرام سے تحقیق کر لے۔ فقط والسلام ۱۲ منہ)

ماہ ذوالحجہ کے احکام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بعد حمد وصلوٰۃ مسلمان بھائیوں کی خدمت میں گزارش ہے کہ اس ماہ مبارک میں حج ہوتا ہے اس لئے اس کو ذوالحجہ کہتے ہیں (یعنی حج کا مہینہ) اور حج کی یاددہانی کے لئے ماہ شوال مناسب ہے۔ اس واسطے حج کی تاکید و فضیلت ماہ شوال کے پرچہ میں درج ہو چکی ہے اب بغرض مکرر یاددہانی عرض ہے کہ جن لوگوں کے ذمہ حج فرض ہے وہ اب بھی ہمت کر کے اس فریضہ خداوندی سے سبکدوشی حاصل کر لیں۔ کیونکہ اس ماہ ذیقعدہ میں جانے سے بھی یہ دولت نصیب ہو سکتی ہے۔ اس کار خیر میں دیر کرنا گناہ ہے جیسا کہ رسالہ شوال میں مفصل گزر چکا۔ سال آئندہ ٹال دینا ہرگز مناسب نہیں۔ خدا جانے اس وقت تک زندگی رہے یا موت کا پیام آ جاوے اور حج کے علاوہ دوسرے احکام شرعیہ جو اس ماہ ذوالحجہ سے تعلق رکھتے ہیں ان کے واسطے ماہ ذیقعدہ کا رسالہ مناسب خیال کیا گیا تا کہ پیشتر سے واقف ہو کر اہتمام[1] کیا جاوے اور وہ احکام یہ ہیں (۱) ذوالحجہ کی یکم سے نہم تک روزے اور دسویں تک شب بیداری (۲) تکبیر تشریق (۳) نماز عیدالاضحیٰ (۴) قربانی ان سب کا مختصر بیان کیا جاتا ہے۔

نو دن کے روزے اور دسویں شب تک بیداری کی فضیلت

حق تعالیٰ شانہٗ نے ارشاد فرمایا قسم ہے فجر کی اور دس راتوں کی اور طاق کی اور جفت کی۔ اس آیت کے متعلق درمنثور نے متعدد سندوں سے روایت درج کی ہے کہ آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا اس آیت میں دس راتوں سے عشرۂ ذی الحجہ مراد ہے اور طاق سے عرفہ کا دن اور جفت سے قربانی کا دن مراد ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی دن ایسے نہیں جن میں نیک عمل اللہ تعالیٰ کو ان دس دنوں (کے عمل) سے زیادہ پسند ہو (بخاری)

اور حضرت رسول خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی دن ایسے نہیں جن میں عبادت کرنا خدا تعالیٰ کو عشرہ ذی الحجہ (کی عبادت) سے زیادہ پسند ہو (کیونکہ ان میں سے ہر ایک دن کا روزہ ایک سال روزہ رکھنے کے برابر ہے۔ اور ہر ایک رات کا جاگنا شب قدر میں جاگنے کے برابر ہے۔ (ابن ماجہ والترمذی وقال اسنادہ ضعیف) **فائدہ:** دسویں تاریخ سے تیرہویں تک چار یوم کا روزہ حرام ہے اس واسطے روزہ کی یہ فضیلت نو تاریخ تک کے لئے ہے اھ

اور ارشاد فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ میں اللہ تعالیٰ سے امید کرتا ہوں کہ عرفہ[2] (یعنی ذی الحجہ کی نو تاریخ) کا روزہ ایک سال گذشتہ اور ایک سال آئندہ کا کفارہ ہو جاتا ہے۔ (مسلم) و نیز ارشاد فرمایا

---

[1] ان احکام میں تین مسئلے خاص طور پر پہلے ہی سے خیال رکھنے کے قابل ہیں اول یہ کہ قربانی کو خوب کھلا پلا کر موٹا کرنا مستحب ہے اس لئے کچھ روز پیشتر ہی خرید لینا چاہیے دوسرا یہ کہ جو قربانی کا ارادہ رکھتا ہو وہ ان دنوں میں (پہلی ذی الحجہ سے قربانی ہونے تک ناخن اور بال نہ بنواوے۔ تیسرا یہ کہ ذی الحجہ کی چاند رات سے ہی شب بیداری اور پہلی ہی تاریخ سے روزہ رکھنا چاہیے اور یہ سب اعمال مستحب ہیں۔ ۱۲ منہ)

[2] اس میں اختلاف ہے کہ یہ عشرہ ذی الحجہ افضل ہے یا رمضان شریف کا عشرہ اخیرہ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ نے لکھا ہے کہ مختار یہ ہے کہ اس عشرہ کے دن افضل ہیں اور عشرہ اخیرہ کی راتیں۔ واللہ اعلم ۱۲ منہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ عرفہ کا روزہ ہزار روزہ کے برابر ہے (ترغیب عن البیہقی والطبرانی باسناد حسن)

اور ایک روایت میں آیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ جس نے عرفہ[1] کا روزہ رکھا اس کے پے در پے دو سال کے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں (ترغیب عن ابی یعلی ورجالہ رجال الصحیح)

فائدہ: یعنی ایک سال گذشتہ کے اور ایک سال آئندہ کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ جیسا کہ مسلم کی روایت میں گزر چکا اھ اس عشرہ کی فضیلت میں بہت احادیث وارد ہوئی ہیں مگر ہم نے اختصار کی وجہ سے چند حدیثیں لکھی ہیں اور انہیں سے معلوم ہو گیا کہ یکم سے نہم تک ہر طرح کی عبادت میں کوشش کرنا چاہیے۔ اور حتی الوسع ان ایام کو صیام وقیام یعنی روزہ وشب بیداری میں گزارنا چاہیے۔ بالخصوص نو تاریخ کا روزہ زیادہ فضیلت رکھتا ہے اب آگے ایک حدیث شریف لکھی جاتی ہے، جس سے دسویں رات کو جاگنے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے۔

فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ جو شخص عیدین (یعنی عید الفطر وعید الاضحیٰ) کی دونوں راتوں میں طلب ثواب کے لئے بیدار رہا اس کا دل اس دن زندہ رہے گا جس دن سب کا دل مردہ ہوگا۔ (ترغیب عن ابن ماجہ وقال رواتہ ثقات الا ان بقیۃ مدلس وقد عنعنہ) علاوہ ازیں جن روایتوں میں اس عشرہ میں نیک عمل اور صیام وقیام کی فضیلت گزر چکی ہے ان سے بھی اس کی فضیلت ثابت ہوتی ہے کما لا یخفی واللہ اعلم۔

تکبیرات تشریق: ارشاد فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ نہ کوئی دن اللہ کے نزدیک اس عشرہ (ذی الحجہ) سے افضل ہے اور نہ کسی دن میں عمل کرنا ان میں عمل کرنے سے افضل ہے۔ پس تم ان میں (خصوصیت سے) لا الہ الا اللہ اور اللہ اکبر کی کثرت رکھو کیونکہ یہ دن تکبیر اور تہلیل کے ہیں (در منثور عن البیہقی)

فائدہ: یوں تو اس تمام عشرہ میں تکبیر وتہلیل کی زیادتی پسندیدہ ہے جیسا کہ اس روایت سے معلوم ہوا ولیکن نو تاریخ کی فجر سے تیرہویں کی عصر تک ہر نماز کے بعد بلند[2] آواز سے ایک مرتبہ تکبیر[3] کہنا ضروری ہے۔ جیسا کہ آثار السنن میں بحوالہ ابن ابی شیبہ حضرت علی کرم اللہ کا معمول مروی ہے۔ (ونقل عن ابن حجر ان اسنادہ حسن) ونیز سنن بیہقی میں حضرت عمرؓ وحضرت علیؓ وحضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے یہی روایت کی ہے علاوہ ازیں بیہقی ہی نے جابر بن عبداللہؓ سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یوم عرفہ کی فجر سے آخر ایام تشریق کی عصر تک تکبیر پڑھا کرتے تھے۔

(وقال اسنادہ لا یحتج بہ وقال ایضا بعد سرد الطرق وفی روایۃ الثقات کفایۃ واللہ اعلم)

نماز عید الاضحیٰ کے احکام

عید اور بقر عید کی نماز شہر اور قصبہ اور اس بڑے گاؤں کے لوگوں پر واجب ہے جو قصبہ کے مشابہ ہو جیسا کہ جمعہ اور جس طرح جمعہ چھوٹے گاؤں میں جائز نہیں اسی طرح عیدین کی نماز بھی جائز نہیں اس لئے چھوٹے

---

[1] بعض جگہ عوام شب برات کی تیرہویں یا چودھویں کو عرفہ کہتے ہیں وہ بالکل غلط ہے۔ ۱۲ منہ

[2] مگر عورتیں آہستہ کہیں ۱۲ منہ۔ [3] تکبیر یہ ہے اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد ۱۲ منہ

گاؤں میں ہرگز نہ پڑھی جاوے۔ اور بقر عید[1] کے روز سنت یہ ہے کہ نماز عید سے پہلے کچھ کھائیں پئیں نہیں جو لوگ قربانی کریں ان کے لئے یہ مسنون ہے کہ نماز کے بعد نہ کھاویں بلکہ قربانی کے بعد اپنی قربانی میں سے۔

کھاویں اور نماز سے پیشتر غسل اور مسواک کر کے اپنے موجودہ کپڑوں میں سے عمدہ ترین کپڑے پہنیں اور خوشبو لگاویں اور جہاں تک ہو سکے جلدی عیدگاہ پہنچیں اور پیدل جاویں اور راستہ میں با آواز بلند تکبیر کہتے رہیں تکبیر وہی ہے، جو ایام تشریق کے حاشیہ میں گزری یعنی الله اکبر الله اکبر لاالٰه الا الله والله اکبر الله اکبر ولله الحمد اور نماز کے بعد بلند آواز سے تکبیر پڑھیں کہ بعض فقہاء نے اس کو واجب کہا ہے اور خطبہ کے وقت اسی طرح صف بستہ چپ چاپ بیٹھے رہیں اکثر لوگ خطبہ نہیں سنتے وہ برا کرتے ہیں۔ اور ترک سنت متوارثہ کے وبال میں گرفتار ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ خطبہ کے وقت بولتے ہیں وہ سخت گنہگار ہوتے ہیں کیونکہ اس وقت چپ رہنا واجب ہے پھر جب واپس ہوں تو جس راستہ سے گئے تھے اس راستہ سے نہ آویں بلکہ دوسرے راستہ سے لوٹیں اور واپسی میں اگر کسی چیز پر سوار ہو جائیں تو مضائقہ نہیں۔

عورتوں کی جماعت: تنبیہ اول:

بعض جگہ دستور ہے کہ جب عیدگاہ میں مرد نماز کو جاتے ہیں تو عورتیں جمع ہو کر اپنے گھروں میں نفل نماز پڑھتی ہیں پھر بعض جگہ تو جماعت کرتی ہیں اور بعض جگہ تنہا پڑھتی ہیں حالانکہ دونوں طرح کراہت سے خالی نہیں کیونکہ نماز عید سے قبل نفل پڑھنا مکروہ ہے اور جماعت ہونے سے زیادہ کراہت ہو جاتی ہے کیونکہ عورتوں کی جماعت بھی مکروہ ہے اور اہتمام سے نفل کی جماعت بھی مکروہ ہے۔

غرض جماعت میں تین مکروہات جمع ہو جاتے ہیں و نیز ایک گناہ بے پردگی کا ہوتا ہے، کیونکہ یہ گمان کرتی ہیں کہ سب مرد چلے گئے اسلئے بے فکر نکلتی ہیں حالانکہ بعض آدمی راستے میں مل جاتے ہیں اسلئے نہایت اہتمام کے ساتھ بچنا لازم ہے اور اگر کوئی نفل پڑھنا چاہے تو نماز عید کے بعد اپنے گھر میں تنہا ہی نفل چاشت کی نیت سے پڑھ لے تو ثواب ہے۔

تنبیہ دوم نماز عید مسجد میں: عیدین کی نماز عیدگاہ میں پڑھنا مسنون ہے اس واسطے اگر امام عیدگاہ دیندار ہو تو عیدگاہ میں جانا چاہیے۔ البتہ اگر بیماری یا بڑھاپے کے سبب مسجد میں شریک ہو جاوے تو مضائقہ نہیں اور مسجدوں میں عیدین کی نماز معذور لوگوں ہی کے واسطے جاری بھی ہوئی ہے ولیکن جب امام عیدگاہ ایسا ہو جس کے پیچھے نماز پڑھنا مکروہ ہو تو پھر دیندار امام کے پیچھے مسجد میں پڑھ لیں غرض بلاوجہ مسجدوں میں نماز عید نہ پڑھی جاوے۔

تنبیہ سوم دعا بعد خطبہ: عید کی نماز کے بعد تو دعا مانگنے کی گنجائش ہے لیکن خطبہ کے بعد دعا مانگنا محض بے دلیل ہے اس واسطے خطبہ کے بعد دعا نہ مانگی جاوے۔

تنبیہ چہارم اذان عید: نماز عیدین کے لئے اذان اور اقامت نہیں ہے اور یہ جو دستور ہے کہ الصلوٰۃ الصلوٰۃ پکارتے ہیں یہ بدعت ہے اس کو ترک کرنا چاہیے۔

تنبیہ پنجم اوقات عید: عید الفطر کی نماز میں تاخیر بہتر ہے اور عید الاضحیٰ میں تعجیل اور معیار

---

[1] اور عید الفطر میں نماز سے قبل کوئی شیریں چیز کھانا مسنون ہے و نیز یہ کہ صدقہ فطر نماز سے پہلے ہی ادا کر دے اور راستہ میں تکبیر آہستہ کہی جاوے باقی سب سنتیں وہی ہیں جو بقر عید میں ہیں۔ ۱۲ منہ [2] اور دیہاتی لوگ اگر صبح ہی قربانی کر کے شہر میں عید پڑھنے آویں تو وہ نماز سے پیشتر ہی قربانی میں سے کھا لیں ۱۲ منہ

اس کا یہ ہے کہ شروع وقت سے اخیر تک یعنی اشراق سے نصف النہار تک کا حساب لگایا جاوے۔ جتنا وقت ہوتا ہو اس کا آدھا کریں آدھے سے پیشتر پڑھنا تعجیل ہے اور آدھے کے بعد پڑھنا تاخیر اس حساب سے بقر عید کی نماز چھوٹے دنوں میں طلوع آفتاب کے بعد اڑھائی گھنٹہ کے اندر اندر ہو جانا چاہیے اور بڑے دنوں میں اس سے کچھ دیر بعد اور عید الفطر کا مستحب وقت چھوٹے دنوں میں طلوع سے اڑھائی گھنٹہ بعد شروع ہو جاتا ہے اور بڑے دنوں میں ساڑھے تین گھنٹہ بعد۔

تنبیہ ششم التزام عربی خطبہ: خطبہ صرف عربی میں پڑھا جاوے اردو فارسی وغیرہ کوئی زبان شامل نہ کی جاوے۔ اور اگر ضروری مسائل سنانا مقصود ہو تو خطبہ ختم کر کے ممبر سے اتر کر سناویں بلکہ مجمع کی ہیئت بھی بدل دی جاوے اور اس کا بھی التزام نہ کیا جاوے بلکہ کبھی سناویں کبھی نہیں۔

نماز عیدین کا طریقہ[1]: امام یوں نیت کرے کہ میں دو رکعت واجب نماز[2] عید چھ زائد تکبیروں سمیت پڑھتا ہوں منہ طرف کعبہ شریف کے۔ اور مقتدی اس کے ساتھ یہ نیت بھی کریں پیچھے اس امام کے۔ یہ نیت کر کے اللہ اکبر کہہ کر ہاتھ باندھ لیں اور سبحانک اللھم پڑھیں اس کے بعد تین تکبیریں اس طرح کہی جاویں کہ دو تکبیروں میں تو کانوں تک ہاتھ اٹھا اٹھا کر چھوڑتے رہیں اور تیسری تکبیر میں بھی ہاتھ اٹھاویں مگر چھوڑے نہیں بلکہ باندھ لیں بعد ازاں امام اعوذ باللہ اور بسم اللہ آہستہ پڑھ کر بلند آواز سے قراءت یعنی الحمد اور سورت پڑھے اور بہتر یہ ہے کہ سورۂ اعلیٰ وغاشیہ پڑھی جاویں مگر اس پر ہمیشہ پابندی نہ کی جاوے اور مقتدی حسب معمول خاموش رہیں اور دوسری نمازوں کی طرح رکوع سجدہ وغیرہ کر کے دوسری رکعت میں اول امام بلند آواز سے قراءت پڑھے اس کے بعد تکبیریں کہی جائیں اور تینوں تکبیروں میں ہاتھ اٹھا اٹھا کر چھوڑتے رہیں پھر بغیر ہاتھ اٹھائے چوتھی تکبیر رکوع کے واسطے کہہ کر رکوع میں جاویں اور دوسری نمازوں کی طرح سجدوں کے بعد التحیات وغیرہ پڑھ کر سلام پھیر دیں اور امام کو چاہیے کہ تکبیروں کے درمیان اتنا وقفہ کرے کہ مقتدیوں کے فارغ ہونے کا گمان ہو جاوے۔

شروع نماز میں نہ ملنے والے کے احکام

اور جو شخص بعد میں آ کر شامل ہو اس کی چند صورتیں ہیں سب کو الگ الگ لکھا جاتا۔

پہلی صورت: اگر کوئی شخص تکبیروں سے پہلے ہی آ گیا۔ تب تو نیت باندھ کر شامل ہو جاوے اور اگر ایسے وقت پہنچا کہ تکبیریں ہو رہی ہیں تو جتنی تکبیر مل جاویں اتنی ساتھ کہہ لے اور باقی ماندہ بعد میں اسی وقت کہہ لے اور اگر کل تکبیریں ہو چکی ہوں تو نیت باندھتے ہی فوراً تینوں تکبریں کہہ لے خواہ

---

[1] یہ طریقہ نماز نہایت آسان عبارت میں پوری تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے اگر اس کو جداگانہ چھاپ کر ضرورت کے موقعہ پر تقسیم کر دیا جایا کرے تو بہت اچھا ہو ۱۲ منہ۔ [2] اگر عید میں عید الفطر اور بقرعید میں عید الاضحیٰ کا لفظ کہہ لیں تو بہتر ہے نیز امام کو امامت کی نیت بھی کر لینا چاہیے ۱۲ منہ۔

قراءت شروع ہوچکی ہو اور ہاتھ اٹھانے اور باندھنے کا وہی طریقہ ہے جو اوپر گزر چکا۔

دوسری صورت: اگر کوئی شخص ایسے وقت آیا کہ امام رکوع میں جاچکا ہے تو اگر غالب گمان ہو کہ تکبیریں کہنے کے بعد رکوع مل جاوے گا تب تو طریقہ مذکورہ کے موافق تکبیریں کہنے کے بعد رکوع کی تکبیر کہہ کر رکوع میں جاوے اور اگر یہ اندیشہ ہو کہ رکوع نہ ملے گا تو رکوع میں شریک ہوجاوے اور رکوع ہی میں تسبیح کی جگہ بغیر ہاتھ اٹھائے تکبیریں کہہ لے اور اگر ایک یا دو تکبیر کے بعد امام رکوع سے اٹھ جائے تو یہ بھی ساتھ ہی اٹھ جائے باقی تکبیر معاف ہے۔

تیسری صورت: اور جو شخص دوسری رکعت میں اس وقت آیا ہو جب امام رکوع میں جاچکا ہے تو اس کا بھی وہی حکم ہے جو پہلی رکعت کے رکوع کا ابھی لکھا گیا ہے اور پہلی رکعت جو رہ گئی ہے جب امام کے سلام پھیر دینے پر اس کو پڑھے تو اول قرات پڑھنا چاہیے اس کے بعد تین تکبیریں زائد ہاتھ اٹھا اٹھا کر کہنے کے بعد چوتھی تکبیر رکوع کے لئے بغیر ہاتھ اٹھائے کہتا ہوا رکوع میں جائے جیسا کہ دوسری رکعت میں حکم ہے۔

چوتھی صورت: اگر دوسری صورت کے رکوع کے بعد کسی وقت آ کر ملے تو پھر دونوں رکعت اس طریقہ سے پڑھے جو شروع میں لکھا ہوا ہے۔

چند ضروری مسائل: (۱) اگر امام نے پہلی رکعت کی تکبیر بھول سے چھوڑ کر قراءت شروع کر دی ہو تو یہ حکم ہے کہ اگر الحمد پڑھتے پڑھتے یاد آ جائے تب تو تکبیریں کہہ کر دوبارہ[۱] الحمد شریف پڑھی جائے اور اگر سورت شروع کر دی ہے تو پھر سورت پوری کرنے کے بعد دوسری رکعت کی طرح تین تکبیریں زائد اور چوتھی تکبیر رکوع کے لئے کہہ کر رکوع میں چلے جاویں قراءت کا اعادہ نہ کیا جائے اور اگر رکوع میں یاد آوے تو تکبیروں کے لئے رکوع سے اٹھنا جائز نہیں بلکہ رکوع ہی میں آہستہ آہستہ[۲] کہہ لے اور مقتدیوں میں سے بھی جس جس کو یاد آئے اپنی اپنی تکبریں کہہ لیں خواہ ان کو امام کے تکبیر کہنے کا پتہ لگا ہو یا نہ لگا ہو۔ اور اگر کسی نے رکوع سے اٹھ کر تکبیریں کہنے کے بعد رکوع کیا تو نماز ہوگئی مگر برا کیا اور یہی تفصیل اس مسبوق کے لئے ہے جس کی دونوں رکعت رہ گئی ہوں۔

(۲) اسی طرح اگر دوسری رکعت میں امام تکبیریں بھول کر رکوع میں چلا جائے تب بھی تکبیروں کے واسطے رکوع سے واپس نہ ہو بلکہ رکوع ہی میں آہستہ آہستہ تکبیریں پڑھ لے اور مقتدی بھی جیسا کہ ابھی[۳] گزرا اور یہی حکم مسبوق کے بھول جانے کا ہے۔

(۳) نماز عیدین میں اگر بھول سے تکبیر رہ جاویں یا اور کوئی بات سجدہ سہو کی موجب ہوجائے تو امام کو چاہیے کہ سجدہ سہو نہ کرے کیونکہ زیادہ مجمع کی وجہ سے لوگوں کو غلطی ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ البتہ اگر مجمع کم ہو اور غلطی کا اندیشہ نہ ہو تو سجدہ سہو کر لے اور اگر مسبوق سے اس کی رہی ہوئی نماز میں کوئی

---

[۱] اگر الحمد پوری پڑھ لی تھی یا اکثر حصہ پڑھ لیا تھا تو اعادہ کرنے سے سجدہ سہو واجب ہوگا۔ مگر امام سجدہ سہو نہ کرے جیسا کہ آگے آتا ہے اور مسبوق کرے ۱۲ منہ [۲] کیونکہ بلند آواز سے کہنے میں جماعت گڑبڑ کر یگی۔ ۱۲ منہ [۳] یعنی کم از کم چار آدمی ہوں ۱۲ منہ

بات سجدہ سہو کی موجب سرزد ہو تو اس کو سجدہ سہو کرنا واجب ہے۔

(۴) اگر نماز پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ کسی وجہ سے نماز بالکل نہیں ہوئی تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مجمع متفرق ہونے سے پیشتر ہی پتہ لگ گیا تب تو دوبارہ نماز پڑھنا ضروری ہے اور اگر مجمع متفرق ہو چکنے کے بعد خبر ہوئی تو اعادہ نماز میں مختلف روایات ہیں۔ مگر آسانی اس روایت کو لینے میں ہے کہ اب جماعت کا دہرانا ضروری نہیں بلکہ صرف امام نماز لوٹا لے وھو حکم الاستحسان کما فی الشامی عن البدائع۔ ہاں اگر احتیاطاً اعلان کر کے دوبارہ پڑھ لی جاوے تو بہتر ہے اگر اس روز موقع نہ ملے تو عید الفطر میں دوسرے روز بھی لوٹا سکتے ہیں اور عید الاضحیٰ میں تیسرے روز بھی واللہ اعلم اور یہ سب تفصیل امام کی نماز فاسد ہونے میں ہے اور اگر مقتدی یا مسبوق کی نماز فاسد ہو جاوے تو کسی حال میں قضا نہیں ہے۔

(۵) اگر کوئی شخص عیدگاہ میں ایسے وقت پہنچا کہ نماز ختم ہو چکی ہے تو یہ تنہا نماز عید نہیں پڑھ سکتا بلکہ اگر دوسری جگہ نماز ہوتی ہو وہاں چلا جاوے ورنہ چار رکعت چاشت کی نیت سے پڑھ لے اور اگر چند آدمی رہ گئے ہوں تو جائز ہے کہ کسی دوسری جگہ جماعت کر کے نماز عید پڑھ لیں۔ فقط والسلام

قربانی کی تاکید و فضیلت

یہ تاکید و فضیلت کا مضمون حیات المسلمین سے کسی قدر تغیر و اختصار کے ساتھ لیا گیا ہے جو شخص پورا مضمون دیکھنا چاہے وہ اصل کتاب ضرور دیکھ لے بلکہ وہ پوری کتاب حرز جان بنانے کے قابل ہے۔ بالخصوص دیباچہ کہ روح الارواح ہے اور تاکید تو اسی کیلئے ہے جس پر واجب ہو لیکن جس پر واجب نہ ہو اگر وہ بھی کر دے یا کوئی شخص اپنے بچوں کی طرف سے بھی کر دے تو اس کو بھی بہت ثواب ملتا ہے اور اگر کسی میت کی طرف سے کرے تو اس میت کو بھی بہت ثواب ملتا ہے اب اس کے متعلق آیتیں اور حدیثیں لکھی جاتی ہیں۔

آیات (۱) فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (کوثر) یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب ہے کہ نماز پڑھئے اور قربانی کیجئے۔ **فائدہ:** اور یہ حکم امت کو بھی شامل ہے کیونکہ آنحضرتؐ کے لئے خاص ہونے کی کوئی دلیل نہیں بلکہ عام ہونے کی دلیل موجود ہے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص قربانی کی گنجائش رکھتا ہو اور قربانی نہ کرے تو وہ ہماری عیدگاہ میں نہ آوے (حاکم) اس حدیث شریف سے کس قدر ناراضی معلوم ہوتی ہے ان سے جو کہ باوجود واجب ہونے کے ترک کرتے ہیں کیا اس کو وہ لوگ سن کر بھی بیدار نہ ہوں گے۔

(۲) فرمایا اللہ تعالیٰ نے کہ ہم نے ہر امت کے لئے قربانی کرنا اس غرض سے مقرر کیا تھا کہ وہ ان مخصوص چوپایوں پر (یعنی گائے اونٹ بکری بھیڑ سب کے نر و مادہ پر) اللہ کا نام لیں جو اس نے ان کو عطا فرمائے تھے۔

(ف ۱) اس آیت سے معلوم ہوا کہ قربانی بڑی مہتم بالشان عبادت ہے جو کہ سب امتوں کیلئے مشروع رہی ہے۔

فائدہ (۲) بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ. جو اس آیت میں آیا ہے اردو میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو اس کا ترجمہ ہو سکے اس لئے جن جن چوپایوں پر یہ لفظ بولا جاتا ہے ان سب کا نام لکھ دیا اور گائے کے حکم میں بھینس بھی ہے اور دنبہ بھیڑ کی قسم ہے۔ پس قربانی بارہ چیزوں کی جائز ہے گائے' بیل' بھینس' بھینسا' اونٹ' اونٹنی' بکرا' بکری' بھیڑ' مینڈھا' دنبہ' دنبی' ان کے سوا اور کسی کی قربانی جائز نہیں۔

(۳) اور قربانی کے اونٹ اور گائے کو ہم نے اللہ (کے دین) کی یادگار بنایا ہے کہ ان کی قربانی سے اللہ تعالیٰ کی عظمت اور دین کی رفعت ظاہر ہوتی ہے اور اس حکمت کے علاوہ) ان جانوروں میں تمہارے (اور بھی) فائدے ہیں۔ (مثلاً دنیوی فائدہ کھانا اور کھلانا اور اخروی فائدہ ثواب (فائدہ:۱) اگرچہ بکری بھیڑ بھی قربانی کے جانور ہیں اور اس لئے وہ بھی دین کی یادگار ہیں مگر آیت میں خاص اونٹ اور گائے کا ذکر فرمانا اس لئے ہے کہ ان کی قربانی بھیڑ بکری کی قربانی سے افضل ہے۔ اور حدیث شریف میں جو آیا ہے کہ سب سے عمدہ قربانی سینگ والا مینڈھا ہے سو اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی جنس میں مینڈھا سب سے افضل ہے یعنی بکری وغیرہ سے اور دنبہ بھی مینڈھے کے حکم میں ہے اور اگر پوری گائے یا اونٹ نہ ہو بلکہ اس کا ساتواں حصہ قربانی میں لے لے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ اگر ساتواں حصہ اور پوری بکری یا بھیڑ قیمت اور گوشت کی مقدار میں برابر ہوں تو جس کا گوشت عمدہ ہو وہی افضل ہے اور اگر قیمت اور گوشت میں برابر نہ ہوں تو جو زیادہ ہو وہ افضل ہے۔ (شامی از تاتارخانیہ)

فائدہ ۲: اس سے معلوم ہوا کہ گائے کی قربانی خاص درجہ رکھتی ہے اور بعض جاہل جو کہتے ہیں کہ حضورؐ نے گائے کا گوشت کھانے سے منع فرمایا ہے سو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس کا گوشت شرعاً ناپسند ہے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی اہل عرب کو بوجہ خشک ملک ہونے کے موافق نہیں۔

نمبر ۴: اللہ تعالیٰ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون لیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ اور اخلاص پہنچتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان چوپایوں کو تمہارا زیر حکم کر دیا تا کہ تم اس بات پر اللہ کی برتری بیان کرو کہ اس نے تم کو توفیق دی اور (اے پیغمبر) اخلاص والوں کو خوشخبری سنا دیجئے (سورہ حج)

فائدہ: اخلاص کے یہ معنی ہیں کہ خاص حق تعالیٰ کو خوش کرنے اور اس سے ثواب حاصل کرنے کی نیت ہو کوئی دنیا کی غرض شامل نہ ہو۔

احادیث-۱: حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قربانی کے دن میں آدمی کا کوئی عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک قربانی کرنے سے زیادہ پیارا نہیں اور قربانی کا جانور قیامت کے دن مع اپنے سینگوں اور اپنے بالوں اور کھروں کے حاضر ہوگا۔ (یعنی ان سب چیزوں کے بدلے ثواب ملے گا اور (قربانی کا) خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے یہاں ایک خاص درجہ میں پہنچ جاتا ہے سو تم

لوگ جی خوش کر کے قربانی کیا کرو (زیادہ داموں کے خرچ ہو جانے پر جی برا مت کیا کرو) (ابن ماجہ ترمذی وحاکم)

نمبر۲: زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ صحابہؓ نے پوچھا یا رسول اللہؐ یہ قربانی کیا چیز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا تمہارے (نسبی[1] یا روحانی) باپ ابراہیمؑ کا طریقہ ہے انہوں نے عرض کیا کہ ہم کو اس میں کیا ملتا ہے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا ہر بال کے بدلے ایک نیکی انہوں نے عرض کیا کہ اگر اون (والا جانور یعنی بھیڑ دنبہ) ہو آپؐ نے فرمایا کہ ہر اون کے بدلہ بھی ایک نیکی (حاکم[2])

فائدہ: کتنی بڑی رحمت ہے کہ بکری وغیرہ کی قربانی کرنے سے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے پیرو کار شمار کیے گئے جنہوں نے اپنے اس پیارے پہلوٹے کے بچے کو قربانی کیا تھا جو بڑھاپے میں بڑی تمناؤں کے بعد نصیب ہوا تھا۔ اس سے بڑھ کر اور کیا فضیلت ہوگی۔

نمبر۳: حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے فاطمہؓ اٹھو اور (ذبح کے وقت اپنی قربانی کے پاس موجود رہ کیونکہ پہلا قطرہ جو قربانی کا زمین پر گرتا ہے اس کے ساتھ ہی تیرے لئے تمام گناہوں کی مغفرت ہو جائے گی (اور) یاد رکھ کہ (قیامت کے دن) اس (قربانی) کا خون اور گوشت لایا جائے گا اور تیرے میزان (عمل) میں ستر حصے بڑھا کر رکھ دیا جاویگا۔ (اور ان سب کے بدلے نیکیاں دی جاویں گی) ابو سعید نے عرض کیا یا رسول اللہؐ یہ (ثواب مذکور) کیا خاص آل محمدؐ کے لئے ہے کیونکہ وہ اس کے لائق بھی ہیں کہ کسی چیز کے ساتھ خاص کئے جائیں یا آل محمدؐ اور سب مسلمانوں کے لئے عام طور پر ہے آپؐ نے فرمایا کہ آل محمد کے لئے (ایک طرح سے) خاص بھی ہے اور سب مسلمانوں کے لئے عام طور پر بھی ہے (اصبہانی)

فائدہ: ایک طرح سے خاص ہونے کا مطلب ویسا ہی معلوم ہوتا ہے جیسا قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے لئے فرمایا کہ نیک کام کا ثواب بھی اوروں سے دونا ہے اور گناہ کا عذاب بھی دونا ہے۔ سو قرآن مجید سے آپ کی بیبیوں کے لئے اور اس حدیث سے آپ کی اولاد کے لئے بھی یہ قانون ثابت ہوتا ہے اور اس کی بناء زیادہ بزرگی ہے۔

نمبر۴: حسینؓ بن علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اس طرح قربانی کرے کہ اس کا دل خوش ہو کر (اور) اپنی قربانی میں ثواب کی نیت رکھتا ہو وہ قربانی اس شخص کیلئے دوزخ سے آڑ ہو جائے گی۔ (طبرانی کبیر)

نمبر۵: حنش سے روایت ہے کہ میں نے حضرت علیؓ کو دیکھا کہ دو دنبے قربانی کئے اور فرمایا ان میں ایک میری طرف سے ہے اور دوسرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے ہے میں نے ان سے (اس کے

---

[1] یعنی بعض کے صرف روحانی باپ اور بعض کے نسبی بھی ۱۲ [2] ورواہ احمد وابن ماجہ ایضاً ۱۲ منہ

متعلق) گفتگو کی انہوں نے فرمایا کہ حضورؐ نے مجھ کو اس کا حکم دیا ہے میں اس کو کبھی نہ چھوڑوں گا (ابوداؤد و ترمذی)

فائدہ: حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہم پر بڑا حق ہے اگر ہم ہر سال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے بھی ایک حصہ مقرر کر دیا کریں تو کوئی بڑی بات نہیں۔

نمبر ۶: ابوطلحہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دنبہ کی اپنی طرف سے قربانی فرمائی اور) دوسرے دنبہ کے ذبح میں فرمایا کہ یہ (قربانی) اس کی طرف سے ہے جو میری امت میں سے مجھ پر ایمان لایا اور جس نے میری تصدیق کی (موصلی وکبیر واوسط)

فائدہ: مطلب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنی امت کو ثواب میں شامل کرنا تھا۔ نہ یہ کہ قربانی سب کے طرف سے ایسے طرح ہوگئی کہ اب کسی کے ذمہ قربانی نہیں رہی۔

فائدہ-۱: غور کرنے کی بات ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قربانی میں امت کو یاد رکھا تو افسوس ہے کہ امتی حضورؐ کو یاد نہ رکھیں اور ایک حصہ بھی آپ کی طرف سے نہ کر دیا کریں۔

نمبر ۷: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی قربانیوں کو خوب قوی کیا کرو (یعنی کھلا پلا کر) کیونکہ وہ پل صراط پر تمہاری سواریاں ہوں گی (کنز العمال فر عن ابی ہریرہؓ)

فائدہ: عالموں نے سواریاں ہونے کے دو مطلب بیان کئے ہیں ایک یہ کہ قربانی کے جانور خود سواریاں ہو جاویں گی اور اگر کئی جانور قربانی کئے ہوں یا تو سب کے بدلے میں ایک بہت اچھی سواری مل جاوے گی اور یا ایک ایک منزل میں ایک ایک قربانی پر سواری[1] کریں گے دوسرا مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ قربانیوں کی برکت سے پل صراط پر چلنا آسان ہو جائے گا جیسے گویا خود ان پر سوار ہو کر پار ہو گئے اور کنز العمال میں ایک حدیث اس مضمون کی یہ ہے کہ

نمبر ۸: سب سے افضل قربانی وہ ہے جو اعلیٰ درجہ کی ہو اور خوب موٹی ہو (حم ک عن رجل) اور ایک حدیث یہ ہے کہ

نمبر ۹: اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ پیاری قربانی وہ ہے جو اعلیٰ درجہ کی ہو اور خوب موٹی ہو (حق عن رجل) (والضعف غیر مضر فی الفضائل لاسیما بعد انجبارہ بتعدد الطرق)

تاکید وفضیلت کے بعد مناسب معلوم ہوا کہ کچھ ضروری احکام بھی مختصر طور پر لکھ دیئے جاویں لہٰذا اصلاح انقلاب سے مختصراً اور خطبات الاحکام سے کسی قدر اضافہ وتغیر کے ساتھ چند احکام لکھے جاتے ہیں۔

احکام قربانی: (۱) ہر عاقل بالغ مرد و عورت مسلمان مقیم جس کے پاس بقدر نصاب[2] چاندی یا روزمرہ

---

[1] یعنی سب قربانیوں پر یکے بعد دیگرے سوار کیا جاوے گا اور ظاہر ہے کہ سواریاں بدلنے سے راستہ جلدی طے ہوتا ہے پس جتنی زیادہ قربانی کی جاوے اتنی ہی جلدی پل صراط سے پار ہو۔ [2] قربانی اور صدقہ فطر واجب ہونے کے لئے غیر ضروری سامان کا تجارتی ہونا شرط نہیں و نیز نصاب پر سال گزرنا بھی شرط نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر قربانی کے بالکل اخیر وقت میں کوئی نصاب کا مالک ہو جاوے تب بھی قربانی واجب ہو جاتی ہے اور اسی طرح اگر کوئی شخص مسافر تھا یا نابالغ یا مجنون تھا یا کافر تھا اور اخیر وقت میں مسلمان مقیم عاقل بالغ ہو گیا تب بھی قربانی واجب ہو جاتی ہے بلکہ اگر کوئی ایسا شخص قربانی کر چکا ہو جس کے ذمہ واجب نہ تھی اور پھر وجوب کی شرطیں وقت قربانی کے اندر پوری ہو گئیں تو اس کو دوبارہ قربانی کرنا پڑے گی۔ ۱۲

کی حاجت ضروریہ سے زائد یا اتنی ہی مالیت کا اسباب ہو اس پر واجب ہے کہ اپنی طرف سے قربانی کرے۔

(۲) اونٹ، بکرا، دنبہ، بھیڑ، گائے، بھینس نر ہو یا مادہ سب کی قربانی درست ہے گائے بھینس دو برس سے کم، بکری ایک برس سے کم کی نہ ہو۔ اور دنبہ چھ مہینہ کا بھی درست ہے جبکہ خوب فربہ ہو اور سال بھر کا معلوم[1] ہوتا ہو اور اونٹ گائے بھینس میں سات آدمی تک شریک ہو سکتے ہیں مگر کسی کا حصہ ساتویں حصے سے کم نہ ہو۔

(۳) جانور قربانی کا بے عیب ہو لنگڑا اندھا، کانا، اور بہت لاغر اور کوئی عضو تہائی سے زائد کٹا ہوا نہ ہو۔ خصی (یعنی بدھیا) کی اور جس کے سینگ نکلے ہی نہ ہوں قربانی درست ہے اور پوپلی جس کے دانت نہ رہے ہوں اور بوچی جس کے پیدائشی کان نہ ہوں جائز نہیں اور اگر بکری وغیرہ کا ایک تھن خشک ہو گیا یا بھینس وغیرہ کے دو تھن خشک ہو گئے ہوں اس کی قربانی بھی درست نہیں۔

(۴) دسویں تاریخ عید کی نماز کے بعد سے بارہویں کے غروب سے پہلے پہلے تین دن دو رات تک قربانی کا وقت رہتا ہے مگر دسویں افضل ہے پھر گیارہویں کا درجہ ہے پھر بارہویں کا اور رات کو ذبح کرنا مکروہ تنزیہی ہے اور اگر دس تاریخ کو کسی وجہ سے نماز نہ ہوئی ہو مثلاً بارش تھی تو زوال کے بعد قربانی کا وقت شروع ہوتا ہے اور اگر نماز عید[2] چند جگہ ہوتی ہو تو ایک جگہ ہونے کے بعد قربانی جائز ہے اور دیہات کے باشندوں کو جائز ہے کہ نماز عید[3] سے پہلے ذبح کر لیں بعد اس کے نماز کے لئے جائیں۔ (۶) اگر قربانی شرکت میں کریں تو محض انداز سے گوشت تقسیم کرنا جائز نہیں تول کر پورا پورا بانٹیں کسی طرف ذرا بھی کمی بیشی نہ ہو۔ ہاں جس حصہ میں کلے پائے بھی ہوں اس میں کمی چاہے جتنی ہو جائز ہے البتہ اگر مشترک ہی خرچ کرنا یا کسی کو دینا چاہیں تو تقسیم کی حاجت نہیں۔

(۷) بہتر ہے کہ کم از کم تہائی گوشت خیرات کر دے اور ایک تہائی اعزا و احباب کو دیدے۔ (۸) قربانی کی کوئی چیز قصاب کو اجرت میں دینا جائز نہیں۔ (۹) قربانی پر جھول ڈالنا مستحب ہے اور پھر اس کی رسی جھول سب تصدق کر دینا افضل ہے۔ (۱۰) قربانی کی کھال تو اپنے کام میں لانا جائز ہے مثلاً مصلیٰ وغیرہ بنوا لے لیکن کھال کا بیچنا اپنے خرچ میں لانے کے لئے درست نہیں۔ ہاں اگر قیمت خیرات کرنے کے لئے بیچے تو خیر۔ مگر اولیٰ یہ ہے کہ کھال ہی کسی کو

---

[1] اور بھیڑ میں اختلاف ہے کہ بکری کے حکم میں ہے یا دنبہ کے۔ بھیڑ سال بھر سے کم کی نہ کرے۔ ۱۲ منہ

[2] دیہات والوں کے واسطے دسویں تاریخ کی صبح صادق سے وقت شروع ہو جاتا ہے مگر بہتر یہ ہے کہ سورج نکلنے سے پیشتر نہ کریں ۱۲ منہ

[3] اور مستحب ہے کہ ذبح سے پہلے یہ آیتیں پڑھے اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ اور بسم اللہ واللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے پھر بعد ذبح یہ کہے اللھم منک ولک اللھم تقبل منی اور کئی شریک ہوں تو منا کہے اور جو کسی اور کی طرف سے ہو تو من کے بعد اس کا نام لے جس کی طرف سے قربانی کی جاوے۔ ۱۲ منہ

دیدی جاوے (۱۱) قربانی کے ذبح کے وقت دعا پڑھنا ایسی ضروری نہیں کہ بدوں اس کے قربانی ہی نہ ہو۔ جس کو یاد نہ ہو بسم[1] اللہ اللہ اکبر کہہ کے ذبح کر لے۔

(۱۲) اکثر لوگ قربانی کی کھال امام یا مؤذن وغیرہ کو دیدیتے ہیں یہ جائز نہیں کیونکہ اس کو ان کی خدمت مسجد کا صلہ سمجھا جاتا ہے اور کسی خدمت کے معاوضہ میں چرم قربانی وغیرہ دینا جائز نہیں البتہ اگر کسی امام وغیرہ سے صاف کہہ دیا جاوے کہ قربانی کی کھال بالکل نہ ملے گی اور پھر کوئی شخص بطور ہدیہ یا صدقہ کھال بجنسہ دیدے تو کچھ حرج نہیں خواہ وہ امام مصرف زکوٰۃ ہو یا نہ ہو کیونکہ بعینہ کھال دینے میں مصرف زکوٰۃ ہونا شرط نہیں۔ بلکہ جس طرح گوشت خود کھاتے ہیں اور امیر غریب اور سید وغیرہ سب کو دیتے ہیں یہی کھال کا حکم ہے گوشت اور کھال میں صرف یہی شرط ہے کہ کسی کو بطور حق الخدمت نہ دیا جائے اور اگر کھال کے دام دینا ہوں تو جس کو دے اس کا مصرف زکوٰۃ ہونا بھی شرط ہے۔ یعنی صاحب[2] نصاب اور بنی ہاشم[3] کو دینا جائز نہیں خوب سمجھ لو۔

(۱۲) ایک عام رسم یہ ہوگئی ہے کہ قربانی کے بعض حصص کو بعض لوگوں کا حق سمجھا جاتا ہے مثلاً سری کو سقے کا اور اگر وہ چیز ان کو نہ دی جاوے تو جھگڑا ہوتا ہے یہ حق سمجھنا اور ایسے موقع پر دینا بالکل ناجائز ہے جس کسی کو کچھ دیا جائے محض تبرعاً دیا جائے جیسا کہ

(۱۳) سے معلوم ہو چکا۔

(۱۴) بعض لوگ گابھن گائے بکری وغیرہ کی قربانی کو ناجائز سمجھتے ہیں یہ تو غلط ہے قربانی میں کوئی فرق نہیں آتا لیکن اگر پہلے سے معلوم ہو جاوے تو بہتر یہی ہے کہ اس کی قربانی نہ کرے۔ بلکہ اس کے بدلے میں دوسری کر دی جاوے لیکن اگر دوسری کم قیمت ہو تو جو دام باقی رہیں وہ خیرات کر دیئے جائیں۔

(۱۵) اگر کسی میت نے قربانی کی وصیت کی تھی تو اس قربانی کا گوشت خیرات کر دینا واجب ہے اور اگر بغیر وصیت کے ویسے ہی کسی نے ایصال ثواب کے لئے میت کی طرف سے قربانی کی ہو تو اس

---

[1] بسم اللہ اللہ اکبر کہنا ذبح کے وقت ضروری ہے چاہے قربانی ذبح کی جاوے یا ویسے ہی کھانے کے واسطے ذبح کیا جاوے۔ ۱۲ منہ

[2] جس قسم کا نصاب ہونے سے قربانی اور صدقہ فطر واجب ہوتا ہے اس قسم کے نصاب کا جو مالک ہو وہ زکوٰۃ فطرہ قیمت چرم قربانی وغیرہ صدقات واجبہ کا مصرف نہیں ہے۔ ۱۲ منہ [3] بنی ہاشم سے مراد بنی فاطمہ اور علوی اور عباسی اور حضرت جعفر و عقیل کی اولاد اور حارث کی اولاد ہے ان میں سے کسی کو زکوٰۃ وغیرہ دینا درست نہیں ۱۲ منہ

میں اپنی قربانی کی طرح اختیار ہے۔

(۱۶) بعض جگہ قربانی کی یا ویسے ہی کسی جانور کی کھال ذبح سے پہلے ہی فروخت کر دیتے ہیں یہ بالکل حرام ہے۔

(۱۷) اکثر جاہل یوں سمجھتے ہیں کہ اگر خاوند غریب یا قرضدار ہو تو بیوی کے ذمہ بھی قربانی نہیں یہ بالکل غلط ہے جب بیوی صاحب نصاب ہو جیسا کہ اکثر مقدار نصاب زیوران کی ملک ہوتا ہے تو اس پر مستقل قربانی وغیرہ واجب ہوتی ہے۔

(۱۸) قربانی کرنے والے کے واسطے یہ مستحب ہے کہ ذی الحجہ کے عشرہ میں بال اور ناخن نہ بنوائے بلکہ قربانی کے بعد بنوائے۔ فقط والسلام۔

باقی مسائل بہشتی زیور وغیرہ میں دیکھ لیں ونیز اصلاح الرسوم بھی قابل دید ہے

واللہ ولی التوفیق عبدالکریم عفی عنہ

خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون مورخہ ۳ شوال ۱۳۵۱ھ

بحمد اللہ تعالیٰ